پیشے والے اتنے تھے کہ انہیں بھی مصلحتوں کو گلے لگانا پڑتا تھا۔ ہنگامہ آرائیاں اور اخبار بازیاں ہو رہی تھیں کہ مظہر امام بحیثیت پروگرام ایگزیکیوٹو آپہنچے۔ سہیل صاحب اردو پروڈیوسر تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ سہیل صاحب بھی مجبور تھے اور مظہر امام بھی۔ جب حکم یہ ہو کہ ادب شاعری کے تن ناتواں میں حب الوطنی ترقیاتی پروگراموں اور فیملی پلاننگ کے انجکشن سرایت کردو تو پھر بیچارے پروڈیوسر اور پروگرام ایگزیکیوٹو کر بھی کیا سکتے ہیں؟

پھر بھی ان لوگوں کی کوششوں سے بہار کے جدید شعرا کی ایک محفل سخن منعقد کی گئی۔ کچھ عمدہ مذاکرے کرائے گئے اور 'نیا سفر نئے راہی' کے پروگرام میں اردو کی جدید ترین نسل دریافت کی گئی۔

مظہر امام 'اکل حلال' پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ دس سوا دس تک دفتر پہنچ جانا اور پھر چھ سوا چھ تک دفتر میں کام کرنا۔ لنچ کے اوقات میں بھی اپنی کرسی پر ڈٹے رہنا اور اس کے گذرنے پر وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے بریف سے لنچ بکس نکال کر تین چار سینڈوچیں لے لینا۔

اردو پروگرام کو بہتر بنانے کی جو ترکیبیں مظہر امام کے ذہن میں تھیں، کچھ دن چل کر ان کا بھی وہی حشر ہوا جو سہیل صاحب کی تدبیروں کا ہوا تھا۔ حکم ہوا کہ 'رفتار زمانہ' پر زیادہ سے زیادہ پروگرام دیا جائے۔ تب مسئلہ یہ اٹھا کہ اردو کے صحافیوں کو ترجمہ شدہ خبریں ملتی ہیں۔ اگر ترجمہ غلط ہو گیا ہو تو؟ یا معاملہ غیر ملکی زبان کا ٹھہرا، بات کہیں الٹی سمت سے پلٹے پڑ گئی تو؟ نتیجہ یہ ہوا کہ کچے پکے سبھی طرح کے مواد آنے لگے۔

لیکن شکایت کرنے والی زبانیں کسی قدر بند ہو گئیں۔ شاعر نہ ہوا، افسانہ نگار، مضمون نگار یا کچھ بھی نہ ہوا تو پھر 'رفتار زمانہ' میں تو کھپ ہی جاتا تھا۔

میں نے کسی قدر یوں کہا کہ کچھ لوگوں کو اس پر بھی شکایت باقی رہی اور انھوں نے اردو اخباروں میں خوب خوب مراسلے نکالے ایک صاحب نے لکھا کہ ریڈیو اسٹیشن پر درباداریاں ہوتی ہیں۔ درباداریاں ہوتی ہوں یا نہ ہوتی ہوں، یہ ایک حقیقت تھی کہ دفتر میں جمگھٹا سا رہتا تھا، بلکہ کچھ لوگ تو وقت کاٹنے آجایا کرتے تھے۔ اس مراسلے کے بعد غیرت مندوں نے تو آنا چھوڑ دیا، یا بہت کم کر دیا، لیکن کچھ لوگ تو اس کے بعد بھی آتے رہے۔

ایک دن میں ریڈیو اسٹیشن میں سہیل صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ اٹھنے لگے تو میں نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ اچھا تو میں بھی ذرا چھوٹی خانقاہ ہو لوں، بڑی خانقاہ تو ہو لیا۔ انہوں نے برجستہ کہا۔ تم نے غلط اندازہ لگایا، وہی بڑی خانقاہ ہے، چھوٹی خانقاہ تو یہ ہے۔

بہر حال یہ کہ دونوں سن و سال کے حدود کو توڑ کے ملتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ سہیل صاحب اکثر لوگوں کے چچا اور ماموں بھی ہو جاتے تھے۔

وہ مکان انہوں نے بہت جلد چھوڑ دیا اور تب 'مسکن' کے ایک اپارٹمنٹ میں اٹھ آئے۔ اس قطعے میں یہ خوبی تھی کہ یہ سر بازار نہیں تھا۔ اس میں در و دیوار کا احساس جاگتا تھا اور ایک علیحدگی کا سکون میسر آتا تھا۔

لیکن وہ گیارہ کمروں کا ایک پر وقار مکان (دربھنگہ) جہاں وہ اپنے والد، والدہ، بڑی اماں، ایک چچازاد بیوہ بہن دو بھائی اور دو بہنوں کے ساتھ رہا کرتے تھے، اب ایک خواب بن گیا تھا۔ اب تو وقت یہ تھا کہ چار چھوٹے کمروں کے اس قطعے کو

پھیلا کر ایک عالیشان محل بنا دیا جائے، یا پھر اُسے سمیٹ کر ایک غنیمت سی اقامت گاہ کی صورت دیدی جائے۔

لیکن میں سوچتا ہوں کہ ایک موِن (شبیر امام، عمر ۱۲ سال) ایک ڈولی (فرزانہ امام۔ عمر ۸ سال) ایک بھابھی، ایک منظر امام اور ایک nanny قسم کے نوکر کے لئے جسے کبھی بھابھی ویشالی سے پکڑ لاتی تھیں اور کبھی وہ دربھنگہ سے لایا جاتا تھا اس سے بڑے قطعے کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی۔

موِن اور ڈولی دونوں بے حد پیارے بچے ہیں۔ موِن کی اٹھان کہتی ہے کہ یہ منظر امام پر جائے گا۔ بے حد سنجیدہ سا اسکول جائے گا، وہاں سے واپس آکر کھیلے گا۔ اور پھر رات کو ٹیوٹر سے پڑھے گا۔

ڈولی فرفری سی ذہین بچی ہے۔ گڑیا جیسی ہوتے ہوئے بھی قطب مینار جیسے پاپا کا مذاق اُڑائے گی۔ ادیبوں اور شاعروں کا آٹوگراف لے گی اور خوش نما کلیوں کی صورت کی جدید ترین نظمیں لکھے گی۔

منظر امام کے یہاں زمین داری تو معمولی سی تھی، لیکن کاشتکاری اچھی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ شہری جائداد بھی تھی اور اس طرح پانچویں دہائی تک جو بہار کے شرفا کے یہاں تہذیب رائج تھی، وہ ان کے گھر میں بھی پائی جاتی تھی۔ ایک ایسا خاندانی نظام جہاں ایک بزرگ کا ہونا بے حد ضروری ہوتا۔ دادا کے انتقال کے بعد باپ، باپ کے انتقال کے بعد گھر کا سب سے بڑا لڑکا جس کے ذمے نظم و نسق سونپ دیا جاتا۔ اور پھر وہ سیاہ و سفید کا مالک ہو جاتا اور اس کی حیثیت بالعموم ایک BENEVOLENT DICTATOR کی ہوتی۔ گھر میں مذہب کا چرچا ہوتا جس کی وجہ سے گھر میں مولوی ہوتے، ذرا اور اچھی حیثیت کے لوگ ہوئے تو ایک حافظ، ایک قاری ایک خوش نویس اور کبھی کبھی ایک لالہ جی بھی رہا کرتے۔ یہ لوگ جہاں بچے کی مذہبی تعلیم کے ذمہ دار ہوتے، وہاں اس کی ذہنی تربیت، اس کی ذہنی پرداخت اور کسی قدر علم مجلس سکھانے کا کام بھی انجام دیتے۔ چنانچہ جب گھر میں مرغی رکھا جاتا تو ان پردے کے پیچھے آکر کہتی "گوشت پوست میرا چمڑی آپ کی"۔

پھر جب بچہ اسکول میں داخل ہوتا تو انگریزی، حساب اور دیگر علوم کے لئے ماسٹر رکھے جاتے۔

منظر امام نے بھی کم و بیش یہی ماحول پایا تھا۔

نو برس کے لڑکے کے ذہن پر ہر نقش ادھورا اور ناپختہ سا اترتا ہے، اور یوں جب میر کارواں نے ۱۱ر نومبر ۳۹ء کو کارواں کو الوداعی سلام کہا تو سارے میں بجلیاں سی کوند گئیں۔ قیامت ایسی قیامت۔ بڑی اماں اور اماں دونوں رو رہی تھیں۔ لیکن منظر امام تو بغیر آنسوؤں کے رو رہے تھے، یا محض ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ احساس زیاں تو ان کے اندر بعد میں جاگا، پھر وہ روئے اور جی بھر کے روئے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں والد کا دس روپے ماہوار پر محکمہ ڈاک و تار میں تقرر ہوا تھا اور وہ ۳۲ء میں سلکشن گریڈ پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے چار سو روپے کی تنخواہ پر ریٹائر ہوئے۔

دادا انبالہ کے رہنے والے تھے۔ وہ ملٹری ڈاکٹر تھے۔ بہار میں آنے کی کہانی یوں ہے کہ جب بکسر (ضلع آرہ) میں اُن کا تبادلہ ہوا تو وہیں انہوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ والد اور ان کے چھوٹے بھائی دادا کے ساتھ ہی آئے تھے۔ والد کی پہلی شادی خاندان ہی میں ہوئی تھی۔ یہ ان کی ابتدائی عمری کا زمانہ تھا۔ ان کی پہلی بیوی سے ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ والد کی دوسری شادی دربھنگے میں اُس وقت ہوئی جب وہ تبدیل ہو کر وہاں پہنچے اور پھر ریٹائر ہونے کے بعد

کلچرل اکادمی، رینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا

جنوری ۱۹۷۴ء

شمارہ ۴۲، ۴۳

دفتر کا پتہ:

ماہنامہ آہنگ، بیراگی، گیا

فون:

دفتر: ۶۶۲

رہائش: ۵۳

کتابت:

قمر نظامی

مطبع:

ہند لیتھو پریس بیکوڈ گنج، گیا

شرح خریداری

سال کے لئے	۱۵ روپے
دو سال کے لئے	۲۸ روپے
تین سال کے لئے	۴۰ روپے

عام شمارہ

ایک روپیہ پچیس پیسے

مرتبین

کلام حیدری، پرکاش فکری

محتویات

مزامیر

نظمیں

غزلیں

افسانے

مضامین

ذکر مارچ ۱۹۷۳ء کا ہے جب ایک رپورٹ کے مطابق "دلّی کے" ترقی پسند ادیبوں کی "تحریک" اور "دعوت" پر اُردو ادب میں عصری آگہی کے موضوع پر ایک دو روزہ سیمنار ہوا جس میں دلی کے ادیبوں کے علاوہ لکھنؤ، الہ آباد، علی گڑھ اور گیا (بہار) کے ادیبوں نے بھی شرکت کی۔

اِس سیمنار کے کنوینر جناب قمر رئیس تھے جنھوں نے ایک رپورٹ کے مطابق سیمنار کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ———

> "ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں نے ادب اور زندگی کی جن اقدار، جس تعلق اور ادیب کے سماجی شعور و آگہی پر جو زور دیا ہے، آج بھی اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔"

پھر:

> "آج کے معاشرے اور حالات میں بھی ادیبوں، خاص طور پر ترقی پسند ادیبوں کا ایک رول ہے۔"

ان دونوں اقتباسات میں سیمنار کے مقاصد کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ دوسرے اقتباس میں "ادیبوں" اور "ترقی پسند ادیبوں" کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا گیا ہے۔ یعنی آج کے معاشرے اور حالات میں ادیبوں کا رول ایک ہے مگر ترقی ادیبوں کا "خاص طور پر" ایک رول ہے۔

مقاصد کا اظہار کہیں نہیں ہے مگر بغیر اعلان کے جو مقصد اس سیمنار کا تھا وہ ترقی پسند مصنفین کی صف آرائی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ آج بھی ہمارے بعض ادیبوں کے ذہن میں پُرانی یادیں اتنی گہری ہیں کہ وہ ادیبوں کی کوئی فعّال انجمن چاہے نہ بنا سکیں مگر انجمن ترقی پسند مصنفین کے مزار کے مجاور بننے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں مارتے ہی رہتے ہیں۔ ادب تخلیق کرنے کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا عرس منانا کون سی ترقی پسندی ہے؟

چھوڑئے اس عرس کا ذکر۔ اب سیمنار کی بحثوں کو دیکھئے۔

پہلا اجلاس، افسانوی ادب اور عصری آگہی کے موضوع پر ہوا جس میں مقالے پڑھے گئے۔ پریسیڈیم میں قاضی عبدالستار اقبال مجید اور بلراج مین را تھے۔ مقالات پڑھنے والوں میں افسانہ نگار انور عظیم، رضیہ سجّاد ظہیر، اقبال مجید، عابد سہیل اور کوثر چاند پوری تھے۔

مقالات میں، رپورٹ کے مطابق یہ بات کھُل کر (!) سامنے آئی کہ اُردو کے افسانوی ادب میں عصری آگہی کا وجود پورے طور پر نمایاں رہا ——

کیوں کر نمایاں رہا ؟

" آزادی کے حصول کے بعد جو مسائل اور حقائق رونما ہوئے اُن کا عکس ہمارے
افسانوں میں موجود ہے ۔ "

افسانوں کا معیار کیسا رہا ؟ افسانے اپنے ماضی سے آگے بڑھے یا نہیں ؟ افسانے بحیثیت افسانے
کہاں تک پہونچے ؟ ان باتوں سے نہ کوئی غرض اور نہ ان کا ذکر ــــــــــ بس صرف یہ کہ آزادی کے بعد " مسائل "
اور " حقائق " کا کہاں کہاں " عکس " ہمارے افسانوں میں موجود ہے ۔

اعلانات اگر ادب کا معیار بن سکتے تو ترقی پسند مصنفین کی چادر پون کی چاندنی مستقل چاندنی بن جاتی ۔
یہ اعلان ملاحظہ ہو :

" حقیقت یہ ہے کہ عصری آگہی کے بغیر اچھا ادب پیدا ہی نہیں ہو سکتا ۔
ادب کے اچھے بُرے کی پہچان میں یہی چیز معاون ہوتی ہے ۔ "

ایسی بے اعتبار چیز کو معاون بنا کر جو ادیب ادب کا جائزہ لیں گے اُسے جانچیں گے ، اُن کا عبرت ناک حشر
ہم ۵۰ ء تک دیکھ چکے ہیں ۔

رضیہ سجاد ظہیر نے تو اور بھی کمال کر دیا ۔ حضرت سعدی کو دمشق کے قحط اور یاروں کے عشق کو بھول
جانے والے شعر پر انہوں نے ایسی داد دی ہے کہ حضرت سعدی ایک بار تو قبر میں ضرور اُٹھ کر بیٹھ گئے ہوں گے ۔
شامت کے مارے کہاں سے گوپی چند نارنگ بھی دوسرے اجلاس میں پہونچ گئے تھے ، جن کی باتوں کو " اکثریت "
نے رد کر دیا ۔ ادبی بحث کا فیصلہ اتنا جمہوری نہیں ہوا کرتا ۔ یہ بات بھیڑ بھاڑ میں کیسے سمجھائی جائے ؟

انجمن ترقی پسند مصنفین کے آئندہ عرس میں دیکھئے کیسی کیسی چادریں چڑھتی ہیں ۔

••

ید اختر

ن کی تلاش

میرے اطراف آباد ہیں جسم کی بستیاں
آب و گل میں ہیں پیوست سب کی جڑیں
سب بدلتے ہوئے موسموں کی ہواؤں کے پروردگاں
اندھی بے رحم فطرت کے ظلم اور الطاف کے ٹھوس مرئی نشاں
ارتقا کے مراحل کی بکھری ہوئی داستاں

کچھ بدن ٹھوس، فربہ، تنومند اصنامِ سنگ
آہنی استخواں اور سنگین عضلات کی گٹھریاں
زندہ روحِ نباتات سے عاری جمادات کی سطح پر

کچھ بدن پھیلنے، پھولنے اور زمین گھیرنے کی جبلت کے آثار ہیں
روشنی اور ہوا کے لئے جن کی شاخیں ہیں دستِ سوال
روحِ حیواں سے عاری نباتات کی سطح پر زندہ ہیں

کچھ بدن خواہشوں کے امڈتے ہوئے گرم طوفاں کی جولاں گہ
اشتہا اور شہوت کی چلتی ہوئی سانس لیتی دکاں
روحِ انساں سے عاری بہائم کی دنیا میں ہیں حکمراں

کچھ بدن روح کا بوجھ کاندھوں پر اپنے اٹھائے ہوئے
رشتۂ جسم و جاں میں بندھے غیرمرئی حقیقت کے دیدار کے ملتجی
جسم ہونے پہ بھی منکرِ جسم اور زندہ رہ کر بھی ہیں خواہشوں سے تہی

میں بھی اک عمر سے جسم کی ایک بستی میں محصور ہوں

شمارہ ۳۴-

میری ہم نام اک روح اس خاک داں میں مرے ساتھ ہی قید ہے
جسم کہتا ہے تو، ہے مری خواہشوں، احتیاجوں، تقاضوں کا پیکر
روح کہتی ہے تو، میری نادیدہ امید و شوق و طلب ہی کی پرچھائیں ہے
جسم اور روح کی اس کشاکش میں مجھ کو پتا اپنا ملتا نہیں

میں اگر روح ہوں، جسم مجھ پر ہے بارِ گراں
میں اگر جسم ہوں، روح کا یہ جہنم ہے میرے لئے اک وبال
میں اگر روح بھی، جسم بھی تو کشاکش ہے دونوں میں کیوں؟

جسم کی بستیوں میں بھٹکتا ہوں، اک عمر سے
روح کے راستے میں ہما دات کا آہنی اور سنگیں حصار
خواہشوں کے دہکتے ہوئے دشت میں ہیں نباتات و حیوان میرے حریف
جسم کی کشمکش روح در روحانیت کے اندھیرے میں بجھتا دیا
جسم کی بستیاں اس کشاکش پہ خندہ زناں
ہاتھ آتا نہیں روح کا غیر مرئی جہاں

کس سے پوچھوں کہ میں کون ہوں، کیا ہوں، میرا مقدر ہے کیا
جسم اور روح کی کشمکش میں مرا حاصلِ عمر ہے رائیگاں
کوئی میرا پتہ مجھ کو دیتا نہیں
عمر کی دولتِ بے بہا شاید آئندہ بھی ہو اسی فکر میں رائیگاں
میں ہوں کیا اور کھڑا ہوں کہاں
میرے چاروں طرف جسم کا دشت ہے نوحہ خواں
میری پہنائی میں روح کا اک خلا از کراں تا کراں بیکراں

وہ جو "میں" ہوں
کہاں کھو گیا جسم اور روح کے درمیاں؟

احمد یوسف

نہ کوئی لطفِ سماعت نہ کوئی لذّتِ دید

اور یہیں سے محرومیوں کی ایک داستان شروع ہوتی ہے۔ دراصل یہ محرومیاں تو عام ہیں، لیکن کتنے ہیں جو اس گراں باری کو محسوس کرتے ہیں۔ کتنے ہیں جو زخم کھانے پر چیختے ہیں چلاتے ہیں ــــ چپکے سے رو لینا، چپکے سے سہ لینا لیکن اس سے بالکل ہی مختلف ذکر اس کی ہوتی ہے جو زخم لگتے ہی اُبل پڑتا ہے۔ دیکھو یہ میرا مقدر ہے بھی یہیں ہوں۔

اب کے جو مظہر امام آئے تو بہ اندازِ دگر آئے۔ جیسے ایک شہر آباد تھا، جیسے ایک شہر کھو گیا تھا۔
یہ غالباً ۱۹۶۷ء کے اواخر کی بات ہے۔ اس بار ان کی حیثیت کسی کانفرنس کے مندوب کی نہ تھی اور نہ وہ یہاں محض ملنے ملانے کی غرض سے دو چار دنوں کے لئے آئے تھے۔
اب کے وہ آکاش وانی میں پروگرام ایگزیکٹو کی حیثیت سے آئے تھے۔
میرے آنے سے ۱۹۵۰ء سے ۵۴ء تک کی بہت سی ملاقاتیں گزر گئیں۔
چلتے چلتے بازوں کے پاؤں شل ہو گئے تھے۔ بڑوں کے یہاں بڑوں ہی کی پہنچ تھی۔ لیکن متوسط درجے کے اور پھر ان سے بھی نیچے درجے کے۔ وہ دیر سے کھڑے تھے، ٹہل رہے تھے۔ کوئی جگہ نہیں کہیں اماں نہیں۔ انہوں نے سوچا چلو اب کہیں تو بیٹھ تو سکتے ہیں کہ دیکھی تو ایک مضبوط تنے سے لگی مضبوط سی شاخ تھی جس پر بے خطر ہو کر بیٹھا جا سکتا تھا۔
گراؤنڈ فلور پر دو کمروں کا ایک نہایت ہی نامعقول سا فلیٹ جسے شور ہنگامے اور چیخ پکار سے الگ تھلگ رکھنا اس لئے ناممکن تھا کہ پڑوس میں ایک بے حد نامی گرامی وکیل رہا کرتے تھے جو رات گئے تک موکلوں میں گھرے رہتے اور جن کے گھریلو زندگی گویا ختم ہی ہو چکی تھی۔
یہ مصائب تو تھے ہی اس پر شام ہوتے ہی ملنے والوں کے تانتے۔
کبھی کبھی کر لیتیں۔ چائے بنانے بناتے اوب جاتیں وہ صبر شکر کرنا جانتی تھیں، لیکن ان کی بیگم [illegible]

جو خود کو سمٹا کر اخلاق مجسم بن جاتی ہیں۔ وہ خود کو سنبھال کر رکھنا جانتی تھیں اور یوں دوستوں، ملاقاتیوں اور جھگڑوں کو اغ
سے باہر دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔

تب ہی ہم نے محسوس کیا کہ مظہر امام بھی کسی قدر تنگ ہیں، اندر کے وار سے بھی اور باہر کے وار سے بھی۔

ان ہی دنوں شہر میں ایک بزرگ رہا کرتے تھے جو اونگھتے شہر میں، سوتے شہر میں آدھی رات کے بعد طلوع ہوا کرتے تھے کہ یہ
وہ وقت ہوتا جب انہیں چائے اور سگریٹ کی طلب ستایا کرتی تھی۔

مظہر امام نے یہ خبر دی تو میں دیر تک حیرت سے ان کا منھ تکتا رہا۔

یہ اسی شہر کی بات ہے؟

بالکل اسی شہر کی۔

تب ہی میں نے سوچا، خدا کے نیک بندے کہاں نہیں ملتے،

ادھر مظہر امام کے گھر کا سناٹا رات کے پہلے ہی حصّے میں بج جاتا تھا۔ ممکن ہے انہیں اس بات کا خدشہ لگا رہتا ہو کہ یہ
وہ زاہد شب گذار کسی دن رات کے پچھلے پہر ان کے یہاں قدم رنجہ فرما گئے تو پھر تو وہ کہیں کے نہیں رہیں گے۔

یہ لمحے ہم سبھوں کی زندگی میں آتے ہیں، اور تب ہی ہم بڑی سنجیدگی سے سوچتے ہیں کہ آخر ہم نے اس کاروبار میں ہاتھ ہی
کیوں ڈالا تھا۔

میں سمجھتا ہوں مظہر امام نے بھی اسی طرح سوچا ہوگا، لیکن جب ایک بار قالین کھل جاتا ہے تو پھر اسے سمیٹنا بڑا ہی مشکل کام
ہے۔ آخر آپ کس کس کو اٹھائیں گے۔

لیکن یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ مظہر امام نے آتے ہی سبھی در کھول دئے تھے اور جب بارش ٹوٹ ٹوٹ کر کمروں میں
آنے لگی تو پھر دوڑ دوڑ کر کھڑکیاں اور دروازے بند کرنے لگے۔ لیکن ایسی تیز بارش اور جھکڑ میں کھڑکیاں کیا خاک بند ہوتیں
وہ اور بھی کھل جاتیں، دروازے ہائیں ہائیں کرتے ہوئے اپنے سینے پھیلا دیتے۔

۶۷ء کے اکتوبر میں وہ گوہاٹی سے تبدیل ہو کر پٹنہ ریڈیو میں آ گئے۔

بہت دنوں بعد ریلوے گودام میں ان سے ملاقات ہوئی تو مجھے پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔

'مظہر امام صاحب؟'

'اچھا آپ ـ!'

ہاں بہت دنوں کی گمشدگی کے بعد بالآخر میں نے 'میں' کو تلاش کر لیا۔

اور تب ہم اس بات پر خوش ہوئے کہ مظہر امام نے اس شہر میں اپنے عہد کو پا لیا اور میں نے اپنے عہد کو۔

شہر میں یہاں سے وہاں تک کوئی نہیں تھا۔ گیا۔ جمشید پور۔ دلی۔ سری نگر۔

اور جب ہم ہی ہم ہوتے تو کتاب کے پچھلے صفحے کھل جاتے۔ ۵۲ء، ۵۳ء اور ۵۴ء۔

۵۲ء میں انجمن ترقی اردو کی کانفرنس۔ ہم رفیع بلخی صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے اور وہ نشست جس میں
جذبی، احتشام حسین، آل احمد سرور، حیات اللہ انصاری، پرویز شاہدی اور ڈاکٹر عبدالعلیم نے شرکت کی تھی۔

۴۵۳ ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ۔ دلی ۔
خم ملی کر دو گہرے دوست پہلی بار ملے ہیں ۔ مظہر امام اور نریش کمار شاد ۔
کبھی نہیں ملے تھے ؟ ۔
' کبھی نہیں ـــــــــــ '
۵۲ ء میں وہ میرے یہاں آئے ۔ ان دنوں میری مشغولیتیں کچھ اور تھیں ۔
آپ آج کل بے حد متفکر گم ہیں ۔ کیوں ۔ ؟
' BECAUSE THE REVOLUTION IS KNOCKING AT THE DOOR ' ـــ
نادم بلخی کے یہاں جاتے ہوئے مظہر امام نے خبر دی ۔
عبدالعزیز خالد آج کی بالکل ہی 'نئی' آواز ہے ۔ (اور انھوں نے تقریباً دو دہائیاں گزرنے کے بعد کہا ۔ بانیٔ اردو غزل کی نئی آواز ہے)
لیکن میں بالکل ہی بے تعلق سا تھا ۔ جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر ۔
وہ پھر چلے گئے ۔

اور آج جب اس واقعہ کو تقریباً بیس سال گزر چکے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وقت ایک پھیلے ہوئے دریا کی طرح ہمارے سامنے رواں دواں ہے ۔ دریا جو ہمارے آگے ہے ۔ دریا جو ہمارے پیچھے ہے ۔ حد نظر تک ۔
نہ کوئی معرکے کا عشق ، نہ خودکشی کی کوشش ، نہ بدمستی کا عالم ، نہ خانہ خرابی ـــــــــــ یہ رہے مظہر امام جنھوں نے اوائل میں 'امام' اسے بنایا جس نے اٹھارہ کامیاب عشق کئے تھے ۔ مظہر امام نے اٹھارہ کیا ایک سو اٹھارہ عشق کئے ہوں گے ۔ مگر یہ کہ تم اپنی راہ پر ۔ میں اپنی راہ پر ۔ اور ہمارے درمیان ایک گہری درد کی خلیج ۔ نہ مجھے تمہاری خبر اور نہ تمہیں میری خبر ۔ یوں کہ بے خبری ہی خبر بن جائے ۔ ہماری نسل کے لوگ غالباً اسی طرح عشق کیا کرتے تھے کہ ' اٹھارہ کامیاب عشق ' تو دراصل زاہدوں کا شیوہ ہے ۔
رابن شا پشپ ہندی کے افسانہ نگار ہیں ۔ باتیں ہو رہی تھیں ۔ احباب اپنے اپنے شہر کے اوصاف بیان کر رہے تھے ۔ پشپ نے کہا ۔ ' جانتے ہیں میرے شہر کی خوبی یہ ہے کہ وہاں مزے میں بیچ سڑک پر چل سکتے ہیں ۔ کوئی گاڑی نکل آئی تو صاف کہہ دیا کہ بھائی بغل سے نکل جاؤ اور خدا کے لئے مجھے نہ ستاؤ ۔ یہاں یہ کب ممکن ہے ۔
مظہر امام نے فخریہ انداز میں کہا ۔ میری پیدائش بھی مونگیر کی ہے ۔ ۳۰ ء کہ سرٹیفکیٹ یہی کہتی ہے ۔
مظہر امام ۶۷ ء میں پٹنہ ریڈیو میں داخل ہوئے تو کتنے ہی لوگوں نے سمجھا کہ ان کے دن پھرے ۔ سہیل عظیم آبادی سے شاعروں کو یہ شکایت تھی کہ وہ شاعری کو نثر کا قاتل سمجھ کر اس سے معاندانہ سلوک کرتے ہیں اور افسانہ نگاروں کو یہ شکایت تھی کہ وہ افسانے میں حل اور مقصد تلاش کرتے رہیں ۔ اور زمانہ یہ تھا کہ غزل نئے ڈکشن کی کھوج میں نئے بازاروں میں نکل کھڑی ہوئی تھی اور افسانہ کتنی ہی ہتھوں میں ڈوب کر نئے انسان کی تلاش میں چل کھڑا ہوا تھا ۔
لیکن یہ شکایتیں یکسر غلط تھیں ۔ دراصل سہیل صاحب GENUINE لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے ، پر یہ کہ دروازہ

پینے والے اتنے تھے کہ انہیں بھی مصلحتوں کو گلے لگانا پڑتا تھا۔ ہنگامہ آرائیاں اور اخبار بازیاں ہو رہی تھیں کہ مظہر امام بحیثیت پروگرام ایگزیکیوٹو آپہنچے۔ سہیل صاحب اُردو پروڈیوسر تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ سہیل صاحب بھی مجبور تھے اور مظہر امام بھی۔ جب حکم یہ ہو کہ ادب و شاعری کے تنِ ناتواں میں حب الوطنی ترقیاتی پروگراموں اور فیملی پلاننگ کے انجکشن سرایت کر دو تو پھر بیچارے پروڈیوسر اور پروگرام ایگزیکیوٹو کر بھی کیا سکتے ہیں؟ پھر بھی ان لوگوں کی کوششوں سے بہار کے جدید شعرا کی ایک محفلِ سخن منعقد کی گئی۔ کچھ عمدہ مذاکرے کرائے گئے اور 'نیا سفر نئے راہی' کے پروگرام میں اُردو کی جدید ترین نسل دریافت کی گئی۔

مظہر امام 'اکلِ حلال' پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ دس سوا دس تک دفتر پہنچ جانا اور پھر چھ سوا چھ تک دفتر میں کام کرنا۔ لنچ کے اوقات میں بھی اپنی کرسی پر ڈٹے رہنا اور اس کے گزرنے پر وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے بریف سے لنچ بکس نکال کر تین چار سینڈوچیں لے لینا۔

اُردو پروگرام کو بہتر بنانے کی جو ترکیبیں مظہر امام کے ذہن میں تھیں، کچھ دن چل کر ان کا بھی وہی حشر ہوا جو سہیل صاحب کی تدبیروں کا ہوا تھا۔ حکم ہوا کہ 'رفتارِ زمانہ' پر زیادہ سے زیادہ پروگرام دیا جائے۔ تب مسئلہ یہ اٹھا کہ اُردو کے صحافیوں کو ترجمہ شدہ خبریں ملتی ہیں۔ اگر ترجمہ غلط ہو گیا ہو تو؟ یا معاملہ غیر ملکی زبان کا ٹھہرا، بات کہیں اُلٹی سمت سے پلٹے پڑ گئی تو؟ نتیجہ یہ ہوا کہ کچے پکے سبھی طرح کے مواد آنے لگے۔

لیکن شکایت کرنے والی زبانیں کسی قدر بند ہو گئیں۔ شاعر نہ ہوا، افسانہ نگار، مضمون نگار یا کچھ بھی نہ ہوا تو پھر 'رفتارِ زمانہ' میں تو کھپ ہی جاتا تھا۔

میں نے کسی قدر یوں کہا کہ کچھ لوگوں کو اس پر بھی شکایت باقی رہی اور انھوں نے اردو اخباروں میں خوب خوب مراسلے نکالے ایک صاحب نے لکھا کہ ریڈیو سٹیشن پر درباداریاں ہوتی ہیں۔ درباداریاں ہوتی ہوں یا نہ ہوتی ہوں، یہ ایک حقیقت تھی کہ دفتر میں جمگھٹا سا رہتا تھا، بلکہ کچھ لوگ تو وقت کاٹنے آجایا کرتے تھے۔ اس مراسلے کے بعد غیرت مندوں نے تو آنا چھوڑ دیا، یا بہت کم کر دیا، لیکن کچھ لوگ تو اس کے بعد بھی آتے رہے۔

ایک دن میں ریڈیو اسٹیشن میں سہیل صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ اُٹھنے لگے تو میں نے بھی اُٹھتے ہوئے کہا۔ اچھا تو میں بھی ذرا چھوٹی خانقاہ ہو لوں، بڑی خانقاہ تو ہو لیا۔ انہوں نے برجستہ کہا۔ تم نے غلط اندازہ لگایا، وہی بڑی خانقاہ ہے، چھوٹی خانقاہ تو یہ ہے۔

بہرحال یہ کہ دونوں سن و سال کے حدود کو توڑ کے ملتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ سہیل صاحب اکثر لوگوں کے چچا اور ماموں بھی ہو جاتے تھے۔

وہ مکان انہوں نے بہت جلد چھوڑ دیا اور 'تب مسکن' کے ایک اپارٹمنٹ میں اُٹھ آئے۔ اس قطعے میں یہ خوبی تھی کہ سر بازار نہیں تھا۔ اس میں در و دیوار کا احساس جاگتا تھا اور ایک علیحدگی کا سکون میسر آتا تھا۔

لیکن وہ گیارہ کمروں کا ایک پُر وقار مکان (دربھنگہ) جہاں وہ اپنے والد، والدہ، بڑی اماں، ایک چچا زاد بیوہ بہن دو بھائی اور دو بہنوں کے ساتھ رہا کرتے تھے، اب ایک خواب بن گیا تھا۔ اب تو وقت یہ تھا کہ چار چھوٹے کمروں کے اس قطعے کو

پھیلا کر ایک عالیشان محل بنا دیا جائے، یا پھر اُسے سمیٹ کر ایک غنیمت سی اقامت گاہ کی صورت دیدی جائے۔

لیکن میں سوچتا ہوں کہ ایک مون (شبیر امام، عمر ۱۲ سال) ایک ڈولی (فرزانہ امام۔ عمر ۹ سال) ایک بھابھی، ایک مظہر امام اور ایک ــــ قسم کے نوکر کے لئے جسے کبھی بھابھی ویشالی سے پکڑ لاتی تھیں اور کبھی وہ دربھنگہ سے لایا جاتا تھا اس سے بڑے قطعے کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی۔

مون اور ڈولی دونوں بے حد پیارے بچے ہیں۔ مون کی اُٹھان کہتی ہے کہ یہ مظہر امام پر جائے گا۔ بے حد سنجیدہ سا ــــ اسکول جائے گا، وہاں سے واپس آکر کھیلے گا۔ اور پھر رات کو ٹیوٹر سے پڑھے گا۔

ڈولی قدرے ذہین بچی ہے۔ گڑیا جیسی ہوتے ہوئے بھی قطب مینار جیسے پاپا کا مذاق اُڑائے گی۔ ادیبوں اور شاعروں کا آٹوگراف لے گی اور خوش نما کلیوں کی صورت کی جدید ترین نظمیں کہے گی۔

مظہر امام کے یہاں زمین داری تو معمولی سی تھی، لیکن کاشتکاری اچھی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ شہری جائداد بھی تھی اور اس طرح پانچویں دہائی تک جو بہار کے شرفا کے یہاں تہذیب رائج تھی، وہ ان کے گھر میں بھی پائی جاتی تھی۔ ایک ایسا خاندانی نظام جہاں ایک بزرگ کا ہونا بے حد ضروری ہوتا۔ دادا کے انتقال کے بعد باپ، باپ کے انتقال کے بعد گھر کا سب سے بڑا لڑکا جس کے ذمے نظم ونسق سونپ دیا جاتا۔ اور پھر وہ سیاہ وسفید کا مالک ہو جاتا اور اس کی حیثیت بالعموم ایک ــــ BENEVOLENT DICTATOR کی ہوتی۔ گھر میں مذہب کا چرچا ہوتا جس کی وجہ سے گھر میں مولوی ہوتے، ذرا اور اچھی حیثیت کے لوگ ہوئے تو ایک حافظ، ایک قاری ایک خوش نویس اور کبھی کبھی ایک لالہ جی بھی رہا کرتے۔ یہ لوگ جہاں بچے کی مذہبی تعلیم کے ذمہ دار ہوتے، وہاں اس کی ذہنی تربیت، اس کی ذہنی پرداخت اور کسی قدر علم مجلس سکھانے کا کام بھی انجام دیتے۔ چنانچہ جب گھر میں مولوی رکھا جاتا تو ان پردے کے پیچھے آکر کہتی "گوشت پوست میرا ہڈی چمڑی آپ کی"۔

پھر جب بچہ اسکول میں داخل ہوتا تو انگریزی، حساب اور دیگر علوم کے لئے ماسٹر رکھے جاتے۔

مظہر امام نے بھی کم وبیش یہی ماحول پایا تھا۔

نو برس کے لڑکے کے ذہن پر ہر نقش ادھورا اور ناپختہ سا اُترتا ہے، اور یوں جب میر کارواں نے ۱۱ر نومبر ۳۹ء کو کارواں کو الوداعی سلام کہا تو سارے میں بجلیاں سی کوند گئیں۔ قیامت ایسی قیامت۔ بڑی اماں اور اماں دونوں رو رہی تھیں۔ لیکن مظہر امام تو بغیر آنسوؤں کے رو رہے تھے، یا محض ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ احساس زیاں تو ان کے اندر بعد میں جاگا، پھر وہ روئے اور جی بھر کے روئے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں والد کا دس روپے ماہوار پر محکمہ ڈاک وتار میں تقرر ہوا تھا اور وہ ۱۹۳۲ء میں سلکشن گریڈ پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے چار سو روپے کی تنخواہ پر ریٹائر ہوئے۔

دادا انبالہ کے رہنے والے تھے۔ وہ ملٹری ڈاکٹر تھے۔ بہار میں آنے کی کہانی یوں ہے کہ جب بکسر (ضلع آرہ) میں اُن کا تبادلہ ہوا تو وہیں انہوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ والد اور ان کے چھوٹے بھائی دادا کے ساتھ ہی آئے تھے۔ والد کی پہلی شادی خاندان ہی میں ہوئی تھی۔ یہ ان کی ابتدائی عمر کا زمانہ تھا۔ ان کی پہلی بیوی سے ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ والد کی دوسری شادی دربھنگے میں اُس وقت ہوئی جب وہ تبدیل ہو کر وہاں پہنچے اور پھر ریٹائر ہونے کے بعد

جائداد خرید کر اور مکان بنوا کر وہیں بس گئے۔

والد شاید مظہر امام کو دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ چاہتے تھے۔ یوں ان کے وصال کے بعد یہ بات مشاہدے میں آئی کہ تیز طوفان اور جھکڑ میں ایک درخت جو اپنی جڑوں سے مضبوط ہے، سناٹے میں کھڑا سارے جسم سے کانپ رہا ہے۔ دمہ جو مظہر امام کا پرانا مرض ہے غالباً اسی احساس تنہائی اور خوف کی پیداوار ہے۔

یہاں گلابوں کا ذکر ضروری ہے کہ کانٹوں بھری راہ پر چلتے چلتے جب ہم نا اُمید سے ہو جاتے ہیں تو یہی گلاب اپنے پیرہن کی خوشبوؤں سے ہمیں مسحور کر لیتے ہیں اور ہمیں زیست کی لذتوں سے آشنا ہونے کا سبق دیتے ہیں۔ بس اسی طرح سے دونوں چلتے رہیں الگ الگ راہوں پر۔

جھریا سے غیاث احمد گدی آئے تو میں نے کہا۔ مظہر امام سے گلابوں کا حال دریافت کر لیجئے۔ مظہر امام گلوں کے ذکر پر خوش ہوئے۔ جیسے انہیں وہ فاتح یاد آ گیا ہو جو نقارے بجاتا شہر میں داخل ہوا تھا۔ لیکن یہاں تو یہ ہوتا کہ کبھی راہ میں سربلند چٹانیں آ جاتیں تو کبھی کوئی دیوار یتیم آ جاتی۔ یوں بھی گلاب گلاب ہوتے ہیں۔ تختیاں لگائے کہ مجھے نہ توڑو۔

مگر اس قربت کی دوری میں جو ٹوٹنے کا عمل ہوتا وہ بڑا جان لیوا ہوتا۔ ہمیں صاف صاف نظر آتا کہ مظہر امام ٹوٹ رہے ہیں۔ سر کے آگے مکڑیاں سفید جالے تان دیتیں وہ اسے نکال پھینکتے۔ زبان کا محافظ اپنی صف سے نکل کر ختم ہو جاتا، وہ ایک نقلی سے محافظ کو وہاں لا کھڑا کرتے۔ غرض جینے کے سو طریقے تلاش کرتے لیکن ٹوٹنے کا عمل ہمارے سامنے تھا۔

'بھائی عرق النسا نے سخت تنگ کر رکھا ہے۔'

مہینوں دکھ جھیلتے رہے، کبھی ایلوپیتھک، کبھی ہومیوپیتھک۔ ہومیوپیتھک۔ کہ نام پر یہ گولیاں بھی نگل جاتیں بالآخر ڈاکٹر نے کمر پر ایک لوہے کی تختی باندھنے کو دے دی۔

کتنے ہی الفاظ ایسے ہیں جن کی معنویت وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ ان ہی میں ہمارے یہاں ایک لفظ 'منتظم' استعمال ہوا کرتا تھا۔ 'بڑا منتظم آدمی ہے۔' یعنی یہ کہ اپنی چادر سے پاؤں نہیں نکالتا ہے۔ کوئی شخص اپنی غرض سے یا دم لینے کو گھڑی دو گھڑی کو آ گیا تو یہ بھی نہیں کہیں گے کہ 'جاؤ جاؤ میاں دوسرا دروازہ دیکھو۔' جتنے دن چاہے وہ مہمان رہے، مظہر امام اور بھابھی کے ماتھے پر شکن نہیں آئے گی، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اس پر دیگیں نہیں لٹائیں گے۔ یوں کہئے کہ انہیں تنگ دل بھی نہیں کہہ سکتے اور انہیں فراخ دل بھی نہیں کہہ سکتے۔ دونوں کے بیچ بیچ ایک صورت۔ مظہر امام بھی ان ہی معنوں میں منتظم ہیں ویسے بھی ان کے یہاں افراط و تفریط کی کیفیت نہیں ملتی۔ ایک متوازن سی کیفیت۔ 'ہاں بھی' اور 'نہیں بھی' کے درمیان۔ قطعیت سے الگ تھلگ سی جیسے بزور رکھنے کے لئے انہیں اکثر مصلحت پسند بھی بننا پڑتا ہے۔

مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ سردیوں کی راتیں بڑی قاتل ہوتی ہیں، تو مظہر امام کہیں گے (حالانکہ لفظ قاتل یہاں تو دوسری شخصیت کا حامل ہے) ۔ ہاں۔ آں۔ وہ تو ہے۔ اور سننے والا 'آں' کو ایک صورت 'نا' کی سمجھ کر سوچے گا کہ کمال ہے صاحب اس ایک بے ضرر سی گفتگو میں بھی وہ قطعیت کی راہ نہیں اختیار کر سکے۔

دراصل ایک خوف ہوتا ہے جو بعض دلوں میں بے طرح گھر کر جاتا ہے، کہیں اس ہاتھ سے۔ ڈور نہ نکل جائے کہیں اس ہاتھ سے

وہ دور نہ نکل جائے۔ ساری زندگی اس خوف سے انہیں نجات نہیں ملتی۔

وہ ۱۹۵۰ء میں دربھنگہ سے بی۔ اے کرنے کے بعد کلکتہ چلے گئے۔ وہاں کسی اخبار میں ملازمت شروع کی۔ ایک مہینے کے اندر ہی وہ اخبار بند ہو گیا اور انہوں نے آدھی سودھی تنخواہ پاکر صبر کر لیا۔ پھر ایک دس روپئے ماہوار کی ٹیوشن پر دو ایک مہینہ گذارا کرنا پڑا۔ وہ بڑی تنگی ترشی کے دن تھے۔ ٹراموے کے سکنڈ کلاس کا کرایہ بھی (جو ان دنوں صرف تین پیسے تھا) اکثر ان کی جیب میں نہیں ہوتا اور تب وہ ہوتے اور سڑکوں کی لمبی لمبی زبانیں اور چاٹنے کا عمل۔ پھر انہیں ایک اسکول میں وہ جگہ مل گئی جس پر اوز عظیم فائز تھے کہ وہ کلکتہ چھوڑ کر دلی جا چکے تھے۔ وہاں پرویز شاہدی ہیڈ ماسٹر تھے۔ پھر وہ اس اسکول سے دوسرے اسکول قدرے بڑھی ہوئی تنخواہ (یعنی پچھتر روپے ماہوار) پر چلے گئے۔ ایک سال بعد پرویز شاہدی بھی اسی اسکول میں آگئے۔ یہیں ۵۳ء میں حسن نعیم بھی ٹیچر کی حیثیت سے آئے لیکن ایک ماہ بعد تنگ آکر دلی چلے گئے۔ مظہر امام اس اسکول میں پورے سات سال یعنی دسمبر ۶۰ء تک اور پھر وہیں سے آل انڈیا ریڈیو کٹک میں بحیثیت TRANSMISSION EXECUTIVE چلے گئے۔ وہاں سے ترقی پاکر گوہاٹی اور پھر وہاں سے پٹنہ ــــــــــــــــ

کلکتہ مظہر امام کی زبان میں ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کی تشنگی اور سیرابی کا شہر ہے اور بقول ان کے وہ اگر کلکتہ نہ جاتے تو ان کی زندگی میں ایک بڑا خسارہ رہ جاتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایک ٹھٹھرے ہوئے پودے کو پانی اور روشنی میسر آئی یہ ہوئی اس کی سیرابی، لیکن جن ضروری اجزا سے اس کی نشو و نما ہوتی وہ اسے مل نہ سکی یہ ہوئی تشنگی کی داستان۔ ویسے پردہ نشینوں کی قربت اور لطیف حلقے تو ہر دور میں ان کے لئے پیاس کا صحرا مہیا کرتے رہے ہیں۔

لیکن یہاں میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تجربے ہر شخص کے مختلف ہوتے ہیں، اس میں بہت کچھ طبیعتوں کا بھی دخل ہوتا ہے بیشتر ایسے ہیں جن کے لئے کلکتہ ٹراموں کا خوب صورت شہر ہے، جہاں سڑکوں پر گاڑیاں چلتی ہیں اور فٹ پاتھ پر آدمی چلتے ہیں، جہاں آبادیوں کے شور ہیں، اکیلے چلنے کا ایک لطف ہے، جہاں کی چائے ایک لطیف ذائقہ دیتی ہے، جہاں کے میدانوں میں خوب صورت شامیں والہانہ اتر آتی ہیں اور جہاں ہر رات عروس نو کی شان میں آتی ہے۔ حسن ہی حسن، جلوہ ہی جلوہ، روشنی ہی روشنی۔ لیکن بس تنہا سفر کے مرجاؤ کہ عین ممکن ہے کہ بھیڑ میں گرفتار ہونے سے تمہیں بھی اسی غم سے دوچار ہونا پڑے جو میر صاحب کو پورب کے ساکنو سے مل کر ہوا تھا۔

لیکن مظہر امام کے تجربے اس سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ انہیں وہاں کی تہذیبی اور ادبی ماحول میں ایک خاص مقام ملا۔ لوگوں نے ان کے اندر کے جوہر نایاب کو پرکھا اور انہیں ایک بلند مرتبہ دیا۔ کئی رسالوں کے ادارے میں رہے۔ چند ایک رسالے کے مدیر اعزازی رہے۔ ترقی پسند مصنفین کی مشترکہ انجمن (اردو اور ہندی) کے سکریٹری رہے۔ زہرہ اور پروین کے کاشانے تک ان کی رسائی رہی۔ اور چونکہ آدمی تہذیب اور شائستگی کے ہیں اس لئے بزرگوں نے بھی معتبر سمجھ کر اپنی محفلوں اور مجلسوں میں جگہ دی۔ بلکہ ل۔ احمد اکبرآبادی کو تو انہوں نے ہی کلکتہ میں دریافت کیا کہ ان جیسا صاحب فکر و نظر ایک عرصے سے کلکتہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا، مظہر امام کی کوششوں سے کلکتہ کے ادبی حلقوں سے متعارف ہوا۔ ان چیزوں نے پانی اور روشنی کا کام کیا اور ان سے ان ہی کی زبان میں ان کی سیرابی ہوئی۔

لیکن حادثہ یہ ہوا کہ انہیں ٹوکنے والا کوئی نہیں رہا۔ اس روش پر نہ چلو۔ یہ چال صحیح نہیں ہے، یہ راہ ویرانے کو جاتی ہے
کیوں کہ لوگ چمک دمک ہی سے مسحور ہو گئے۔ قیمتی پتھر کے اندر اور بھی ستارے جگمگائیں، اس میں اور بھی جلا ہو، اور بھی
تڑپ پیدا ہو اس میں، اس کی فکر تو اس وقت ہوتی ہے جب کچھ صاحب نظر کے اندر بے اطمینانی پیدا ہو اور وہ یہ سمجھیں کہ
سفر کی آخری منزل دراصل سفر کی ابتدائی منزل ہوتی ہے۔ خود پرویز شاہدی کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا تھا۔ ضرورت
تھی کچھ عمدہ کھاد کی، جو اس وقت نہ ملی یا ملی تو کم ملی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں حسن ہے، جذبہ ہے، صداقت ہے
لیکن جس مرتبے کی فکری توانائی کی ہمیں اُن سے توقع تھی، وہ ہمیں نہیں ملتی۔

اس میں بہت کچھ مظہر امام کی قناعت پسند طبیعت کا بھی ہاتھ تھا کہ وہ تو مختلف رسالوں کی ادارت، مختلف مقابلوں
کی فتح اور اچھے رسالوں میں اشاعت پذیر ہونے ہی کو (کہ اس وقت بہار میں ایکا دکا ہی لوگ ان منزلوں سے گزرے تھے)
فتوحات سمجھتے رہے۔ پھر شاعروں کو تو مشاعروں کی بوتل بھی مار دیتی ہے کہ اس کے بعد تو جیسے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں ہی
سلب ہو جاتی ہیں۔ ہماری زبان میں بڑے بڑے شعری GENIUS پیدا ہوئے لیکن شاعروں کی بوتل میں پھنس کر
اپنی سرحدوں سے باہر اس جہاں سے پرے کسی دوسرے جہاں تک نہ پہنچ سکے۔

ان معاملات میں آج بھی کہ ہم ساتویں دہائی کے تقریباً وسط میں پہنچ چکے ہیں۔ اور بہت سی عصبیتیں، بہت سے
تصورات وقت کی کھردری اور سخت چکی میں پس کر ختم ہو چکے ہیں۔ مظہر امام مختلف النوع فتوحات کو سینے سے لگائے
بیٹھے ہیں۔ حالانکہ بڑا ACHIEVEMENT یہ ہے کہ آپ کے جلائے ہوئے چراغ سے بہت سے چراغ جل اُٹھیں اور
آپ ایک مخصوص روش کے بانی سمجھے جائیں۔ ورنہ جہاں تک تعریف و توصیف کا سوال ہے سچ تو یہ ہے کہ ایک صاحب
نظر کی 'واہ' پر سو شاعروں کی واہ واہ قربان کی جا سکتی ہے۔

مظہر امام ۴۹ء کی فروری میں منظر شہاب کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ وجہ تھی۔ ریل کا پہیہ جام کریں گے۔ یہ ایک
رومانی عہد تھا اور جس کسی کے حصے میں خوش رنگ تتلیاں نہیں آتی تھیں، وہ خود کو خوش رنگ خوابوں میں گم کر لیتا تھا۔
مگر یہ کر دھوم مچ گئی کہ دربھنگہ کے دو شاعر گرفتار کئے گئے جو سیاسی کارکن کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے
سرگرم کارکن بھی تھے۔ تجویزیں پاس کی گئیں۔ تحریریں شائع ہوئیں اور تقریریں ان کی رہائی کے لئے کی گئیں۔
۴۹ء کی جنوری میں دربھنگہ سے ماہنامہ 'نئی کرن' مظہر امام کی ادارت میں نکلا۔

دربھنگہ سے پٹنہ کی راہ میں دوستوں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم محمد یٰسین شاہو بیگھوی کو منظر شہاب بنا دیں۔ شاہو بیگھوی کو
اپنے شاہو بیگھوی ہونے پر فخر تھا اس لئے وہ اس اطلسی جامے کو اُتار پھینکنے کے روادار نہ تھے، لیکن ام۔ امام اور م۔
ج۔ دربھنگہ ان کے دوست تھے۔ چنانچہ انہوں نے انیس کا مشہور مقطع پڑھا اور بالآخر اس نئے خرقے کو زیب تن کر لیا۔
بعد میں ام۔ امام نے اپنا پورا نام مظہر امام لکھنا شروع کر دیا۔ منصوب حسن کی مجھے خبر نہیں۔

منظر شہاب کا ذکر اپنے جلو میں بہت سے روشن چراغوں کو کھینچ لاتا ہے۔ وہ مظہر امام کے بہنوئی ہیں اور ان دونوں ایک
ملک کے باشندے ہیں۔ افسوس کہ ان کی مصروفیتوں نے ایک مدھم لہجے کے خوش فکر شاعر کو ہم سے چھین لیا۔
ہمارے درمیان ایک طبقہ ایسا ہے جو خبروں کا گھوڑا لئے پھرتا ہے۔ میرے گھر سے اُٹھا کر مظہر امام کے یہاں پھینک آیا

مظہر امام کے یہاں کا گھر کسی اور کے یہاں۔ یوں تو کسی نہ کسی پیمانے پر آج ہر شخص یہ خدمت انجام دے رہا ہے، لیکن گھر اُٹھانے والوں کا تو ایک کلاس ہی وجود میں آگیا ہے۔ اس قماش کے ایک صاحب دارالخلافہ سے ہمارے ایک ہم عصر کے یہاں سے ایک بڑا گھڑلے کر پہنچے اور مظہر امام کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس تعفن اور دبدبے سے مظہر امام سخت الجھن میں گرفتار ہوئے۔ انہوں نے مجھے فون کیا۔ میں نے کہا حضرت وہ پیشہ ور ہے ذرا تحقیق کر لیجئے۔ ہم عصر نے خط کے جواب میں لکھا میں خود ہی آرہا ہوں۔

وہ آئے تو ایک شام ہم ایک نشست میں ملے۔ چاروں اور عود و عنبر کی خوشبوئیں پھیل رہی تھیں، شام حسین تھی، باتیں حسین تھیں، نخنے حسین تھے، دوران پاک اور مطہر خوشبوؤں کے درمیان ہم سب خود کو پانے کی کوششوں میں مصروف تھے ہم عصر نے کہا گفتگو یہاں تک صحیح ہے، یہاں سے محض افسانے ہی افسانے ہیں۔ ہم عصر کے دوست نے بھی اس کی باتوں کی پُر زور تائید کی۔ آپ تو انھیں جانتے ہی ختم کیجئے۔ مظہر امام نے کہا میں سب کچھ بھول گیا۔ سمجھو سب کچھ ختم ہوا، اور ہم سب گلے مل کر رخصت ہوئے۔

اس واقعہ کے بعد مظہر امام کو لازم تھا کہ وہ یا تو بھول جاتے کہ ہم سبھوں نے عود و عنبر کی خوشبوؤں کے حضور میں یہ بات کی تھی، یوں بھی کہ خود ہم عصر کو اس کا افسوس تھا، لیکن انہوں نے پھر اس پیشہ ور سے دریافت کیا۔ اُس نے کہا سامنا کرادیجئے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے مظہر امام سے کہا۔ مظہر امام صاحب اگر آپ اس طرح پوچھ گچھ کرتے رہے اور اس طبقے کی جو درآمد و برآمد کے اس ناجائز کاروبار سے فضا کو مکدر کرتا ہے، ہمت افزائی کرتے رہے تو پھر ہم سبھوں کا خدا ہی حافظ ہے۔

کچھ دنوں بعد اسی قبیلے کے ایک فرد نے ایک غزل کے مزاج داں کے قصے ان کی میز پر رکھ دیئے۔ مظہر امام نے فوراً ہی صاحب غزل کو بلا بھیجا اور اس سے دریافت کیا کہ کیا واقعی .... اس نے کہا واقعہ صحیح ہے۔ مگر میں نے اس پس منظر میں کہا تھا۔ اس واقعے سے جہاں یہ پہلو نکلتا ہے کہ مظہر امام دوستی کے باب میں طہارت قلب کو ضروری سمجھتے ہیں اور اس بات کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ پانی گدھوں اور خندقوں میں نہ جمع ہونے پائے۔ یہ افسوس ناک بھی ہے کہ آخر اس طبقے کو اتنی اہمیت ہی کیوں دی جائے کہ کل کلاں وہ اس گھر کو شہر یاروں کے حضور میں بھی پہنچا سکتا ہے۔

(اور ایسا ہوا بھی ہے)

اس سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ خبر رساں نے مجھ سے کہا۔ " جانتے ہیں جب وہ جہانیاں جہاں گشت اس دوست کی نئی قیام گاہ کا ذکر کر رہا تھا کہ جس کے فرش سنگ مرمر کے ہیں اور منقش در و دیوار کی تابانیاں آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہیں اور بڑے بڑے شیشے ہر چہار طرف جھل جھل کرتے ہیں اور جہاں اس کی نشست گاہ ہے، وہاں سردیوں میں ہلکی آنچ کا لطف آتا ہے اور گرمیوں میں گلابی جاڑے اس کی فضا میں بکھر جاتے ہیں اور خدام سفید جاموں، رنگین دستاروں اور سنہری پٹیوں سے لیس اُس کے حضور میں ہمہ وقت ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں، اور ایک عجیب شان ہے، تو جانتے ہیں کیا ہوا۔

کیا ہوا؟ ــــــــ

منظر امام نے بے حد کڑوا منھ بنایا اور ....
میں نے منظر امام سے یوں ہی دریافت کیا "کیا واقعی منظر امام صاحب؟" لیکن انہوں نے اس گفتگو کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

منظر امام کو ماحول یہ ملا کہ بڑے ماموں منظور احمد نظر کو شاد عظیم آبادی سے تلمذ تھا۔ چنانچہ شاد کے ایک شاگرد قیس عظیم آبادی نے شاد اور ان کے شاگردوں کے حالات اور ان کے کلام پر مشتمل جو تذکرہ "گلشن حیات" کے نام سے مرتب کیا ہے، اس میں منظور احمد نظر کا کلام اور ان کے حالات بھی ملتے ہیں۔ منجھلے ماموں خلیل احمد جگر تخلص کرتے تھے اور چھوٹے ماموں افتخار احمد دہر ناصری شاعری سے زیادہ اردو قواعد اور انشاء کے ماہر ہیں۔ بڑے بھائی حسن امام درد افسانہ نگاری اور شاعری کیا کرتے ہیں۔

منظر امام نے افسانے بھی لکھے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں "مضراب" کراچی میں ان کا ایک افسانہ شائع ہوا تھا، "آخر اس درد کی دوا کیا ہے"۔ اس رسالے کو شش۔ منظفر پوری ایڈٹ کر رہے تھے۔

لیکن شاعری انہوں نے ۴۳ء ہی سے شروع کر دی تھی۔ ابتدا میں چونکہ جوش سے متاثر رہے، اس لیے "مستی انقلابیت" خدا کو گالیاں دینے اور کبھی کبھی غیر ذمہ دارانہ باتیں کرنے کی عادت انہیں جوش ہی سے ملی۔
۴۳ء ہی کا ایک شعر ہے۔

جس خدا کو مانع کون و مکاں سمجھا تھا میں تھی اس کی فتنہ زائی وجہ بربادی ہند

یا پھر تقریباً دو دہائیوں کے بعد کا یہ شعر ہے،

لوگ عربی قرآن پڑھتے ہیں بستر مرگ پر ہے اردو زباں

یہ اشعار ایسے ہیں جن پر یہ شعر جسے منظر امام کے والد مرحوم اکثر گنگنایا کرتے تھے، بہت بھاری ہے۔

خدا گر محمدؐ کو پیدا نہ کرتا
خدا کی قسم یہ خدائی نہ ہوتی

اس شعر میں سامنے کا مضمون سہی، لیکن صداقت اور خلوص تو ہے، لیکن منظر امام کے ان اشعار میں تو شاعر انقلاب کی تقلید کے سوا کچھ بھی نہیں۔

لیکن شکر ہے کہ جوش نے انھیں زیادہ DAMAGE نہیں کیا۔ غالباً یوں کہ جوش سے پہلے انہوں نے اصغر اور جگر کو بھی پڑھا تھا۔ ان شاعروں نے انہیں متانت اور سنجیدگی عطا کی اور جوش کے ضرر رساں اثرات کو زائل کرنے میں ان کی مدد کی۔ پھر بعد کے دنوں میں انہوں نے فیض، راشد، یوسف ظفر، خترالایمان، منیب الرحمان اور پھر فراق کو پڑھا، اور ان سے متاثر ہوئے۔

ان کے مجموعے "زخم تمنا" میں ۵۲ غزلیں اور ۳۰ نظمیں ملتی ہیں۔
دو غزلیں ۴۸ء کی ہیں۔ پہلی غزل کا ایک شعر ہے جو خاصا بھدا سا ہے:

فراز چرخ سے تاروں کی تھاہ پا آیا ملی نہ تھاہ ابھی تک زمیں کے ذروں کی

اسی طرح دوسری غزل کے اس شعر کا ثانی مصرع بیتاب عظیم آبادی کے ایک شعر کے ثانی مصرعے سے ٹکرا گیا ہے۔

منظر امام کا شعر ہے ۔ کاکلِ وقت میں سلجھاؤ نظر آتا ہے

آپ نے زلفِ پریشاں کو سنوارا تو نہیں

بیتاب کا شعر ہے :

سنتے آئے ہیں کہ اک روز قیامت ہو گی

آپ نے زلفِ پریشاں کو سنوارا تو نہیں

اس کے بعد کی غزلوں میں بتدریج ضبط و نظم کی کیفیت آتی گئی ہے۔
'زخم تمنا' کے آخری صفحوں میں کچھ اور اوائل' یعنی ۴۳ء ۴۴ء کے ارد گرد کی غزلیں بھی ملتی ہیں' جن میں
اس قسم کے اشعار ملتے ہیں: ملیں زاہد کو حورانِ کہن سال

عبادت کا صلہ یہ اس نے پایا

شیخ کی ریش ایک دھوکا ہے — اس کا باطن سیاہ ہے اے دل

ان غزلوں میں روایتی مضامین کی کثرت ہے ۔ پھر ترقی پسند دور کی غزلیں ہیں' جن میں حیات کو سنوارنے کا عزم، جدوجہد
کا پیغام اور مستقبل کے اشارے ملتے ہیں۔

فرازِ دار کو بخشی ہے میں نے رنگینی — کفِ حیات سے لپٹی ہوئی حناہوں میں

ان کی اس مشہور غزل :

جب سرخیِ گلشن کا بھی ذکر ہوا ہے — تیرے لب و رخسار کی بات آ ہی گئی ہے

کے اس شعر میں :

آرائشِ عالم پہ کبھی بحث جو ٹھہری — اس گیسوئے خمدار کی بات آ ہی گئی ہے

مجاز کے اس شعر کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا — تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

عجیب اتفاق ہے کہ منظر شہاب نے بھی اس مضمون کو اپنے ایک مقطع میں سمویا تھا۔

منظر شہاب کاکلِ نسریں سنور چکی — لیکن وہی ہیں گیسوئے دوراں کے پیچ و خم

۴۵ء میں انہوں نے سودا کی زمین 'کروں یا نہ کروں' میں قافیہ بدل کر غزل کہی ۔ اس زمین کو فیض نے سودا
کے یہاں سے ڈھونڈھ نکالا تھا۔

مفتیِ دیں نہ کہیں کفر کا فتویٰ دے دیں — اپنے جینے کی بھی تدبیر کروں یا نہ کروں

اس زمین میں فیض کا بھی ایک شعر سنتے چلئے :

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس — مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

دھیرے دھیرے اندازِ بیان بدلتا جاتا ہے۔ چنانچہ ۵۵ء کے بعد کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں:

عشرتِ نشوونما سے آج بھی واقف نہیں — میری کلیوں کا وطن، میرے گلوں کی سرزمیں
تم اپنے سامانِ جنگ لاؤ، سنان و تیر و تفنگ لاؤ — میں جام و طاؤس و چنگ لاؤں مقابلہ ہے یہ دو بدو کا
میرے رستے میں زر کا وقت کا طوفاں لیکن — اک دیا میں نے سرِ راہ جلایا تو سہی
ہو رہا تھا کل تغافل کا بتوں کے تذکرہ — لے گئے اس سلسلے میں ہم خدا کا نام بھی

چلتے چلتے یہاں ایک غزل ملتی ہے جو شروع سے آخر تک ایک ہی موڈ کی غزل ہے اور بڑی مرصع غزل ہے۔ لیکن، 'آپ' کے بعد دوسرے اشعار میں 'تو' کا استعمال سماعت پر گراں گذرتا ہے۔

آپ کو میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے — میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے چاہا تھا کبھی
میری الفت نے کیا غیر کو مائل ورنہ — میں تری انجمنِ ناز میں تنہا تھا کبھی

کچھ اور اشعار دوسری غزلوں کے درج ذیل ہیں:

آرزو شرح و بیاں سے محروم — کوئی مضمون ادق ہو جیسے
محو ہوتی ہی نہیں یاد تری — کوئی بچپن کا سبق ہو جیسے
پوچھیں تو ذرا پیچ و خمِ راہ کی باتیں — کچھ لوگ ابھی لوٹ کے آئے ہیں سفر سے
خوشبوئے گل و لالہ چھپا لیتے ہیں پتے — اب قدرِ ہنر ہے تو فقط عرضِ ہنر سے
پینے والو بقدرِ ظرف پیو — زندگی کا نشہ نہ آ جائے
چلو ہم بھی وفا سے باز آئے — محبت کوئی مجبوری نہیں ہے

یہاں پر 'زخمِ تمنا' کی غزلیں ختم ہو جاتی ہیں۔ بعد کی غزلوں میں تمدن اور انفرادی طرزِ فکر کی جھلک زیادہ ملتی ہے۔ لیکن غزلوں میں ان کا کہیں بھی کوئی مزاج نہیں بنتا۔

۱۹۶۱ء کے بعد کی غزلوں کے جستہ جستہ اشعار سنتے چلیے:

چاہو تو ہشیار رہو، ہشیاری سے کیا ہوتا ہے — ٹوٹنے والے خواب کی بستی اک دن لوٹ ہی جاتے ہیں
اور ہم سے کیا ہوگا اپنے دل کو سمجھا لیں — صبح ہو نہ ہو لیکن رات بیت جائے گی
میری تخئیل کے افسردہ لب پر — وہ اپنے ہونٹ رکھ کر سو گئی ہے
کوئی دیوار تو حائل بھی کہ ہم تم برسوں — ایک ہی گھر میں رہے پھر بھی شناسا نہ ہوئے
خیریت پوچھتے ہیں لوگ بڑے طنز کے ساتھ — جرم بس یہ ہے کہ اس شوخ کا ہمسایہ ہوں
اتنے نزدیک سے ہم تیری صدا کیا سنتے — دور سے تو نے کبھی ہم کو پکارا ہی نہیں

ہم خود ہی اعتبار کے قابل نہیں رہے — کس منہ سے تم کو دوست کہیں اور اُسے عدو

تم ہی آ جاؤ ذرا ہاتھ میں پتھر لے کر — آئینہ اب میرا کھویا ہوا چہرہ مانگے

ان کے یہاں جابجا طنزیہ لہجے کے اشعار بھی مل جاتے ہیں :

جس کے گھر کی نالیاں کیڑوں کی ہیں تفریح گاہ — وہ بھی لے کر عزم تزئینِ چمن آ جائے ہے

پل ہی پل سڑکیں ہی سڑکیں عشق ہے بے امتحاں — آج رستے میں کوئی دریا نہیں صحرا نہیں

اسی امید پہ اربابِ شہر زندہ ہیں — کہ اس پہاڑ کے آگے بہت اُجالا ہے

سنا ہے موت نے کل رات خودکشی کر لی — نئے مریض سے کہہ دو شگون اچھا ہے

ویسے میں سمجھتا ہوں کہ "نئے" کی جگہ "ذرا" اچھا رہے گا۔

ان کی غزل :

ہم کسی شہر میں آزاد نہیں رہ سکتے — ہم ابھی لاش کو بھی لاش نہیں کہہ سکتے

میں اشعار کی ناہمواری بے طرح کھٹکتی ہے۔

لیکن ۷۰ء کے بعد کی ایک غزل جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے درج ذیل ہے :

جب سر پہ آ پڑی ہے تو غیرت بھی آئے گی — دستار گر گئی تو شرافت بھی آئے گی

تیشہ اُٹھایا ہے تو اب جو بھی زد میں آئے — اس راستے میں تیری عمارت بھی آئے گی

اس دور کی ایک غزل کا یہ شعر ایک اچھوتے مضمون کا حامل ہے :

پسلی سے اپنی آپ نکالیں کوئی وجود — ویران ساعتوں کی کلائی مروڑ دیں

یہ شعر بڑی عمدہ تلمیح پیش کرتا ہے۔

اور پھر ایک غزل کا مطلع ہے :

نیند گہری تھی مگر چونک کے بیدار ہوئے — کن ہواؤں نے پکارا تھا کہ ہشیار ہوئے

کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں پیکر تراشی کا رجحان ملتا ہے۔

جس سے وابستہ تھیں شامِ درد کی تنہائیاں — صبح کی صورت وہ سادہ پیرہن آیا تو ہے

دن کا سورج آگ اُگل کر خود بھی آخر راکھ ہوا — کبھی پہلی رات پہ اپنے سپنوں کی برسات کروں

شب کی اُبھری خشک رگوں میں اب تو لہو بھی سوکھ چکا — لاؤ بلاؤ آج کہاں ہیں صبح کی مے چھلکانے والے

اس طرح ۶۸ء کی ایک غزل کا مطلع ہے :

پیشانی پر چاند لئے کون اُبھرا آدھی رات گئے — خون رگوں میں چہکا، بپھرا، چمکا آدھی رات گئے

اور یہ شعر دوسری غزل کا ہے :

شعر اُگنے والا ہے سانس رُکنے والی ہے
جنگلوں کے جلنے کا دُور سے سماں دیکھوں

اور اس غزل کے کامیاب مرقعے ملاحظہ ہوں:

میری آنکھوں میں گزرتے ہوئے موسم کا عکس ہے — سیلِ صبح اک روز اس کو بھی بہا لے جائے گا
اس طرح گرنے نہ دو یادوں کی شبنم دیر تک — یہ خنک سایہ بھی کوئی دل جلا لے جائے گا

مظہر امام نے آزاد غزل کا تجربہ بھی کیا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں پہلی بار انہوں نے آزاد غزل کہی اور اس طرح وہی اس کے موجد ہیں۔ ایک شعر درج ذیل ہے:

جن کے دل میں رخشندہ ہیں الہامی آیات
وقت کے بھاری شانوں پر وہ رکھ کر دیکھیں اپنا ہات

وحید اختر کا کہنا ہے کہ ہم اسے نظم کیوں نہ کہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس نوع کے تجربے غزل میں مقبول بھی نہیں ہو سکتے کہ بڑا کام تو یہ ہے کہ غزل کو اس کی اسی شکل میں گہرے مضامین سے مرصع کیا جائے۔

لیکن غزلوں میں جو انہوں نے پیکر تراشی کی ہے وہ بے حد خوب صورت ہے اور اگر اس طرف وہ مزید توجہ دیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ غزلوں میں بھی اپنا ایک نقش چھوڑ جائیں گے، ہر چند کہ ان کے یہاں تراش خراش، الفاظ کی نشست و برخاست اور جابجا اشعار کی ناہمواری کو دیکھ کر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا مزاج بنیادی طور پر غزل کا مزاج نہیں۔ ویسے وہ سو سے زیادہ غزلیں کہہ چکے ہیں۔

لیکن نظم میں ان کے قدم شروع ہی سے متوازن رہے ہیں، انہوں نے بڑی خوب صورت نظمیں کہی ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے فکر و نظر کے گل بوٹے نظموں ہی میں کھلائے ہیں۔

انہوں نے بیشتر آزاد نظمیں ہی کہی ہیں لیکن 'زخمِ تمنا' میں ہمیں پابند نظمیں بھی مل جاتی ہیں۔ ان میں موضوعاتی نظمیں بھی ہیں اور کیفیاتی نظمیں بھی۔

اوائل کی نظموں میں 'شمع خاموش ہے'، 'برف میں آگ'، 'غروبِ شام'، 'پھیلے ہوئے ہاتھ' کامیاب نظمیں ہیں۔ 'قربِ دوست' میں غزلِ مسلسل کی کیفیت ملتی ہے۔ 'اپنی محبت کے لئے' رومانی نظم ہے۔

تب ۱۹۵۵ء کی نظم 'نگارِ شہر' ہمارے سامنے آتی ہے۔

یہ سچ سہی کہ جنونِ وفا نہ راس آیا
مگر میں ترکِ محبت کروں تو کیسے کروں؟

'تحفہ' اور 'نوعروس' بھی رومانی نظمیں ہیں۔

۱۹۵۷ء کی نظم 'شعاعِ فردا کے راز دانو!' ایک فکری نظم ہے۔

'آدم'، 'خیرِ طلب' اور 'اشتراک' مختصر نظمیں ہیں جو ۱۹۶۰ء کی ہیں۔ ان کے مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہاں سے شاعر نے ایک نیا سفر شروع کیا ہے اور صحیح معنوں میں یہیں انہوں نے پہلی بار خود کو RECOGNIZE

کرانے کی کوشش کی ہے۔ یہ بڑی منفرد نظمیں ہیں اور دیرپا ابھرپور STROKE لگاتی ہیں۔

ویسے بھی ان کی مختصر نظمیں بے حد جامع ہیں اور ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے کم سے کم مصرعوں میں بہت بڑی باتوں کو سمویا ہے۔ 'آؤ' 'خیر طلب' 'اشتراک' کے علاوہ 'حیات آوارہ' (۶۴۶ء) بھی اس کی عمدہ مثال ہے۔

اس نوع کی کچھ نظمیں انہوں نے ۶۲ء میں بھی کہی ہیں۔ جن میں 'رات دن کا قصہ' 'وہ ایک بات' اور 'ٹھہرے ہوئے لمحے سے پرے' قابل ذکر ہیں۔ ان میں گہری فکر ہے اور آج کے کرب اور بے پناہی کو شاعر نے بڑی خوب صورتی سے نظم میں سمویا ہے۔

ایک پہچانا ہوا انجان شہر
رات کے کالے بدن پر
برص کے اُجلے چراغ
آدمی کی کھال میں چیتے کی رُوح
جسم کے مرگھٹ پہ سانسوں کی چتا جلتی ہوئی

——— رات دن کا قصہ

جنگ کا ذکر سہی
باغ میں ہنستے ہوئے پھولوں کی تعریف سہی
رقص اور سنگ تراشی کے مسائل پہ
کوئی بحث سہی
یہ ضروری تو نہیں ہے کہ محبت ہی کریں

——— ٹھہرے ہوئے لمحے سے پرے

یہاں ان کی نظم 'وہ ایک بات' کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

میں نے اک بات محسوس کی
میں نے وہ بات تم سے کہی
تم نے اُس سے کہی
اُس نے اُن سے کہی
پھر مجھے بھی نہ اس کی خبر ہو سکی
کس نے کیا بات
کس سے کہی

——— وہ ایک بات

یہاں ایک ایک لفظ کی قیمت ہے۔ اتنی COMPACT نظم کی مثال ہمارے یہاں کم ہی کم ملتی ہے۔ یہاں ایک طائر بے بال و پر کی آواز، ایک خاموشی کا چیختا ہوا سفر خاصا حسن پیدا کر دیتا ہے۔ ذاتی طور پر مظہر امام کی یہ نظم مجھے بے حد پسند ہے۔

'آنگن میں ایک شام' میں بادلوں کے کف آلود تھپیڑوں کا شور بڑی اچھی کیفیت پیدا کرتا ہے۔

وہ اپنی بیشتر رومانی نظموں میں ایک حرماں نصیب عشق کا IMAGE چھوڑ جاتے ہیں جیسے 'کنگال آدرش' 'گوشت کا نغمہ' اور 'رشتہ گونگے سفر کا'۔ انہوں نے اپنے بیشتر رومانی شاعروں کے کئی درتوں کو ناقابل قبول سمجھ کر ٹھکرا دیا ہے۔ مثلاً وہ زیادہ پرپیچ راہوں سے ہو کر اور بہت سی بے معنی باتوں کے بعد، اپنی بات پر نہیں پہنچتے بلکہ براہ راست اور بے معنی باتوں سے پرہیز کرتے ہوئے عرض مدعا تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر یہ رویہ بھی ان کے یہاں نہیں ملتا کہ پہلے انقلاب لانے دو تب ایک سنہری صبح کو ہم گنگناتے چشمے پر ملیں گے اور وہاں پہنچ کر جنم جنم کی پیاس بجھائیں گے۔

ان کی ایک نظم 'وہ دیکھو' کے پہلے بند میں محبوب کا سراپا اور بڑی خوب صورت شبیہ تیار ہوتی ہے۔

"وہ رخشاں جبیں، وہ سرشار آنکھیں، وہ شاداب عارض، وہ لعل آفریں لب

لیکن اس دور کے بعد' یعنی چھٹی دہائی کے آخری سرے پر مظہر امام کے خواب ٹوٹتے ہیں۔ اور اس کے بعد ایک بے مقصدی اور بے سمتی کی کیفیت ہر جگہ ملتی ہے۔

عقیدے زخموں کا تیر کھا کر سسک رہے ہیں
یقین کی سانس اکھڑ چلی ہے
حسیں خرابوں کے ہونٹ سے خاک وخوں کے شعلے ابل رہے ہیں

اکھڑتے خیموں کا درد ________

تشکیک اور بے یقینی کی کیفیت:

کوئی خدا ہے تو وہ کہاں ہے
کوئی خدا تھا تو وہ کہاں ہے

اکھڑتے خیموں کا درد ________

اور آخر میں نظم ایک رجائی نوٹ پر ختم ہوتی ہے:

جو اپنی کشتی پہ بچ رہے گا
وہی علیہ السلام ہوگا

اکھڑتے خیموں کا درد ________

پھر 'دھوپ میں ایک شورہ' ایک مسموم دن کی داستان ہے:

صبح سے ہی ہوا گرم ہے
آفتاب اپنے خیمے سے پگھلا ہوا سینہ سار ہا ہے
سامنے کے دریچے سے مہتاب اترے اگر

پھر چلے جاؤ گے

دھوپ میں ایک مشورہ ________

تیز صحرائی ہوائیں ان نظموں کا پس منظر بن گئی ہیں۔ ان تیز ہواؤں میں انسان، اس کا عقیدہ اور سب ہی کچھ بکھر سا گیا ہے۔

مظہر امام نے ۸۰ء میں وہ سفر شروع کیا جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ جب ہم چلتے چلتے تھک جاتے ہیں، جب ہم چپکے چپکے خود کو یہ کہنے لگتے ہیں کہ کہیں دم لو، کوئی گھنا سایہ، کوئی ٹھنڈے پانی کا چشمہ تاکہ ماندگی دور ہو اور ہم تازہ دم سے ہو جائیں۔ اور یوں رفتہ رفتہ ماندگی کی تہیں ہمارے اوپر سے اُتر جاتی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ کل کی شب کا خواب ہمارا تعاقب شروع کر دیتا ہے۔

جسے میں نے اس موڑ پر دیکھا تھا۔ جسے میں نے اس شبستان میں دیکھا تھا۔ جس نے کل کی رات گھور اندھیرے میں چمکتی ہوئی قندیل کا کام کیا تھا۔

"وہ تم ؟ — نہیں وہ تم نہیں

وہ تم نہیں ہو ؟

نہیں وہ تم ہی ہو"

پھر کبھی قدم سے قدم مل جاتے ہیں اور کبھی قدم سے قدم الگ ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی اس طرح ایک ساتھ سفر کرتے ہیں کہ ساتھ ہیں مگر ساتھ نہیں ہیں۔

کل سرا ہے ایک ذہن نے کہا تھا۔ ہر روز جب ہمیں ایک ہی پھل ملتا رہتا ہے تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے دانت بیکار ہو گئے ہیں اور ہم نے پھل کو کاٹنے، چکھنے، چبانے اور اس کا ذائقہ حاصل کرنے کی صلاحیت کھو دی ہے۔

"اور جب تم نے ہم سے کہا کہ اے موسیٰ ہم سے ایک ہی کھانے پر صبر نہیں ہو سکتا ....." (ق۔ م)

اس پر مستزاد یہ کہ اس موڑ پر جسے دیکھا تھا وہ کہاں ہے ؟۔ رنگ و نور کا وہ سیلاب جو کل دکھائی دیا تھا، وہ تو میرے حصے میں نہیں آیا۔ وہ تاریک راہوں کی قندیل۔

تب ایک ایسی تشنگی کا احساس جاگتا ہے جو سمندر کا پانی پینے پر جاگتی ہے، جو سدا جاگتی رہے گی جو کبھی نہیں سوئے گی یہ داخلی کرب، یہ تنہائی، یہ سوکھے حلق اور سوکھے لبوں کے سفر کی داستان، مظہر امام کی شاعری میں یہاں سے وہاں تک بکھری ہوئی ہے۔

یہ دُنیا ایک ایسا مکاں ہے جہاں کوئی کھڑکی نہیں ہے

صرف دروازہ ہے ایک، اندر سے جو بند ہے

اگر کھول پائیں تو کھولیں

کہ اندر ہمیں ہیں

تمہارے لئے ایک نظم ________

یہ محرومیاں جابجا پھیلی ہوئی ہیں اور انہوں نے شاعر کو بے حد حزن میں ڈوبا ہوا لہجہ عطا کیا ہے۔

اب اک مُردہ انسان کا کوٹ میرے بدن کی کثافت چھپائے ہوئے ہے
میں برسوں کی رسوائیاں
اس کی بوسیدہ جیبوں میں
مدفون کرنے میں مصروف ہوں

——— تمہارے لئے / ایک نظم

تب روشن دن کے خواب دیکھنے والا شاعر کہ سفر کی تنہائی اور آبلہ پائی جس کا مقدر بن چکی ہے، کہتا ہے:

پسلی سے اپنی آپ نکالیں کوئی وجود
ویران ساعتوں کی کلائی مروڑ دیں

فرد کی ذات کی محرومیوں کے تاریک سائے کہاں نہیں منڈلاتے، لیکن وہ جو ذہین و طباع ہیں، وہ جو صاحب قلب و نظر ہیں۔ وہ چیخ اُٹھتے ہیں، اتنا اندھیرا کیوں؟ ہم کہاں ہیں؟ ۔ ہم کیوں ہیں؟

پچھلے صفحوں میں میں نے ایک زاہد شب گذار کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے متینوں کے شہر میں اپنا حجرہ بنا لیا تھا۔ ایک رات کہ وہ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ اور آدھی سے کم باقی تھی اپنے ہی جیسے کئی اصحاب زہد و تقویٰ کو لئے مظہر امام کے یہاں 'حق حق حق' کرتے پہنچ گئے۔ ابھی پچھلے پہر شروع ہونے میں تھوڑی دیر تھی کہ انہوں نے محفل سماع شروع کرنے کا حکم دیا۔ مظہر امام کی وضعداری کہ وہ باہر نہیں نکلے۔ تب پیروں، فقیروں نے موذن کے اعلان تک وہ رات ان کے گھر درس حقانیت میں گذار دی اور پھر صبح دم 'حق حق حق' کرتے وہاں سے رخصت ہوئے۔ کئی دن بعد مظہر امام کی شاہ جی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے دست بستہ عرض کیا۔ 'قبلہ میں گنہگار سہی پر میرے بچوں نے کیا قصور کیا تھا۔'

ہم نے ایک اُٹھتی بزم کی آخری جھلک دیکھی ہے اس لئے ہم بعد کے آنے والوں سے ہمیشہ ایک سربلندی کا احساس رکھتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ۔ جو تم دیکھ رہے ہو، وہ ہم بھی دیکھ رہے ہیں، لیکن جو کچھ ہم نے دیکھا ہے وہ تم نے نہیں دیکھا۔

اب جو لوگ آتے ہیں انہوں نے گرم ہواؤں میں آنکھ کھولی ہے۔ وہ ایک تپتے ہوئے دن میں پہنچے تھے۔ اس ریزہ ریزہ کرنے والے دن کا کوئی آخری سرا نہیں ہے۔ زندگی نے اس تپتے ہوئے دن کو اپنا سفر شروع کیا تھا اور اس تپتے ہوئے دن پر وہ ختم ہو جائے گی۔ ایک خشونت، ایک درشتگی نے انھیں گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ان کے سامنے نہ ہم ہیں نہ آپ ہیں فقط گرم ہواؤں والا دن ہے۔ اس لئے وہ ملتے ہیں تو خنجر بکف ملتے ہیں، ایسے میں ہمیں ان کے خنجر سے دور ہی دور رہنا پڑتا ہے۔

سرگوشیاں، سازشیں اور خطابازیاں آئے دن چلتی رہتی ہیں۔

جب دل پر بہت بوجھ ہوا تو مظہر امام کے یہاں جا کر دل ہلکا کر لیا اور تب ایسا محسوس ہوا کہ ہم نے دریا میں ایک قیمتی خزانہ ڈال دیا ہے۔ اب کوئی لہر، کوئی موج، کوئی سیلاب اسے اس کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا، وجہ یہ ہے کہ دریا گہرا ہے، چھچھلا نہیں ہے۔

بہت سی محرومیاں، بہت سے طوفان جو کبھی کبھی بہت شور مچا کر اُٹھتے ہیں، لیکن ساحل اس طرح شانت رہتا ہے۔ ساحل کی بے چینی دیکھ کر لوگ دریا اور موج دریا کا علم حاصل کرتے ہیں، لیکن یہاں تو ——

ادھر کچھ دنوں سے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ انہوں نے سن و سال کی سیاہ کے آگے سپر ڈال دی۔ یہ آخر کیوں؟ کہ سفر میں ہنستے کھیلتے رہو تو اس کی زیر باری کم ہو جاتی ہے، تب ہی ہم اس منظر امام کو تلاش کرتے جو نامی گرامی سخنوروں کا شاعرہ آرگنائز کیا کرتا تھا، جس میں شعر و سخن کے ایسے ایسے اعلیٰ نمونے پیش کئے جاتے تھے۔

سخن کی سخن میں سخن ڈال دی
نصیبا! کہاں تو نے فن ڈال دی

کچھ دن ہوئے ہم نے یہاں ' شام منظر امام ' منعقد کی تھی۔ ہمیں ان کی تین نظموں اور تین غزلوں پر گفتگو کرنی تھی اس موقع کے لئے میں نے ایک چھوٹا سا مضمون لکھا تھا۔ جس میں میں نے ان کی غزلوں کے سلسلے میں ایک ذرا سخت رویہ اختیار کیا تھا۔

اس کے بعد ایک صاحب پھر ان کے یہاں ایک گھڑے کر حاضر ہو گئے۔

میں نے اُن سے دریافت کیا۔ منظر صاحب آپ نے کوئی غلط عینک تو نہیں لگائی۔

کہنے لگے ' نہیں صاحب ' غلط عینک لگانے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔

انور عظیم آئے ہیں ہم کہاں بیٹھیں گے۔ منظر امام کے یہاں۔

حسن نعیم آئے ہیں —— منظر امام۔

بشیر بدر اور نازش آئے ہیں —— منظر امام

کلام حیدری آئے ہیں —— منظر امام

منظر شہاب آئے ہیں —— منظر امام

شمس الرحمٰن فاروقی آ رہے ہیں، آپ ہی کے یہاں نشست اچھی رہے گی۔

ایک خاصے مرکزی مقام پر، ہم ایک اچھی سی فضا میں بیٹھتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، مسائل پر اُلجھتے ہیں، چائے پیتے ہیں۔ اور پھر رخصت ہو جاتے ہیں۔ یاد ہے ہم نے ' اہل قلم ' کی بنیاد بھی ان ہی کے یہاں رکھی تھی۔

لیکن کل جب وہ یہاں سے چلے جائیں گے تو کون ایسا ملے گا، جس کے یہاں ہم اپنی نشستیں رکھا کریں گے، کون ہے جو تھکے ماندوں کو اپنے یہاں دو گھڑی بٹھا کر تازہ دم ہونے کا موقع دے گا، اور کون ہے جو ہمارے دل کے بھاری بھرکم بوجھ کو ایک گراں قدر امانت سمجھ کر اپنے دل کے دریا میں محفوظ کرے گا۔

اور تب دُور دُور تک سناٹا سا چھا جاتا ہے اور سڑکیں ویران سی دکھائی دیتی ہیں اور گرمیوں کی دوپہر کے گرم گرم بگولے سائیں سائیں میں ناچتے گاتے شور مچاتے میرے آگے سے گزر جاتے ہیں۔

●●

حق اعظمی

استعداد

مجھ سے بوجھل ہواؤں نے سرگوشیوں میں کہا
موسموں سے مصافحہ کرو
فکرِ پاریدگیٔ شفق چھوڑ کر
کمناتی ہوئی جوئے ابیض رواں ہے بہت دیر سے
بس تمہارے لئے
بال و پر کی دمک
اندراس کی منزل کی ہوگی سند
میں نے چاہا بہت
سعیٔ ناکام بھی کی، مگر
نیلی پگڈنڈیوں کو نہ طے کر سکا
اسودی سیڑھیوں سے نہ اترا کبھی
اخضری راہداری سے گزرا ہی تھا
"پولیو" راہرو بن گئے
میں کنایوں پہ ان کے ہی چلتا رہا
نیلی پگڈنڈیوں میں بھٹکتا رہا
اور ہواؤں کی سرگوشیاں اب بھی سنتا ہوں میں!
"موسموں سے مصافحہ کرو
فکرِ پاریدگیٔ شفق چھوڑ کر"

اکرام باگ

بو

ممکن ہے
کسی دن یہ نیندِ اعصابی
بیچ کمان میں راکھ کی صورت ملے
تب حوض کے کناروں میں بہتی ہوئی پاکیزگیوں کے ساتھ
میرے گناہوں کی آگ

کسی پہر
تیری گلی کی نالیوں میں مجسّم ہو جائے
ابھی مَیں سنگین لہروں میں ہوں جاری
تہجد ساعتوں میں
تیری سانس کے اصنام کس نے تراشے ؟
کہ وہ مَیں ہوں مسجد گزیدہ
کئی روز سے
چاٹتا ہوں اپنا کوہِ ہوس
مگر،
منبروں سے لپٹا ہوا زرد کیڑا
مرتا نہیں
صبح کی پہچان ملبہ نہیں تعمیر ہے
سوناگ پھنی کی بُو سے اَٹا میرا کمرہ پہچان گروں کے لئے عادت ہے ●●

اندر کے آدمی کی التجا

احمد اعجاز

جب بھی پیالے تو یخ بستہ جھیل پہ اُترے
درپن اس کا جگہ جگہ سے ٹوٹ ہی جائے
پانی اس کے اندر کا اوپر آجائے

جب تو اُجلے پربت کی چوٹی پر اُترے
جھرنے کتنے آنکھوں سے اس کی بہ نکلیں
پتھر اندر سے کتنے چمکیلے نکلیں

جب تو ٹین کی چھت پر میرے گھر کی اُترے
آئینہ اِک لمبا چوڑا سا بن جائے
اور اس کو جب دیکھوں تو دیکھا نہ جائے

اے سورج تو لاکھوں انسانوں کے سر پر جمی ہوئی برفوں کو بھی
اب پانی کر دے
یا پھر میرے اندر آ کر میرے کرب کو اپنے جیسا روشن
اور چمکیلا کر دے

• •

مگر خوف سے لوٹ جانے کا حاصل ہی کیا ہے

کسی نے پکارا
”ہراساں ہوئے ہو؟
مگر خوف سے لوٹ جانے کا حاصل ہی کیا ہے؟
کہ ہر راستہ کس نگر میں تمہیں لائے گا
اور ہر سمت اندھے کنویں مُنھ کو کھولے ملیں گے
جہاں تہ میں ہر پل
مچلتی ہوئی نرم و نازک تمناؤں والے حسیں بالکوں کیلئے
کتنے ہی سانپ بچھو ملیں گے
ہزاروں ہی عفریت آگے بڑھیں گے
سنو! ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں میرے بچے
کہ اندھا کنواں من کے اندر چھپا خوف ہے۔“
یہ کسی نے ہزاروں برس پہلے مجھ سے کہا تھا
مگر میں تو چپ چاپ پتھر کی مانند جب سے کھڑا ہوں

• •

کرشن موہن

چار مختصر نظمیں

ماسوائے حسنِ ظاہر

وہ زن جو ماسوائے حسنِ ظاہر کوئی جوہر ہی نہیں رکھتی
ہے نانِ روغنی جو گرم ہے جب تک
مزہ دیتی ہے لیکن سرد ہوتے ہی
لطافت اور لذّت اپنی کھو دیتی ہے اور بے رنگ ہوتی ہے

••

پیاس

محبت کی پیاسی
ہے دانشوروں کی، فقیروں کی، سنیاسیوں کی اُداسی
کہ ہے اُن کی مستی میں پوشیدہ امرد پرستی کی پستی
ہو سرمد کہ سقراط
عجب ہے یہ احساسِ عزلت کا تیور
یہ گہنا یا زیور
یہ امرد پرستی، اُداسی کی داسی
محبت کی پیاسی

••

یکسر بے خبر

ہمیں معلوم ہے یہ تو
کہ اک دن موت آئے گی
مگر کب آئے گی یہ جانتا کوئی نہیں، اگیان کے گہرے سمندر میں
رواں ہیں سب

....

کسی گاڑی کے نیچے جس طرح سویا ہوا کوئی سگِ بے حس
ہو یکسر بے خبر، چل دے گی کب گاڑی

••

ہیزم

اگر سیج پر
ویشیا بن نہ پائے
تو عورت ہے اک ہیزمِ خشک و بے حس

••

قیصر ضحیٰ عالم

ادب اور اخلاقیات

ادب سے مذہب اور اخلاقیات کا فاصلہ شائد بہت طویل نہیں رہا ہے۔ ادیب نے اکثر اپنے اس نوع کے خیالات اور احساسات کا اظہار اپنی نگارشات میں کیا ہے۔ اُن موقعوں پر بھی جب وہ دراصل کسی دوسرے سلسلے کی بات کر رہا ہوتا ہے۔ مذہب اور اخلاقیات نے ادب کے احاطے میں وسیع اور محدود دونوں شکلوں میں داخلہ پایا ہے۔ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ادب نے مذہبی نقطۂ نظر سے گناہوں میں دلچسپی لی ہے اور کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو گناہ کے لئے شرم اور پچھتاوا نہیں بلکہ ایک خاص لذت کا احساس ہے لیکن مذہب ادیب کے اس طرزِ فکر کی مذمت کرے گا۔ چونکہ ادیب عام طور سے اِس جانب نہایت صاف گو رہا ہے اس لئے عالموں نے اُسے ڈانٹا اور پھٹکارا بھی ہے۔ جان کے بقول

"جسے خدا نے بھیجا ہے اُس سے گناہ سرزد نہیں ہو سکتا اس لئے کہ خدا کا بیج اُس شخص میں ہے اور اُس سے گناہ ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا نے اُسے بھیجا ہے۔"

لیکن جیسا کہ برٹرینڈ رسل رقم طراز ہے :—

"روایتی اخلاقیات کا بھی گناہ سے احتراز پر اور اگر گناہ سرزد ہو چکا ہو تو اُس سے برأت اور پاکیزگی کے حصول کے لئے رسوم پر بے حد اصرار ہے۔"

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ۱۹۳۵ء میں کہا :

"چونکہ عہدِ جدید میں مذہبی اور اخلاقی معاملوں کے سلسلے میں کوئی مفاہمت نہیں ہے اس لئے عیسائی قاریوں کے لئے یہ اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مطالعے خصوصاً تخیلی اور تخلیقی ادب کے مطالعہ کے سلسلے میں اصول اور معیار کو ذہن میں رکھ کر تفتیش و تجسس کر لیا کریں۔"

ایلیٹ کے نزدیک مطالعہ کی اس طرح کی جانچ پڑتال ادب کی عظمت کے تعین کا ایک طریقہ ہے۔ ادب پاروں پر صادر کئے گئے فیصلوں کی بنیاد اخلاقیات پر مبنی کچھ معیار پر بھی ڈالی جانی چاہئے یعنی فن کے کسی نمونے پر ادبی اور اخلاقی رائیں جدا نہیں کی جانی چاہئیں۔ بہر حال براہِ راست مذہبی رنگ لئے ہوئے ادب پاروں کو عام طور سے

اعلیٰ ادب قرار نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن حیات اور فنون دونوں کے لئے اقدار کی ضرورت کو مانا جا چکا ہے۔

مذہب کیا ہے؟ اِس استفسار کا کوئی تشفی بخش جواب دینا شاید ایک مشکل امر ہے۔ تمام مدارس فکر کے لوگ اس کی کسی ایک تعریف پر راضی نہیں معلوم ہوتے۔ کچھ فلسفیوں نے مذہب کو بے ربط اور منتشر ما فوق الطبیعی (META-PHYSICAL) تصورات کا توہم پرست مرکب کہا ہے۔ کچھ علمائے عمرانیات نے اسے انسانی اقدار کا مجموعی اظہار بتایا ہے۔ کارل مارکس کے پیروؤں نے اس کی تعریف عوام کے لئے خواب آور دوا کہہ کر دی ہے۔ کچھ علمائے نفسیات کے مطابق یہ ایک فوق انا کی، ذہنی تصویر کے گرد اسطوری اور خیالی اُلجھاوا ہے۔ کانٹ نے مذہب کا جوہر قوت ارادی (WILL) میں بطور ضمانت ترتیب اخلاقی (MORAL ORDER) پایا۔ ہیگل نے اس کی کھوج خرد میں کی۔ جرمن فلاسفر شلیر میخر (۱۷۶۸ - ۱۸۳۴) نے اس کی دریافت احساس میں ہر چیز کے کُلی فنی وجدان کے طور سے کی۔

مذہب بندے اور خدا کے بیچ کا تعلق ہے، چونکہ اس کا لگاؤ علت اولیٰ (FIRST CAUSE) اور غایت آخری (FINAL END) کے اصول، ایک تصوری اور مثالی چیز کی صحت، اور انسان کے خدا (THE ULTIMATE BEING) سے رشتے کے ساتھ ہے اس لئے اسے فلسفہ اور ما بعد الطبیعات کے اشتراک کی ضرورت ہے۔ لفظ مذہب کی تشریح و تفسیر کتنے ہی طریقوں سے ممکن ہے۔ اس کا تعلق مثالی (IDEAL) زندگی کے اقدار کی تلاش سے ہے جس کی تین خاص صورتیں ہیں: تصور اور قیاس، اس تصور کے حصول کے لئے استعمال کئے گئے دستور، اور اس تلاش کا گرد و پیش کی دنیا سے رشتہ بتلانے والی دینیات یا دنیاوی مشاہدہ و مطالعہ۔ مذہب سے مراد وہ خاص نظام بھی ہے جس میں مثالی زندگی کی تلاش شامل ہے۔ اس کا تعلق ایک کنٹرول کرنے والی لائق اطاعت عظمت اور پرستش فوق بشر طاقت کو انسان کے ذریعہ تسلیم کرنے سے، تسلیم کنندہ کے احساس اور روحانی وضع سے اور اس احساس کی راہ و روش اور زندگی میں مظاہرے سے ہے۔ اس کا واسطہ، ضمیر، واجب التعظیم رسموں اور اُن کی تعمیل سے ہے۔ نلسن نے 'اے ہسٹری آف گریک ریلیجن' میں لکھا ہے کہ

"ہر شخص میں ما فوق البشری سے رابطہ قائم کرنے کی خوابیدہ آرزو اور اپنے آپ کو وقتی اور زمانی سے اوپر اُٹھا کر روحانی حالت میں محسوس کرنے کی تمنا موجود ہوتی ہے۔ متبرک اور مقدس سے غیر مقدس اور نجس کی علحدگی، روح اور خدا پر یقین فوق بشری الہام (SUPER NATURAL REVELATION) پر بھروسہ، پرستش اور نجات کی جستجو جیسے انسانی اعمال اور اعتقادات سے عام عقیدہ کے مطابق مذہب کی تشکیل ہوتی ہے۔ خدا (THE ULTIMATE REALITY) کا تجربہ یا ذاتی طور سے خدائی طاقت کے رُو برو ہونا مذہب کا مقصد رہا ہے۔"

مذہب اور ادب کے باہمی تعلق کے بارے میں 'نیو شیف ہرزوگ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجس نالج' (۱۹۵۹ء) یوں گویا ہے:

"مذہب اور ادب کا ایک ہی بنیادی منبع ہے۔

ہب خدا (ULTIMATE BEING)
کے ساتھ آدمی کا رشتہ ہے۔ اس کا واسطہ
نسان کے اس ابدی اور آفاقی ہستی کے
ین فرائض سے ہے۔ بنیادی طور سے ادب
می اسی لگاؤ کی نمائندگی کرتا ہے۔ ادب
ضاحت کرنے، تائید میں دلائل پیش کرنے،
افق پیدا کرنے، تفسیر و تشریح کرنے اور یہاں
ب کر اطمینان اور تسکین دینے کی کوشش کرتا
ہے۔"

ں نیویں اساطیر میں ادب اور مذہب تقریباً متحد
نوں دراصل ایک ہی چشمے سے پھوٹتے ہیں، دونوں
سطہ زندگی سے ہے۔ فرانسیسی ادب میں کبھی دینوی
ی موضوعات بھرے پڑے ہیں، لیکن خصوصاً انگریزی
حوالہ سے یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اس صدی میں
، موضوع اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔" بیسویں صدی کے
یڈیا آف ریلیجس نالج" (۱۹۵۵ء) کی بیسویں صدی
ادل کے متعلق یہی رائے ہے۔ صورت حال میں کچھ
رہی ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں علامہ اقبال ہیں
جز ممنوعہ بن چکے تھے ان دنوں کافی دلچسپی اور
ظہار ہو رہا ہے۔ سائنس کے سبب جس کا جھکاؤ
پرستانہ فلسفہ، صنعت، دنیاداری اور غیر مذہبیت
ہے۔ روحانی زندگی کا ایک پائدار اظہار شاید مشکل ہے
مذہب کے مقام کی بے قدری کی وجوہات شاید
ں۔ ایلیٹ کے ذریعہ بتائے گئے جدید دنیا
سلک عناصر، بیزاری، اکتاہٹ اور روحانی خلا
ایلڈس ہکسلے کے بقول ہم لوگ آج تاریخ کے
بے دین عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ بیسویں
انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجس نالج کے مطابق

ہم لوگ، ایسے دور سے گذر رہے ہیں،
جب عوام کو ہنگامہ، ہیجان، لطف اور
جوش، تصورات (IDEAS) کے مقابلے
میں زیادہ اہم اور جسمانی تجربے اخلاق،
اور روحانی تصورات کے مقابلے میں زیادہ
پرکشش معلوم ہوتے ہیں۔"

ہکسلے نے لکھا ہے کہ دین پچھلی کئی صدیوں سے، گو یہ انحطاط
ہے لیکن بہرحال ابھی بھی زندہ ہے، کچھ لوگ جو یہ اعلان کرتے
ہیں کہ وہ بغیر مذہب کے ہیں، مذہب کی کسی نہ کسی متبادل
صورت پر ایک طرح کا یقین ضرور رکھتے ہیں، اس وقت کی
لا مذہبیت ہکسلے کے نزدیک کوئی مستقل چیز نہیں ہے اس کے
لئے کائنات کی بے پایانی اور اس کے معمات کا احترام کا جذبہ
ہی سب سے بنیادی مذہبی طرز فکر ہے۔ ہکسلے کے ذریعہ
بیان کردہ متبادل مذاہب میں روایتی مذہب کے جیسے رسوم
اور پیشوا ابھی موجود ہیں۔ مذہب کے بدل سیاست، فن، جنس
تجارت، ضعیف الاعتقادی وغیرہ ہیں۔ آرتھر کوسلر نے
سوشلزم کو بیسویں صدی کی ابتدا کا دین اور سہارا (HOPE)
قرار دیا۔ بی ایٹرس وب (BEATRICE WEBB)
لکھتی ہیں کہ انیسویں صدی کے اختتام میں ذہین لوگ عام طور
سے یہ سوچنے لگے تھے کہ آخر میں تمام انسانی پریشانیاں اور
تکلیفیں سائنس کے ذریعہ ہی دور ہوں گی۔

آرنلڈ کے مطابق مذہب کی بنیاد فرضی اور عقل سے
بعید باتوں پر نہیں بلکہ قابل تسلیم سچائیوں پر ہونی چاہئے جسے
سائنس بلا تامل قبول کر لے۔ چنانچہ آرنلڈ پر یہ الزام عائد
کیا گیا کہ وہ سائنس کی حد سے زیادہ اطاعت اور لحاظ کرتا تھا

ویسٹر مارک نے اخلاقی تمیز کی معروضیت سے انکار کیا۔
فریزر نے GOLDEN BOUGH میں یہ صاف کہہ دیا
کہ جس طرح مذہب نے سحر (MAGIC) پر فتح پایا ہے اسی طرح

فہم و ادراک (REASON) کے سامنے مذہب کو بھی گھٹنے ٹیک دینا ہوگا امریکی سی۔ ال۔ سٹیونسن نے بھی اخلاقی بصیرت میں معروضی معقولیت نہیں پائی ۔

مذہب اور ادب یکساں طریقوں کا بھی انتخاب کرتے ہیں، دونوں ہی تخیل کی قدر کرتے ہیں اور فن کا استعمال زندگی اور مظاہر کی تشریح کے لئے کرتے ہیں، دونوں ہی کا خیالات، احساسات اور جبلّات سے سروکار ہے ۔ دل و دماغ، ضمیر اور ارادہ، آرزو اور تمنا دونوں کے مشترک میدان ہیں، دونوں ہی خدائی کے متعلق اعتقادوں اور مافوق کی تعلیم سے لیس ہیں اور دونوں ہی کے پاس ایک باقاعدہ نقشہ یا سانچہ موجود نہیں ۔ یہ ضروری ہے کہ اس نوع کا موضوع تحریر کا INHERENT حصہ معلوم ہو ۔ ادب کو کافی مواد مذہب اور اس سے لگاؤ رکھنے والے مضامین سے دستیاب ہوتا ہے ۔ عظیم شرک کتابیں بذاتِ خود ہی ادب پارہ ہیں اور بیش قیمت ادب کی تخلیق کے لئے تحریک، شاعرانہ وجدان، اور روحانی فیضان بھی بہم پہنچاتی ہیں ۔ اہم مذہبی ادارے، گرجے، خانقاہیں وغیرہ عمدہ ادب کی تخلیق کی جانے والی دانش گاہیں رہی ہیں ۔ پچھلی دو صدیوں کے ادب میں مذہب کے کردار کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ آفاقی اور مخصوص طور سے مذہبی ۔ آفاقی شاعروں میں پوپ، گوئٹے اور ورڈز ورتھ کا شمار ہوتا ہے ۔ مخصوص مسیحی پیغام براؤننگ اور ٹے نی سن کے یہاں موجود ہے ۔ شیکسپیر کی دل چسپی بنیادی حقیقتوں اور سچائیوں میں تھی ۔ ملٹن مذہبی شاعر سے زیادہ ایک عالم دین تھا ۔ شیلی کے بموجب علم اخلاق کی بنیاد واعظوں کے ذریعہ نہیں بلکہ شاعروں کے ذریعہ رکھی جاتی ہے ۔

" شاعری ادب میں اظہار کی بلند ترین اور بیش قیمت ترین شکل ہے ۔ یہ خیال، احساس اور تخیل کے نظام کے سب سے اونچے نقطوں کی نمائندگی کرتی ہے، مذہب وجود کی سب سے بلند قامت شکل ہے، چونکہ انسان کے خدا کے ساتھ اور خدا کے انسان کے ساتھ رشتہ کی طرف نشان دہی کرتی ہے ۔ دونوں ہی اپنے اپنے وجود کی ترتیب کے سب سے بلند مقام پر پہنچ جاتے ہیں ۔ اور اس لئے انسانیت کی دوسری طاقتوں کے مقابلہ میں ایک دوسرے سے زیادہ گہرا اور سیدھا لگاؤ رکھتے ہیں ۔ " (یونوشیف ہرزوگ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجس نالج)

مذہب کا انسان کی داخلی ضروریات سے قریبی تعلق ہے ۔ اس کا رشتہ مثالی زندگی کے اقدار کے حسن کو دوبالا کرنے سے ہے ۔ عوام الناس کی خدمت بھی پرستش میں ہے چنانچہ مذہبی قوانین کو معاشرہ میں انتشار کی حوصلہ افزائی نہ کر کے ذہنی اور اخلاقی تربیت، باہمی اتفاق اور استحکام کو ترقی دینے کی سعی کرنی چاہئے ۔ ایک سچے مذہبی ذہن کی روحانی صلاحیت، سکون، آسودگی، طاقت، محبت ذہنی اور اخلاقی تربیت کی تمیز اور شعور میں مضمر ہے ۔ مذہب انسان کو سچے اور رحم دل برتاؤ کے جذبہ کی علم برداری، محبت، خوش نیتی اور خلوص کے لئے سرگرم رہنا سکھاتا ہے ۔ یہ انسانی تکلیفوں اور سماجی جرائم کی جانب خصوصاً بے حد ذکی الحس ہے ۔ انسان کے اندر مذہب کا عمل زندگی کے حسن کے مخالفین پر حاوی ہونے میں مددگار ہوتا ہے ۔ تمام اہم اور حیاتی مذاہب کے کامل ہونے کی ایک دلیل انسان کا دوسرے انسانوں کے لئے تسکین اور راحت کے اعتبار سے محترم اور وقیع ہونا ہے ۔ جب ہم

ب اور مذہب کے علاقے کی بات کرتے ہیں تو ہمیں
سانی رشتوں کے اقدار پر ضرور روشنی ڈالنی چاہئے جو
ب میں مذہب کے ذریعہ داخلہ پاتے ہیں۔ بڑے شعراء
حال علوم و فنون کے احیاء کے زمانے کی نشان دہی کرتے
لیکن مفکروں اور عالموں نے بھی اخلاقی اصلاح اور
ادۂ روحانی سے متعلق باتیں کی ہیں۔

اکثر ادیبوں کی نگارشات میں انسان دوستی نمایاں
، اُن کا سلسلہ دوسرے انسانوں کی عزت و وقعت ہے
سلے نے THE CLOUD OF UNKNOWING
ے ایک حوالہ دیا ہے:

" خدا محبت و الفت سے جیتا جا سکتا ہے
عقل و خرد اور غور و خوض سے کبھی نہیں۔ "

ایلیٹ کے بہ قول جب ہم پاتے ہیں کہ کوئی انسان ایک
خاص قسم کا برتاؤ بہ ظاہر مصنف کی پسندیدگی اور استحسان
کے ساتھ کر رہا ہے اور مصنف کی نیک خواہشات ان حرکات
وسکنات کے لئے محفوظ ہیں جو کہ اس برتاؤ کے اُس کے
ذریعہ ترتیب دیئے ہوئے نتیجہ کی طرف اُس کے رُخ سے عیاں
ہے۔ تو ہم اُسی طرح کے برتاؤ کو اپنانے کے لئے مائل ہو سکتے
ہیں۔ ایلیٹ آگے کہتا ہے کہ عیسائی ہونے اور ساتھ ساتھ
ادب کے قاری ہونے کے ناطے یہ علم رکھنا ہمارا فرض ہے کہ
ہمیں کیا پسند کرنا چاہئے۔ ہکسلے نے بھی زور دیا ہے کہ دنیاوی
محبت روحانی محبت کے لئے ایک لازمی تمہید اور ضروری
وسیلہ ہے۔

مثال کے طور پر جدید امریکی ڈرامہ نگار آرتھر ملر
وجود کی ہر سطح پر رابطے قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈرامہ
اس کے لئے ذریعہ ہے ایک انسان اور دوسرے انسانوں
کے درمیان رشتے پیدا کرنے کا۔ خدا کے متعلق وہ کبھی متردد
دکھائی نہیں دیتا اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ ملر کی نگارشات
میں خدا کا تذکرہ شاید کہیں موجود نہیں۔ ملر کے لئے انسان
کی الوہیت سے زیادہ معتبر اور مستند ہے اُس کی انسانیت
اور رحم دلی، اُس کے نزدیک خدا انسان کے اخلاقی
حسن کے ذریعہ ہی خود کو منظر عام پر لا سکتا ہے۔

ای۔ ایم۔ فورسٹر کے اُس اعلان کو کہ اگر اُسے
اپنے ملک اور اپنے دوست کے درمیان فیصلہ کرنا ہو کہ
دغا بازی کس کے ساتھ کی جائے تو اُسے امید ہے کہ اُس
میں اپنے ملک کے ساتھ غداری کرنے کی ہمت ہوگی۔
جی۔ ایچ۔ بین ٹوک نے اہانت آمیز کہا ہے۔ فورسٹر
اس دنیا کو انسانوں سے بھرا پڑا ایک گلوب سمجھتا تھا،
جہاں خیر سگالی، تہذیب اور عقل کے ساتھ انسان ایک
دوسرے سے نزدیک ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈی ایک
مَنس نے ۱۹۵۸ء میں ایک جدید اخلاقی ڈرامہ
ONE FOR THE GRAVE لکھا:
CAREER, EVERY MAN, SACRIFICE,
FORGET FULNESS, COMMON SENSE,
CONSCIENCE, THE MARXIST, THE
ANALYST, FREE WILL, THE ELEC-
-TRONIC BRAIN, THE SCIENTIST,
اُس ڈرامہ کے کچھ کردار ہیں۔

وِلا گیس
ظہیر صدیقی

● پکلی فورنیا کی ایک یہودی عورت کا پورا خاندان ہٹلر کے نازی کیمپ کے عتاب کا شکار ہوا اس کے بعد وہ حساس عورت روحانی سکون کی خاطر صیہونی مقبوضہ یروشلم میں سکونت پذیر ہوئی مگر جون ۱۹۶۷ء میں ـــــ صیہونی جارحیت کو اس نے شدت سے محسوس کیا اور بالآخر بدنصیب عورت نے صیہونی درندگی کی تاب نہ لاکر بیت المقدس میں خودکشی کرلی۔
شاعرہ ولاگیس مشرق وسطیٰ کے سفر میں اس عورت کی دردناک کہانی سے کافی متاثر ہوئی اور اس نے یہ تاثراتی نظم لکھی جو سب سے پہلے کویت ٹائمز کے ۲۴ر اپریل ۱۹۷۰ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ ●ـــــــــ (ادارہ)

میرے لوگو!

مجھے اپنے لوگوں کی وطن واپسی کا جشن منانے دو
ہاں! اسے ایک عالمی جشن کی شکل دو
ساحل میری نگاہ کا مرکز رہا
اور پہاڑوں کے حصار میں چاند تنگ ہوتا رہا
(یا وہ بادل ہی تھے پہاڑوں کی طرح پھیلے ہوئے)
اور میں بول اٹھی
'وطن ـــ میں اور میرے لوگ وطن آرہے ہیں
اس لمحہ نے میرے والد کی یاد تازہ کردی
جن کی موت ناکارہ انداز میں ہوئی
(یہ کہانی باربار دُہرائی گئی ہے
لیکن ـــ پھر بھی وہ میرے والد تھے)

جو نازی کیمپ میں گیس کے شکار ہوئے
میری ماں نے خودکشی کرلی
میں نے چاہا کہ اس کی تقلید کروں
لیکن میں بہت چھوٹی تھی
کیا انسان کا گوشت پوست
امکانات کا گھر نہیں؟
مذہبی ـــــــ میں کبھی نہیں تھی
ایک یہودی کے لئے مذہبی ہونے کا ایک ہی راستہ ہے
کیا وہ مذہبی یہودی ہے
کیا قیامت ہے!

"منتخب لوگ" آخر ہم کیوں پریشان رہے ؟
"منتخب لوگ" آخر ہم تمام عمر کس شے کی تلاش میں
سرگرداں رہے ؟
مَیں نہیں کرتی پرواہ اس نظریہ کی
جو نصرانیوں کی دین ہے
جس نے آریوں کو "اعلیٰ نسل" بنایا
لیکن اپنا وطن — یہ ایک الگ لہر ہے
ہاں! اگر میرا وطن ہوتا
میں اس کی پوجا کرتی
لمبی تاریک راہوں پر تنہا چل کر
منزل کو چھو لیتی
اور سرگوشی سنتی ایک خواب کی۔
"بے زمین افراد
بے افراد زمین کے حصول میں مصروف ہیں"
یہ تھا میرا مذہب
اور میری معصومیت اتنی معصوم تھی
جو میرے ذہن کو چھو بھی نہ سکی
فلسطین میں فلسطینی ہو سکتے تھے
جون ۱۹۶۷ء نے یہ ثابت کر دیا
نومبر ۱۹۶۸ء — میں اپنے خواب کی سمت چل پڑی
مسافروں کی فہرست میں
ایک بھی غیر یہودی نہ تھا
ہمارے جشن میں دخل دینے والا اجنبی ذہن
میرا اپنا گھر تھا
جس نے "گھر جانے" کے "جم غفیر" کی باتوں میں

بہت کچھ محسوس کیا
اس جہاز سے اُتر کر
واپس جانے کا ٹکٹ
ایک میرے پاس ہی نہیں تھا
میں نے سوچا دور ہو جاؤں
غرور میں غلطاں ان مسافر یہودیوں سے
گویا انہوں نے
براڈوے میں اپنی پوشاک کی دکانوں کی مدد سے
یا نیو جرسی میں اپنی رفعت کے سہارے
یا واشنگٹن میں اپنی اونچی عمارتوں کے ذریعہ
کسی کٹر عیسائی کو شکست دی ہو
ریگستان کی ریت پر خون چھڑک کر
شیخی بگھارنے والے
جیسے ان میں سے ہر ایک عظیم فاتح ہو
زمین مجھے پہچان لے گی
میں نے سوچا
زمین جس کو میں اپنا سکتی ہوں
زمین — کیا تم اُس زمین کو جانتے ہو ؟
کیا اُس زمین کی تلخ مٹھاس سے واقف ہو ؟
کیا تم جانتے ہو کہ عربوں کی زمین کیسی ہے ؟
کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے
ہماری طرح داخل ہونے والوں کو
زمین خود ہی کیسے
"نہیں" کہہ دیتی ہے
صرف عربوں نے نہیں کہا

"چلے جاؤ!
ہم تمہیں جہازوں اور بندوقوں کے ساتھ ناپسند کرتے ہیں
ناپسند ہیں ہم کو
تمہاری بڑھتی ہوئی آبادی
اور تمہیں تسلیم کیے جانے کا اصرار"
تنہا عربوں ہی نے نہیں کہا ——
خود زمین نے بھی یہی کہا
کیا تم نے اس زمین کو ویسی ہی پایا
جیسی عربوں نے چھوڑا تھا
مہربان ہاتھوں کی بنائی ہوئی پگڈنڈیاں
جنھوں نے بارش کے ایک ایک قطرہ کو محفوظ کیا
اور پودوں کی مدد کی کہ شگافوں سے نکلیں
دیکھا ہے تم نے؟
خلوص کے ساتھ قابل کاشت بنائے ہوئے کھیتوں کو
جو ایک اوسط سائز کے میزپوش سے ڈھکے جا سکتے ہوں
کیا تم نے دیکھا ہے؟
محض ایک خاردار جھاڑی کے گرد محصور
پہاڑوں سے جھولتے ہوئے میدانوں کو
اور صحراؤں سے ابھرتے ہوئے موسم گل کو
اگر یہ سب تمہیں دیکھا ہو
تو بار بار تذکرہ نہ کرو
کہ ہم یہودیوں نے کیسے
اپنے ریگ زاروں میں گلاب کھلائے ہیں
اے میرے لوگو!

کیا تم نے دیکھا ہے
یروشلم کی شاہراہوں کے گوشوں کو؟
بڑھتا ہوا انبوہ؟
خوف سے زرد چہرے؟
وہ گوشے میرے لئے آشنا سا ہیں
عہد آفریں زمین کے خوابوں کے ذریعہ نہیں
بلکہ اپنی یادوں کے توسط سے
یادیں برلن اور وارسا کی
یادیں وائنا کی اور پیرس کی

میرے لوگو!
کیا تم نے دیکھا ہے؟
ان کے پاک شہر ہیں
پاؤں کی ضرب سے اکھڑتے ہوئے گھر کے دروازے
اور گھر سے نکالے ہوئے خوف زدہ افراد
اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے قابل رحم سرمایہ
کہ اسے کوئی بھی اپنا لے
لیکن ایک زبردست دھماکہ
اور پھر جا بہ جا بکھرے ہوئے جسموں کے چیتھڑے
تم نے کبھی غور کیا ہے؟
کھنڈروں کے ملبہ میں
گم شدہ کھلونے ڈھونڈھتے اور روتے ہوئے بچوں کو
جبکہ ان کے والدین
بے بسی کے عالم میں کہیں قریب ہی چُپ چاپ کھڑے ہوں

تم نے کبھی غور کیا ہے ؟
خاندان کے خاندان
لامحدود بزرگوں کی لمبائی
اپنے اندوختہ اثاثہ کے ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے طے کر رہے ہوں
اور پھر وہ کیمپ ـــــ میں اس کا نام نہ لوں گی
جہاں میرے والد اسیر ہوئے
میں جو کچھ جھیل چکی ہوں
کیا تم جھیل سکے ہو ؟ (اے میرے لوگو)
اور دیکھ سکے ہو ؟
تھکے ہارے جلوس کو
پھر سے زندگی کی سوغات پاتے ہوئے

محض کرب اُٹھانے کے لئے
محض عالمِ یاس میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے
یخ زدہ پتھر کی سل
اور لوہے کے ہیبت ناک شکنجے
اور سب سے بڑھ کر وہ قہقہے
اُف !
وہ قہقہے !!
بے رحم اور خوف ناک
یونیفورم اور بوٹ میں ملبوس آدمیوں کے قہقہے
قہقہے جو میں نے دوسرے شہر، دوسرے براعظم اور دوسرے وقت میں
پہلے پہل سُنے

میرے والد ـــ بوڑھے، کمزور اور تنہا
اور وہ تندرست و توانا لوگ
ان کے لئے یہی بات مضحکہ خیز تھی
کہ جب انہوں نے میرے والد کو ٹھوکر ماری
تو وہ گر پڑے
مجھے خدا پر یقین نہیں
لیکن مجھے دوزخ پر یقین ہے
کیونکہ میں نے وہ قہقہے سُنے ہیں جو دوزخ سے آتے ہیں

اور اب میں
یروشلم کے ایک ہوٹل میں
بستر پر بے خواب سو رہی ہوں
پاک شہر میں
جہاں یہودیوں کے قہقہے
ہوا میں سسکیاں لیتے ہوئے
میرے والد کی لاش سے اُبھرتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ
چنگھاڑ رہے ہیں

●●

بشکریہ "العرب" (فلسطین نمبر)

جاوید نہال

منی شیش محل

ڈھول تاشے بج رہے تھے۔ اور ڈومنی رنگ و روپ کالے گورے اور چھوٹے بڑے کا امتیاز کئے بغیر ناچ رہی تھی۔ اور شیش محل میں بہت سی ڈومنیاں ناچتی ہوئی نظر آرہی تھیں ——— ایک، خوب، صورت سا بچہ ڈومنی کے پاس کھڑا تھا۔ صرف کھڑا تھا۔ پھر اس کے پاؤں خود بخود تھرکنے لگے۔ ڈومنی کی مقناطیسی قوت اسے نچا رہی تھی ——— اور

مغل اعظم کی روح کراہ رہی تھی۔ اندر سے ٹوٹ رہی تھی۔ چھن چھنا چھن اور بکھرتے اُڑتے ہوئے شیشوں کے ٹکڑے سنگ مرمر کی سفید سطح پر چمکتی ہوئی سرخ دھار۔ بچہ رو رہا تھا۔ تلوؤں کے خون کو چہرے پر مل رہا تھا زمین پر لوٹ رہا تھا۔ ناچ بند ہو گیا تھا۔ اور مغل اعظم اندر سے ٹوٹ رہا تھا۔

ایسا کیسے ہوا ؟ ایسا کیسے ہوا ؟

آوازیں تھیں جو شیش محل کی چمکیلی دیواروں سے ٹکرا کر بکھر رہی تھیں۔

"مت رو۔ کچھ نہیں ہوا۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بھوت پریت کا قائل نہیں ہوں۔" مگر بچہ گم سم تھا۔ اکی آنکھیں شیشے میں کچھ پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر وہ چیز جس کی تلاش تھی۔ کہیں بھی نہیں تھی۔ شیش محل کے مالک کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اور پھر دو آنکھیں پتھریلی سطح میں جذب ہو گئیں۔ اپنا وجود کھو بیٹھیں۔

مغل اعظم اندر سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس کی روح کراہ رہی تھی۔ "چاند" کی رنگین دل فریب دنیا کے مالک بن گئے تھے۔ مگر اس کا سارا حسن تم نے چھین لیا تھا۔

"تم فریبی ہو۔ تم جھوٹے ہو، تم کچھ نہیں، بے بس رہو۔"

اور مغل اعظم ہنس رہا تھا۔ سب فضول باتیں ہیں۔ ہمالہ کی چوٹیاں آج بھی اپنی طاقت پر مسکرا رہی تھیں سمندر کی اتھاہ گہرائی آج بھی ناقابل عبور تھی۔ شیش محل بکھر چکا تھا۔ ناچ رک گیا تھا۔ زندگی تھم چکی تھی۔ دوسری فتح بھی شکست میں بدل چکی تھی۔ انسان کی بے بسی خنداں تھی۔ اس کی عظمت کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اور مغل اعظم اندر سے ٹوٹ رہا تھا۔

'حوا' کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئی تھیں۔ انگاروں میں بدل گئی تھیں۔ "یہ کس کام کا ہے۔ یہ

سب کچھ کس کے لئے؟ ۔"

میں بے بسوں کی دنیا میں رہنا نہیں چاہتی ۔ اور مغل اعظم کے ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے ۔ جیسے تلوار کی تیز دھار اس کے اندر اُتر گئی ہو ۔ جس سے خون اُبل پڑا ہو

ڈھول تاشے اُٹ گئے تھے ۔ ایسا کیسے ہوا ۔ ایسا کیسے ہو گیا ؟ ۔ یہ بے معنی سوال ہے ۔ زندگی کے ایک ایک پل کی بھیک مانگنے والا بوڑھا بول رہا تھا ۔

" ایسا تو ہوتا آرہا ہے ۔"

" ایسا تو برسوں سے ہوتا آرہا ہے ۔"

" مغل اعظم بے بس تھا ۔ تم بھی بے بس ہو ۔ ہم بے بس ہیں"۔

شیش محل میں شیشوں کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے ۔ ہر ٹکڑا ایک تصویر بنا ہوا تھا ۔ تصویر جو کبھی زندہ تھی ۔ اب مر چکی تھی ۔ بے رنگ و روغن ہو چکی تھی ۔

بہت دنوں کے بعد ایک رات جو فانوس کی روشنیوں کے بجائے ، برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی ۔ نئے منی شیش محل میں وہی رات پھر زندہ ہو گئی تھی ۔ مغل اعظم کی روح پھر ایک بار نئے منی شیش محل میں اُتر آئی تھی ۔ ڈومنی اور انارکلی کے رقص میں کھو جانے کے لئے" ۔

کروڑوں دن پہلے شیش محل رقص و سرود کی محفل میں کھو گیا تھا ۔ جواب تک نہ مل سکا ہے ۔ اور مغل اعظم کی روح کراہ رہی تھی ۔ اندر سے ٹوٹ رہی تھی ۔

نئے منی شیش محل کی نئے رنگوں کی تصویریں اور بھی بے بس ہیں ۔ نادار و محتاج ہیں ، اشاروں پر ناچتی رہتی ہیں ۔ مگر آج بچہ رو نہیں رہا تھا ۔ اس کی آنکھیں پتھریلی سطح میں جذب نہیں ہوئی تھیں ۔ اور لہو کی دھار کا نشان بھی کہیں نہیں تھا ۔

منی (۱۸/۱۱/۸۲) شیش محل کی چمکیلی دیواروں میں ناچتی تھرکتی فیشن ایبل انارکلیوں کے سبز ، دھانی ، سرخ عکس لہرا رہے تھے ۔ جس میں ایک دنیا کھو گئی تھی ۔

مغل اعظم خوش ہے ۔ بے بسی کی فضا میں بھی زندگی مہک رہی ہے ۔ ایسا ہی ہونا چاہئے ۔ کڑھ کڑھ کے جینے سے ناچتے ناچتے مر جانا بہتر ہے ۔ مغل اعظم کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں ۔ انارکلیاں نیم برہنہ رقص کر رہی تھیں ۔ مغل اعظموں میں جذب ہوتی جا رہی تھیں ۔ آج بھی سنگی سطح پیلے سرخ رنگ کی لہروں میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ صدیوں کی گندگیوں کی تہہ کو دھو رہی تھی ۔

وہ سب دقیانوسی تھے ۔ ان کی ساری چیزیں دقیانوسی تھیں ۔ تہذیب بے معنی سی شئے ہے ۔ ہم اس تہذیب کی اخلاقی قدروں کے خول کو ، جو بہت ہی گندہ بدبودار ہو گیا ہے ۔ اپنے جسم سے اُتار پھینکنا چاہتے ہیں —"

ڈھول تاشے بج رہے تھے ۔ ڈومنیاں اور انارکلیاں ناچ رہی تھیں ۔ ان پر نیا رنگ اور روغن چڑھا ہوا تھا ۔ منی شیش محل کی چمک مختلف رنگوں کے عکس میں کھو گئی تھی منی شیش محل تھک گیا تھا ۔ ظلمت کے طلسم میں گرفتار ہو گیا تھا کچھ نیم برہنہ ، کچھ ننگے ، گورے اور کالے بدن ایک دوسرے سے چپکے بے سدھ پڑے تھے ۔ مدہوش پڑے تھے ۔ شیش محل کی خوشبو بدبو میں بدل گئی تھی ۔

" تم کبھی زندہ نہیں ہو پاؤ گے ۔ بے حسی کے خول نے تم کو جکڑ دیا ہے ۔ تم اس سے کبھی نکل نہیں پاؤ گے ۔"

منی شیش محل کی دیواروں سے خوفناک آواز ٹکرا

رہی تھی۔ اور منی شیش محل کے سبھی پرزے اُڑنے لگے تھے۔
مغل اعظم کراہ رہا تھا۔ اندر سے ٹوٹ رہا تھا۔ مگر مدہوش، بدمست جسموں میں حرکت نہیں ہوئی۔ سب تھک گئے تھے۔ اور سچ مچ تھوڑے ہی وقفے میں منی شیش محل ویران ویران رہنے لگا۔

مغل اعظم آج بھی شیش محل کا مالک تھا۔ مگر اس کی سلطنت کھو گئی تھی۔ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ سونے چاندی کی پیالیاں تھیں۔ انارکلیوں کے مجرے تھے عیش کے ساتھی تھے۔ اور غم کی تنہائی تھی۔ مگر اب صرف تنہائی ایک وفادار بیوی کی طرح اس کے ساتھ چپکی تھی۔ ہر گام پہ اس کو سہارا دے رہی تھی۔
منی شیش محل ہی اس کا سب کچھ لوٹ کر لے گیا تھا
کتنا خوب صورت تھا اس کا ساتھی، کتنا جاہ و جلال تھا اس میں نور جہاں اور ممتاز محل کی طرح عقلمند خوب صورت اور عظیم۔ مگر وہ اس کے لیے تاج محل نہیں بنا سکا۔

روشنی اسے اندھیروں کے غار میں دھکیل کر بھاگ گئی تھی۔ کسی نئے منی شیش محل کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ مگر روشنی بے قصور تھی۔ وہ کھوکھلے تاریک جسم سے کب تک چپکی رہ سکتی تھی۔ اور وہ سب کچھ رکھنے پر بھی بے بس تھا۔ اسے اپنی ذات سے بھی نفرت سی ہو گئی تھی۔ جس نے اسے شیش اور منی شیش محل عطا کیا تھا۔ وہ اس اندھیرے غار سے نکل کر کھلی فضا میں رہنا چاہتا تھا۔ اور ایک دن اس کی بے بصر آنکھیں پھر چمکنے لگیں۔ وہ مر مر کر جینا نہیں چاہتا تھا۔ اقبال کی میزانِ زندگی میں پورا اترنا چاہتا تھا۔
منی شیش محل کی دیواریں اسے آواز دے رہی تھیں۔
لیکن وہ بہرہ ہو چکا تھا۔ مغل اعظم پر تھوک کر چلا آیا تھا۔ منی شیش محل اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔
چھوٹا سا کم روشن کمرہ منی شیش محل سے زیادہ کشادہ زیادہ دلکش تھا۔ اس کی بوسیدہ دیوار پر صرف ایک آئینہ اٹکا ہوا تھا۔ منی شیش محل میں آئینوں کی کمی نہیں تھی۔ مگر یہاں تو اس کے پاس صرف ایک چھوٹا سا دھندلا آئینہ تھا جس میں اپنی بدلی ہوئی صورت دیکھ کر اسے بڑی خوشی محسوس ہوتی تھی اس کی حس مر چکی تھی۔ اس کا سارا کرب دور ہو چکا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنے ہاتھوں سے احساس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ منی شیش محل عشرت کدہ تھا، وہاں اسے سب کچھ ملتا تھا مگر طمانیت نہیں تھی۔ کرب اس کے وجود پر محیط رہتا تھا۔ یہاں اس نے اسے اذیت ناک کرب کو شکست دے دی تھی۔
آئینہ میں اس کا وجود جذب ہو گیا، اپنے وجود سے بھی وہ فرار رہا تھا۔ اس کی بے جان اور بے حس رگوں میں گرم لہو دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔
" تم کبھی زندہ نہیں ہو گے۔ تم کبھی زندہ نہیں ہو گے۔"
ایک مہیب آواز اس کے دل سے نکل کر اس کے چھوٹے سے کمرے میں گونجی اور بوسیدہ دیوار پر لٹکے ہوئے آئینے میں اس کی بدلی ہوئی ہئیت ابھری۔ اور اچانک جیسے دھماکا ہوا۔ آئینہ چور چور ہو کر اس کے قدموں میں بکھر گیا تھا اس کا احساس پھر جاگ اٹھا تھا۔ وہ کرب جسے وہ بھول گیا تھا۔ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے وجود پر محیط ہو گیا تھا
" چلو نا بہت دیر ہو رہی ہے" —— ایک ساتھ چار مختلف آوازیں مل کر ابھریں۔ " چلو بھی نخرے مت کرو۔ سیٹھ کا پہلا بچہ پیدا ہوا ہے۔"
ڈھول کی ہلکی ہلکی آوازیں اس کے چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔
اور مغل اعظم کی روح فضا میں تحلیل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

● ●

● آج کے اس اذیت ناک مشینی دور میں بنگالی شاعری کی خوب صورت بلی کے گلے میں ریشم کی ڈوری سے گھنٹی باندھ کر جو اُسے گاؤں کے بھولے پن کی جانب لئے چلا آرہا ہے، وہ ودّیا ساگر کالج بیوڑی ضلع بیربھوم (مغربی بنگال) میں انگریزی کا اُستاد ہے کبیرالاسلام جس کے ۲ شعری مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ●——— (ر۔ن)

بنگالی کی تین نظمیں

کبیرالاسلام
رونق نعیم

مچھلی

ہر دل کے گہرے سمندر میں ہے
ایک مچھلی
میں مچھیرا ہوں
اور مجھے اُس کا پتہ معلوم نہیں
پھر بھی دور تک پھیلے ہوئے
گہرے سمندر کے سنسار میں
پھینکتا ہوں جال
معلوم نہیں
کہ کہاں ہے اُس کی محبوب پناہ گاہ
جس کا نام ہے دل
اُس سمندر کے پانی ●●

دوپہر

چاروں اُور بیچ دوپہر میں
کون کس کے تالاب سے
غسل کر کے جا رہا ہے
اتنا سا تو صرف وقت ہے
اِس لئے کاہلی کیسی
اِس بیلا سب چھوڑ چھاڑ کر
اِس گھاٹ میں غوطہ لگاؤ
بیچ دوپہر میں ●●

تمہاری صبح کے لئے

تمہارا سورج تو نکل پڑتا ہے
صبح ہونے سے ذرا پہلے
مُرغ بولے یا نہ بولے
تمہارا سورج تو نکل پڑتا ہے
صبح ہونے سے ذرا پہلے
تمہارے محتاط اور مشغول لمحوں کا پیار
برس پڑتا ہے
فیڈنگ بوتل
اسٹوو
اور فلاسک پر
تب مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم بہت دور کی مخلوق ہو
اور میں باہر کے ہلکے ہلکے اندھیارے میں
ٹہلنا چاہتا ہوں

تمہارے چہرے کے نقوش
مجھے تم سے رشک ہوتا ہے
کہ تم اپنے مُنّے کے ساتھ اپنی زندگی میں
کامیاب بھی ہو اور مکمل بھی
میں تو صرف دُور کا تماشائی ہوں
ویسے "میرا میرا" کہتے ہوئے ڈھل جاتا ہے
میرا سارا دن
"میرا میرا" کے لفظوں سے کھل جاتے ہیں
سب دَروازے
اور اچانک جھلملا سا جاتا ہے
تمہارے لازوال چہرے کے آسمان میں
قطب
اور میں رشک کے بغیر سرک آتا ہوں
پاس والی دوپہر کی جانب
صرف تمہاری صبح کے لئے

اسد زیدی

• ہندی شاعری میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ وہاں ہر روز ایک نئی بحث اور نیا واد شروع ہو جاتا ہے لیکن اُس کا شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اپنی شاعری کو بلندی پر دکھلانے کے لئے ایک ایسی زبان میں بات کہی جاتی ہے جسے 'دیوبانی' کہنا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک مصنوعی اور طلسمی فضا بنائے رکھنا ہی شاعری کی سب سے بڑی خوبی سمجھا جاتا ہے۔ ہندی کے جن نوجوان فنکاروں نے اس طلسمی فضا کا پردہ چاک کیا ہے اُن میں اسد زیدی پیش پیش ہیں۔ وہ اپنے محسوسات کو مصنوعی دھندلکوں میں چھپانا پسند نہیں کرتے بلکہ اپنی بات کو صاف اور مختصر الفاظ میں بیان کرنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

اسد زیدی ایک ذہین شاعر ہی نہیں، ایک کہانی کار اور نقاد بھی ہے۔ اُس کا ایک مضمون 'دُنیا کا سکندر نامہ' ادبی حلقوں میں توجہ سے پڑھا گیا ہے۔

اسد زیدی کی سیلانی طبیعت انھیں ادھر سے یوپی لے آئی ہے یہاں وہ ایک ہندی رسالے سے منسلک ہیں۔ • ——— خلیل تنویر

پانچ نظمیں

اسد زیدی

خلیل تنویر

نظم ۔ ۱

حالانکہ ———

گذرا ہوں

کئی بار

پھر بھی میں نہیں جانتا

کیا ہوتا ہے عورت کا جسم

ابھی میں ———

ماں سے آگے

کوئی پہچان نہیں بنا پایا ہوں

• •

نظم ۔ ۲

بہت بولا کرتی ہے

جنگلوں کی ہریالی

جب تک کہ آپ

اُس کے پنکھ اُجاڑ نہ دیں

اور پھر موسم ———

چُپ کے سے

بہت چپکے سے

گذر جاتا ہے

• •

اسد زیدی
خلیل تنویر

نظم ۔ ۳

بڑے عجیب دن آئے ہیں کہ لوگ
عجیب پوشاکیں پہنے ہوئے
اجنبیت سے گذر جاتے ہیں
ہر سڑک ——
کسی نہ کسی نمائش گاہ سے جا ملتی ہے
تماش گیر روتے ہیں

حیرت ہے ——
ہر چیز پکڑنے سے نکلی جا رہی ہے
دنیا تنگ اور تنگ ہوتی جا رہی ہے
بھاگیں کہ دوڑیں
چیخیں کہ روئیں ...
پاگلوں کے مانند ہنسیں
اسی طرح سب چلتا رہا تو
بہت جلد ہی یہ شہر اُجڑ جائے گا
بڑے عجیب دن آئے ہیں
سب علاج کے لیے نکلے ہیں
کسی کو کسی کا درد معلوم نہیں
کوئی کچھ بتانا نہیں چاہتا

● ●

نظم ۔ ۴

تمہاری بیساکھیوں کے بغیر
رگڑتا ہوں
تم دیکھتے رہو
اور مسکراتے ہو
میں چلتا ہوں ۔ روتا ہوں
ہنستا ہوں ۔ اور چلتا ہوں
تمہارے لیے میرے پاس
صرف ایک انکار ہے
اب نہیں میرے لئے ممکن
فانوس بن کر لٹکے رہنا
گو تمہارا ڈرائنگ روم
کتنا ہی شاندار
کتنا ہی مہذب
اور شاہی ہو
میں تمہارے طلسم کی قید سے
انکار کرتا ہوں

● ●

نظم ۔ ۵

کتنا بھلا لگتا تھا جینا
جب صاف ارادوں کو لے کر
چلتے تھے ——
دنیا کے سارے کاروبار
سپاٹ تھی سمے کی تختی
جس پر ایک بلّی دوڑتی چلی گئی
آر پار
آخر کون سے پرلوبھن کے لئے
انتظار اپنی حد پار کر جاتا ہے
اور جوالا مکھی جنم نہیں لیتا

● ●

شبّیر احمد

سُوکھی ٹھٹھری ندی

میں نے اپنے تمام دوستوں کو بہت ایمانداری کے ساتھ بتا دیا تھا کہ اب میں کہانی نہیں لکھ سکتا کہ میں نے اپنی تخلیق کے سوتے کو خشک ہو جانے پر آمادہ کر لیا ہے۔ سوکھی ٹھٹھری خشک ندی کھیتوں میں لہلہاتے ہوئے گیہوں کے پودوں کو ایک فریب مسلسل کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔ گویہ فریب بھی زندگی کو کبھی کبھی خوب صورت بنا دیتا ہے لیکن میں نے طلسم فریب کے تہ دار آئینے کو زور سے سمنٹیڈ فلور پر دے مارا تھا کہ اب میں اس کے سہارے زندگی کو خوب صورت بنانا نہیں چاہتا تھا۔ آئینہ ٹوٹ گیا اور ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔ اور اسی وقت سیّی افسانہ نگار حیات آگیا۔

" ان ٹوٹے بکھرے ریزوں کو سمیٹ کر اپنے دامن میں رکھ لو یہ بڑے قیمتی ریزے ہیں۔ "

" اب یہ کثیف ریزے کسی کام کے نہیں رہے۔ "

" انعکاس کے لئے کثافت تو ضروری چیز ہے۔ "

" مگر یہ اب اپنا جوہر کھو چکے ہیں۔ "

میرے پیارے سیّی افسانہ نگار حیات! میری فکر اور تخیل کا شیش محل چور چور ہو چکا ہے۔ ہاں! تم ٹھیک ہو کہ لطیف احساسات کی کہانیاں لکھتے ہو۔ خلاء کو اپنی گرفت میں لینے کی کوششوں میں سرگرداں ہو۔ لکھتے جاؤ، لکھتے جاؤ ـــــ خوب لکھو، لیکن سنو! ہو سکے تو میری بات مان لو۔ تم بھی لکھنا چھوڑ دو کہ ایک دن تمہاری تخلیق کا سوتا بھی خشک ہو جائے گا۔ اور تمہاری پرواز کا آسمان محدود، اتنا محدود کہ تم پرواز کے لئے پہلا ہی پر مارو گے کہ تمہارے پر آسمان سے ٹکرا جائیں گے۔ اور تم اوندھے منھ زمین پر گر کر لہولہان ہو جاؤ گے۔ کوئی پوچھے گا بھی نہیں کہ تم کیوں گرے، کیوں لہولہان ہوئے۔ سورج کی بے لوث خدمتوں کا کس نے اعتراف کیا ہے۔ سورج اپنی کرنیں سمیٹ لے تو؟ تم بھی لکھنا چھوڑ دو۔ آخر کب تک اپنی لانبی لانبی انگلیوں کو فگار کرتے رہو گے۔ یہ کیوں سوچتے ہو کہ تمہیں کہانی لکھنا ہے۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تمہاری آنکھیں دھنس گئی ہیں۔ گال پچک گئے ہیں۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے۔ کب تک ان تمام آرزوؤں کا جن کا تعلق اور بھرم تم سے ہے، قتل کرتے رہو گے۔ ہو سکے تو تم سوچو کہ جب تم جاڑے کی سرد رات میں شہر کی سڑکوں اور گلیوں کا بے مقصد چکر مار کر اپنے گھر لوٹتے ہو تو تمہارے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے ہیں۔ اس رات کا واقعہ یاد ہے نا! جب تم

لڑکھڑا کر گرنے لگے تھے تو میں نے سنبھال لیا تھا۔

" میں اپنے دل کے اندر داخل اور خارج ہونے والے ایک ایک قطرۂ خون کو محسوس کرتا ہوں۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنے جسم کے تمام کپڑوں کو اتار کر پھینک دوں۔ میرے اندر اک آگ سی لگی ہوئی ہے۔"

" سنو میاں! گیارہ ٹیکسی ڈھائی بجے شب میں جائے گی اور ابھی ایک ہی بجے ہیں۔ تم گھر چلے جاؤ اور پھر پیٹ کھالو، پھر تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

—— میں نے تم سے بہت ہی سچی بات کہہ دی تھی کہ میں جانتا تھا کہ سوکھی ٹھٹھری خشک ندی کے چاروں طرف لہلہاتے ہوئے گیہوں کے پودے، اب تک ندی سے توقع لگائے ہوئے تھے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ندی اب ایک قطرہ بھی پانی کا نہیں دے سکے گی ——

ندی اور گیہوں کے کھیتوں کے درمیان بیٹھا ہوا اپاہج نہ جانے کب سے آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھا ——

اور ہسپتال کے بند دروازے کے باہر ضرورت مندوں کی ایک لمبی قطار اب تک کھڑی ہوئی تھی جب کہ ڈاکٹر نہ جانے کب اپنی خوب صورت سبک رفتار کار میں بیٹھ کر جاچکا تھا۔ آخر کب تک یہ لوگ یوں ہی کھڑے رہیں گے، گھنٹہ، دو گھنٹہ اور بس پھر تھک ہار کر لوٹ جائیں گے۔ اور ہوا بھی یہی۔ وہ سب کے سب لوٹ گئے تھے۔ آسمان پر اٹھی ہوئی اپاہج کی آنکھیں بھی زمین کی طرف لوٹ آئی تھیں۔ سورج نے اپنی کرنوں کو جب سمیٹ لیا تو اس نے بھی اپنی بیساکھی سنبھالی اور تاریکی کے سمندر میں ڈوب گیا کہ آسمان سے نور کی بارش نہیں ہوئی تھی اور سورج نے اپنی کرنوں کو سمیٹ لیا تھا۔ چاروں طرف —— گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتے —— ایک قدم چلنا دشوار —— مگر کچھ لوگ اس اندھیری رات میں بھی اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے کہ ان کی انگلیوں کی پوروں سے روشنیاں نکل رہی تھیں کہ یہ لوگ فاران کی چوٹی پر گونجنے والی آواز کی حقیقت سے واقف تھے۔ بقیہ تمام لوگ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ ہر طرف سے ایک ہی آواز بلند ہو رہی تھی۔

روشنی —— !

روشنی —— !!

روشنی —— !!!

مگر اندھیرا ان کا مقدر بننے والا ہے کہ ان لوگوں نے سورج کی بے لوث خدمات کا آج تک اعتراف نہیں کیا۔

سنو میاں جیات! میرے عزیز بھائی، اب تم کبھی مجھ سے کہانی لکھنے کی فرمائش نہ کرنا کہ آج تک کوئی داد شوق نہیں دے سکا۔ زلف گیتی کے سنوارنے والوں کو اتنی فرصت ہی کہاں ہے۔ زرد دھوئیں کے شہر میں رہنے والے لوگ صرف مشینوں کی گڑگڑاہٹ سن سکتے ہیں۔ ان کی آنکھیں زرد دھواں اگلنے والی مشینوں کو دیکھتی رہتی ہیں اور وہ سب کے سب اسی طرف دوڑتے رہتے ہیں۔ اور شاید اسی لئے میں نے اپنی تخلیق کے سوتے کو خشک ہوجانے کا حکم دے دیا ہے۔ اس آئینہ ساز سے بڑا احمق کون ہوگا جس کے آئینہ کو دیکھنے والا کوئی نہیں۔ صرف آئینہ کی تخلیق ہی تو سب کچھ نہیں۔ میں نے بھی اپنے سورج کی کرنوں کو سمیٹ لیا ہے اور اس کے ایک ایک ذرے کو اپنے دل کے نہاں خانے میں رکھ کر مقفل کر دیا ہے کہ میرے اندر بڑی گہری تاریکی ہے۔ فکر اور تخیل کے تمام دروازوں کو بند کر دیا ہے۔ احساسات کے دریچوں اور روزنوں پر پردے ڈال دئے ہیں کہ روشنی جسم کی قید سے باہر نہ جا سکے۔ باہر گھپ اندھیرا۔ ایک قدم چلنا دشوار —— اس کے باوجود میاں جیات! بے تکلف برطرف، اب تم بھی اپنے گھر چلے جاؤ —— میں جانتا ہوں تم گھپ اندھیرے میں بھی

قرجاری رکھ سکوگے کہ تمہاری انگلیوں کی پوروں سے
الی روشنیاں تمہاری رہبری کریں گی۔ کہ تم بھی فاران کی
ہ گونجنے والی آواز کی حقیقت سے آشنا ہو۔ آؤ۔ میرے
، آؤ ـــــ صدر دروازہ تک تم کو رخصت
وں ـــــ اچھا شب بخیر !

" کھٹ ! کھٹ ، کھٹ "
" کون ـــــ ؟ "
" مقصود ــ "
" کیا ہے ـ ؟ "
" آپ کو زعفرانی چائے پلانی چاہتا ہوں ـ "
" مگر تم تو جیل چلے گئے تھے ـ ؟ "
" ہاں ! مگر میں نے آپ سے کہا تھا نا صاحب !
وہ مغل پٹھان کب تک جیل میں کھلاتا رہے گا۔ ایک روز
پس آ کر آپ کو زعفرانی چائے ضرور پلواؤں گا۔"
ب تم لوٹ جاؤ۔ میں زعفرانی چائے نہیں پیتا
ہنا ـ اب یہاں کبھی نہیں آنا "
دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ اور میں نے
وس کیا کہ ایک بار پھر میرے کمرے میں زعفرانی چائے کی بو
پھیل کر رہ گئی ہے ـــــــ
کھٹ ، کھٹ ، کھٹ ـ
" کون ــ ؟ "
" میں نذیر ہوں۔ ڈولی کی ماں نے پھر مجھے مارا ہے۔"
" کیوں ــ ؟ ــــ "
" میں اس کو " چھوٹی بیگم " جو نہیں کہتا ـ "
تو میں کیا کروں۔ ڈولی کے والد حمید صاحب سے اس کی
شکایت کرو۔ یا پھر ڈولی کو چھوٹی بیگم کہنا شروع کر دو۔ تم

اس حقیقت کو کب تک جھٹلاتے رہوگے کہ نوکرانی کا بیٹا
بھی نوکر ہی ہوتا ہے اور یہ کہ اس کی کوئی انا نہیں ہوتی
تم فوراً چلے جاؤ ــــــ
اور پھر کئی قدموں کی ملی جلی چاپیں۔
" دروازہ کھولئے ــــ میں بڑے میاں ہوں۔"
" میں چھوٹی بہو ہوں ـ "
" میں بنو میاں ہوں ـ "
" میں جھڑو میاں ہوں ـ "
" دروازہ کھولئے ــــــ دروازہ کھولئے
دروازہ کھولئے ہم سب تاریکی میں بھٹک رہے ہیں۔"
دروازہ کھولئے ! دروازہ کھولئے !! دروازہ
کھولئے !!!
چیختے رہو۔ آخر کب تک چیخوگے۔ تھک ہار کر
لوٹ جاؤگے کہ میں نے دیکھا ہے کہ آسمان پر اٹکی ہوئی
اپاہج کی آنکھیں زمین پر لوٹ آئی تھیں، اور وہ اپنی
بیساکھی سنبھال کر تاریکی کے سیلاب میں ڈوب گیا تھا ــ
اور ہسپتال کے بند دروازے پر کھڑی ہوئی ضرورت مندوں
کی قطار بھی تھک ہار کر لوٹ گئی تھی۔ تم بھی لوٹ جاؤگے
باہر اب تک شور ہو رہا تھا۔ احساس کے دریچوں
اور روزنوں کے پردے سرکا سرکا کر کچھ لوگ اندر جھانک
رہے تھے۔ پھر وہ لوگ کود کود کر کمرے میں داخل ہو گئے
تھے ـــــــ
" خبردار ! میں تم سب کی ٹانگیں توڑ دوں گا، نہیں
تو واپس جاؤ ــ "
مگر واپس جانے کو کوئی بھی تیار نہیں ہوا۔ بلکہ ان
لوگوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان سب کی آنکھیں
ڈبڈبائی ہوئی تھیں ــــــ
میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں (بقیہ صـــ ۴۷ پر)

باقر مہدی

غزل

[قبلہ جمیل مظہری کی خدمت میں !]

قریبِ ماہ سے آگے نکل رہے ہیں لوگ!
خلا میں ڈوب کے چلنا ہے چل رہے ہیں لوگ

بغاوتوں کی نئی مشعلیں جلائیں گے
ابھی تو زخم کے شعلوں میں جل رہے ہیں لوگ

امیجری سے مزاجِ غزل بدل دیں گے
ابھی تو رنگ ، لکیریں بدل رہے ہیں لوگ

نہ جانے کیسی امیدوں کی راکھ جلتی ہے
چھپا ہے برف میں سورج پگھل رہے ہیں لوگ

برس کے خوف کے بادل کھلے تو کیا دیکھا
کہ خار خار کو پی پی کے پل رہے ہیں لوگ!

کبھی تو آئیں گی شب خوں کی ساعتیں باقر
شفق کے دشت میں کب سے ٹہل رہے ہیں لوگ

• •

حرمت الاکرام

غزل

اک بات ہوس کے ماروں سے اپنے اسلوب میں کہنی تھی
خود ہم نے پاؤں سمیٹ لئے، چادر تو نہ ایسی چھوٹی تھی

پلکیں جھپکیں تو نہ اُٹھ پائیں، ہم دادِ نظارہ کیا دیتے
باقی ہے فقط یہ کہنے کو، سج دھج کے قیامت آئی تھی

ناپ اور ہے فاصلوں کی لیکن کیا تھاہ سمندر کی پائیں
ملتی تھی گہرائی اور بن کی، میری خاموشی گہری تھی

خود ہی پانی خود ہی شعلہ، میں کیا کیا تھا، یہ کس کو خبر
آنکھوں سے نیر برستا تھا، ہونٹوں سے آگ برستی تھی

یہ نگر نگر جنگل جنگل بھٹکی لیکن سُکھ پاتی کیا
ٹھوکر پہ نہ ٹھوکر کھاتی کیوں اُمید جنم کی اندھی تھی

ساون کی گھٹاؤں سی شیتل، پھاگن کی ہواؤں سی چنچل
وہ دُنیا بھی کیا دُنیا تھی جو ساتھ ہمارے کھیلی تھی

اک چنگاری تا دیر اُڑا کی رات، فضاؤں کے بن میں
دھرتی پہ اُترتے ڈرتی تھی، جانے کس دیس کی ٹھہری تھی

میں دُنیا کو سمجھا نہ سکا : دنیا نے نہ میری ایک سُنی
میں اس کے حق میں گونگا تھا وہ میرے حق میں بہری تھی

یادوں کے کھنڈر کی ویرانی اک دستک سے ہے کتنی خفا
دن ڈوبتے ہی جا سوئی، کچی نیند سے صبح کو جاگی تھی

میں نے تو بُرا ہی چاہا تھا، اچھا ہے کہ اس نے سُکھ پایا
پانی جو ملا، چُپ ہو بیٹھی۔ یہ آگ بھی کتنی پیاسی تھی

خوش فہم ہو تم یہ کیا جانو : غاروں میں ایک جنم بیتا
اس جگمگ چاند کی بڑھیا چپکے چپکے کل شب کہتی تھی

حرمت یہ باغ کی تتلی ہے سب دوڑتے ہیں جس کے پیچھے !
ہم خوش ہیں پھونک کے جس کی چِتا، وہ دنیا گھر کی ناری تھی

عزیز قیسی

غزل

سرِ شام جلتے جسموں کا گاڑھا دھواں ہے شہر
مرگھٹ کہاں ہے کوئی بتاؤ کہاں ہے شہر

مرجاد ننگ و نام و نسب پوچھتا نہیں
مُردوں کے سلسلے میں بہت مہرباں ہے شہر

فٹ پاتھ پہ جو لاش پڑی ہے اسی کی ہے
جس گاؤں کو یقیں تھا کہ روزی رساں ہے شہر

ہو دیکھنا تو آئیے سڑکوں کی دھوپ میں
ان سرد سائبانوں کے نیچے کہاں ہے شہر

لٹکا ہوا ٹرین کے ڈبّوں سے صبح و شام
لگتا ہے اپنی موت کی جانب رواں ہے شہر

رہ رہ کے چیخ اُٹھتے ہیں سنّاٹے رات کو
جنگل چھپے ہوئے ہیں وہیں پر جہاں ہے شہر

بھونچال آتے رہتے ہیں اور ٹوٹتا نہیں
ہم جیسے مفلسوں کی طرح سخت جاں ہے شہر

●●

ابواللیث جاوید

آدھا چاند، پورا چاند

قدموں کے چہرے راستوں پر پڑے کراہ رہے تھے اور راستوں کی مانگ میں زندگی کی تلخیوں کا زنگ پھیلتا جا رہا تھا۔ دُور بہت دُور ایک چیل چٹانوں کے آس پاس منڈلا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اب ٹکرائی، اب ٹکرائی مگر ارادوں کا پتھر دم توڑتی ہوئی خواہشات کے سر سے کبھی نہیں ٹکرایا۔ وہ ٹکٹکی باندھے وقت کا چہرہ گھورتی رہی، جس پر تہ بہ تہ سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان سلوٹوں کی دراروں میں ارمانوں کی چتائیں جل رہی تھیں اور گدلا گدلا دبیز دھواں پھیلتا جا رہا تھا، نہایت کثیف اور بدبودار۔ جیسے واقعی کہیں شمشان میں کوئی لاش جل رہی ہو۔ اُس نے ان ارادوں کی کوکھ میں جھانک کر دیکھا تھا مگر ہر بار اُسے ایک کیڑا سا کلبلاتا نظر آیا تھا۔ ماضی کی صلیب پر یادوں کی تڑپتی لاشیں جھول رہی تھیں اور سُرخ سُرخ لہو، ٹپاٹپ ذہن کے کھردرے فرش پر چُو رہا تھا۔ ان قطروں سے بکھر رہی تھیں روشن لمحات کی تاریکیاں۔ تاریکیوں کے سینے میں دبے ہوئے گنہگار دھبے زور زور سے پکار اُٹھتے تھے۔ اور اس کارواں رُواں کھڑا ہو جاتا تھا۔

اور اُس کا رواں رواں اُس وقت بھی کھڑا ہوا تھا جب وہ اپنی عمر کی آنکھ مچولی کھیلتی گھڑیوں کی دل نواز آوازیں سُن رہی تھی اور بچپن کی بھولی بھالی باتیں اُس سے الوداعی سلام کہہ رہی تھیں اور جوانی کی مست مست اُمنگیں اُسے گلے لگانے کے لئے بازو پھیلائے اُس کی طرف لپک رہی تھیں۔ وہ گھڑیاں کتنی خطرناک تھیں اُس کے لئے! نہ لڑکپن نہ جوانی، نہ اندھیرا نہ اُجالا، جیسے تھوڑا تھوڑا دن، تھوڑی تھوڑی رات، تھوڑی تھوڑی خوشیاں، تھوڑا تھوڑا غم ــــ! یہ امتزاج تھا دو مختلف عمروں کا، یہ سنگم تھا دو مختلف سمتوں میں بہتی ہوئی دھاروں کا ــــ یہ لمحہ تھا ادراک کی غیر پختگی کا، یہ وقت تھا بہاؤ کا، روانی کا، پھسلن کا اور واقعی پھسلنے میں، گرنے میں، سنبھلنے میں اُس وقت نہ جانے کیوں اتنی لذّت تھی، اتنی مٹھاس تھی، اتنی شیرینی تھی۔ اور جب موسم انگڑائیاں لیتا اور فضاؤں میں گُدگُدیاں سمو جاتیں تو اُس کا انگ انگ تھکن محسوس کرتا، کسک محسوس کرتا، اور آنکھوں میں بے قراری سمو جاتی۔ اُس کی آنکھیں کچھ ڈھونڈتیں۔ کوئی سُہانا سا درد، کوئی انجانا سا خواب!!

"اُف ہائے ــــ! مَیں مری ــــ!!"

درد کی شدت سے اُس کے مُنہ سے نکل گیا۔ سلائی مشین کی سوئی اس کی انگلی میں چُبھ گئی تھی اور خون کی دھار بہ نکلی تھی۔ قریب ہی بیٹھے ہوئے ساجد نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑا

اور خون رستی ہوئی اُنگلی کو جلدی سے اپنے مُنہ میں لے کر چوسنے لگا۔ اس کا سارا جسم ایک عجیب سی کپکپاہٹ میں ڈوب گیا۔ کسی جوان ہاتھوں کا یہ لمس اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ جس میں ایک انجانا سا کیف تھا، اَن دیکھا سا مزہ تھا۔ اور زخم کے اس درد میں اُسے ایک انوکھی سی لذّت مل رہی تھی۔ ساجد دیر تک اُس کے ہاتھ کو سہلاتا رہا اور وہ خاموش بیٹھی ساجد کو غور سے دیکھتی رہی اور درد کا شیریں پن محسوس کرتی رہی۔ فرحت کے آتے ہی ساجد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور بولا — "دیکھو آپی — ان کی اُنگلی بُری طرح گھائل ہوگئی ہے ذرا فرسٹ ایڈ کر دو —"

"تم نے تو فرسٹ ایڈ کر ہی دی۔ اب اور کیا فرسٹ ایڈ ہونی ہے — !" فرحت مسکراتی رہی

"جی — وہ — میں — تو —" ساجد ہکلانے لگا۔

"ہاں — ہاں — ! کچھ کہو بھی تو سہی — !!"

وہ گھبرایا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور فرحت مسکراتی ہوئی شازی کی طرف دیکھتی رہی جو نظریں نیچی کئے ہوئے اپنی زخمی انگلی پر دوپٹے کے ایک سرے کو لپیٹ رہی تھی۔

شازی کی اُنگلی پر ساجد کے بوسہ کا لمس اُبھرتا رہا۔ زخم پر ہلکے ہلکے پھاہے کی طرح، کلی کی پنکھڑیوں پر بھنورے کے لمس کی طرح اور اس کا احساس دوشیزگی کی بند کلی کی طرح اُبھرتا رہا، کھلتا رہا، گویا ماہِ نو کا باریک سا ٹکڑا آسمان کے مغربی کنارے پر اُبھر رہا ہو، ڈوب رہا ہو، دیکھنے والوں کی نظروں سے کبھی اوجھل، کبھی نمایاں۔ اُس نے اپنے آپ میں ایک کھلبلی سی محسوس کی، ایک بے چینی سی محسوس کی۔ ایسی بے چینی جو پہلے تو کبھی نہ تھی۔ احساس کی آندھی چلتی رہی اور شباب کی موجوں میں مد و جزر آتا رہا۔ کنارے مدہوش ہوتے رہے اور آکاش اور دھرتی کی بلندی و پستی ایک دوسرے کو دعوتِ ہم آغوشی دیتی رہی۔ نظروں کی جنت بستی رہی اور خیالوں کا ابلیس شجرِ ممنوعہ کی طرف لے جاتا رہا۔ لے جاتا رہا اور قدم ڈگمگاتے رہے۔ ایک پُر شور سنّاٹا دل و دماغ پر طاری رہا اور شازی اسی کیفیت میں اپنے بستر پر آ گری اور دیر تک پڑی خیالوں کے ریگزاروں پر برہنہ پا بھٹکتی رہی۔ اندھیرے میں خیالوں کی چمگادڑیں دیواروں سے ٹکراتی رہیں۔ ہوائیں چلتی رہیں اور اُس کے لاشعور پر ایک لطیف مردانہ لمس حاوی رہا۔ سارے جسم کی پہاڑی ندی میں طغیانی آتی رہی۔ اور دور جنگلوں کا شور سنّاتا رہا۔ برساتی چشمے اُبلتے رہے اور وہ اس بوندا باندی میں اپنا چہرہ بھگوتی رہی ساجد کے ہاتھوں کی گرفت اور اُنگلی پر بوسہ کا نقش اُسے بھٹکاتا رہا۔ اس کے احساس کو جوان کرتا رہا، اس کی خواہشوں کو جگاتا رہا۔

اور پھر شازی پر بہار کی مہربانی ہوگئی۔ پھول میں خوشبو سما گئی اور وہ گل گلزار ہوتی چلی گئی۔ وہ ہواؤں کے دوش پر اُڑتی رہی اور خوشبو چمن چمن پھیلتی رہی۔ اُس کی نظریں ٹکراتی رہیں آئینوں سے، آئینوں میں چھپے ہوئے چہروں سے، اُن چہروں سے جن میں پیار کی لکیریں تھیں۔ خون کی رنگت تھی اور زندگی کی نشانیاں تھیں۔ اُسے نشانیوں کی خواہش تھی اور اس کے دل میں ایک تڑپ تھی سیمابی سی، بالکل شہابی سی۔ اُبلتے ہوئے لاوا جیسی گرمی تھی، تن بدن میں، اور اس گرمی میں اس کا دل و دماغ جھلس رہا تھا، فکر و نظر، لمحہ و ساعت اور ساری کی ساری گھڑیاں، رات کی تنہائیاں، دن کے ہنگامے، شام کا سیندور اور صبح کا سہاگ اور سہاگ کا خیال آتے ہی ایک خوشبو سی اُڑ جاتی تھی ارمانوں کی، ولولوں کی، حوصلوں کی اور کسک سی ہونے لگتی تھی دل میں، آنکھوں میں بے چین سا سرور دوڑ جاتا تھا اور کسی اجنبی سے قدموں کی آہٹ کا سنگیت فضاؤں میں جاگ جاتا تھا اور زبان دھیرے

دھیرے، ہولے ہولے کسی نام کی رٹ لگانے لگتی تھی۔ مگر اُسے یقین نہیں آیا تھا زبان پر، دل پر، کانوں پر، کیوں کہ جب عمر ایسی متوالی ہو جاتی ہے، تو دھوکا دینے لگتا ہے سب کچھ —— اپنا بھی، پرایا بھی ۔ مگر وہ نام جو خود بخود لبوں پر مچلا تھا اُس میں اپنائیت تھی، پکار تھی، کشش تھی دعوت تھی اور ایک اشارہ تھا۔ دل کا اور ارمانوں کا ہاتھ بڑھ گیا تھا اُس جانب، جس جانب نظروں کی جنت تھی، تکمیل تھی ارمانوں کی۔

"سنو — !"

"جی — ! جی —— !!"

"یہ جی جی کیا — ؟ بیٹھو یہاں — !"

"فرحت آپی —— !"

"فرحت آپی نہیں ۔ میں ہوں ساجد ۔ تمہارا زخم؟"

اور ہاتھ پھر ساجد کے قبضہ میں تھا۔ اور وہ انگلی کا زخم تو کب کا بھر چکا تھا، پر زخم تیار تھا ایک نیا، بالکل شگوفہ جیسا، جس میں چبھن بھی تھی تو بڑی میٹھی میٹھی، درد بھی تھا تو بڑا ہی لطیف سا۔ شازی کھوئی رہی خوابوں میں، میٹھے میٹھے سپنوں میں، اس کا شہزادہ بالکل اُس کے سامنے تھا، محوِ گفتگو جس کی باتیں کانوں میں رس گھولتی رہیں، جس کی آواز کا جادو اس پر چلتا رہا، چلتا رہا اور بالآخر ساجد کی آغوش میں اُس کا سارا وجود آکر ٹک گیا تھا اور ناریل کی لمبی باہوں میں اٹکا ہوا چاند آسمان کی طرف دیکھتا رہا، جیسے اُس بے رحم سے وہ کوئی مدد مانگ رہا ہو، بالکل مجبور اور لاچار سا۔ ابابیل کا جھنڈ بیلاؤں سے باتیں کرتا رہا اور ویرانوں کی آنکھیں شازی کے بدن کی طرح کھلی رہیں، بالکل آدھی آدھی سی اور ندیوں کا شور اُس کے بکھرے جذبات کی طرح بڑھتا رہا۔ آنکھوں کے آنگن میں برہنگی کا شباب نچلا اور شازی کے شباب کے بچپن سے نبرد آزما ہوتا چلا گیا۔ معصوم بچپن شباب کے گرم جھکڑ میں جھلس گیا اور بستر پر مچلتی آرزوؤں کا ستایا ہوا گورا بدن سسکیاں لے رہا تھا جیسے آدھا چاند غروب ہو رہا ہو۔

کمرے کی کھڑکی سے سمندر کی لہریں صاف صاف دکھائی دے رہی تھیں اور صبح کے بھولے پن کو سمندر کا آئینہ اس کے رات کی داستان دکھاتا رہا۔ یہ کھلے کھلے سے گیسو، یہ اڑی اڑی اُڑی سی رنگت اور رنگت میں مدوجزر کی بلندی اور میرین ڈرائیو کے سمندری فٹ پاتھ پر قدموں کی آہیں اُبھرتی رہی تھیں۔ اُن آہوں میں گم تھیں وقت کی مایوسیاں، کرینا کیاں دور سمندری سطح پر بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے۔ ایک پرندہ نے چونچ ماری تھی اور مسرتوں کے ایک قیمتی لمحہ کو چُرا لیا تھا۔ شازی کو جیسے چوٹ سی لگی تھی۔ یہ چوٹ لگنے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ وہاں سے اُٹھی تھی اور باتھ روم میں سما گئی تھی اور پہلی بار اُسے باتھ روم آپریشن تھیٹر جیسا معلوم ہوا تھا۔

جون کی لہکتی دوپہر میں ٹھک ٹھک کی صدائیں فضا کی دیواروں سے سر ٹکراتی رہیں اور کوئی کواڑ چرمرایا تھا اور شازی اس کے اندر سما گئی تھی۔ دیوار سے پیٹھ لگائے وہ کھڑی رہی ساجد کے ہاتھوں کا لطیف لمس اُس کے کنوارے جسم کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا رہا، ہاتھ کا سایہ اُس کے بدن پر تیرتا رہا، تھرتھراتا رہا، مچلتا رہا۔ اب ہاتھوں کے قبضہ میں بدنامی کا گول مٹول چہرہ تھا۔ نہایت سبک سبک سا اور جنوں کے کتے اُچھلتے رہے کودتے رہے اور آخر میں اُن کی رسّی اس زور سے ٹوٹی کہ ہانپتے ہوئے صحرا کی ریت پر اُن کی ناپاک رال کی بوندیں جذب ہوتی چلی گئیں۔ پیاسی دھرتی پر بارش اور پھر بارش کے بعد نکھرا ہوا پورا چاند ساجد کے بستر پر مسکرا رہا تھا۔ وہی کل کا آدھا چاند آج بالکل پورا پورا سا تھا، مگر چاند کے جسم پر ایک دھبہ لگ گیا تھا اور جب جب چودھویں کا چاند نمودار ہوا، سمندر میں جوار بھاٹا آتا رہا اور شازی کے جسم کی سمندری سطح پر کوئی پرندہ اپنی ٹھونگیں مار کر مسرتوں کا لمحہ چُراتا رہا

جوہو بیچ کی گیلی ریت پر خاموشیوں کی زبان نے شازی کو جو لذت دی تھی وہ شاید انوکھی تھی۔ لہریں اپنے کو دور تک پھیلا کرتی رہی تھیں اور دور کوئی تارا ٹوٹ کر سمندر کی لہروں میں گم ہو گیا تھا۔ دو شیزہ سی چاندنی مسکراتی رہی تھی مگر شہر کی روشنی نے اس کی مسکراہٹوں کو نگل لیا تھا۔ گیٹ وے آف انڈیا پر ہپیوں کا ہجوم تھا۔ تہذیب کی انتہائی بلندیاں اُن کے ڈھنگ پر ماتم کناں تھیں اور ساجد کی بانہوں میں مونا کا وجود کسمسا رہا تھا۔ شازی جب سامنے سے اُسے گھورتے ہوئے گذری تو ساجد نا آشنائی کا لبادہ اوڑھے تہذیب کی تابانی سے اپنی آنکھیں پھوڑتا گذر گیا اور شازی کی آنکھوں میں اندھیرے گھستے چلے گئے۔ اندھیروں میں اُجالوں کا بسیرا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر مونا لیزا کی مسکراہٹ فلورا فاؤنٹین کے خوب صورت فٹ پاتھ پر جب اُس نے سیلپنگ پلز خریدنی چاہیں تو رات کا طلسم پاش پاش ہو چکا تھا اور کبھی نہ ٹھکرا دینے والی صبح کا سحر انگیز خیال تصور میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔ سمندر کے سینے پر اُبھرتا ہوا حاجی علی کا مزار روشنی کا مینار معلوم ہو رہا تھا اور شازی اندھیروں سے نکل کر روشنی کے سائے میں آ چکی تھی۔ پانی زیادہ نہیں بڑھ پایا تھا مگر راستے پانی کی فریادوں میں گم ہو گئے تھے۔ رات کا عکس پانی کی پیشانی پر لہرا رہا تھا۔ ایسے راستوں پر بھی ہندوستان بھیک مانگ رہا تھا۔ سامنے نارد دیو کی ایر کنڈیشنڈ مارکیٹ کھڑکیاں پیٹ رہی تھی۔ ڈوب مرنے کے لئے سمندر دعوت دے رہا تھا۔ مگر کوئی قدم آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ ریس کورس کے میدان میں گھوڑوں کی دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ اور ہر گھوڑے کا تعاقب ایسی نظریں کر رہی تھیں جو ہمیشہ بلندیوں پر ہی رہتی ہیں۔ قدموں سے کون کیڑا کچلا گیا، کون جاندار روندا گیا اس سے بالکل بے نیاز، بے خبر، بے پروا۔ ان نظروں کو بلندیوں کی معراج انہیں جانداروں نے عطا کی ہے جن کے مقدر میں خاک و خشت، افلاس و ناداری ہے

دور ایک آواز اُبھری تھی۔

"یہ جو محبت ہے اُس کا ہے کام
محبوب کا جو بس لیتے ہوئے نام
مر جائے
مٹ جائے
ہو جائے بدنام ..... "

کٹی پتنگ کو سہارا ابھی مل گیا تھا مگر شازی دوراہے پر کھڑی تھی اور کارواں گذر گیا تھا، اس کا غبار فضا کو گدلا کر رہا تھا۔ سڑک بیوہ کی مانگ کی طرح سونی تھی مگر اُس کے دل میں بے پناہ ہنگامہ برپا تھا۔ راہیں مسدود تھیں اور منزلیں دھندلکے میں گم۔ اُبھرے پیٹ والی عورت نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو زندگی محسوس ہوئی۔ یہ زندگیاں کبھی سارے ملک کا مسئلہ بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ دو لاکھ زندگیوں کا سوال تھا۔ اگر حملے کئے بھی جائیں تو عدم و وجود کی درمیانی مدت پر موت حاوی ہو جائے یہ کوئی ضروری بھی تو نہیں۔ نازی کیمپوں کی داستانیں، بنگلہ دیش کی انقلابی دھرتی پر دہرائی گئی تھیں۔ اور انسانیت ننگ آ کر چہرہ پر شیطانیت کا چہرہ چڑھا لیا تھا۔ بھائی نے بہن اور باپ نے بیٹی جیسے پاک رشتوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اب اس دھرتی پر باقی ہی کیا رہ گیا تھا۔

سورج کا آدھا جسم سمندر کے پانی میں ڈوب چکا تھا اور پانی کی مضطرب سطحوں پر سنہری کرنوں کا جال پھیلتا جا رہا تھا۔ شازی کی زندگی بھی کسی نئے جال میں پھنسنے والی تھی۔ ایک جال کی نکلی، مگر پھانس دل میں چبھی ہوئی تھی۔ قدموں کی آہٹ نے اس میں کوئی خوف پیدا نہیں کیا۔ وہ بڑی دلیری سے آنے والے کا انتظار کرتی رہی۔ درندگی ـــ رات کے مرد اور دن کے مرد پر اُسے ہنسی آ گئی۔ خوب صورت لباس کے اندر چھپا ہوا بھیڑیا۔ جسموں کی تھکن اور باہر جلتی ہوئی گرم گرم لُو میں پسینے کا بہنا اُسے یاد آیا۔ قدم قریب آئے تو اُس کے منہ سے شراب کا بھبکا پھوٹا۔ اُس کا جیون ساتھی اور سر پر بھوت سوار کئے ہوئے۔ شمع بجھتی چلی گئی۔ اور جب

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

غزلیں

شہاب جعفری

سوئے شہر آئے اڑاتے پرچمِ صحرا کو ہم
اے جنوں اب کے الٹ کر رکھ ہی دیں دنیا ہم

تھا کہیں ماضی میں تو لے حال اب آ گے تیرا کام
لے تو آئے تیری چوکھٹ تک ترے فردا کو ہم

پیاس کے ایندھن میں جلتی آدمی کی لاش کو
لے کے کاندھوں پر چلے روتے ہوئے دریا کو ہم

کتنے دانا ہیں لگا کر آگ سارے شہر کو
ایک گنگا لے چلے جلتی ہوئی لنکا کو ہم

پیاس کہہ کہہ کر پکاریں بیچ دریا میں کھڑے
پانی پانی کہہ کے مانگیں ریت سے دریا کو ہم

جو کا ہر دانہ گہر کے مول تھا بازار میں
کھیت کی مٹی لئے روتے ہیں ان داتا کو ہم

مضطرب ہیں سائے سناٹے کہ آوازیں نہیں
رہرو دلبے ہیں اک پتھر تلے صحرا کو ہم

دھوپ اگر ہوتی تو تن ڈھکنا کچھ آساں تھا شہاب
روشنی سے چھین لیتے پردۂ سایا کو ہم

●●

ضربِ تیشہ کی صدا میں کیا اٹھا کر لے گئے
ٹوٹتے پتھر سے ہم صحرا اٹھا کر لے گئے

بیخودی کو جانتے کیا ہم خودی خوانِ جنوں
قطرے کی تمہید میں دریا اٹھا کر لے گئے

پاؤں جب سمٹے تو رستے بھی ہوئے تکیہ نشیں
بوریا جب تہہ کیا دنیا اٹھا کر لے گئے

ہر جگہ لگتا رہا یوں ہی کہ لٹ جائیں نہ ہم
ہم تو ہر دھرتی سے گھر اپنا اٹھا کر لے گئے

اس سفر میں ساتھ کون آتا، صداسب کو تو دی
زندگی کا بوجھ تھا، تنہا اٹھا کر لے گئے

ہیں پرانے بھی نہیں شائستۂ تشنہ لبی
ہم سے گر شبنم چھنی، دریا اٹھا کر لے گئے

سربلند اپنا لہو تھا، سرنگوں قاتل کی تیغ
ہم ہتھیلی پر جو سر اپنا اٹھا کر لے گئے ●●

فضل تابش

غزلیں

سوتے ہوؤں میں بیٹھا وہ زندہ دکھائی دے
تنہا ملے تو جینے سے اوبا دکھائی دے

دھومیں مچاتی ہنستی ہوئی زندگی کے پار
دیکھو تو سارا شہر تڑپتا دکھائی دے

میں جلتی ریت زیست سے گزرا ہوں ننگے پاؤں
آسائشوں میں کوئی مجھے کیا دکھائی دے

جاڑوں کی رات اس سے لپٹ سونے کا مزہ
سورج اسی کے جسم میں ڈوبا دکھائی دے

ترکِ لباس اس کے لئے لازمی نہیں
مجھ کو وہ ہر لباس میں ننگا دکھائی دے

پہلے میں اس کو چوم کے اظہار کر تو دوں
پھر اس کے بعد آگے کا نقشہ دکھائی دے

اوہام چھوڑ چلئے تو ہر راہ صاف ہے
ڈریئے تو موڑ موڑ خدا سا دکھائی دے

سوئے ہوئے تالاب سا ٹھہرا ہوا چہرہ
اُس کا تو نہ تھا، جانے کہاں سے اُٹھا لایا

ہر رات شناسائی سے سہما ہوا پہنچا
ہر رات نیا باب بدن پر لکھا پایا

کم عمر ہے معلوم نہ ہوگا اُسے کچھ بھی
اس خام خیالی نے مزہ کر دیا دونا

سڑکیں تو گئی رات بھی سنسان تھیں یونہی
کل رات بھی رستے میں اُسے کون ملا تھا

میں جھوٹ کا عادی نہیں پھر بھی یہی سچ ہے
میں جب بھی ملا اُس سے کبھی سچ نہیں بولا

وہ میرے لئے آنکھیں بچھائے تھیں کبھی سے
میں ساری کتابوں کا گنہگار تھا تنہا

غزلیں

مسعود احمد شمیم

حصارِ جسم تو ٹوٹا، یہ مرحلہ کیا ہے؟
صفاتِ ذات کا ہونٹوں پہ ذائقہ کیا ہے؟

تلاشِ ذات کی منزل نفیٔ ذات میں ہے
نفیٔ ذات میں ناموں کا تذکرہ کیا ہے؟

بکھر بکھر کے یہ سنورے، سنور کے پھر بکھرے
یہ ہست و نیست کا ناختم سلسلہ کیا ہے؟

مراد جود ہے مانا، وجود لاموجود!
مگر یہ فکرِ رسا ذہنِ نابغہ کیا ہے؟

یہ چیختا ہوا بے تاب ہے سمندر کیوں؟
سروں پہ ناچتا نیرنگ دائرہ کیا ہے؟

شمیم آؤ: محیطِ خلا میں کھو جائیں
لباسِ جسم سے گزریں مضائقہ کیا ہے؟

مدحت الاختر

دیکھتے رہ گئے سب دیکھنے والے مجھ کو
تیری آنکھوں نے کیا کس کے حوالے مجھ کو

طشت از بام گرا یوں کہ خبر تک نہ ہوئی
اس سے پہلے کہ بکھر جاؤں اٹھا لے مجھ کو

خاک ہو کر بھی پریشانیٔ فطرت نہ گئی
جانے کس روپ میں اب دیکھو ڈھالے مجھ کو

شام ہوتے ہی پلٹ جائیں گے پیاسے ہو کر
چھیدنے آئے ہیں جو دھوپ کے بھالے مجھ کو

—

میری پستی سے، نہ کر اپنی بلندی کا گماں
یعنی تو دیکھ سکے، دیکھ کے پالے مجھ کو

سلام بن رزاق

اعتراف

میں نے ابتدا میں ان باتوں کو محسوس نہیں کیا تھا۔ مگر اِدھر چند روز سے مجھے بُری طرح احساس ہو رہا ہے کہ وہ میرا دشمن ہے۔ وہ دھیرے دھیرے میری شخصیت کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ کسی اژدہے کی طرح وہ مجھے نگلتا جا رہا ہے۔ وہ میرے وجود سے اس طرح لپٹ گیا ہے جیسے چندن سے سانپ لپٹ جاتا ہے۔ میں اُس سے بچ نکلنے کی کتنی ہی ترکیبیں کرتا ہوں۔ مگر لگتا ہے بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے۔ میں اُس سے جتنا چھٹکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اُس کی گرفت مجھ پر اُتنی ہی سخت ہوتی جا رہی ہے۔ اُس کے بے جا لطف و کرم کا سلسلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اُس کی ہر مہربانی مجھے بے انتہا تکلیف پہنچاتی ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھ پر مہربانی کرنے کے مواقع تلاشتا رہتا ہے۔ اُس کے نیک سلوک کی ضربات سے میری انانیت ٹکڑے ٹکڑے ہوئی جا رہی ہے۔ مگر وہ مجھ پر اپنے چھوٹے چھوٹے احسانوں کا بوجھ لادتا ہی جا رہا ہے جب اُس کے احسانوں کے بوجھ تلے دب کر میں چھٹپٹانے لگتا ہوں۔ تب میں نے دیکھا ہے کہ وہ اندر ہی اندر بے حد خوش ہوتا ہے۔ وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتا مگر مجھے اپنی کمتری کا احساس دلا کر میری زخمی شخصیت کی تڑپ دیکھ کر اُسے جو لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہ اُس کے لئے بڑا لذت بخش تجربہ ہے۔

میں جانتا ہوں کہ مجھ میں کچھ فطری کمزوریاں ہیں۔ جن سے وہ پورا پورا فائدہ اُٹھاتا رہتا ہے۔ میں اُس کے مقابلے میں کم چالاک ہوں۔ زندگی کی دوڑ میں جس ریاکاری اور عیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مجھ میں نہیں ہے۔ میری ان کمزوریوں نے مجھے ہر جگہ شکست دی ہے۔ اُس کی انہیں خوبیوں نے اُسے ہر مقام پر فتحیاب کیا ہے۔ وہ ایسے کسی بھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ جہاں وہ اپنی اُن خوبیوں سے فائدہ اُٹھا سکتا ہو۔ میں اُس کی ان چالاکیوں کو خوب سمجھ گیا ہوں۔ مجھے اس سے بے حد نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ بلکہ اب مجھے اُس سے ایک طرح کا خوف بھی محسوس ہونے لگا ہے۔

شروع میں وہ مجھ سے جس خلوص اور محبت سے ملتا تھا۔ اُسے دیکھ کر میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اصل میں اُس کا وہ سارا خلوص میری شخصیت کو ڈس ڈالنے کا بہانہ ہے۔ اُس کا پریم جال اصل میں ایک زبردست

سازش تھی میری خودداری کو کچلنے کی۔

وہ شروع ہی سے مجھے دھوکا دیتا رہا تھا۔ یہ میری غفلت تھی کہ میں اُس کی فریب کاری کو بروقت سمجھ نہیں پایا تھا۔ اُس کے دل میں چھپے کالے چور کو تو میں دھیرے دھیرے ہی دیکھ سکا تھا۔ وہ مجھے اپنی چھوٹی چھوٹی مہربانیوں کے پیچ کش میں اس طرح کس رہا تھا کہ میں ہاتھ پاؤں بھی نہیں مار سکتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اُس کے ان احسانوں کا بدلہ کبھی نہ چکا سکوں گا۔ مگر وہ برابر میری مدد کرتا رہتا تھا۔ اب سمجھ رہا ہوں میں اُس کی چالاکیوں کو۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ میں اُن احسانوں کا بدلہ کبھی نہ چکا سکوں۔ وہ اُن احسانوں کے بوجھ تلے میری گردن ہمیشہ دبی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح مجھے اپنا احسان مند اور دست نگر بنا کر شاید اُس کے احساسِ برتری کو تسکین ملتی تھی۔ ایسے کسی بھی واقعہ کے بعد میرا شخصی غرور ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ میں اپنے آپ کو بے حد حقیر سمجھنے لگتا ہوں۔ پھر یہ حقارت کا احساس ایک شکنجے کی طرح میرے پورے وجود کو جکڑ لیتا ہے۔ اب تو تنہائی میں بھی میں اُس پر کڑھتا اور جھنجھلاتا رہتا ہوں۔ ذہن میں ہر وقت اُس کی نفرت انگیز تصویر گھومتی رہتی ہے۔ میں اکثر تنہائی میں سوچتا ہوں کہ اب کی اگر وہ ملا تو اُسے اس طرح جھڑک دوں گا۔ اُس نے چائے یا شراب کا آفر کیا تو یوں پھٹکار دوں گا۔ اُس کی کسی بھی قسم کی مدد قبول نہیں کروں گا۔ چاہے مجھ پر کیسا ہی کڑا وقت آجائے، اُس سے کبھی کچھ نہیں لوں گا۔

مگر جب وہ سامنے آتا ہے تو تنہائی میں سوچی ہوئی یہ ساری اسکیمیں مجھے بھول جاتی ہیں۔ اُس کی شکل دیکھتے ہی جیسے مجھے کاٹھ مار جاتا ہے۔ اُس کے لفظوں کی آنچ سے میں موم کی طرح پگھلنے لگ جاتا ہوں۔ دھیرے دھیرے میں اتنا نرم پڑ جاتا ہوں کہ وہ جیسا چاہتا مجھے موڑ لیتا ہے۔ وہ میرے پاس بیٹھا باتیں کرتے کرتے ہر وقت مسکراتا رہتا ہے۔ اُس کی سفاک مسکراہٹ مجھے اندر بہت گہرے تک کاٹتی چلی جاتی ہے۔ اُس نے میرے وجود کے گرد اپنے خلوص کی جو مصنوعی دیوار کھڑی کی ہے۔ اُسے میں روز توڑ دیتا ہوں اور وہ روز بنا لیتا ہے۔ وہ میری شخصیت کو ریزہ ریزہ کر دینا چاہتا ہے۔ میں بار بار اس شیرازے کو جمع کرتا ہوں اور وہ بار بار کسی نئی ٹھوکر سے اُسے منتشر کر دیتا ہے۔

جب میں اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہنستا قہقہے لگاتا ہوتا ہوں۔ میری گفتگو کا جادو چاروں طرف چھا چکا ہوتا ہے کہ اتنے میں وہ آجاتا ہے۔ اُس پر نظر پڑتے ہی میں گھبرا جاتا ہوں۔ زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ میری گفتگو کا طلسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ الفاظ برف کی طرح سرد و بے جان ہو کر جہاں کے تہاں منجمد ہو جاتے ہیں۔ میں اس طرح سکڑ سمٹ جاتا ہوں جیسے پھولے ہوئے غبارے میں سے ہوا نکل گئی ہو۔ اُس وقت میں کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح اُس کے سامنے گردن جھکا کر چپ چاپ بیٹھ جانے کی ذلت اُٹھاتا ہوں۔ شرمندگی اور غصے سے میری عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ میں اندر ہی اندر بُری طرح تلملانے لگتا ہوں۔ اُلٹے پڑے تلچٹے کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہوں۔ مجھے ہر ایسے موقع پر اپنے چھوٹے پن اور شکست خوردگی کا بُری طرح احساس ہونے لگتا ہے۔ وہ لمحہ میرے لئے بڑا نازک ہوتا ہے۔ مجھے غصہ تو اتنا آتا ہے کہ جی چاہتا ہے بڑھ کر اُس کا گلا گھونٹ دوں۔ مگر میں ایسا کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ کیوں کہ مجھے دوسرے ہی لمحے احساس ہوتا کہ میں اپنی ساری قوت لگاؤں بھی تو اُس کے احسانوں کے اُس ملمع کو اُتار نہیں سکوں گا۔ جو میرے وجود پر زنگ کی طرح چڑھا ہوا ہے۔ کاش میں نے ابتدا ہی سے اس کی چال سمجھ لی ہوتی اور اُس سے کسی بھی احسان کو

قبول کرنے سے انکار کر دیا ہوتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو میں پوری طرح اُس کی مٹھی میں ہوں۔ اُس کے ذرا سے دباؤ پر میری چیخیں نکل سکتی ہیں۔ وہ کسی عفریت کی طرح میرے شعور پر چھایا ہوا ہے۔ وہی اُس نے مجھ پر بے شمار مہربانیاں کی ہیں۔ مگر اب یہ ساری مہربانیاں میرے وجود میں کیلوں کی طرح گڑ گئی ہیں۔ اُس کی دوستی میرے لئے اُس میٹھے زہر کی طرح ہو گئی ہے جسے میں جرعہ جرعہ حلق سے اُتار رہا ہوں۔

میں ہر لمحہ چھوٹا ہوتا جا رہا ہوں۔ وہ ہر لمحہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ میں گھٹ رہا ہوں، وہ بڑھ رہا ہے۔ وہ مجھ سے کافی اونچا ہو گیا ہے۔ اتنا اونچا کہ کتنی ہی دفعہ اُسے مار ڈالنے کے ارادے سے میں نے اُس کی گردن دبوچ لینی چاہی۔ مگر میں زمین سے صرف اُچھل کر رہ جاتا ہوں۔ کیوں کہ اُس کی گردن تک میرے ہاتھ نہیں پہنچ پاتے۔ میں چیخ چیخ کر اُسے گالیاں دیتا ہوں۔ اُسے جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دیتا ہوں۔ مگر میری آواز اُس کے کانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی ہوا میں کھو جاتی ہے۔ میں اپنے چھوٹے قد پر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا ہوں۔ دوستی کے پردے میں ہماری یہ سرد جنگ آج بھی جاری ہے۔ آج بھی وہ مجھے اسی طرح دھیرے دھیرے ختم کرنے میں مصروف ہے۔

مجھے لگتا ہے زندگی کے سمندر میں، وہ ایک بڑی مچھلی کی طرح ہے۔ جو مجھے ہڑپ کرنے کے لئے میرا پیچھا کر رہی ہے۔ اور میں کسی چھوٹی مچھلی کی طرح اپنے وجود کو بچانے کے لئے بھاگ رہا ہوں۔ وہ بھی تیزی سے میرے پیچھے چلا آ رہا ہے اپنا خوفناک جبڑا کھولے ہوئے مجھے نگلنے کو۔

اپنی ہستی کو بچانے کے لئے مجھے اسی طرح بھاگتے رہنا ہے۔ اُس وقت تک بھاگتے رہنا ہے۔ جب تک میرا قد کم از کم اُس کے قد کے برابر نہیں ہو جاتا۔

●●

غزلیں

مشتاق جاوید

نظر کا تار نظر ہی میں ٹوٹ جاتا ہے
دلوں کا کتنا یہ نازک عجیب رشتہ ہے

سمجھ کے پھر اُسے آسیب مجھ نہ پھیر اپنا
اَنا کی توڑ کے زنجیر لوٹ آیا ہے

حضور اپنے مدارج کا جائزہ لے لیں
ہوا کے دوش پہ کس کا مکان ٹھہرا ہے

وہ ٹھہرے پانی کی صورت سے اپنی ہستی میں
تہوں میں اُس کی مگر ایک شور برپا ہے

مری نگاہ کا منظر دھوئیں میں ڈوب گیا
یہ میرے خواب پہ کس نے غبار پھینکا ہے

جمنا پرشاد راہی

سلگتی ریت پہ آنکھیں نچوڑتے کیوں ہو
سمندروں کو سرابوں سے جوڑتے کیوں ہو

بکھر نہ جائیں حسین واقعات کی کڑیاں
تصورات کی زنجیر توڑتے کیوں ہو

گلی کی دھوپ سے پتھر بھی موم ہونے ہیں
کھلا تم اپنے دریچوں کو چھوڑتے کیوں ہو

وہ آدمی تو فرشتوں میں ہو چکا شامل!
اب اُس کا نام مرے ساتھ جوڑتے کیوں ہو

کسی کی روح اندھیروں میں ڈوب جائے گی
ندی میں دیپ عقیدت کے چھوڑتے کیوں ہو

تمہارے پاس جو امرت کی ایک بوند نہیں
تو خواہشات کی لاشیں جھنجھوڑتے کیوں ہو

زمیں کی گود میں کچھ اور بھی تو سورج ہیں
نظر کا دائرہ اتنا سکوڑتے کیوں ہو

حقیقتوں کے سپنے ناگ بڑھ کے ڈس لیں گے
خیال و خواب کی دیوار توڑتے کیوں ہو

جو لفظ مصحفِ ہستی کا ترجمان نہیں
تم ایسے لفظ سے معنی نچوڑتے کیوں ہو

مان سنگھ خیال

جن کی گنتی تھی میزبانوں میں
اُن کی گنتی ہے میہمانوں میں

زندگی کا بھرم سا ہوتا ہے
دیکھ کر روشنی مکانوں میں

ہم کو تازہ ہوا کہیں نہ ملی
پوچھ آئے سبھی دکانوں میں

پائیے گا کہاں حقیقت میں
ڈھونڈیئے گا ہمیں فسانوں میں

ہر نظر ہو گئی ہے پتھر کی
پھول کھلنے لگے چٹانوں میں

اپنی کھڑکی سے دیکھتا ہوں خیالؔ
رینگتے راستے ڈھلانوں میں

غزلیں

فاروق راہب

سورج کی کرنوں کی خاطر آوازوں کا بونا قیدی
صحرا صحرا بھاگ رہا تھا تاریکی سے جب بھی اُلجھا

ڈھونڈ رہا تھا دیوانے کو رنگوں کا پیاسا ساگر بھی
شیشے کے تہہ خانے میں لیکن وہ چھپ کر جا بیٹھا تھا

آگ لگی جو بستی بستی سینے سارے جھلس گئے تھے
اپنے کرموں کا ہی پھل تھا وقت مگر مجرم ٹھہرا تھا

تم سے نہیں ہے شکوہ کوئی تم ہو پھول نئے موسم کے
بیچ کی نسلوں سے ہی تو ہر دور میں رہتا ہے شکوہ

نین سے نیر بہانے والو! دُکھ سُکھ کے تم ہی ہو رفیق
آؤ مل کر آج ہی رولیں راہب کل مرجائے گا

قوس صدیقی

دائرہ جو ہے مرے گرد بنا رہنے دے
مجھ کو اے دوست اِسی گھر میں چھپا رہنے دے

زخم خوردہ سہی یہ شورِ اَنا رہنے دے
اپنے احساس میں نشتر کو چُھپا رہنے دے

جلتے سورج پہ نہ یوں پھینک کوئی شام ابھی
اپنے سائے کو ابھی پیچھے لگا رہنے دے

ذوق، مریم ہے اِسے جادۂ تسکین دے دے
نفس، عیسیٰ ہے اِسے سولی چڑھا رہنے دے

ڈاکٹر نریش

خالی بوتل

آج پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ میں نے گھر جانا نہ چاہا ہو۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا۔ پانچ بجے دفتر سے چھٹی ملتی ہے تو سیدھا گھر کی طرف دوڑتا ہوں۔ راستے میں رُکنا ہی نہیں چاہا کبھی۔ لیکن آج میں دفتر میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کاش کوئی ایسا سرکاری کام نکل آئے کہ مجھے شہر سے باہر بھیج دیا جائے۔ یا پھر کوئی بہت ہی امپارٹنٹ فائل مکمل کرنے کا آرڈر مِل جائے۔ کوئی ایسا کیس جس پر قلم گھساتے گھساتے اور فائلوں کے پنے اُلٹتے پلٹتے رات ہو جائے۔ دس ساڑھے دس بجے دفتر سے نکلوں اور کہیں جاکر سو رہوں۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ پانچ بجتے بجتے ایک ایک کرکے دفتر کی سبھی کرسیاں خالی ہونے لگی تھیں اور میں پانچ منٹ بھی اپنی سیٹ پر بیٹھا نہ رہ سکا تھا۔ اُٹھ کر تھکے من سے زینہ اُترنے لگا تھا۔ اُتر کر سڑک پر آگیا تھا۔ اور سڑک پر بڑھتے ہوئے میرے قدم مجھے سومیش کے گھر لے آئے تھے۔ سومیش کا گھر پورے کا پورا مجھ سے مانوس و آشنا ہے۔ گھر کی سبھی دیواریں، دیواروں پر لگی سبھی تصویریں، تصویروں میں بنے ہوئے سبھی لوگوں سے میں واقف ہوں۔ کچھ بھی اجنبی نہیں ہے۔ سومیش ابھی تک گھر نہیں پہنچا ہے۔ بھابی نے گرم چائے کا ایک پیالہ لاکر میز پر رکھ دیا ہے اور میں تپائی پر ٹانگیں پھیلا کر صوفے میں دھنس گیا ہوں۔

سومیش ابھی تک نہیں لوٹا ہے۔ بھابھی کو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ وہ باورچی خانے میں کھانا بنانے میں مصروف ہے۔ اسے سومیش کی عادات معلوم ہیں اور وہ ان عادتوں سے سمجھوتا کر چکی ہے۔ سگریٹ کا آخری حصّہ ایشٹرے میں بجھانے کے لئے اُٹھتا ہوں تو باورچی خانے سے بھابی کی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔ کاش میں نے اپنی بیوی کو دارجیلنگ نہ جانے دیا ہوتا۔ اس کے بغیر میں کتنا تنہا، کتنا اکیلا محسوس کرتا ہوں۔ وہ جب بھی کہیں گئی ہے میں کئی کئی روز اداس رہا ہوں۔ کوئی ہنسی، کوئی خوشی، خوشی دینے والا کوئی واقعہ مجھے بہلا نہیں سکا ہے۔۔ دو تین روز کے بعد میں آہستہ آہستہ حالات سے سمجھوتا کرنے لگتا ہوں اور اس کی غیر موجودگی کا احساس کم ہونے لگتا ہے۔ پھر بھی میں نے اس کے کہیں بھی جانے پر کبھی بھی اعتراض نہیں کیا ہے۔ اتنا پیار کرنے والی، مجھ پر جان چھڑکتی ہوئی اُس عورت کو منع کرنے کی ہمت ہی نہیں ہے مجھ میں۔

لیکن آج میں واقعی پچھتا رہا ہوں۔ اس مرتبہ میں اسے منع کر سکتا تھا۔ وہ خود بھی وہاں جانے کے لئے ایسی بے قرار نہ تھی۔ میں ہاں نہ کرتا تو شاید اسے بُرا بھی نہ لگتا۔ لیکن میں نے سوچا اس کی چھوٹی بہن لینے کے لئے آ ہی گئی ہے تو کیوں نہ دس پانچ دن گھوم آئے۔ لیکن تب مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ کوئی مجھ سے اس کے فراق کے مقدس لمحات چھیننے کی کوشش کرے گا۔ نہیں جانتا تھا کہ کسی کی دو کالی بڑی بڑی آنکھیں ڈرائنگ روم سے لے کر کچن تک کا جائزہ لیں گی۔ اور کسی کا لایا ہوا پھلوں سے بھرا لفافہ میرے فرج پر پڑا پڑا مسکرا مسکراتے گنگنانے لگے گا اور یہ گنگناہٹ اتنی تیز اتنی تیکھی ہوگی کہ میری تنہائی کا سینہ چھلنی ہونے لگے گا۔

میں اسے نہیں جانتا تھا۔ کل صبح صبح میرے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ سفید ساڑھی میں لپٹی کسی عورت کی دو کالی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں میں مسکان ناچ اُٹھی تھی۔

"آپ گوپال جی ہیں؟"

"کہئے... اندر آیئے نا۔"

ادھر ادھر دیکھ کر، پہلی نظر میں ہی کمرے کا جائزہ لے کر اس نے کہا تھا۔

"بڑا خوب صورت ڈرائنگ روم ہے آپ کا۔"

میں حیران تھا۔

"معاف کیجئے میں نے آپ کو ---"

"پہچانا نہیں؟ میں سامنت کی بہن ہوں۔"

"اوہ، کہئے کب آئیں آپ؟"

"کل۔"

کیسے آنا ہوا اِدھر؟

میرے ایک رشتہ دار یہاں ہسپتال میں داخل ہیں ان کی تیمارداری کے لئے آ ئی ہوں۔"

"کہاں ٹھہری ہیں آپ؟"

"کہیں بھی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جہاں ٹھہری ہوں وہ جگہ ہی ایسی ہے جہاں مجھے یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ میں وہاں ٹھہری ہوں ہوں۔"

"اوہ۔"

چند لمحوں کی بوجھل چپ کے بعد وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی سامنے والی میز پر سے کنگھی اُٹھا کر اس نے اپنے بالوں کو سنوارا تھا یا سنوارنے کی ایکٹنگ کی تھی۔ اور کہا تھا۔

"اچھا تو چلوں؟"

"ارے چلئے: اسے تو تیجئے نا کچھ۔"

نہیں چائے کی خواہش نہیں ہے۔"

اور وہ کافی عاجزی سے نمستے کر کے چلی گئی تھی.. زینہ اُترتے ہوئے، اس کی رفتار اتنی مدھم تھی کہ لگتا تھا جیسے اس کا ہر قدم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کو لوٹ رہا ہو۔ وہ ابھی سیڑھیوں میں ہی تھی کہ میں نے گھبرا کر دروازہ بند کر لیا تھا۔ میں اس تمام تنہائی کو، تنہائی کے تقدس کو، تنہائی کے حق واحد کو سمیٹ لینا چاہتا تھا جسے اس کی سانسوں نے، اس کی آنکھوں نے اس کی باتوں نے مجروح کر دیا تھا۔

کل دفتر سے گھر لوٹ کر، بیچ کمرے کے کھڑے ہو کر میں نے دو تین لمبے لمبے سانس کھینچے تھے۔ تقریباً یہ احساس ہونے لگا تھا کہ میری تنہائی مجروح نہیں ہوئی ہے۔ البم اُٹھا کر میں نے اپنی اور اپنی بیوی کی تصویریں دیکھنا شروع کی تھیں۔ ان

لمحوں کی تصویریں جنھیں ہم نے جیا تھا، بھوگا تھا۔ ایک ایک تصویر سے نظر چپک، چپک جا رہی تھی۔ تمام تصویریں دیکھنے کے بعد میں نے البم کو سلیقے سے لگایا تھا۔ البم میں سے ایک عجیب سی خوشبو نکل کر میرے نتھنوں میں گھسنے لگی تھی۔ میں نے منہ اٹھا کر کمرے میں پھیلی ہوئی عام بو کو سونگھ کر دونوں میں تمیز کرنا چاہا تھا۔ مگر پورے کمرے میں وہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میری بیوی کے جسم کی خوشبو اور میں جیسے اس خوشبو میں نہا رہا تھا۔

دفعتاً کسی کی انگلیوں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اٹھ کر دیکھا وہی تھی۔ کمرے میں آ کر وہ اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں صبح بیٹھی تھی اب بھی اس کی نگاہیں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میری سانسوں میں گھل رہی میری رفیق حیات کے جسم کی خوشبو ہی تھی لیکن وہ عورت میری بیوی نہیں تھی۔ سامنت کی بہن تھی۔ سگی نہیں، ماموں زاد یا پھوپھی زاد بھی نہیں، منہ بولی بھی نہیں صرف کہنے بھر کی بہن۔

"آپ پانچ بجے آ جاتے ہیں دفتر سے؟"

"نہیں۔ پانچ بجے تو چھٹی ہوتی ہے۔ سوا پانچ تک پہنچتا ہوں۔"

"بھابی کب آ رہی ہیں؟"

"اگلے ہفتے آئیں گی۔"

"آپ کو کھانے وانے کی بہت دقت ہوتی ہوگی۔؟"

نہیں ایسی کچھ خاص دقت نہیں ہوتی۔ دوپہر کا کھانا تو دفتر کی کینٹین میں ہی کھاتا ہوں اور شام کا کھانا خود بنا لیتا ہوں۔ وقت بھی تو کاٹنا ہوتا ہے۔

پھر ایک بوجھل سا گئے لمحے بھر کی چپ ہم دونوں کے درمیان آ بیٹھی تھی۔ میں اس چپ کے بوجھ تلے دبتا جا رہا تھا لہٰذا میں نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ بیٹھئے، میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔"

"ارے ارے کیا کر رہے ہیں آپ؟ آپ تشریف رکھئے میں بناتی ہوں۔"

اور میرے ہاں نہ کے لئے وقت کی گنجائش نہ چھوڑ کر وہ کچن میں چلی گئی تھی۔ گیس کا سوئچ آن کر کے اس نے پانی چڑھا دیا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک کچن کی طرف سے آنے والی پروائی کے کاندھوں پر سوار ہو کر مجھ تک پہنچ رہی تھی البم میرے قریب میز پر پڑی تھی۔ میں نے فوراً اٹھا کر الماری میں رکھ دی۔

چائے پینے کے بعد اس نے جن نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا اس کے بیان کے لئے الفاظ میرا ساتھ نہیں دیتے۔ ہاں میرے لئے انہیں برداشت کرنا بڑا مشکل تھا۔ وہ شاید اپنی ایسی نگاہوں کے اثر سے واقف تھی۔ اسی لئے اس نے بڑی تیزی سے نظریں گھما کر کہا تھا۔

"اچھا تو چلوں...."

"جی...."

"چلوں۔ دیر ہو رہی ہے۔"

اور وہ دروازے تک بڑھ گئی تھی۔ ایک بار تو میرے جی میں آیا کہ کہہ دوں اگر ٹھہرنے کا انتظام معقول نہیں ہے تو یہاں آ جائیے۔ لیکن نتھنوں نے جن تبدیلی خوشبو کو محسوس کیا تھا، اس نے جیسے میرے ہونٹ سی دیئے تھے۔ وہ دروازے تک جا کر پلٹ آئی تھی۔

"مٹی کا تیل تو ہوگا گھر میں؟"

"جی...."

"وہی لینے کے لئے آئی تھی۔ کوئی بوتل وتل ہو تو دیجئے"

اور میں نے کچن میں جاکر مٹی کے تیل سے بوتل بھر دی تھی
اس نے بوتل لے کر میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ اور ویسی ہی
رفتار سے زینہ اُترنے لگی تھی، جیسی رفتار سے صبح آتی تھی۔

آج گھر جانے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ طبیعت ہی نہیں
چاہ رہی۔ اپنی تنہائی پر اور کسی ضرب کا خیال بھی مجھے
ناگوار گزر رہا ہے۔ لیکن سومیش ابھی تک نہیں لوٹا ہے۔ بھابی
کھانا بنا چکی ہے۔ [illegible] کے منہ میں بوتل۔ [illegible] وہ اسے
باہوں میں جھلا رہی ہے۔ بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا ہوں۔ [illegible] کیا
ضروری ہے کہ وہ پھر میرے ہاں آئے۔ اتنی دیر تک یہاں
بیٹھے رہنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ سومیش کے رہتے اور
بات ہے۔ اُٹھ کر چلنے لگتا ہوں تو بھابی آواز دیتی ہے۔
”کہاں چلے بھائی صاحب۔ آتے ہی ہوں گے وہ
کھانا تیار ہے۔“
”ابھی آجاؤں گا، تھوڑی دیر میں بھابی۔“
بھابی کو ایسا چکما پہلے بھی کئی بار دے چکا ہوں
کہ کر نہیں پلٹتا۔ وہ میری عادت سے بھی واقف ہے۔
لیکن بڑی بھولی ہے۔ ہر بار باتوں میں آجاتی ہے۔ دھوکہ
کھا جاتی ہے۔

تھکے ہارے بوجھل قدموں سے گھر پہنچتا ہوں۔
ساتھ والے مکان سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت نکل رہی ہے
اس کی سفید ساڑھی ہی دیکھ پایا ہوں۔ دل دھک سے رہ
گیا ہے۔ لیکن وہ پڑوسن ہی ہے۔ سکھ کا ایک لمبا مگر اُلجھا
ہوا سانس لیتا ہوں۔ دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھتا ہوں۔
جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر میری انگلیاں فوراً اس کی
چابی تلاش کر لیتی ہیں۔ تالا کھولنے لگتا ہوں تو پاؤں
بوتل سے ٹکرا جاتے ہیں۔ وہی بوتل جسے کل مٹی کے تیل سے
بھرا تھا۔ جسے وہ لے گئی تھی۔ بند کواڑوں کے باہر وہی
خالی بوتل پڑی ہوئی ہے۔ میرے پیروں سے لڑھک گئی ہے
اس کا ڈھکن ذرا دور جا گرا ہے۔ اور مجھے مٹی کے تیل کی بو
اپنے نتھنوں سے ٹکراتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔

●●

بقیہ : سوکھی ٹھٹھری ندی

کہ اب میں ان آنسوؤں کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا
پھر وہ سب ایک ساتھ گڑگڑانے لگے ــــــــ
روشنی !
روشنی !!
روشنی !!!
اور تب میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں
ٹھونس لیں۔

●●

مصور سبزواری

"جسموں کا بن باس"

ایک جائزہ

تاریخ کے ہاتھ نے بازگشتوں اور بیتی ہوئی پرچھائیوں کو کالے کاغذوں میں محفوظ کیا۔ مذہب نے مقبروں اور سمادھیوں کے روپ میں پیش کرکے ان پر عقیدتوں کے چراغ جلائے مگر ایک دن وقت کے تیز ریلے نے کالے کاغذوں کے سارے حروف اور عقیدتوں کی ساری روشنیوں کو ختم کر دیا۔ وجہ؟ وقت کی جبریت — جب تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کے عمل میں ناکام رہی تو یہ اساطیری کہانی بن گئی اور جب مذہب نے انسان کو ٹھکرا کر فرشتوں اور دیوتاؤں کی تلاش شروع کر دی تو مذہب صرف ایک آسیب بن کر رہ گیا۔ جس سے نئے سائنسی علوم نے جلد چھٹکارا دلایا۔ بازگشتیں بیتی ہوئی پرچھائیاں اور یادیں آوارہ گھومتی رہیں۔ آخر یادوں کے ان مرغولوں کو کسی مدھم گیت، کسی شکستہ دل اور کسی ٹوٹتے تار کی جھنکار نے اپنے اندر جذب کیا۔ انہیں ملبوس اور جسم دیا۔ جہاں بہتے ہوئے موسموں کی ہواؤں کے ساتھ جابر عظمتیں اور انا پرستی کے سارے فلسفے دم توڑ گئے وہاں یہ اڑتے ہوئے غبارے کبھی فنا آشنا نہیں ہوئے۔ اس طرح غیر مرئی نامحسوس یادیں لازوال بن گئیں۔ بے وجودیت کے باوجود یہ انسانی جسموں کے اندر اور باہر رہیں۔ اگر انسانی ذہنوں نے انہیں فرسودہ اور بے کار سمجھ کر ذہن بدر کرنا چاہا۔ انہیں گرفت میں لاکر گلا گھونٹنے کی کوشش کی مگر ہواؤں کی شہ رگ تک کس کے ہاتھ پہنچے ہیں؟ لہروں کے پاؤں کو کس نے تراشا ہے؟ صوت و صدا کے طائروں کو کس نے مٹھی میں بھینچا ہے؟ آخر نیچر پر کی گئی ساری فتوحات اور سائنس کے سارے حیرت انگیز فاتح وسائل تھک ہار کر یہ تسلیم کر بیٹھے کہ یادوں کے اس سفر کو جس کے لامتناہی سلسلے ازل سے ابد تک پھیلے ہوئے ہیں، اختیاری طور پر کوئی نہیں روک سکتا۔ خدا بھی ایک مقدس یاد ہے اور انسان بھی اس یاد کا ایک جیتا جاگتا رشتہ جس کی تجسیم و تخلیق یاد کے ایک قطرہ سے ہوئی اور اس قطرہ کو عورت کے روپ میں وقت نے اپنے بطن میں رکھا۔

"جسموں کا بن باس" کی شاعری کا سارا تانا بانا انہیں اڑتی بکھرتی یادوں کے نقطۂ انحراف پر تیار ہوا ہے۔ یادوں کی شاعری کے بارے میں کتابی تنقید کہتی ہے کہ اس کا قدم ہمیشہ ماضی کی سمت میں مراجعت کرتا ہے اور چونکہ یہ حال سے کٹ کر جاتی ہوئی دنیا کی پرچھائیوں میں پناہ لیتا ہے اس لئے مستقبل سے اس کا کوئی تعلق پیدا نہیں ہوتا اور اس کا ملجا و ماوی افسردہ دلی اور رومانوی آدرش کے سوا اور کچھ نہیں۔ یادوں کی شاعری پر یہ الزام بھی چلا آتا ہے کہ جب حقائق کی سنگینی عمل کے راستے

مسدود کر دیتی ہے تو اس کا اثاثہ لے دے کے چند خواب و خیال رہ جاتے ہیں۔ سادہ لوح اور شیریں جذبات کی ہلکی پھلکی عکاسی اور ناکام آرزو مندی ہی اس کا حصول ہے۔ حسن پرستی اور ماورائیت جو رومانیت کے بنیادی عناصر ہیں۔ اس میں نیم جمالیاتی کیف کے ساتھ قاری پر منکشف کئے جاتے ہیں۔

لیکن نئی نسل کی حسن پرستی اور حسن کے تعلق سے ماضی کا احترام مغرب کی نیم پختہ رومانویت سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری بھی یادوں ہی کی شاعری تھی جس میں رومانویت اور جمالیاتی احساس کا ایک ایسا ادراک پایا جاتا ہے جو اس کے پیش رووں اور ہم عصروں سے بالکل الگ ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ نئی شاعری کا عاشق نیاز عشق سے زیادہ اپنی محبت کی ناکی تنظیم میں یا اپنی تکمیل ذات میں مصروف ہے۔ وہ اپنے نفسیاتی جذبے کو محبوب کے سامنے سبک ہونے سے بچاتا ہے۔ اسے ماضی صرف اس لئے عزیز ہے کہ اس وقت اس نے مساوی سطح پر اپنے محبوب سے محبت کی تھی اور کرائی تھی اور بعد میں وہ توازن بگڑ گیا اس لئے انہیں لمحوں کا اعادہ اسے پسند ہے جن میں مہکی ہوئی سانسوں اور نرم گفتاری کا احساس باقی ہے۔ محبوب ہر جائی ہوا کرے وہ تو ایک آئیڈیل عاشق کی طرح خواہش کام جوئی اور جسم کی ساری حد بندیوں سے دور تنہا جینے کا عہد کر لیتا ہے۔ نہ غرقابی کا مظاہرہ کرتا ہے نہ زہر خوردنی سے اپنی تشہیر کراتا ہے۔

پنجاب کی البیلی دھرتی اور الھڑ رومانوں میں پل کر آزاد گلاٹی نے بھی کوئی ایسی محبت ضرور کی ہوگی جس میں بھیگی بھیگی دھلی دھلی صبحیں آئی ہوں گی۔ چاندنی کا رس پیئے ہوئے نشیلی راتیں کسمائی ہوں گی... الاؤ کے دھوئیں کی خوشبوئیں، نلپچے رت جگے ہوئے ہوں گے اور پھر جے۔ ایم۔ سنج کے ڈرامے "سمندر کے سوار" کی طرح کسی بے رحم ازلی سمندر سے اس کی جنگ ہوئی ہوگی اور اس جنگ کشمکش میں ناگزیر طور پر آزاد گلاٹی کا پیار بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہار گیا ہوگا اور آزاد گلاٹی کے پاس خواب کے زخم، یاد کی گٹھری، خیال کے سائے۔ آرزو کے دیپ۔ یاد کا گہنایا ہوا چاند اور یادوں کی کسک کے علاوہ اور کچھ نہ رہا ہوگا۔

درج ذیل اشعار اسی کیفیت کے غماز ہیں :

اپنے اندر کے سونے پن سے جب آپ ڈرو ں
خالی راہوں پر یادوں کی انگلی تھام چلوں

آج اک گھر اس طرح پھر شہر میں سوتا ہوا
برسوں پہلے کا کوئی غم دل میں پھر تازہ ہوا

سایۂ نو آتا ہے تو محفوظ کر لیتا رہوں میں
اور اک کہنہ کلنڈر ذہن کی دیوار پر

حال کی تپتی دھوپ ہو یا ہو مستقبل کے ٹھنڈے سائے
ساتھ مگر رہتی ہے ہر دم گزرے لمحوں کی پرچھائیں

شام آتی ہے تو اپنی خامشی میں ڈوب کر
گونجتا ہوں اپنے اندر بیتی آوازوں کے ساتھ

لیکن یہ اشعار محض تخیلی ماورائیت لئے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کے اندر ایک شخصی وجود بھی نئی ہوش مندی کے ساتھ نظر آتا ہے جس نے آگے چل کر واقعیت اور عصریت کا روپ دھار لیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آزاد کے یہاں رومانویت اور واقعیت دو بنیادی عناصر ہیں مگر اس نے اپنے انفرادی عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ان کی تلاش میں وہ عقل سے بھاگ کر جذبات کی قوس قزح میں پناہ نہیں لیتا۔ جمالیات اس کا تخلیقی عمل نہیں۔ جذبہ اس کی شاعری کی تمام تر اساس نہیں۔ اگر وہ عملی طور پر رومانوی ہوتا تو جذبات کو ہی علم و عرفان کا واحد ذریعہ بنا لیتا۔ اور اپنی گہری فکر کے مربوط سلسلوں کی تلاش بھی نہ کرتا۔ مندرجہ ذیل اشعار رومانویت

اور یاد پرستی سے آگے بڑھ کر عصری حسیت کے آئینہ دار بن گئے ہیں۔ ان اشعار میں آزاد کا فن ایک بلند تر سطح پر ہے:

رنگوں کا سلسلہ نظر آتا ہے دور تک ۔۔۔ اک شخص مجھ کو دیکھتا جاتا ہے دور تک
وہ شخص ایک خواب کا سایا ہے یا سراب ۔۔۔ ملتا کہیں نہیں نظر آتا ہے دور تک
ہمارے پاؤں ابھی ساحلوں کی ریت میں تھے ۔۔۔ کسی کے پیار کا دریا چڑھا، اُتر بھی گیا
تمہارے جسم کی خوشبو ہی قید تھی ورنہ ۔۔۔ ہوا کا ایک بگولہ تمہارے گھر بھی گیا
بارش میں ایک پیڑ کے نیچے وہ میرے ساتھ ۔۔۔ دل میں سلگتی آگ سے میں بھیگتا رہا
دل پہ نہ جانے کیا کیا بیتی، بات فقط اتنی سی تھی ۔۔۔ اب کے بچھڑتے وقت نہ اُس نے پوچھا "پھر کب آؤ گے؟"
میرے بدن سے لگ کے وہ شب بھر پڑا رہا ۔۔۔ میں اس کے جسم سے بھی پرے دیکھتا رہا
دل میں کتنے درد الاؤ بن کر جلتے رہتے ہیں ۔۔۔ ہنس ہنس کر ملتے ہیں پھر بھی سب سے یہ برفیلے پیڑ
آزاد! جب بھی تیز ہوا سنسنا اُٹھی ۔۔۔ چھونے لگا درخت سے ہر شاخ کا بدن

آزاد کے یہاں ملن کی سرشاری نہیں۔ اس کا محبوب یقیناً پردیسی ہے جس سے کسی جنم میں وہ ایسا بچھڑا ہے کہ اگلے جنموں میں بھی ملنے کی اُمید نہیں۔ مگر پھر بھی جدائی کا سوز گھلاوٹیں اور لذتیں لئے ہوئے ہے۔ "جسموں کا بن باس" کی تقریباً نصف شاعری کی فضا لڑکھڑاتی ہوئی کہر آلود کیفیت سے شرابور ہے۔ ڈوبتی قندیلوں اور واپس ہوتی ہوئی لہروں کی طرح دھندلا ہوئی اُمیدیں دھوپ چھاؤں کا ایسا عجیب امتزاج پیش کرتی ہیں کہ جن کی داد آزاد کو نہیں اس کے اس احساس کو ملتی ہے جس میں جذبات کی جلتی بجھتی آگ ہے۔ فکری سطح پر اس کی اس قسم کی غزلوں کی اپیل محدود ہے مگر ان غزلوں کا اگلا قدم حیاتی شاعری کی بڑی کامیاب نظیر پیش کرتا ہے۔ میکانکی استدلال سے آزاد جان بوجھ کر بچا ہے کیوں کہ اس نے رومان اور جذبے کو صرف داخلی توسیع ذات کا وسیلہ بنایا ہے۔ اس کی محبت اور اس کا خلوص آدرش ہے جو یہ سکھاتا ہے کہ چاہنے اور چاہے جانے کے بھی کچھ اصول ہیں۔ اس کے یہاں اس انسانی کمزوری کا بھی اظہار ہے کہ مزوری نہیں انسان جس سے پہلی بار محبت کرے اُسے اپنانے کی بھی جراُت کر سکے .... آزاد کے یہاں جدائی اور محرومی کی صورت میں کوئی منتقمانہ جذبہ محبوب کے خلاف نہیں اُبھرتا بلکہ وہ سماجی پس منظر میں شناسائیوں اور قربتوں کے اس بن باس کی ذمہ داری دوسری چیزوں پر ڈالتا ہے اور کہتا ہے:

وہ بھولتا نہیں ہمیں اس خوف سے کہیں ۔۔۔ یاد آنہ جائیں ہم کسی پہچان کی طرح
اس نے اچھا کیا ٹھکرا دیا مجھ کو، ورنہ ۔۔۔ خود اسے جینا ہی پڑتا مرے جیسا بن کر
لے نئے رشتے کے آغوش میں جانے والے ۔۔۔ میں بھی جی لوں گا ترا ٹوٹا ناتا بن کر
کھلے رسموں کی چمکتی ہوئی تلوار کے وار ۔۔۔ بیاہ منڈپ میں تڑپتی رہیں گھائل روحیں

اور یہ اشعار بھی آزاد کے مثالی اور رضائی کردار کے مکمل عکاس نظر آتے ہیں جب کہ وہ اپنے انجام ربط سے واضح طور پر باخبر ہو کر یہ پیش گوئی کرتا ہے:

یہی درختوں کے سائے یہ راستہ ہوگا — تمہارے ساتھ مگر کوئی دوسرا ہوگا
ہماری باتیں خلاؤں میں ڈوب جائیں گی — ہمارا نام بھی ہونٹوں کو کاٹتا ہوگا

"جسموں کا بن باس" کی شاعری پر ایک اعتراض ہے کہ اس میں رومانویت، واقعیت اور عصریت کے تینوں رنگ خلط ملط ہوگئے ہیں۔ دراصل یہ صورت حال کسی جذباتی بہاؤ کی وجہ سے نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ خارجی احوال کی ناسازگار کیفیات اور منتشر لمحات کے شیرازہ کو یکجا کرنے کی سعی سے اتفاقیہ پیدا ہوگئی ہے جس کی موجودگی میں تاریخی تسلسل ادب کی جگہ تاریخ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ نیم تاریخی شعور ہی آزاد کی شاعری کو کیف اور تاثیر بخش سکا ہے اور عیب کو ہنر بنا گیا ہے۔

آزاد کا احساس ذاتی نہیں عصری بھی ہے۔ اس نے چکور کی طرح چاند کا پنچھی بن کر صرف نیلے آسمانوں کو ہی چھونے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بلکہ ایک دردمند بنجارے کے روپ میں دھرتی کے رواں دواں دکھ سکھ کے اختلاط میں عمل اور ردعمل کی کش مکش کو بھی اپنے نغموں میں اس رنگ سے پیش کیا ہے جس سے اس کے مشاہدات اور محسوسات کا شخصی رشتہ عالمگیر مسائل سے جا ملا ہے۔ یہ اشعار عصری تفسیر اور تنقید کی روشن مثالیں ہیں:

ہم نے سہا ہے عمر کا اک ایسا وار بھی — گرنے لگا ہے اپنے بدن کا حصار بھی
کیا علم تھا وہ لوگ ہمیں چھوڑ چکے ہیں — ہم بڑھتے رہے جن کے لئے اگلی صفوں میں
ساگر کی سرحدوں کے قریب جب بھی آگئے — ہم کو کفن پہننا پڑا بادبان کا
کیا کیا روپ بدل کر آئے انسانی ذہنوں کے جنگل — پردوں پر خونخوار درندے، دیواروں پر پھیلے جنگل
سارے کمرے کو نگلتی جا رہی ہے تیرگی — روشنی سہمی ہوئی بیٹھی ہے اب دالان میں
تمہارے جسم کی جنت تو مل گئی ہے، مگر — میں اپنی روح کے دوزخ کا کیا علاج کروں؟

چونکہ آزاد کی غزلوں کا براہ راست اثر حواس پر ہے اس لئے ان کے حسیاتی پہلو کی کامیابی ذرا بھی مشکوک نہیں۔ آزاد نے رومانوی اور واقعاتی انداز بیان کے دلکش وسیلوں سے خارجیت میں داخلی حسن اور داخلیت میں خارجی عوامل کو اس صناعی اور حسن کاری سے سمویا ہے کہ جذبے اور فکر کے مشترک مدار پر رکھی ہوئی اس قسم کی کامیاب انفرادی مثالیں بہت کم ہیں۔ اس کے یہاں زندگی کی اعلیٰ اقدار، ان اقدار سے وفاداری اور مقاصد کا احترام اس حد تک ملتا ہے کہ اس کی غزلیں تہذیب نفس اور تزکیہ روح کی اعلیٰ ترین محرک معلوم ہوتی ہیں۔ آزاد کے یہاں رمزیت کم ہے۔ ژولیدہ اسلوب سے پاک و صاف ایک نکھرا ہوا اسلوب اور نغماتی زبان ہے جو کہ "جسموں کا بن باس" کی شاعری کے لئے قطعی طور پر ضروری تھی۔ لیکن جذبے کی براہ راست ترسیل کے پس پردہ ایک ایسا باضابطہ شعور ہے جس کی صورت غیر روایتی اور غیر اساطیری ہے۔ آزاد کے اشعار ایک ایسے ضبط اور ٹھہراؤ کا احساس دلاتے ہیں جو شاید اس کے کسی بھی ہم عصر میں نہیں۔ اس کی جذباتی کاوشوں میں ایک ایسا شریفانہ احساس ہے جو اسے اپنے حریف کی نارسائی پر خندہ زن نہیں ہونے دیتا اور شکستوں کی یورش میں ایسا لگتا ہے کہ گویا آزاد کا ایک قطرۂ خون دل پھیل کر اتنا بڑا سمندر بن گیا ہے کہ جس میں دکھوں اور غموں کے ہزاروں پہاڑ چپ چاپ ڈوب گئے ہیں۔ انسانی فطرت کے داخلی

خارجی محرکات کی عکاسی اور ان کی مہذب تربیت کے جو تیور آزاد کی غزلوں میں جا بجا ملتے ہیں ان کی بدولت "جسموں کا بن باس" کی شاعری کو اگلی قطار میں رکھنا ہوگا۔
جسموں کا بن باس، ڈیمائی سائز پر عمدہ گیٹ اپ اور گرد پوش کے ساتھ جلی حروف میں چھاپا گیا ہے جو پی۔ کے پبلیکیشنز کے حسنِ نفاست اور اچھے معیار کا ضامن ہے۔ انوار انجم کا سرورق بامعنی ہے۔
غزلوں کا یہ مجموعہ نئی غزل کو احساسات اور امکانات کی اس خوب صورت اور تازہ وادی میں لے جاتا ہے جہاں سے لوٹ کر آنے کو ہواؤں تک کا بھی جی نہیں چاہے گا۔

بقیہ: آدھا چاند، ....

کمرے میں صبح کی کرن دوڑی تو نیلم نے رُخ بدل کر کہا تھا۔
"تم تو بھیگی ہوئی تولیہ ہو۔ تم سے جیسے کسی نے اپنا گیلا جسم پہلے ہی پونچھ لیا ہو۔ مجھے گھن آ رہی ہے۔"
کمرہ خالی تھا اور اُس کی ہر چیز بالکل خالی خالی۔ اور خالی ذہن میں کتنے خیالات گھستے رہے، نکلتے رہے۔ بائیکولا کی بستیوں کا خیال اشارے کرتا رہا مگر اُس کی ہمت نے ان اشاروں کو کچل دیا۔ دادر کے کانی ہاؤس میں آنے والے ایکسٹرا چہروں میں ایک چہرہ اور جا ملا۔ اور پردوں پر ایک توبہ شکن انگڑائی اور اُبھری۔ زندگی میرین ڈرائیو کی خم دار سڑک کی طرح پیچیدہ تھی، مگر روشن سی۔ پیر تھکا دینے والے راستے ہر سو پھیلے ہوئے تھے جن پر قدموں کے چہرے پڑے گراہ رہے تھے۔ ▬ ▬

R N: Regd No 4253/64
P.T. Regd. No 155
PHONE NO. OFF 862 RES. 53

THE Aahang Urdu Monthly
Editor: KALAM HAIDRI
BAIRAGI, GAYA.

Hind Litho Press, Gaya.

Per Copy Rs 1-20

کلچرل اکادمی، رینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا

مارچ، اپریل ۱۹۷۴ء

شمارہ : ۴۵، ۴۶

دفتر کا پتہ،
ماہنامہ آہنگ، بیراگی، گیا

فون :
دفتر : ۶۶۲
رہائش : ۵۳

کتابت :
قمر نظامی

مطبع :
ہند لیتھو پریس بیکو ڈرگنج گیا

شرح خریداری

سال کے لئے	۱۵ روپے
دو سال کے لئے	۲۸ روپے
تین سال کے لئے	۴۰ روپے

عام شمارہ

ایک روپیہ پچیس پیسے

مرتّبین

کلام حیدری، پرکاش فکری

مزامیر

یہ مارچ اور اپریل کا مشترکہ شمارہ ہے۔

یوں تو بہار میں نارمل زندگی اس وقت بھی نہیں ہے، دور، دور جانے والی بسیں بند ہیں۔ ریل گاڑیاں شوکت تھانوی کی سودیشی ریل سے بھی آگے بڑھ گئی ہیں۔ ڈرتے ڈرتے جو لوگ مجبوراً سفر کرتے ہیں وہ ابتدا اور انتہا سے بے خبر منزل تک پہونچنے کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ بازاروں میں کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر دیگر اشیائے استعمال خال خال ملتی ہیں، عوام کے چہروں پر خوف، غصہ، ادبار، بے بسی، جھنجھلاہٹ ہے۔ ۱۵ مارچ سے ۲۵ مارچ تک تو بہار میں زندگی بالکل ہی معطل رہی۔ اخباروں میں کیا آتا ہے؟ ریڈیو کیا کہتے ہیں، لیڈروں کے بیانات میں کیا ہوتا اور کیا نہیں ہوتا، ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہماری اس ریاست میں زندگی حیران پریشان بے یقینی کے لق و دق صحرا میں ماری پھر رہی ہے۔

اسکول، کالج اور یونیورسیٹیاں بند، ہوسٹلوں کو طالب علموں سے خالی کرانے کے بعد اب وہاں کون رہے گا، معلوم نہیں۔ کچھ دن تو یونیورسیٹیاں فوجی پارکیں بنی رہیں، آئندہ کیا ہوگا؟ یہ ریاست کے چیف منسٹر سے لے کر میاں للّو تک کوئی نہیں جانتا۔

ابھی تک ہماری حکومت کی سمجھ میں یہ نہیں آیا ہے طلبا کی یہ بے چینی، ان کا یہ احتجاج کس بات کی علامت ہے۔

روزمرّہ کی زندگی درہم برہم ہو تو ادبی رسائل کا حال کیا اور مستقبل کیا؟

کلام حیدری

محتویات

مزامیر

افسانے

غزلیں

نظمیں، قطعات

مضمون

ہلال جعفری

پانچ نظمیں

(۱)

خدائے برگزیدہ
مجھے تو نے سلامت کیوں نکالا
وہ اس سرسبز و شاداب، مگر بے انت دلدل سے
جہاں میرے رفیقوں، ہم نواؤں کے لہو کی فاختائیں
اچانک سنسناتی برچھیوں کی زد میں آکر
خود اپنے جسم سے آزاد ہونے کی جہد میں
زمیں کی گود تک پہنچیں
مگر پر پھڑ پھڑا کر اُڑ نہ پائیں

●●

(۲)

گیت کے بول
اندھے گپھاؤں میں روپوش ہیں
بھیڑیے جنگلوں سے نکل کر
لپکتے ہیں آبادیوں کی طرف
کھیتیوں میں قبا چاک عفریت
چھائے ہوئے ہیں
آسماں سرخ ہے
اور سمندر میں چنگھاڑتی ہیں بلائیں
میرا ہمزاد زنداتیوں کے جلو میں
سر جھکائے ہوئے سوچتا ہے
یہ موذی، درندے
آدمی کے لبادے میں کیوں ہیں ؟

●●

ہلال جعفری

(۳)

کانچھی
میں نے پہلے بھی یہی کہا تھا
شریانوں میں لہو گرم ہے
دھان کی فصلیں کم
اب کے گر سیلاب آئے گا
بہ جائیں گے ہم

رُت بدلا
شاخیں ارزیں
کرگس ہوگئے سیر
ان کے لہو کی ارزانی کا
ماتم اور درندہ
پربت پربت جن کے نغمے
لہو لہان پرندہ
کانچھی ہیں اور زندہ !!

(۴)

میں
میرا ہمزاد
اور خطۂ آب و گل
سب
لہو میں نہائے ہوئے ہیں
ویران آبادیوں
جنگلوں
اور دریاؤں میں
ہر طرف
کاسۂ سر کا انبار ہے
اور خونی لبادے درختوں کی شاخوں میں
لٹکے ہوئے ہیں
چیختی ہیں ہوائیں

بلال جعفری

(۵)

کہو
کہانی ان فاختاؤں کی
جنھیں تیرہ بہی تیروں نے گھائل نہیں کیا
لکھو
گیت ان بطخوں کے جو غول در غول
اس وادی کے دامن میں بہنے والے
دریاؤں میں اُترے
اور میٹھے پانی کی
میٹھی مچھلیاں کھا کر خوش ہوئے

کرو
ذکر ان آہوؤں کا
جو ان دلدلوں میں غرق ہوئے
نہیں ہوئے !!

●●

عزیز احمد کی ناول نگاری

شمیم افزا قمر

عزیز احمد اردو کے ایک کامیاب ناول نگار ہیں۔ لیکن چند غیر ادبی وجوہات کی بنا پر مبصروں اور ناقدوں نے ان کے ناولوں کو وہ مقام عطا نہیں کیا جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔ مثال کے طور پر محمد حسن جب اردو ناولوں کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو جہاں ۱۹۴۷ء کے یادگار ناولوں میں شکست، [illegible] اور ٹیڑھی لکیر کا ذکر کرتے ہیں وہاں اسی زمانہ میں لکھے گئے عزیز احمد[1] کے ناول 'گریز'، 'آگ' اور 'ایسی بلندی ایسی پستی' کا نام بھول جاتے ہیں۔ اور جب آج کل کے اچھے ناولوں کا نام شمار کرتے ہیں تو آمنہ ابوالحسن کا ناول 'سیاہ، سرخ، سفید'، رضیہ سجاد ظہیر کا 'سمن' اور 'سرِ شام'، صالحہ عابد حسین کے ناول 'راہِ عمل'، 'اپنی اپنی صلیب' اور حامدہ کاشمیری کا ناول 'بلندیوں کے خواب' کا نام تجویز کرتے ہیں لیکن عزیز احمد کا 'شبنم' 'بڑے لوگ' اور 'تیری دلبری کا بھرم' کا نام یک لخت فراموش کر جاتے ہیں۔

محمد حسن لکھتے ہیں:

> [2] ...... ۱۹۴۷ء میں جن ناولوں کی دھوم رہی ... ان میں اب 'ٹیڑھی لکیر' کے نقوش ذہن پر ثبت ہیں ...... آمنہ ابوالحسن کا ناول 'سیاہ سرخ سفید'، رضیہ سجاد ظہیر کا 'سمن' اور 'سرِ شام'، صالحہ عابد حسین کے ناول 'راہِ عمل'، 'اپنی اپنی صلیب' اور حامدہ کاشمیری کا ناول 'بلندیوں کے خواب' اس دور کے اچھے ناولوں میں شمار کئے جائیں گے۔ ان میں دلچسپی، رنگینی اور کشش ہے۔

ادبی تاریخ کے جائزہ میں ایسا متعصبانہ رویہ تنقیدی اصول کے منافی ہے۔ اس طرح کے بے توازن (LOPSIDED) رویے قاری کے ذہن کو گمراہ (MIS LEAD) کرتے ہیں اور مبصر کے دیوالیہ (BANKRUPT) ذہن اور نیم برشت مطالعہ کی غمازی ہے۔ ہم عصر اردو ناول نگاری میں عزیز احمد کا مقام نمایاں ہے۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ مختصر ہے اور کسی بھی اعتبار سے چیکرڈ نہیں ہے۔ مرزا رسوا نے ایک کامیاب ناول لکھا۔ پریم چند کے ناولوں کا وصف ان کی عوامیت نگاری میں ہے جہاں بورژوا سوسائٹی کے نقش و نگار نہیں ملتے۔ مزید برآں ہیئتی اعتبار سے بھی وہ خام ہیں۔ کرشن چندر کے ناول اس لئے عظیم نہیں ہیں کہ انہوں نے افسانہ نگار کے قلم سے ناول لکھا ہے۔ عصمت چغتائی کی 'ٹیڑھی لکیر' میں عظمت کے داغ بیل

۱؎ تصنیف گریز ۱۹۴۵، آگ ۱۹۴۶، ایسی بلندی ایسی پستی ۱۹۴۷

۲؎ ڈاکٹر محمد حسن ۱۹۴۷ کے اردو ناول نیا دور لکھنؤ

ملتے ہیں مگر اس کا اختتام بھی اپنی راہ سے بھٹکا ہوا نظر آتا معلوم ہوتا ہے۔ مکالمے کی بہتات نے اسے ایک ڈرامائی رنگ دے دیا ہے۔ ان ناول نگاروں کے پس منظر میں اگر ہم عزیز احمد کو رکھتے ہیں تو وہ ان سبھوں سے تابناک نظر آتے ہیں۔

اب تک ان کے آٹھ ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ابتدائی دو ناول "ہوس" "مرمر اور خون" ان کے زمانہ طالب علمی کی تصنیف ہیں۔ یہ فنی خامیوں سے بھرپور ہیں۔ اس کے بارہ سال بعد وہ اپنا تین اہم ناول 'گریز' 'آگ' اور 'ایسی بلندی ایسی پستی' بالترتیب ۱۹۴۵، ۴۶، ۴۷ میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے بعد عزیز احمد کے تین مزید ناول 'شبنم'، 'برے لوگ' اور 'تیری دلبری کا بھرم' شائع ہوئے ہیں۔ یہ ناول اگر فنی کارنامہ کی بہت عمدہ مثال نہیں تو انہیں بہ آسانی فراموش بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا ہر ناول تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے ایک نیا تیور رکھتا ہے۔ عزیز احمد کے پیش نظر اردو ناول کا نہایت قلیل سرمایہ تھا لیکن انہوں نے روسی، فرانسیسی اور انگریزی ادب سے استفادہ کیا تھا۔ اس طرح ناول نگاری کی ایک جداگانہ راہ اختیار کی جو کم از کم اردو میں نئی تھی۔ اپنی پہلی تصنیف کے متعلق عزیز احمد رقم طراز ہیں:

> "اس زمانہ میں میں KNUT HAMSEN کی نفسیات نگاری سے بھی متاثر تھا اور خصوصاً بھوک کی ہئیت اور تکنیک کا مجھ پر بہت اثر تھا۔ ہوس میں جتنی بھی نام نہاد نفسیات نگاری ہے وہ کنوٹ ہامزن کی چھوٹی نقل ہے۔"

گرچہ اول الذکر ناول اپنی فنی خامیوں کے باعث خارج از بحث ہیں لیکن کچھ چونکا دینے والی نفسیاتی الجھنیں، باغیانہ تیور اور بے باک اسلوب کی جھلک ان ناولوں میں بھی موجود ہے۔ خاص کر نسیم اور زلیخا کی نفسیاتی کش مکش کی کچھ اچھی جھلکیاں ہوس میں نظر آتی ہیں جو بعد میں سماجی کمزوریوں کی نقاب کشائی اور ان کے ناصحانہ انداز میں فوت ہو جاتی ہیں۔ پھر بھی دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں اول یہ کہ وہ اپنے ناولوں میں ہمیشہ نئی چیز پیش کرتے ہیں۔ دوم یہ کہ وہ جو کچھ پیش کرتے ہیں اس کی پیش کش میں کہیں نہیں جھجکتے۔ اس طرح حقیقت پرستی ان کے ناولوں میں ایک اٹل قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ 'گریز' سے اُن کا فن نکھرنا شروع ہوتا ہے اور اس کا ثمر انہیں "ایسی بلندی ایسی پستی" میں ملتا ہے۔

'گریز' اپنے طرز کا ایک چونکا دینے والا ناول ہے۔ تکنیکی اعتبار سے یہ ایک کامیاب ناول سمجھا جاتا ہے۔ مصنف نے گا ہے گاہے شعور کی رو کی تکنیک برت کر اردو ناول نگاری کو ایک نئے اسلوب سے روشناس کرایا ہے۔ اس ناول میں ایک غلام ہندوستانی آئی۔ اے۔ ایس افسر کی ذہنیت کا پورا جائزہ لیا گیا ہے۔ 'گریز' زندگی سے گریز ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے گریز ہے۔ حد یہ ہے کہ اپنی محبت اور عشق کی تلخیوں سے بھی گریز ہے۔ ناول کا ہیرو نعیم بیسویں صدی کے رجحانات و میلانات کا آئینہ دار ہے۔ نہ تو اس کے پاس اخلاقی قدروں کا واضح تصور ہے نہ ہی مذہبی بندشوں کا لحاظ۔ وہ نئے علوم اور نظریات سے پوری طرح واقف ہے۔ لیکن اس آگہی نے اسے غیر مطمئن کر دیا ہے، غیر آسودہ بنا دیا ہے۔ وہ تشکیک کے کرب میں مبتلا ہے۔

لہ شبنم ۱۹۵۰ء۔ برے لوگ ۱۹۵۰ء کے بعد، تیری دلبری کا بھرم ۱۹۶۲

لہ ہوس سیکنڈ اڈیشن صہ ۱۳

برے لوگ۔ چونکہ کتاب پر DATE OF PUBLICATION کا پتہ نہیں ہے اس لئے صحیح تاریخ دینا مشکل ہے۔

رہی اس کا المیہ ہے۔ عزیز احمد نعیم کے داخلی احساسات کے ذریعہ خارجی دنیا کی تصویر میں پیش کرتے ہیں۔ جنگ کے دوران
اور غلام ہندوستان کی ذہنی اور جذباتی حالت کا تاثر پیش کرتے ہیں۔ عزیز احمد کے ناولوں کا سب سے بڑا جادو
ہے کہ وہ وقت اور زمانہ کی گردش کو اپنے ناولوں میں اس طرح جگہ دیتے ہیں کہ وقت کی دھڑکنوں کی آواز یا کرداروں کے
نس کے زیر و بم کا احساس ہوتا ہے۔ 'گریز' میں بھی یہ خوبیاں موجود ہیں لیکن 'آگ' اس کی بہترین مثال ہے۔ 'آگ'
میں وقت کی گردش اور اس گردش کا ردعمل نہایت واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے 'آگ' اس دور کا
اہم ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہیئتی ترکیب میں احساسِ زمان و مکاں اور کردار کا جو تناسب اس ناول میں ملتا
دیگر ناولوں کو کم ہی نصیب ہوتا ہے۔

ایک مراسلہ کے جواب میں عزیز احمد لکھتے ہیں کہ وہ اپنا بہترین ناول آگ کو سمجھتے ہیں۔ لیکن حال ہی میں
فیسر رالف رسل (لندن یونیورسٹی) نے "ایسی بلندی ایسی پستی" کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ دراصل ان دونوں ہی
لوں کو عزیز احمد کی بہترین تخلیق کہا جا سکتا ہے۔ 'آگ' میں ہمیں ناول کی تکنیک کا وہ سجل اور تراشا ہوا فارم نہیں
جس کی بہترین مثال 'ایسی بلندی ایسی پستی' ہے۔ لیکن اپنے موضوع کی اہمیت، تاریخی پس منظر اور وقت کے فطری بہاؤ
وجہ سے یہ ناول ہم عصر تاریخی ناول کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اردو کا ایک منفرد ناول ہے۔ واضح رہے کہ
قت کے بہاؤ کا یہی احساس اور تاریخی پس منظر قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" میں اور عبداللہ حسین نے "اداس
لیں" میں پیش کیا ہے۔ لیکن یہ بہت بعد کی تخلیق ہیں۔

'آگ' نہ مکمل واقعاتی ناول ہے نہ محض کرداری نہ یہ اکثر و بیشتر ناولوں کی طرح کردار اور واقعات کا بہترین امتزاج
نہ ہی اسے مکمل تاریخی یا ڈرامائی ناول کہا جا سکتا ہے۔ اردو ادب میں یہ اپنے طرز کی ایک نئی پیش کش ہے۔ اس کا اپنا طرز
۔ اس پر ہم کسی خاص اسلوب کی مہر نہیں لگا سکتے۔ یہ ناول دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ شنیدہ ہے۔ اس میں غضنفر جو
س کے بیٹے سکندر جو کے عشق کی کہانی ہے۔ دوسرا حصہ ایک سفر نامہ ہے۔ جس میں مصنف اپنے چشم دید تجربات پیش کرتا ہے
جو ہمیں ڈی ایچ لارنس کا ناول 'ایرونس روڈ' کی یاد دلاتا ہے۔ جس طرح لارنس نے اٹلی کو پیش کیا ہے۔ اس طرح عزیز
د نے کشمیر کو پیش کیا ہے۔ اس کا نام علامتی ہے۔ اس ناول میں کشمیر کی زندگی بالکل عریاں ہے۔ یہاں کشمیر جنت نشاں ہی نہیں
زخ بھی نظر آتا ہے۔ کشمیر کی غربت اور اس کا افلاس اس کی گندگیاں اور اس کی نجاستیں اس کے بے کس و مجبور عوام اس
جو کی ننگی مخلوق اور وہاں کی افلاس زدہ اخلاقی قدریں غرض کشمیر کی زندگی کے سبھی کربناک پہلو ظاہر ہیں۔ پھر افلاس و غربت
اضافہ کرنے والوں کی زندگی کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ جو ہر دن امیر سے امیر تر بنتے جا رہے ہیں۔ 'آگ' اس بلندی اور
کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں کردار، واقعات، فضا، ماحول، زمان و مکان اور پلاٹ سبھی موجود ہیں۔ لیکن ان تمام
اجزائے ترکیبی کے باوجود یہ ایک غیر ہیئتی ناول ہے۔ جس طرح زندگی کسی سیال مادے کی طرح بڑھتی پھیلتی اپنا راستہ خود
بن کرتی ہے اسی طرح یہ ناول بھی زندگی اور وقت کے دھارے پر بہتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ناول کسی ایک کردار یا ہیرو کو
کی مکمل ماہیت اور زندہ کردار کی حیثیت سے نہیں پیش کرتا جیسا کہ اکثر ناول میں ہوتا ہے یا خود عزیز احمد کے دیگر
لوں میں موجود ہے بلکہ غضنفر جو کے خاندان کے تین پشت پیڑھی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں یا غضنفر جو کے

آہنگ/۴۵

خاندان کو علامتی کردار مان کر کشمیر کے سرمایہ دار برطانوی طرکیبت اڈوڈ و گراشاہی حکومت ہیرو کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جو دراصل اشرار ہیں اور کشمیر کے غریب عوام ہاتو ، ہانجی وغیرہ جو مظلوم ہیں ثانوی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کردار اپنی ایک مختصر سی جھلک دکھاتے ہیں لیکن ان میں زندگی کے آثار ہیں۔ یہ انسانی نفسیات وعادات کے باریک نکتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان نفسیاتی نکتوں کی وجہ سے کردار میں حقیقت کی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جیتی جاگتی دنیا کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً لالہ جوالا پرشاد ہمیشہ ناک کی سیدھ میں چھڑی گھماتے ہیں۔ نورشاں کولھے کے بل ادھر ادھر سرک سرک کر کام کرتی ہے۔ عبدالرب گھوڑے سے اترنے کے وقت ہمیشہ بسم اللہ کہتا ہے۔ عزیز احمد ایسے ہی کرداروں کا ایک ہجوم " ایسی بلندی ایسی پستی " میں پیش کرتے ہیں جو الگ جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ مثلاً مشہور الملک کے نام کے ساتھ ہی ان کی شان دبدبہ اور اہمیت کا خیال آتا ہے یا نیازی۔ محمود شوکت اور اصغر بے حد تیز، طرار اور ہوشیار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اُن ہی کا ساتھی اور ہم عمر خاقان نہایت بھدا اور بے وقوف۔ یہ خیال صرف اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ مصنف ہمیں ان کی خصوصیات سے آگاہ کرتا ہے بلکہ ان کرداروں کے حرکات اور سکنات سے یہ نتیجہ خود ہی اخذ کر لیتے ہیں۔ عزیز احمد اطہر کے کردار کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" نورجہاں .... کیا نورجہاں کی شادی ہو گئی ؟ اس سوال پر سب ایسے ہنسے کہ سوال کرنے والا خود ہی جھینپ گیا۔ حیدر محی الدین کی والدہ نے کہا۔

" اطہر تم کس دنیا میں رہتے ہو ؟ "

" مجھے کیا معلوم تھا میں دیرہ دون میں تھا ......"

سرتاج نے اطہر کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی کسی معمہ کی طرف دیکھے۔ ساری زندگی وہ کچھ عجیب رہا تھا۔ حد سے زیادہ چھوٹا ہوا۔ حد سے زیادہ تیز...... اس کے بال اب بھی اسی طرح گھونگھر والے تھے جیسے بچپن میں تھے۔ آنکھوں میں اب بھی وہی شرارت کی چمک تھی۔ اس کا قد چھوٹا تھا مگر جسم بڑا ورزشی اور سڈول۔"

اطہر کے باطنی کردار کے ساتھ ساتھ اس کی جسمانی ساخت کا مختصر سا بیان اس کے کردار میں زندگی کی توانائی پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح ایک متحرک اطہر کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس کے عجیب ہونے کا مزید ثبوت ہمیں اس وقت ملتا ہے جب وہ نورجہاں کی شادی ہونے کی خبر سن کر اس کی محبت کی شدید کسک اپنے دل میں محسوس کرتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے اور طلاق کے بعد شادی کر لیتا ہے۔ اس محبت اور شادی کے درمیان وہ فلرٹ کرنے کی مطلق کوشش نہیں کرتا جس کا وہ عادی تھا۔

عزیز احمد اپنے کردار کے داخلی اور خارجی پہلو کو ابھارتے ہوئے اُسے رفتار زمانہ کے درمیان اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہر گردش اُن کے کردار کے چہرے اور حرکات سے مترشح ہوتی ہیں۔ مثلاً " آگ " میں سکندر جو کے متعلق لکھتے ہیں:

" جب بخار اُترا تو ایک عجیب غیر قدرتی، غیر صحت بخش سکون ان پر حاوی ہو گیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس کے حق ارادیت کو تسلیم کیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ مشورہ دیا کہ بجائے اس کے کہ انورجو اپنی بیوی کے

---

۱ ایسی بلندی ایسی پستی صفحہ ۱۶۷ ۲ آگ صفحہ ۹۵ ۔ ۲۹۶

ساتھ اس چھوٹے سے سسرال والے مکان میں لے جائے۔ کیوں نہ پورے کا پورا خاندان ہمت سنگھ ایونیو والے بڑے
مکان میں منتقل ہو جائے۔ .... لیکن خود سکندر جو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انھیں اپنے تیسرے پل والا
مکان چھوڑنے کا بڑا رنج تھا۔"

یہی احساس "ایسی بلندی ایسی پستی" میں ہمیں خورشید زمانی بیگم کے بالوں میں سفیدی دیکھ کر اور ان کی لڑکیوں کی شادی بیاہ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ پیرس بک نے ٹالسٹائی کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے بعض نسلوں کو ابھرتے اور فنا ہوتے دیکھایا ہے۔ عزیز احمد کی عظمت کا راز بھی یہی ہے کہ انہوں نے رفتار زمانہ کی گردش بے حد واضح اور صاف دیکھائی ہے۔ منشی پریم چند سے لے کر کرشن چندر تک کے ناول نگاروں میں ہمیں رفتار زمانہ کا وہ احساس نہیں ملتا۔ جو عزیز احمد کے یہاں ملتا ہے۔

عزیز احمد اپنے ناولوں میں واقعات بھی فطری انداز میں پیش کرتے ہیں۔ حادثات تقریباً مفقود ہیں یا اگر ایک دو حادثاتی واقعات ہوتے بھی ہیں تو مصنف ان پر روزمرہ کے واقعات کی مہر لگا دیتا ہے یا ان میں طنز کی چاشنی پیدا کر دیتا ہے جو ناول کی فضا میں خوشگوار ہیجان اور تجسس پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً انور جو ایک زمانہ سے فضلی کے عشق میں مر رہا تھا۔ اسے اس کی شادی کی دوسری رات ہی اچانک فضلی کے مکان میں نقب لگا کر اڑنے کا موقع میسر آجاتا ہے۔ اور وہ اس رنگین موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اسی طرح "ایسی بلندی ایسی پستی" میں جب سلطان حسین نور جہاں کو تھپڑ مار دیتا ہے اور وہ روٹھ کر ہلکان رہتی ہے اسی وقت زینت رکاب جنگ نور جہاں سے ملنے پہونچ جاتی ہے۔ اور دوسری دفعہ جب خورشید زمانی بیگم اپنی پھوپھیوں سمیت سلطان حسین کے گھر پر یلغار کرتی ہیں اور ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے تو سلطان حسین سے ملنے ان کے دوست واحباب پہونچ جاتے ہیں۔ اچھے گھرانے والوں کے یہاں یہ چھوٹی چھوٹی حرکتیں بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح کے اکثر واقعات "بڑے لوگ" کے بڑا پن پر گہرا طنز کرتے ہیں۔ عزیز احمد ان کی زندگی کا ہر نقش اجاگر کر کے ایک زہر خند کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا خیال ہے کہ کوئی نثر اس وقت تک جامع یا مستحکم نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں شاعری کا ہلکا سا خمار نہ ہو اور کوئی شاعری اس وقت تک قابل تحسین نہیں ہوتی جب تک کہ اس میں اچھی نثر کی جھلک نہ ہو۔ عزیز احمد کی نثر نگاری میں ایلیٹ کے خیال کی سچائی جھلکتی ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسی تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتے ہیں جو کسی بڑے شاعر کے اچھوتے پن کی یاد دلاتا ہے۔ وہ مہتاب جنگ کے کردار کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "نواب[1] مہتاب جنگ جن کو قدرت نے خوب صورت اور آداب محفل کے لئے کامل پیدا کیا تھا۔ کتنی مہارانیوں کے دل میں ان کا راز رہ چکا تھا ....
> .... سلطان حسین کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کا سب سے خوش قسمت انسان۔ پھر ہر ایک سے بے تکلف ہر ایک کے دوست۔ کسی کی کمر میں ان کا ہاتھ حمائل، کسی کے ہاتھ میں ہاتھ۔ کیا آداب کیا طرز گفتگو یہ اور بات تھی کہ گفتگو حد سے زیادہ سطحی۔ یہ اکبر کے زمانہ میں ہوتے تو عبدالرحیم خانخاناں کا چراغ جلنے نہ پاتا۔ ملکہ الزبیتھ کے زمانہ میں ہوتے تو لسٹر پر نظر نہ ڈالتی۔ قدرت نے عجیب غلطی کی تھی کہ اس اٹھ اٹھ کے

---

[1] ایسی بلندی ایسی پستی ص ۳۲۶

درباری کو بیسویں صدی میں پیدا کیا تھا ۔
نواب مہتاب جنگ کو " خانخاناں " کہہ کر اور " اونچ اونچ درباری " کے خطاب سے نواز کر مصنف ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے کہ اس کا ہر خط نمایاں ہے اور زندگی سے بھرپور ہے ۔ ان کی نثر نگاری کا کمال " آگ " میں بھی اسی طرح نمایاں ہے ۔ وہ کشمیر کی فضا اور ارضیت کے ایک ایک لمحہ ایک ایک پل کو اس طرح بیدار کرتے ہیں کہ فردوس بریں کا کشمیر میں بھڑکتے شعلوں کی آگ محسوس ہوتی ہے ۔ ناول میں یہ گہرائی اور گیرائی عزیز احمد کی بے پناہ قوتِ بیان سے پیدا ہوتی ہے ۔ وہ جو بھی پیش کرتے ہیں مکمل کیمیت کیفیت اور شدت کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں ۔

" ایسی بلندی ایسی پستی " کے بعد ان کے دو اور ناول " شبنم " اور " برے لوگ " منظرِ عام آتے ہیں ۔ لیکن یہ اوسط درجہ کے ناول ہیں ۔ ان میں وہ گہرائی اور گیرائی نہیں جو ان کے پہلے دو ناولوں کا طرۂ امتیاز ہے ۔ اس لئے ان پر کچھ لکھنا تضیع اوقات ہوگا ۔ مگر ۱۹۶۲ء میں اپنی آخری تصنیف " تیری دلبری کا بھرم " میں پھر وہ ایک نیا تجربہ پیش کرتے ہیں ۔ اس میں وہ فن کارانہ اصولوں کی زیادہ پابندی نہیں کرتے لیکن ان کا نظریہ (VISION) وسیع معلوم ہوتا ہے ۔ ان کے تجربات متنوع ہیں ۔ ان کی زبان تیکھی ہے ۔ اسلوب بے باک اور لب و لہجہ طنزیہ ہے ۔ یہ عناصر کسی فن کار کو عظمت عطا کرتے ہیں ۔ ایک فن کار کی نظر زمان و مکان کے حدود سے پرے ہوتی ہے ۔ اس لئے بڑے فن کار ہمیشہ باغیانہ تیور رکھتے ہیں ۔ اس ناول کا موضوع دلچسپ ہے ۔ مصنف ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی زندگی اور ان کے حرکات و سکنات کو یوروپین ممالک میں پیش کرتا ہے ۔ لیکن دراصل مصنف نے دو تہذیبوں کے تصادم کا نتیجہ الم انگیز دکھایا ہے ۔ امتیاز رنگ و نسل اور خون کا کرب ناک لاینحل مسئلہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس ناول میں عزیز احمد شاید KIPLING کے اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ۔

EAST IS EAST , WEST IS WEST

AND NEVER THE TWAIN SHALL MEET .

بہرحال " تیری دلبری کا بھرم " عزیز احمد کی بہترین تصنیف نہیں ہے ۔ اور اس مختصر مقالہ کے حدود کو قائم رکھ کر ان کی کسی تصنیف پر مفصل بحث بھی ممکن نہیں ۔ اس لئے یہ کہنے پر اکتفا کرنا پڑتا ہے کہ ان کی فنی خدمات قابلِ تحسین ہیں ۔ وہ اپنا فنی نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" .... اپنی حد تک مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ میں نے حقیقت نگاری کو ہمیشہ فوٹوگرافی سمجھا ہے ۔ ممکن ہے کبھی کبھی شیشہ دھندلا ہو یا فلم خراب ہو ، یا فلم لیتے وقت روشنی ٹھیک نہ ہو یا میری بصارت یا بصیرت میں فرق ہو لیکن میں نے زندگی کی تنقید ہمیشہ زندگی کی عکاسی کے اندر سے کی ہے ۔ اور اصلی اور نقلی کے فرق کا قائل نہیں ۔ "

دراصل فن کار کا یہی اعلیٰ ترین منصب ہے ۔ اس لئے فن کے غیر جانبدارانہ ہونے پر عظیم فن کار نے زور دیا ہے ۔ عزیز احمد ادب کو زندگی کی فوٹوگرافی کہتے ہیں ۔ لیکن وہ صرف کیمرہ کا بٹن دبانا ہی نہیں جانتے بلکہ اس کے مختلف شلث اور زاویوں کی پہچان بھی رکھتے ہیں ۔ زندگی بے حد رواں دواں و ہمہ گیر شئے ہے ۔ اس سمندر میں ہر فن کار اپنی استعداد کے مطابق پسند و انتخاب کی صلاحیت آزادی اور تخیل رکھتا ہے ۔ یہی صلاحیت تخیلاتی آزادی اور پیش کش کسی فن کار کی کامیابی اور ناکامیابی کی دلیل ہوتی ہے ۔ عزیز احمد کی کامیابی کا راز صرف ان کی کردار نگاری ، حقیقت پرستی اور واقعہ طرازی میں مضمر نہیں بلکہ ان کے فن کی مکمل پیش کش میں ہے ۔

شاہد اختر

آگ پھول اور گیت

ان لوگوں نے زمین پر ستارے بچھا دئیے
جو رات کو جگمگاتے بھی ہیں
لیکن جب قریب جاؤ
تو یہ دُور ہو جاتے ہیں
یہی تو زندگی کا رومانس ہے
گاؤ لوگو، میرے ساتھیو!
کہ زندگی کٹھن بھی ہے
اور تھوڑی بھی

پھر جنگ کے دنوں میں
جب طیاروں سے آگ پھول برستے ہیں
جن سے تمھاری بچیاں راکھ ہو جاتی ہیں
اور تمہاری بیویاں تم سے بچھڑ جاتی ہیں
تم گاتے ہی رہتے ہو
گاؤ لوگو، میرے ساتھیو!
کہ زندگی کٹھن بھی ہے
اور تھوڑی بھی
تب یہ لوگ تمہیں روکتے بھی ہیں
گانے نہیں دیتے
کیونکہ ان کے پاس ایک بے آواز میزائل کے سوا کچھ بھی نہیں
جس سے یہ تمہاری عورتوں کو داغدار کرتے ہیں
اور تمہاری کھیتیوں کو بیمار کرتے ہیں
پھر تم کیا کرو؟

●●

نظم

بے کیف دنوں کی آواز
مجھ سے کچھ کہتی ہے لیکن
میں سوچا نا چاہتا ہوں
اس ننھے سے پودے کے نیچے
جس پر کسی کی نظر نہیں پڑتی
جس کے پھول کی خوشبو دور نہیں جاتی
جس کا سایہ ایک لوری سے بڑا نہیں

اُداس راتیں سسکیاں لیتی ہیں
ان لڑکیوں کی طرح جنھیں کسی نے پوچھا نہیں
اندھیرے کے تابوت سے نکل کر
میں وہاں جانا چاہتا ہوں
جہاں ایک پرندہ
اپنی ننھی سی چونچ سے
پانی پی رہا تھا

●●

سیاہ، سفید، سُرخ

اختر اورینوی

آسمان گہرا نیلا تھا۔

اماوس کی رات کالی، طوفانی اور ڈراؤنی تھی —
آکاش بہت اونچا ہے اور کالے طوفانی بادل بہت نیچے۔ اس اونچ نیچ کو سمجھنا مشکل ہے۔ رات کی تاریکی کو دُور جھلملاتے ہوئے ستارے، مدھم مدھم روشنی دیتے رہے ہیں، جو کبھی سونا ہے کبھی روپا۔

دھرتی ہریالی اور مٹھاس، رنگ اور خوشبو اُگاتی رہی
پھر اس نے چلتی پھرتی زندگی اور توانائی، روشنی اور زیبائی اُگائی۔

سورج صبح و شام آسمان پر ہولیاں کھیلتا رہا۔ چاند دودھیا چاندنی برساتا رہا۔ اور پھر ایسا ہوا کہ فطرت نے مٹی، پانی، گرمی اور روشنی کی مدد لے کر دھرتی کی کوکھ سے آدمی اُگائے۔
آدم زاد فرشِ زمین پہ چھا گیا۔ اور آسمان کی وسعتوں کی تسخیر کے لئے اُڑ چلا۔ وہ بہت حد تک فطرت پر قابو پا گیا۔ لیکن مورکھ نے یہ نہ جانا کہ فطرت ایک عظیم قدرت کی مٹھی میں ہے۔ اسے بار بار اس حقیقت سے آشنا کیا گیا اور وہ خود پرستی میں اس سچائی کو بار بار بھولا۔

اور یہ ہوا کہ ہزاروں صدیاں گذرتی رہیں۔ پھر کہانی لکھنے والوں کے ہاتھ میں قلم آیا اور دماغ میں علم داخل ہوا۔
آدمی اپنی لاشوں کے پہاڑ پار کرتا اور اپنے ہی خون میں تیرتا ہوا ازل سے ابد جانے والی راہ طے کرتا رہا۔
میں آپ کو ایک لمحے کی سچی کہانی سناتا ہوں۔ لیکن لمحہ اکیلا نہیں ہوتا۔

ایک افسانہ نگار کے یہاں چیکوسلواکیہ کے نہایت خوش دل پرافسر آئے اور اُس کے ساتھ بودھ تہذیب کے آثار دیکھنے گیا اور نالندہ گئے۔

کئی دن دونوں کا ساتھ رہا۔ پرافسر صاحب علامہ اقبال پر تحقیقی کام کر رہے تھے اور بہت باخبر تھے۔ افسانہ نگار اُنہیں دیکھ کر، اُن سے باتیں کر کے انگریز شاعر کیپلنگ (KIPLING) کے خیال کو غلط اور جرمن شاعر و مفکر گوئٹے کے رویے کو صحیح سمجھنے لگتا ہے۔ جیسے پرافسر کی ذات میں مغرب و مشرق مل گئے تھے اور وہ مغرب کا سلام مشرق کو پہنچا رہے تھے
بودھ گیا کی فضا میں فسانہ نگار پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ لمحے مل کر زنجیرِ لمحات بنے۔ اور یہ زنجیر نوعِ بشر کی المناک تاریخ کے روپ میں ڈھل گئی۔
سرسبز زمین پر خون کی نہریں بہنے لگیں۔ خون کے چھینٹے اور دھلے جم کر سیاہ ہو گئے۔ آدمیوں کی کھوپڑیوں کے مینار سورج اور چاند کی کرنوں کی اوٹ بن گئے۔ تارے اوجھل ہو گئے۔ بچوں، عورتوں، بوڑھوں کی بے گور و کفن ننگی لاشیں تہذیب انسانی کا کھلا ہوا عجائب خانہ بن گئیں۔
شہر کے شہر دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے۔ طاقتور سائنس داں قوموں نے گاؤں کر بچوں اور جوانوں کی ہڈیاں کھیتوں میں بکھیر دیں تاکہ لوگ علم تشریح اعضا سیکھیں، اور آدم زاد کے سڑے ہوئے جسم کی کھاد سے فصل اچھی پیدا ہو۔

فن کار نے دیکھا کہ ہر شخص کے ہاتھ میں اپنے اپنے
انفیں ہیں اور بڑے بھلے کی ناپ تول کے جدا جدا
ترازو ۔

فن کار اور پرافسر دودھ منڈ دیکھ کر نئے بنے ہوئے
طرف چلے ۔ پرافسر صاحب بہت سی باتیں دریافت
نے مگر فن کار زیادہ ترچپ ہی رہا ۔ دونوں سیگوڈا
سڑک پر آ نکلے اور پرافسر صاحب مختلف زاویوں
کھینچنے میں مشغول ہوگئے ۔ کسی دکان پر کوئی غیر ملکی ریڈیو
کر رہا تھا ۔ ہوا کی رگوں میں نفرت اور حسد کے انجکشن
انہ حب الوطنی کے ساتھ دئیے جا رہے تھے
سڑک کے کنارے کوڑے کے ڈھیر پر ایک مرا ہوا
پڑا تھا ۔ پاس میں ایک حاملہ کتیا محبت ، غم ، امید
لے جلے احساسات کی نظروں سے مردہ پلے کو
یکھ رہی تھی ۔ کبھی وہ اٹھتی ، کبھی بیٹھتی ، کبھی پلے کو
آہستہ اپنے جبڑوں کے بیچ داب لیتی ۔ آگے بڑھتی اور
رکھ دیتی ۔

کتیا بے حد بے چین تھی ۔ اُس کا پیٹ اپنے جسم پہ لینے
ں کے بوجھ سے پھولا ہوا اور بھاری تھا ۔ برسات کی
پ نکلی ہوئی تھی ۔ ڈیڑھ یا دو بجے ہوں گے ۔ اُمس
رحدت بھی ۔ کتیا دم لے لے کر مردے پلے کو زندہ کرنا
۔ کوڑے پر پڑے ہوئے بے جان پلے کو وہ اپنے منہ اور
سے پیار کرتی پھر اپنی جھولتی ، گدرائی چھاتیاں پلے
ڈالنے کی کوششیں کرتی کرتی تھک جاتی اور کوڑے
طرف ہو بیٹھتی ۔ ابھی تو وہ حاملہ تھی ۔ اس کی چھاتیوں
چھوٹے کوزوں میں زندگی بخش دودھ بھرا نہیں تھا ۔
، کو ب اور حسرت سے مردہ پلے کو تک رہی تھی ۔
یک پرافسر کئی فوٹو کھینچ کر افسانہ نگار کے قریب آیا
بیٹھ گھبرا گئی ۔ فن کار اپنے خیالات میں محو تھا ۔

صبح کے اخبارات کا ایک ایک لفظ غصے سے چیخ رہا تھا ۔ مختلف
ملکوں کے ریڈیو گرج رہے تھے ، چنگھاڑ رہے تھے ۔ جنگ کے
مہیب سیاہ دیو اپنے بھیانک پر پھیلائے فضا میں اُڑ رہے تھے
آدم زادوں کے دل کے افق پر آگ لپک رہی تھی ۔ اُن کے
افکار و بیانات آتشیں لاوا اُگل رہے تھے ۔ کلاکار احساسات
و جذبات کی جوالا مکھی میں گرفتار ہو گیا تھا ۔ وہ دیر سے پرافسر
کی طرف متوجہ ہوا اور اُس نے کتیا اور مردہ پلے کی طرف اشارہ
کر دیا ۔

کتیا بڑے جوش سے اُٹھ کر پلے کی طرف بڑھی اور اپنی
ایک چھاتی اُس کے منہ میں ڈالنے لگی ۔ اچانک ممتا کا گہرا سوتا
پھوٹ پڑا اور اُجلے دودھ کی دھار چاندنی کی طرح مرے
ہوئے پلے کے منہ پر پھیل گئی ۔ پرافسر کے کیمرے کی ' کلک '
سنائی دی ۔ فن کار حیرت زدہ تھا ۔ حیات ، موت کے پہلو
میں کوڑے پر بہہ رہی تھی ۔ اور یہ معجزہ فلم بند ہو چکا تھا ۔

افسانہ نگار نے اپنے آپ سے سوال کیا ۔ کب جیون
کی چتا سے محبت کی اُجلی گنگا بہ نکلے گی ؟

چاپ سے بھرے منظر

پتھروں میں چپ ساکت ہوئی
یہ کس نے شبنمی لباس اوڑھ کر
سورج کو دعوت دی تھی
اور یہی وہ جگہ ہے جہاں سے میں آباد ہوں
تم نے کہا تھا : جستجو اور چشمہ ......
کچھ بھی ہو ہرا کائی دوئی نہیں
مانا کہ ابجد کا ایک ہی حرف کافی ہے
یوں پیاس کا مطلب آرام بھی ہے
ایسی انہونی میں میں اور تنہائی
اکیلے بے پل چاند میں گم سم
پیچھے کی سرگوشیاں اور بیل کی کٹی شاخ
اپنے پرندوں کا مفہوم ڈھونڈنے میں کوئی جگنو پاس نہیں آیا
برسات نے سارے رنگ بہا دیئے
اس بار ایک ہی اکہرا موسم
تم دور سے مسکراتے ہو
بجھتے کولوں کا سنگیت مری نس نس میں ڈولتا ہے
تاریک ہوتے خوف اب جاگتے ہیں
میں تھک گیا ہوں سانس کی حکمرانی سے
تم مرا کابوس ہو یا کر کچھ .....
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دھوپ آ بھی جائے
تو الگنی پر پڑے کپڑوں کا بسیرا جاری ہے
جو چاہے نقش دیا رنگ کہاں ؟
اب جو پردے سرسراتے ہیں
ایک محدود آسمان کے نیچے ترا سراب ہے
اور خزاں کا سکون ایک نظر آنے والا منظر نہیں
تم ہوتے تو میں کہتا .....
آؤ اس بار چاپ کا خاتمہ
کسی نحیف قلعہ کے سربستہ تہ خانہ میں ہوتا ہے یا نہیں
دیکھیں !

●●

اکرام باگ

ھجر

چاندنی بہ گئی راستے بجھ گئے
نیم کی پتیوں پر
جدائی کے الفاظ روشن ہوئے
سوختہ جان میں کوئی کانٹا نہیں
صرف ملبہ ہے کہتے ہیں جس کو مکاں
سیڑھیوں پر مگر
کچے پکے نشان
آنکھ بھی سانس کی گنتی سے تو اترتی نہیں
زندگی ریگ ہے موت ہے تشنگی
تو گر کر رخش سراب

اور میں
دھوپ چہرہ سے رس کے ابھی تک تو ٹوٹی
نہیں
کب کہ ماتم ہوئیں چھاؤں کی بدلیاں
دستخط سے بدلتا ہوا کارواں بڑھ گیا
میں کہ مقسوم ہوں چار جانب یہاں
بے گجر صبح شائد جھپٹنے کو ہے۔

●●

خلیل تنویر

آگ کا سفر

جب ہم چلے تھے ہمیں اپنی آگ کا احساس تھا۔ پھر
رفتہ رفتہ وقت گزرتا گیا۔ ہم نے آگ کو مقدس
جان کر پوجنا شروع کر دیا، اب آگ سے ہم ڈرنے
لگے اور آگ ہمیں جلاکر راکھ کرتی رہی۔

••

نافہمی

تم نے اُسے صلیب سے پہچاننے کی کوشش کی
مگر تم اُسے پہچان سکے؟ تم نے اُسے
صرف صلیب سمجھا۔

••

پہچان

تم سے میری پہچان، سارے رشتے اُسی
ایک شخص کے قریب آنے سے بنے۔ اور اب جب کہ
وہ مجھ سے بہت دُور چلا گیا ہے۔ وقت نے تم سے
میری پہچان بھی چھین لی ہے۔ اب میں تمہارے لئے
اجنبی ہوں۔

••

سزا

ہر رات ہمیں ایک ریگستان میں
بھٹکنا پڑتا ہے اور ہماری پیاس نہیں بجھتی
جانے کب یہ اننت سفر ختم ہو؟
جانے یہ کون سی سزا ہے۔

••

کشتی کا سفر

کشتی سے اُترتے ہوئے لوگوں کے چہروں
پر خالی پن کا احساس بُری طرح جھلکتا ہے۔
آدم کی کہانی بھی تو کشتی کے سفر کی کہانی ہے۔
وہ جب بھی سناٹے کی حد پار کرتا ہے ایک
آواز سنائی دیتی ہے تم کسی اور ہی کشتی میں
ہو۔ اُس کے ہاتھ سے پتوار چھوٹنے لگتے ہیں
روشنیاں بجھنے لگتی ہیں۔

••

انل رسن رائے

ماں کی موت

حاملہ عورت معمولی یا غیر معمولی کسی بھی حالت میں
غیر حاملہ عورت سے زیادہ جنسی بھوکی ہوتی ہے۔ اور اپنے
محبوب سے زیادہ انس رکھتی ہے۔

زیادہ سکھ دینا اور زیادہ سکھ حاصل کرنا چاہتی ہے
اس کی زبان اور رانوں کا ناخن بڑھ جاتا ہے۔ بڑے ناخن اس
اس خارش اس ناخن کا مداوا کریں۔ حاملہ عورت یہی چاہتی ہے۔

میری ماں اگر زندہ ہوتی۔ میری ماں کا انتقال کینسر میں
ہوا جس وقت وہ مری تو اس کی رانوں کے درمیان [illegible] زرد
گاڑھا سیال خارج ہو رہا تھا۔

یہ بات میں نے ان عورتوں سے سنی جو [illegible] کا
اظہار کرنے کے لئے آئی تھی مگر انہوں نے زیادہ [illegible]
تمام [illegible] استعمال کیا، یا گاڑھے سیال مادے کے [illegible]
جو انہوں نے اس وقت دیکھا تھا، جب میری ماں کو نہلایا جا رہا تھا۔

میں یہ باتیں اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ میں آپ کو
اپنے خاندانی رازوں میں شریک بنانا چاہتا ہوں، بلکہ
یہ اس وقت کی بات ہے جب رشتے کی تمام عورتوں نے (جو
ان کی زندگی میں ان سے انتہائی محبت کا اظہار کرتی تھیں) انہوں
نے نہلانے سے انکار کر دیا۔

میں اپنی ماں کو خود نہلانا چاہتا تھا۔ جب میں وارڈ
سیون سے اپنی ماں کی لاش لئے مردہ خانے جا رہا تھا۔ اور جب
لاش ایمبولینس میں رکھی جا رہی تھی تب میں نے پہلی بار زرد
سیال بہتے دیکھا تھا۔ میں اسٹریچر کے دائیں پاؤں پھیلائے اینٹ
اسٹول نما کرسی پر بیٹھا تھا۔ میرا ایک پاؤں اسٹریچر کے پچھلے پہیے
سے ٹکرا رہا تھا۔ اور زرد سیال میرے گھٹنے پر بہہ رہا تھا۔

جب ہم وارڈ سیون سے باہر نکل رہے تھے۔ تب مجھے
اس نرس نے کہا تھا کہ وہ بیڈ نمبر ۱ کی لڑکی آپ کو بلا رہی ہے
اس نرس کی چھاتیاں پتہ نہیں کیوں مجھے مصنوعی سی لگیں۔

بے بی میری چھوٹی بہن ہے، کچھ زیادہ چھوٹی نہیں تھی
میرے ہسپتال آنے سے اس کی ڈھارس بندھ گئی تھی۔ پچھلے کئی
دنوں سے وہ ہسپتال ہی میں تھی، شاید دس دن سے، کیوں کہ
دس دن ہی یہاں میری ماں کو موت کے انتظار میں لگے تھے۔

میں نے ایک مرتبہ بے بی کی طرف دیکھا۔ جو نرس کی
مصنوعی چھاتیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے خوشی
تھی کہ اس لڑکی نے ہمیں بلایا، پتہ نہیں کیوں۔ شاید اس لئے کہ
گزشتہ دس دن میں سے آٹھ دن میں نے اس کی خوش فہمی میں گزارے
تھے۔

سیال میرے گھٹنے سے بہتا ہوا میرے جوتے میں داخل ہو گیا
ہے ایمبولینس تکنیکی خامی کی وجہ سے رک گئی ہے ....
... ڈرائیور ہیلپر کو گالی دے رہا ہے۔ ماں ....!
ہینڈل لا ......

اگر اس وقت کوئی مریض ایمرجنسی میں ہسپتال لے
جایا جا رہا ہوتا تو ... ...

بے بی مجھ سے کہہ رہی تھی۔ بھائی جان وہ لڑکی میری
دوست بن گئی ہے ہم اس لڑکی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

مجھے اب تک معلوم نہیں کہ حاملہ عورت کی رانوں اور زبان کا لالچ معمولی یا غیر معمولی عورتوں سے کہیں بڑھ جاتا ہے، بہت زیادہ سکھ اور کم سکھ میں کیا فرق ہے۔ میں نے اگر کہیں پڑھا تھا تو اس کی تفصیل کہاں ہے۔ اگر میری ماں زندہ ہوتی تو پھر۔

اس نے کہا تھا کہ آپ بے بی کو مجھ سے ملانے لائیں گے کیا؟ ہم لوگ سوسائٹی میں ہیں۔ اور بہت سی باتیں۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ہمارے گھر ضرور آئیں۔ بہت اچھی لڑکی ہے، آپ کی ماں کی موت کا افسوس میں اس لئے نہیں کروں گی کہ ..... مگر نہیں ...... میری ممی نے اب تک شادی نہیں کی، پتہ نہیں کیوں۔ مجھے تو بس اتنا پتہ ہے کہ روز اس بنگلے کا مالک ایک نیا شخص ہوتا ہے۔ ممی کتنی بے وقوف ہیں بلکہ کتنی معصوم، وہ سمجھتی ہیں کہ میں کچھ نہیں سمجھتی۔

وہ بڑبڑاتی رہی اور ہم وارڈ میں سے باہر آگئے۔

بے بی نے مجھے بتایا کہ اس لڑکی نے کل اسے ایک لاکٹ دیا تھا چاندی کی زنجیر میں کانسی کی مریم۔

سب عورتیں ہماری طرف ہمدردی سے دیکھ رہی تھیں مگر پتہ نہیں کیوں مجھے ان کا اس طرح دیکھنا قطعی اچھا نہیں لگا۔

زرد سیال میرے جوتے میں بھر چکا ہے۔ بے بی اسٹریچر کے سرہانے بیٹھی ناک اور منہ سے بہنے والا سیال صاف کر رہی ہے، مجھے ایسا لگتا ہے یہ آنکھوں اور ناک سے بہنے والا سیال ان کی آخری نہ ہونے والی گفتگو ہے۔

میں نے بہت سے سینئر دوستوں سے پوچھا تھا۔ یہ حاملہ عورتیں معمولی یا غیر معمولی جنسی عورتوں سے زیادہ جنسی بھوکی کیوں ہوتی ہیں۔ وہ چپ ہو جاتے ہیں۔ جیسے یا تو مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں یا انہیں اپنی کم علمی کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے ——

بے بی زرد سیال صاف کر رہی ہے۔ ایمبولینس پھر اسٹارٹ ہو چکی ہے۔ میلیر لڑکے کے پتہ نہیں کتنے رشتہ داروں سے ڈرائیور نے جنسی رشتے قائم کئے۔ ہم گالیاں دیتے وقت صرف رشتہ داروں کو گالیاں دیتے ہیں جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں یا جن سے ہمیں سب سے زیادہ نفرت ہوتی ہے۔

میری دوست لڑکیاں اور عورتیں بھی اس مسئلے پر گفتگو کی ذرہ برابر بھی ہمت نہیں رکھتیں حالانکہ بہت سی اس مرحلے سے گزر چکی ہیں اور جو باقی ہیں انھیں گزرنا ہے۔

بے بی سیال صاف کر رہی ہے۔ اس کا چہرہ مجھے بالکل کانسی کے مجسمے کی طرح لگ رہا ہے، پتہ نہیں کیا سوچ رہی ہے اس کے گلے میں لٹکی ہوئی کانسی کی مریم مجھے اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے (ENCOURAGE) کر رہی ہو اور چور نظروں سے پادری کی طرف بھی دیکھ رہی ہو۔ عجیب خوف زدہ معصومیت ہے۔

اگر میں اس سے پوچھتا۔ اس حاملہ عورت کی جنسی بھوک رانوں اور زبان کا سکھ دینے اور سکھ لینے کی خواہش۔ تو وہ کیا کہتی لیکن کیا میں ان سے یہ بات پوچھ سکتا تھا۔ ؟؟

ایمبولنس میرے گھر کے سامنے رک چکی ہے۔ میرے رشتہ دار جنھوں نے زندگی بھر میری ماں کی مخالفت کی، ایک دوسرے سے رونے میں سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے کپڑے میں نے اپنی بغل میں دبا رکھے ہیں۔ بے بی مجھ سے چپکی ہوئی کھڑی ہے۔

مجھے پتہ نہیں کس کس نے مل کر اس کو ایمبولنس سے اتارا تھا زور زور سے روتے ہوئے لوگ، ایسا لگ رہا تھا جیسے بے وقوف مسخرے اوور ایکٹنگ کر رہے ہوں۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ مجھے اور بے بی کو کبھی کبھی اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ہم سیٹ پر لگے ہوئے کیمروں کے آئی لینس ہوں۔

عورتیں اپنے رشتے یاد دلا کر رو رہی تھیں۔ بے وقوف میں نے اس کو دیکھا تھا وہ اس وقت بھی مسکرا رہی تھیں جیسے مجھ سے کہہ رہی ہوں، دیکھو ان سب بے وقوفوں کی اداکاری دیکھو

انہیں اداکاری کے بیچ بھی دیا نہیں آتے۔

بے بی مجھے دیکھ رہی ہے اور کانسی کی مریم بے بی کو جیسے وہ ہماری اداکاری نہ کرنے پر ناراض ہو۔

نہلانے والی عورتوں نے انکار کر دیا ہے، دو کو تو قے آ چکی ہے رشتے کی تمام عورتیں اپنی تمام ہمدردیاں سمیٹ کر کونے میں چپ کھڑی ہیں۔

بے بی مجھ سے کہہ رہی ہے۔ بھائی جان ہم خود کیوں نہ امی کو نہلا لیں۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ بالکل کانسی کی مریم۔ میرے جوتے میں سہال ہے جب میں چلتا ہوں تو عجیب آواز پیدا ہوتی ہے جیسے کتے برتن چاٹ رہے ہوں۔

میں اپنی پوری قوت سمیٹ کر کہتا ہوں۔ ہٹ جاؤ تم سب۔ ہم خود اپنی ماں کو نہلا لیں گے۔ کیوں بے بی۔ اور وہ میری طرف دیکھتی ہے جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

اور لوگ ــــ لوگ تو ہمارے وجود کا احساس ہی نہیں رکھتے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ مرد عورتوں کو نہیں نہلا سکتے۔ کوئی کہتا ہے۔ اس لڑکے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مگر میں بضد ہوں۔ آخر کیا وجہ ہے، ماں تو میری ہی ہے نا۔ کیا میں جس کی کوکھ سے پیدا ہوا ہوں اس کو نہلا بھی نہیں سکتا

سب لوگ چپ ہو جاتے ہیں۔

اس دن میں نے سب کے سامنے سگرٹ پیئے اور اپنے تمام دوستوں سے خوب قہقہے لگا کر باتیں کیں۔ جیسے مزدور بھاری شہتیروں کے درمیان باتیں کرتے ہیں سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مگر میں نے سب مجبور ڈسپلن توڑ دیئے۔ بے بی بھی مجھے دیکھ کر ہنس رہی ہے لیکن کبھی کبھی بالکل خاموش ہو جاتی ہے۔ اس نے ایک بار پھر مجھ سے پوچھا، بھائی جان' آپ امی کو کیوں نہیں نہلا سکتے۔ میں نے کہا تھا ہم سب مجبور ڈسپلن کا شکار ہیں۔

مجھے ایک بات یاد آ رہی ہے میں نے ایک گرگٹ دیکھا تھا۔ اس کے گرد کچھ کوے بیٹھے تھے۔ اور وہ ان سے اپنی دم بچانے کے لئے مسلسل کود رہا تھا مگر کوؤں کو جب بھی موقع ملتا وہ اس کی دم پکڑ لیتے اور تھوڑی بلندی پر لے جا کر پٹک کر زمین پر چھوڑ دیتے ہیں، اور زمین پر گرتے ہی اسے پھر گھیر لیتے ہیں۔ مگر وہ گرگٹ بھی عجیب تھا۔ کئی بار موقع ملنے کے باوجود وہ وہاں سے بھاگا نہیں۔ مجھے اپنے چاروں طرف کوے نظر آ رہے ہیں جو میری دم پکڑنا چاہتے ہوں۔ مگر میں گرگٹ نہیں ہوں۔

دفنانے کے چوتھے روز سب لوگ چلے گئے۔ وہ شخص مجھے رتو بار میں ملا تھا جس کے بارے میں سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ عمر پچیس اور تیس کے درمیان ہو اور کم از کم چھ ماہ کی حاملہ ہونا ضروری ہے۔ اس بے وقوف نے مجھے اس طرح دیکھا تھا جیسے میں یا تو بہت جذباتی ہوں یا اوور ایکٹنگ کر رہا ہوں۔ میں نے دوبارہ دہرایا، سمجھے عمر ۳۵ تک چل سکتی ہے مگر حمل چھ ماہ سے کم نہیں۔ اور معاملہ سو روپے میں طے ہو گیا۔

کمرہ بہت اچھے انداز سے سجا ہوا تھا، تھوڑی دیر بعد وہ آ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی، میرا چہرہ بیس سال سے زائد کا محسوس نہیں ہوتا۔ وہ چپ میرے سامنے بیٹھی رہی اور میں وسکی کی بوتل خالی کرنے میں مصروف رہا۔

اب وہ کپڑے اتار رہی تھی سات ماہ کے پیٹ کا ابھار نیچے کی طرف ڈھلک کر، اوپر کو اٹھے ہوئے پستان چوڑے چکلے کولھے، سونے کی سل جیسی چمک دار پنڈلیاں، رانوں کی گلابی جلد کے نیچے سبز نسوں کا چمکدار جال، میں نے اس سے پوچھا، حاملہ عورت زیادہ سکھ، مگر وہ مجھے اسی حیرت زدہ انداز سے دیکھتی رہی پتہ نہیں کیوں۔

وہ پھر میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کئی بار پیٹ کے ابھار کو چھو کر دیکھا لیکن نہ تو وہ شرمائی اور نہ میں اس سے

آگے بڑھ سکا۔

نائیلان کا ہلکے نیلے سلیپنگ گاؤن پہنے وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے کئی بار اشارے سے مجھے بلایا۔ مگر پتہ نہیں کیوں میں اٹھ نہیں سکا۔

رات بھر بیڈ پر وارڈ سیون کی وہ معصوم لڑکی سوتی رہی۔ اور میں یہی پوچھتا رہا، حاملہ عورت، معمولی یا غیر معمولی جنسی عورتوں سے زیادہ جنسی بھوکی کیوں ہوتی ہے۔ دیوار پر لٹکی ہوئی کانسی کی مریم بے بی اور میری ماں۔ بار بار آکر مجھے دیکھتی رہیں۔

کلاک نے چھ بجائے وہ جلدی سے اٹھی اور اس نے پوچھا تم اب تک سوئے کیوں نہیں۔ بالکل میری ماں کی طرح میں کھڑا ہوگیا اور کہا کہ میں جانا چاہتا ہوں۔ وہ مین گیٹ تک میرے ساتھ آئی۔ چلتی ہوئی حاملہ عورت بھی عجیب لگتی ہے۔

جب میں دروازے سے نکل رہا تھا تو اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور سرد ہونٹوں کا ایک طویل بوسہ میرے ماتھے میں جذب ہوگیا۔ بالکل میری ماں کی طرح۔ میں اب تک نہیں جان سکا۔ حاملہ عورت معمولی یا غیر معمولی جنسی عورت سے زیادہ جنسی بھوکی کیوں ہوتی ہے۔ زبانوں اور رانوں کا لالچ کس طرح بڑھتا ہے۔ زیادہ سکھ دینا اور زیادہ سکھ لینا یہ سب کیا ہے۔!!

بیان ملکیت و دیگر تفصیلات

ماھنامہ آھنگ، بیراگی، گیا

فارم IV رول نمبر ۸

مقام اشاعت	محلہ بیراگی، گیا
مدت اشاعت	ماہنامہ
پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کا نام	کلام حیدری
ملکیت	کلام حیدری
زبان	اردو

میں کلام حیدری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفاصیل میری دانست میں صحیح و درست ہیں۔

دستخط: کلام حیدری

نازش انصاری

قطعات

نہ خلوتیں نہ کوئی اور انجمن ملتی
قدم قدم پہ اداسی کی خیمہ زن ملتی
سکوتِ دشت دلوں کے قریب تھا ورنہ
تمام شہر میں آواز بے کفن ملتی

شہر گردی ہی مقدر ہے تو پھر
گھر میں ہی مرا رہنا ٹھیک تھا
آنکھیں اپنی آئینے کو دے کے آج
اپنی آنکھوں میں تماشا بن گیا

دکھ اٹھاتے ہیں تپتے سورج کا
سرد تاروں کا غم بھی جھیلتے ہیں
ہم وہ مقتل نشیں ہیں جو اکثر
زندہ رہنے کا کھیل کھیلتے ہیں

قلبِ حساس پہ وہ اک لمحہ
سوچئے تو گراں گزرتا ہے
جب کہ پتھر کا کوئی سوداگر
دل سے شیشے کا مول کرتا ہے

کبھی آکاش پہ چلتے کبھی جل کے پگھل جاتے
ہواؤں سے الجھتے اور صداؤں پہ مچل جاتے
دلِ گوشہ نشیں کے ہم عقیدت مند تھے نازش
مزاجِ دل بدل جاتا تو کچھ ہم بھی بدل جاتے

بازی گر کا دوسرا سفر

شفق

وہ کون سی چیز ہے جو زمین سے بھاری اور آسمان سے اونچی ہے؟

سُرخ تھال کا نرچھاکنارا پانی کو چھو رہا تھا۔ ہوا بالکل بند تھی، فضا میں عجیب سی گھٹن تھی جیسے کوئی تبدیلی ہونے ہی والی ہے۔ کشتی سبک رفتاری سے منزل کی طرف گامزن تھی اور وہ اطمینان سے بیٹھے بیڑی کا دھواں اُڑا رہے تھے اور اپنے سوال کے جواب کے انتظار میں میرا منہ تک رہے تھے۔

یہ سوال مجھ سے دوسری بار پوچھا گیا ہے۔ پہلی بار جب میں اس سوال کا جواب دے چکا ہوں پھر کیا بار بار ایک ہی جواب دینا مناسب ہوگا کہ وہ مقام بہت پیچھے چھوٹ گیا۔ جہاں اس سوال کا جواب آسان تھا ٹھوس تھا اور وہ مطمئن ہو گئے تھے مگر اب کشتی بہت آگے بڑھ چکی ہے سورج ڈوبنے والا ہے۔ میں چپ ہوں مگر میرے اندر گذرے لمحوں کی کہانی لکیریں بن بن کر پھیل رہی ہیں میرا دل چاہتا ہے میں انہیں ایک ایک کہانی سنا دوں، جب وہ منزل سے مایوس ہو چکے تو میں نے مجذوب بن کر باتیں کیں، وہ چونکے اُن کے اندر سویا ہوا درندہ جاگا تو وہ میرے پیچھے ہو لیے، میں نے اپنی قمیص پھاڑ کر بانس پر لٹکائی پرچم بنایا اور معرکے سر کر ڈالے، اور جب میں سلاخوں میں قید کر دیا گیا تھا وہ نامعلوم شخص میری مدد کو آیا اُس کے اشارے پر سلاخیں پگھل گئیں، وہ مجھے ساحل پر لا کر ایک کشتی میں بٹھا گیا کہ یہاں سے چلے جاؤ، تمہارا سفر بہت طویل ہے، یہاں تمہاری ضرورت ختم ہو چکی ہے یہاں کے لوگ کبھی بیدار نہ ہوں گے اور تب سے اب تک میں کشتی پر ہوں، میں اُنھیں سب کچھ بتا کہ میں نے کن کن لوگوں کو کشتی میں سوار کرایا ہے اور ا ان کے گھروں تک پہنچایا ہے مگر میں کچھ نہیں کہتا کہ وہ خو ہو جائیں گے اور کیا پتہ مجھے ہی ڈرا کہولا سمجھ لیں جو ہزا سال سے ہزاروں روپ میں انسانوں کو [illegible] تب ہی کسی کی نظر سُرخ تھال پر گئی اور وہ خوف سے چلا وہ دیکھو وہاں ......

سب نے بیڑیاں پانی میں پھینک دیں۔ دھواں میں گھونٹ لیا اور خوف سے تھر تھر کانپنے لگے۔

چند لمحوں میں یہ تھال سمندر کے گہرے پانی میں جائے گی۔ پھر تمہارا پرسکون چہرہ بھی نظر نہ آسکے گا، ہما چہرے بھی سروں سے غائب ہو جائیں گے۔ ہمارے بزرگو صدیوں پہلے آنے والے اس طوفان کی نشان دہی کی ہے طوفان آرہا ہے ساری علامتیں وہی ہیں' سب کچھ دہی تم سن رہے ہو تم ہمیں بچا سکو گے، ہمیں ہمارے بچوں پہنچا سکو گے؟ ابھی تو ساحل بہت دور ہے ہم کیا کریں

وہ رونے لگے تو میں نے اُنہیں سمجھایا، میری کشتی ہمیشہ صحیح سلامت منزل پر پہنچی ہے اسے کبھی حادثہ نہیں آیا، میں تمہیں تمہارے گھروں تک ضرور پہنچاؤں گا مجھ پر بھروسہ رکھو۔

وہ سب خوف زدہ تھے، میں پُرسکون تھا کہ میر

کانوں میں ہر وقت گونجتا رہتا ہے۔

تم زندہ رہو گے، تمہاری زندگی تمہاری موت ہے۔

سُرخ تھال کے بیچ اُبھرنے والا سیاہ نقطہ اپنا حجم بڑھا رہا تھا اور کہیں دُور گرجتے ہوئے طوفان کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ میں نے بادبان لپیٹ دیئے اور پتوار مضبوطی سے تھام طوفان کا انتظار کرنے لگا۔ پھر سورج ڈوب گیا اور اندھیرا پھیلتے ہی گرجتا ہوا طوفان میری کشتی پر چڑھ دوڑا۔

میرے ہم سفروں کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے طوفان کی شدت محسوس کرتے ہی چیخ کے ساتھ اوندھے مُنہ کشتی میں گرے اور پھر شاید بے ہوش ہوگئے کیونکہ اُن کے جسم ساکت ہو چکے تھے۔

دیو پیکر موجیں اپنا بھیانک جبڑا پھیلائے کشتی نگلنے آتیں اور میر ... سکے ان وعزم سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتیں میرے بازو پتوار چلاتے چلاتے شل ہوئے جا رہے تھے مگر میں عہد کر چکا تھا یا تو ساحل پر پہنچوں گا یا کوئی لہر میرا جبڑا اُڑا دے گی مگر پتوار رکھ کر بے بسی کی موت کا انتظار نہیں کروں گا میں کشتی آگے بڑھا کر طوفان کی زد سے نکلنا چاہتا تھا اور طوفان مجھے اپنے ساتھ بہالے جانا چاہتا تھا۔

اس کشمکش میں رات گذر گئی اور طوفان آگے بڑھ گیا۔

میں نے ان لوگوں کو اُٹھایا، انھوں نے آنکھیں کھول کر غور سے میرا چہرا دیکھا، پھر اپنا جسم ٹٹولا، پھر کشتی ٹٹولی، پھر میرا ہاتھ تھام کر اُس پر اپنا چہرہ رگڑنے لگے ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

تم ہمارے محسن ہو، تم نے ہمیں دوسری زندگی دی ہے ہمارے بچے ہمیں ہمیشہ بے گنوں ... یاد رکھیں گے۔ ہماری بیویاں فطری عمل کے دوران ہمیں اپنی کوکھ میں چھپا لیں گی۔ اپنی دودھ بھری چھاتیوں پر تمہارے ہونٹوں کا لمس محسوس کر کے بے خود ہو جائیں گی۔

وہ جذبات سے بے قابو ہوئے جا رہے تھے، اُن کی نظروں میں اُن کے بچے گھوم رہے تھے اُن کی مائیں، اُن کی منتظر بیویاں ان کے مویشی، رستہ تکتی نگاہیں، قدموں کی آہٹ پر منتظر کان..... ساحل کی طرف بڑھتے ہوئے تیز تیز قدم۔

میں نے اُن سے کہا، اب میں تمہارے سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔

مگر ہمیں جواب نہیں چاہیئے؟

کیوں؟

کیونکہ ہم وہاں سے آگے بڑھ چکے ہیں جہاں یہ سوال ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ اب تو صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تمہیں سکون کا خزانہ کہاں سے ملا؟

اور تب ایسا ہوا کہ میرے چہرے پر لہریں گزرنے لگیں اور ہر گذرنے والی لہر مجھ سے کہتی رہی۔

میں تمہاری بیوی ہوں، میں منّا ہوں، میں ایمبولینس ہوں، میں بھیڑیا ہوں، میں نوزائیدہ تخلیق ہوں، میں پاگل خانہ ہوں، میں یہ ہوں، میں وہ ....

تو میں گھبرا کر آنکھیں بند کر تا ہوں مگر میں دیکھ رہا ہوں، میں سُن رہا ہوں، میرے اندر چیخیں ہیں، رونے کی آوازیں ہیں، خونی قہقہے، کھُلتے بند ہوتے دروازے ...

تمہاری سزا یہ ہے کہ تم زندہ رہو گے۔ تم زندہ رہو گے تم زندہ ...

میں کشتی کا پتوار تھامے کھڑا ہوں، میرے ہم سفر نعرے لگا رہے ہیں۔

وہ دیکھو دُور ساحل کی روشنیاں جھلملا رہی ہیں میں نے لوگوں سے کہا، اُنہوں نے آنکھوں پر ہاتھ کی دوربین بنا کر ساحل کی طرف دیکھا اور خوشی خوشی اپنا سامان سمیٹنے لگے افق میں روشنی کی کرن پھوٹنے والی تھی، تھوڑی ہی دیر میں

سورج نکل کر دیکھے گا کہ اس طوفان میں کون کہاں گیا؟ اور میں انھیں ساحل پر اُتار کر آگے بڑھ جاؤں گا۔ کیونکہ میری سزا میری زندگی ہے

محفوظیت اور سلامتی کے احساس نے میرے ہم سفروں کی عجیب حالت کر دی تھی وہ مجھ سے سوال پوچھتے تھے اور پھر بھول جاتے کہ انہوں نے کچھ پوچھا تھا۔ وہ خود کہیں تھے، اُن کا ذہن کہیں تھا اُن کی زبانیں کہیں بھٹکیں۔

پھر نہ جانے کتنی منتظر اور اشک بار آنکھوں نے کشتی کو ساحل سے لگتے اور اُنہیں سلامتی کے ساتھ کشتی سے اُترتے دیکھا اتگنت باہیں پھیلیں اور وہ ان میں سما گئے۔ میں کشتی پر کھڑا دیکھتا تھا کیا انوکھا تھا یہ ملاپ، وہ ایک دوسرے میں ضم ہو جانا چاہتے تھے۔

اور جب میں نے پتوار سنبھالی تو وہ میرے پاس آئے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے۔

میرے محسن! تم تھک گئے ہو گے۔ کچھ دیر ٹھہر کر آرام کر لو، ہم بڑے مہمان نواز ہیں، ہم نے مہمان کے لئے اپنے بچے ذبح کر ڈالے ہیں، تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ ہماری بیویاں تمہاری خادمائیں، ہم تمہارے غلام، ہمارے بچے تمہاری غذا.... ہم جانتے ہیں تمہاری منزل بہت دور ہے، مگر یہ ہماری التجا ہے کہ تم ہمیں شرف میزبانی بخشو!

میں جلد از جلد آگے بڑھ جانا چاہتا تھا مگر مجبور ہو گیا۔

خوشی کے شادیانے بجائے جا رہے تھے۔ شاہراہیں دلہن کی طرح سجی ہوئی تھیں، میرے گلے میں پھولوں کا ہار تھا راستوں کے دونوں کناروں پر کھڑے لوگ نعرے لگا رہے تھے [illegible] کی خبر جنہیں وہ [illegible] رہے تھے جنگل کی آگ کی طرح سب کے کانوں میں پہنچتی پھر رہی تھی۔

اُس کا ظہور ہو چکا۔ جس نے طوفان سے کشتی کو ساحل کی صورت دکھائی اور جو دافع بلا ہے۔

اور میں حیرت سے لوگوں کو دیکھ رہا تھا، یہ کیسے لو[illegible] ہیں، یہ کیسی جگہ ہے۔ سب کی گردنوں پر ایک عجیب الخلقہ مخلوق سوار تھی، سیاہ فام، سُرخ خونی آنکھیں بھیڑیے [illegible] سفید چمک دار اور نکیلے دانت، پتلی پتلی چھوٹی ٹا[illegible] جنھیں وہ گردن میں پھنسائے ہوئے تھے، اُن کے قہقہے بڑے ڈراؤنے تھے، جب اُن کا دل چاہتا بال مٹھیوں [illegible] جکڑ کر کھوپڑی کا پٹ کھول دیتے مغز کھاتے، خون پ[illegible] اور پھر پٹ بند کر کے قہقہے لگانے لگتے۔

اور وہ لوگ اُن کا بوجھ اس طرح اُٹھائے پھر[illegible] تھے جیسے وہ انھیں کے بدن کا عضو ہوں، کسی کے کاندھ[illegible] پر بوجھ نہیں تھا کسی کے چہرے پر شکن نہیں تھی۔ ہاں جب کھو[illegible] کا پٹ کھولتے تو گھڑی بھر کے لئے کرب کی لہریں اُٹھتیں، [illegible] کھاتے تو درد سے کراہتے، خون پیتے تو زیرِ لب گالیاں اور جب وہ کھوپڑی کا پٹ بند کر دیتے تو پہلے کی طرح بے[illegible] لاپرواہ، مطمئن۔

مجھے دیکھ کر وہ مخلوق اپنے خون آلود دانت دکھا[illegible] لگی، اُن کی زبانیں لپ لپ کرنے لگیں، ہونٹ غرّانے۔ تو میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ پھر مجمع ایک اونچے مقام پر ٹھ[illegible]

لوگو! یہ شخص عجیب ہے، میرے ہم سفر میرا انتظار [illegible] کر رہے تھے، جب طوفان آیا تھا چاروں طرف گھٹا ٹوپ [illegible] چھا گیا تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اور موت [illegible] لمبی زبانیں ہمارا لہو چکھنے کے لئے ہماری طرف بڑھ رہی تھیں [illegible] ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب ہم اپنے بچوں سے کبھی نہ مل سکیں۔ ہماری بیویوں کا سیندور پونچھ دیا جائے گا، ہماری مائیں ہم[illegible] آنسوؤں سے غسل دیں گی، مگر یہ شخص تنہا ہمارا محافظ ب[illegible] گیا، تنہا موت سے لڑتا رہا، مسکراتا رہا۔ اُس وقت بھی [illegible] ہی [illegible] جتنا اس وقت ہے ہمیں یقین ہے یہ ہمیں [illegible]

سکون کا راز بتائے گا .....

سکون کا راز ..... اس طرح انھیں نہ جانے کتنی کہانیاں سنائی ہوں گی ، تین آنکھوں والے کی کہانی ، کتاب کے الفاظ غائب ہونے کی کہانی ، موت کی وادی میں اُس قوم کی کہانی جس نے اپنا سب کچھ کھو دیا اور میرا سب کچھ چھین لیا ۔ میری بیوی میرا ماتا میرے کا عذاب اور جواب خود فریبی کا شکار ہو کر شوہر کا امپورٹڈ خون کھا رہی ہے اور سُولی پر لٹکنے کے بعد بھی اوپر والوں کے گُن گا رہی ہے ، پھر اُس نوزائیدہ تخلیق کی کہانی جو ساری روایات کو فنا کرنے کا عہد کر چکی ہے ۔ پھر انہیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ میں معتوب قرار دیا جا چکا ہوں ۔ میری زندگی میری سزا ہے تو وہ خوف زدہ ہو جائیں گے ۔ مجمع لوٹ گیا تو میں نے ہم سفروں سے پوچھا ۔

کچھ ہمارے بارے میں بتاؤ ، جو ساحل پر قدم رکھتے ہی تمہارے کاندھوں پر سوار ہو چکے ہیں ۔

اُن کے چہرے پھیکے پڑ گئے اور وہ مخلوق قہقہے لگانے لگی ہمارے بارے میں ' قہ قہ قہ ..... ہمارے بارے میں ۔ ہم سم پا ہیں ، تم بھی نہ بچ سکو گے ۔ آج نہیں تو کل ..... کل نہیں تو پرسوں ۔

ایک رات جب نرم چاندنی نے ہمیں تھپک کر سلا دیا تھا ۔ ہمارے دروازے کھلے ہوئے تھے اور ہماری سرحد کے نگراں اپنی چھاونیوں میں بے فکری سے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اُنہوں نے غافل لشکر پر شب خون مارا اور آن کی آن میں پوری سرحد روند ڈالی ، یہ پہرے داروں کا مغز بھوڑ کر کھا گئے ۔ خون سے پیاس بجھائی اور پھر نیند کی ماتی بستی پر ظلمت بن کر چھا گئے ، صبح آنکھیں کھلیں تو ان کی موجودگی کا احساس ہوا ، ایک نئے بوجھ کا احساس ہوا ۔ درد سے شانے ٹوٹنے لگے ، ہم نے جد و جہد کی انہیں اُتار پھینکنا چاہا مگر ایک طویل جد و جہد کے بعد ہمیں ہتھیار ڈالنے پڑے اور اب ایسا ہوتا ہے کہ جب ہمارے بچے سولہویں منزل عبور کرتے ہیں اُن کی آنکھوں میں بادل خیمہ زن ہوتے ہیں اور جس رات بارش کی پہلی پھوار پڑتی ہے صبح جب وہ بھیگے کپڑے لئے بستر چھوڑتے ہیں تو دیکھتے ہیں نہ جانے کب کس لمحے میں یہ اُن کے شانوں پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے ہوتے ہیں ان کی کھوپڑی کا پٹ کھول دیتے ہیں اور پھر ساری زندگی یہ مغز سے بھوک اور خون سے پیاس بجھاتے ہیں ۔

ہمیں اِس لئے تمہاری تلاش تھی ۔ ہم تمہارے منتظر تھے ہم تمہارے انتظار میں سمندر سے آنے والی ہوا سے پوچھتے ، انہوں نے تمہیں دیکھا ہے ؟ ہم سمندر میں اپنے نمائندے بھیجتے کہ تم مل جاؤ تو تمہیں مہمان بنا لیں اور واقعی تم دافع بلا ہو ، تم نے جس طرح ہمیں موت سے چھینا ہے ہمیں یقین ہے تم اس مصیبت کا سدباب کر سکو گے ۔

میں نے انہیں یقین دلایا ، تم بے فکر کرو ، میں سدباب ضرور کروں گا ۔

تب ہی وہ مخلوق غرانے لگی ، تم سدباب کرو گے ، تم جانتے ہو ہم کون ہیں ، اور ڈور کو کہاں سے حرکت دی جاتی ہے اور ڈور کو حرکت دینے والا کون ہے ۔ ہم آتے رہے ہیں ہم آتے رہیں گے اور آج نہیں تو کل اوپر سے آرڈر آئے گا پھر کل نہیں تو پرسوں ۔ تمہارا خون بڑا لذیذ ہوگا اور تمہارا مغز ..... وہ ہولے ہولے مُنہ چلانے لگے ۔

وہ گھر گئے تو ان کی بیویاں ، اُن کے بچے ، اُن کی مائیں دروازوں پر ملیں ، انہیں اپنے قریب پایا تو لپٹ کر رونے لگیں ، اتنا زبردست طوفان آیا اور تم کھلے سمندر میں ، ہمارے دل دہل رہے تھے ۔ ہماری آنکھیں طوفان میں کشتی کو ہچکولے کھاتے دیکھ رہی تھیں مگر تم بہادر ہو ، دلیر ہو ، تم واپس آئے ہماری آنکھوں میں روشنی آ گئی ۔ یہاں کا حال کیا بتائیں تمہارے جانے کے بعد یہاں بڑی تیز

دھوپ نکلی ہے۔ کنویں، تالاب خشک ہوئے جا رہے ہیں،
ہم کئی کئی دنوں پیاسے رہتے ہیں تب کہیں گھونٹ دو گھونٹ
پانی ملتا ہے۔

"گھبراؤ نہیں وہ آگیا ہے اب بارش بھی ہوگی۔ کھیت
بھی لہلہائیں گے، اب کوئی بھوکا پیاسا نہیں رہے گا، ہم
اپنی سرحدوں کی تعمیر پھر سے کریں گے۔ تب کوئی ہماری سرحد میں
قدم نہ رکھ سکے گا۔ ہمارے دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوں گی
جن سے ہوا اور دھوپ آئے گی چلو اندر چلیں۔...

نہیں ...... رک جائیے ..... بیویاں خوف سے
چلائیں، اندر کیسے جائیے گا۔

کیوں ؟

ہم تو تب سے دروازے پر کھڑے ہیں جب سے آپ
باہر گئے تھے۔ اور ہم ہی نہیں محلے کے سارے لوگ ہماری ہی
طرح دروازوں پر کھڑے ہیں۔

مگر کیوں ؟ وہ حیران ہوئے جا رہے تھے۔

دیکھئے ذرا غور سے دہلیز کے ان پتھروں کو دیکھئے،
دھوپ سے ان میں بڑے بڑے آبلے پڑ گئے ہیں۔ ان آبلوں
میں خون بھرا ہوا ہے۔ تازہ اور سرخ خون۔ ان آبلوں میں
زندگی ہے، ان پتھروں میں جان ہے، درد کا احساس ہے
پاؤں پڑنے سے آبلے چھپاک سے پھوٹ جاتے ہیں۔ اور اندر
سے سسک سسک کر رونے کی آوازیں آتی ہیں۔

تمہیں وہم ہوگیا ہے۔ بے وقوفی مت کرو، اندر چلو۔
ان کے اندر اتنے دنوں تک ٹھہرا ہوا پانی سیلاب
بن گیا تھا اور باندھ توڑ کر بہ جانا چاہتا تھا۔ پیاسی دھرتی
کو سیراب کر دینا چاہتا تھا۔ اُن کی نظروں میں ایک کے بعد
ایک، بدن چھوڑتے کپڑے تھے اور پھر ہانپتے ہوئے کبوتر اور
مثلث۔ نشیب و فراز، کچھ بار بار دہرائی جانے والی گنتیاں
وہ بیویوں کو اندر کھینچ لے گئے

انہوں نے کوئی آواز نہیں سنی، کچھ نہیں دیکھا، کسی کی
پرواہ نہ کی، اور جب وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے پلٹے تو
اُن کی بیویاں خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں، انہوں نے
ان کے سارے کپڑے اُتار ڈالے اور مخصوص جگہوں پر ہاتھ
رکھا، ہونٹ رکھے، مگر کہیں کوئی لمس نہیں، کوئی لہر
نہ اُٹھی، کوئی احساس نہ جاگا۔ کوئی عضو نہ پگھلا وہ سب
پتھرا چکی تھیں، بانجھ ہو چکی تھیں۔

خدا کے لئے ہمیں چھوڑ دیجئے، ہم پتھرا چکے ہیں، ہمارے
اعضا شل ہو چکے ہیں۔ ہم فطری عمل کے دوران آپ کو قوس قزح
کے رنگ نہیں دے سکتے، وہ سارے آبلے پھوٹ گئے ہوں گے
آپ رونے کی آوازیں سن رہے ہیں۔

دہشت تیری کی۔ وہ جذبات سے دیوانے ہوئے جا رہے
تھے۔ انہوں نے بیویوں کو بستر پر کھینچ لیا اور پھر .... مجبوراً ہو کی
مورتیاں متحرک ہوگئیں مگر .... لذت کے سوتے خشک ہو چکے
تھے، لمس پتھرا چکے تھے۔

وہ بپھر گئے، انہوں نے بیویوں کو بستر سے ڈھکیل
دیا۔ اور باہر نکل کر سارے آبلے پاؤں سے مسل ڈالے
سسکیوں کی بھی پرواہ نہ کی، بہتے خون سے اُن کے پاؤں
لت پت ہو چکے تھے۔

کوئی دروازے کے باہر نہ ٹھہرے۔ سب اندر آجاؤ
وہ چیخ رہے تھے، اور خوف زدہ لوگ سہمی ہوئی نظروں سے
کبھی بہتے خون کو دیکھتے اور کبھی اُن کو مگر کوئی حکم عدولی کی
جرأت نہ کر سکا کہ انہوں نے طوفان کی سختیاں جھیلی تھیں،
سرکش موجوں کو روندا تھا اور اس کا یقین دلایا تھا کہ بادل
چھائے گا اور جلتے تپتے ہونٹ شاداب ہو جائیں گے۔

اس رات جب میں نرم و گداز بستر پر سونے کی کوشش
کر رہا تھا۔ دروازہ آپ سے آپ کھلا اور وہ مخلوق بیرون
سے چل کر کمرے میں داخل ہوئی۔ تم یہاں کیوں آئے ہو،

ہم نہیں چاہتے کہ آگے والے ہمارے متعلق جان سکیں ہم جب ضرورت سمجھیں گے اُن کی سرحدیں روند ڈالیں گے ۔ مگر تم یہاں سے چلے جاؤ ورنہ تمہارا مغز اور خون بھی ہماری غذا میں شامل ہو جائے گا ۔

میں صرف مسکراتا رہا ۔

تب وہ غرانے لگے ۔ تم نہیں جانتے ہم کون ہیں ، مگر ہم یہ جانتے ہیں تم خطرے کا سد باب نہ کرسکو گے ، تمہیں ڈور کا سرا نہ مل سکے گا وہ ہاتھ کہیں اور ہے جس نے ہماری ڈور تھام رکھی ہے اور وہ ہاتھ پوری کائنات پر حاوی ہے ، تم حقیر کیڑے مزدور دیوانے عافیت اسی میں ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ ورنہ انجام جلد دیکھ لوگے ۔

وہ چلے گئے ، دروازہ آپ سے آپ بند ہوگیا ۔

اب میں جذبات سے مشتعل نہیں ہونا چاہتا تھا اس لئے آنکھیں بند کرلیں ۔

تب ہی باہر شور ہوا ، تیز تیز دروازے کھلے اور وہ اپنے گھروں سے نکلے اُن کے چہرے اُترے ہوئے تھے آنکھیں بجھی ہوئی تھیں ۔

ہم کیا جانتے تھے یہاں سے جاتے ہی ہمارا آخری سہارا بھی ہم سے چھن جائے گا ، ہماری بیویاں پتھرا جائیں گی اور ہم مٹھی بھر چھاؤں کو ترس جائیں گے ۔

وہ سب میرے پاس آئے ۔

تم واقع بلا ہو ۔ ہماری بیویاں واپس کرو ۔

جاؤ ، تمہاری بیویاں تمہیں واپس مل گئیں ۔

مگر کیسے ؟ ہم بہت پریشان ہیں ، ہم سے مذاق مت کرو ۔۔

میں نے جیب سے کاغذات نکالے اور ان میں تقسیم کر دیئے کہ فطری عمل سے پہلے اپنی بیویوں کو سنا دینا وہ پگھل جائیں گی اور تمہیں آغوش میں سمیٹ کر اُن جہانوں کی سیر کرا دیں گی ۔ جن کے تم متلاشی ہو ، وہ تمہیں اپنی کوکھ میں چھپا لیں گی

مگر دوسری صبح بڑی ڈراؤنی تھی ۔

سب کے دل کسی انجانے خوف سے دھڑک رہے تھے کچھ ہونے والا ہے ، کوئی بڑا حادثہ ، کوئی بڑی آفت آنے والی ہے ۔ اُن کی نظریں خطرے کی نوعیت جاننے کے لئے ایک دوسرے سے اُلجھ رہی تھیں مگر کوئی نہ بتا سکا کہ کیا ہونے والا ہے مسلسل چیختا ہوا خطرے کا الارم آخر کس چیز کی پیشین گوئی کر رہا ہے ہم تو رات سکون سے سوئے تھے ، ہماری بیویوں کی آغوش کھلی ہوئی تھی اور وہ مکھن کی طرح پگھل رہی تھیں اور اندر ہی اندر گرجتا ہوا سیلاب پھوٹ کر نکلا تھا ۔ پیاسی دھرتی سیراب ہوگئی تھی اور یہ یقین ہوگیا تھا کہ اب راتوں کو سکون سے سو سکیں گے مگر صبح اُٹھتے ہی بجتا ہوا خطرے کا الارم کس کے آنے کی اطلاع دے رہا ہے ۔ ہماری بیویوں میں جان پڑتے ہی سارے پتھر بے جان ہوگئے ہیں اب ان میں سے کوئی سسکی نہیں اُبھرتی ، کہیں سے خون کے سوتے بھی نہیں پھوٹتے ، لوگ پتھروں کو روندتے پھر رہے ہیں پھر .....

اور شانوں پر بیٹھی ہوئی مخلوق مسکرا رہی تھی ۔

دوپہر ہوتے ہی ایک نئی اطلاع ملی ، ڈگڈگی والا گلی گلی شور مچا رہا تھا ۔

شہر کے ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ تم امتحان کی گھڑیوں میں ناکام ہوگئے اور ایک مفرور دیوانے کی مدد کی ، اوپر والوں کا نمائندہ آرہا ہے سب کو سزا ملے گی ، کوئی سزا سے نہ بچ نہ سکے گا ۔ تم سب اپنی باری کا انتظار کرو حکم سرکار کا حاکم سرکار کا ۔ ڈگڈ ڈگڈ ڈگڈ

لوگ اپنے دروازے اور کھڑکیوں پر کھڑے سن رہے تھے ، خوف سے ان کے چہرے پیلے پڑ گئے تھے ، اعلان کرنے والے کی آواز سناٹے میں ڈوبتے ہی لوگ ، اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئے ، شاہراہیں ویران ہوگئیں ، لوگ چلتے تو سہم سہم کر ،

باہر آتے تو رگو شور ہو، اور جب کبھی شانوں پر بیٹھی مخلوق کا قہقہہ، سناٹے کا سینہ چیرتا ہوا فضا میں اُبھرتا تو خوف سے چیخیں نکل جاتیں، ساری نگاہیں شہر کو آنے والے راستے پر لگی ہوئی تھیں، اُس کے آنے کا خوف تھا، اُس کے آنے کا انتظار تھا۔

اور پھر وہ آگیا، شام ہوتے ہی دروازے کی کنڈیاں کھٹکھٹائی جانے لگیں اور جو بھی دروازہ کھولنے جاتا ایک چیخ مار کر گرتا اور بے ہوش ہو جاتا، جب چیخ سن کر جب گھر والے مدد کو دوڑتے تو اُس کا سارا بدن آبلوں سے بھرا پاتے، درد ٹیس، اور آبلوں سے بہتا ہوا خون۔

اور چیختی ہوائیں سب کا دل دہلا رہی تھیں، وہ آگیا ہے اوپر والوں کا نمائندہ خیمہ زن ہو چکا ہے سب اپنی اپنی باری کا انتظار کرو، کوئی نہ بچ سکے گا کوئی نہ بچا سکے گا۔

اور پھر مردہ گاڑی کا شور ہوا، اُس سے بڑے بڑے اسٹریچر اُتارے گئے، اور متوب افراد کو مردہ گاڑی میں سوار کرا دیا گیا، خبریں گشت کر رہی تھیں۔ وہ گیا، فلاں شخص گیا۔ ابھی یہ ابھی وہ۔ دیکھتے دیکھتے شہر ویران ہو گیا، سب اپنی اپنی باری کے منتظر ہو گئے، مردہ گاڑی کا شور، کنڈلیوں کا شور، رونے کا شور، گھنٹوں میں شہر گریہ میں تبدیل ہو گیا۔

لوگ زمین پکڑ پکڑ کر خود کو گردن تک دفن کئے آنکھیں کھولے دروازے اور کھڑکیوں کو تک رہے تھے، کب کنڈلی کھٹکھٹائی جائے گی وہ دروازہ ہی نہ کھولیں گے تو اسٹریچر کی ضرورت بھی نہ پڑے گی۔

اور پھر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی تو وہ سب گڑھوں سے نکل آئے۔ سب ایک جگہ اکٹھا ہوئے اور میرے پاس آئے۔

تم ہمارے محسن ہو! تم نے ہماری جانیں بچائی تھیں۔ اب اس مصیبت سے بھی نجات دلاؤ۔ ہماری بیویاں ہمارے بچے بھی اسٹریچر پر سوار ہو گئے اب ہماری باری ہے ہم بھی چند لمحوں کے مہمان ہیں پھر عزیزوں سے جا ملیں گے، شہر خموشاں میں دفن ہو جائیں گے۔ تم آگے والوں سے کہہ دینا کہ اس جزیرے میں کیا ہوا تھا۔ وہ اپنی سرحدوں کی نگرانی کریں ورنہ ...

گھبراؤ نہیں۔ میں اُن کے شانے تھپکے، میں خطرے کا سدّ باب کروں گا، صرف ایک شخص آگے آئے جو دلیر ہو، نڈر ہو۔

وہ خوش ہو کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے تب بھیڑ سے ایک شخص باہر آیا، میں نے اپنی ڈائری کے ورق پر اوپر والوں کے نام ایک پیغام لکھا اور اس شخص کے حوالے کر دیا کہ جب رات کے بارہ بجے تم گھر سے نکل کر فلاں میدان میں جاؤ گے وہاں خیمے نصب ہوں گے، بہت آدمی ہوں گے مگر تم کسی سے مخاطب نہ ہونا سب سے بڑے خیمے کا پردہ ہٹا کر یہ خط اندر ڈال دینا اور پھر بغیر کسی طرف دیکھے لوٹ آنا اگر تم نے پلٹ کر دیکھا تو ...... جلدی جاؤ وقت کم رہ گیا ہے۔

اور وہ شخص جب اُس میدان میں داخل ہوا تو ایک ہزار لشکر میدان میں خیمہ زن تھا، بڑی بڑی گاڑیاں، خیمے، اس نے ایک خیمے کا پردہ ہٹایا اور خط اندر ڈال دیا۔

تب ہی شور اُٹھا۔

ہم ابھی ہی چلے جائیں، ابھی، تو ہماری گاڑیاں بھی نہیں بھری ہیں، ہمیں ابھی ہی رخصت کیا جا رہا ہے، ہمیں ....

اور جب لوگ اُس شخص کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے، میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ مخلوق کمرے میں داخل ہوئی، جب تک میں بچاؤ کے لئے کچھ کرتا اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی اور پھر میرا شانہ بوجھ سے دب گیا، گردن درد سے ٹوٹنے لگی بال کی جڑیں چرچرانے لگیں، میں نے جد وجہد کی اپنی ساری طاقت صرف کر دی، مگر میں تھک گیا۔ میرے بازو شل

بقیہ صفحہ ۱۲۴ پر

انیس لیبانی
ندیم گویانی

قتل کی رات کا آخری بیان

ایک جھٹکے سے کچھ بھی نہیں کاٹا جا سکتا
اس جھٹکے سناٹے میں
مونگے کی چٹان پر نیلے بچھو کا ڈنک تنا ہے
ادھر شہر پناہ کی دیوار پر کلبلاتے سوراخ سے
سمندر کی کائی میں اُلجھے بغیر
پہاڑ چڑھتی ہوئی چیخ گھاٹی میں اُترجاتی ہے
اسی دہشت سے ٹھوٹھ ہرا نہیں ہو پاتا
لیکن سوکھی جڑوں سے
جو ریگ مال تیار ہوتا ہے
اسے بھی تو روکا نہیں جا سکتا

ترائی کے دوسرے سرے پر
اُجالے کی چمک کے ساتھ
وہ سپیت ناک جبڑا کھلے گا
اور پھر کہیں نہ ختم ہونے والے اکیلے پن کا سامنا

مندر میں سنکھ کے ساتھ
محلّے کا کھجیلا کتا روئے گا
چیخ بھی اتنی عبث ہے
جو بے وقت ہی ہو جاتی ہے

ڈوبنے والے کا ہاتھ کسی بھی آنکھ میں نہیں چھپتا۔
آخر سب کچھ ڈوبنا ہے، بغیر اپنا حساب لئے
چیخ اور سناٹے کے بیچ
اپنی پہنچ تک ہر کوئی انسان جی لیتا ہے
دیکھنا ہے ـــ کون تخت پر بیٹھائے گا
ایک جنگل کے جل جانے کے بعد کی خاموشی ؟

●●

انیس لٹیانی
ندیم گویائی

آخری لفظ

یہی ہوتا ہے
یا تو زیادہ اُجالے میں
شکل پہچان سے باہر ہو جاتی ہے
یا آنکھ میں چوزے لگتے ہیں
پہلے دُنیا ایک اندھیرے میں تبدیل ہو جاتی ہے
اور بعد میں ایک کوّا آنتیں کھینچنے لگتا ہے
اس پتھریلی زمین پر اپنے ہی بوجھ سے
گھِستا چلا جاتا ہے آدمی
اور ہر بار زندہ کر کے
رکھ دیا جاتا ہے تلوار کی تیز دھار پر

آخری وقت میں بھی کوئی شہر تک نہیں پہنچ پایا
اسی کوّے نے قسطوں میں دی ہیں
شہر پر ان گنت ہڈیاں
کسی نے ہمت نہیں کی

کہ ہر ہر کوّے کو پاگل گھوڑے کے سامنے کھڑا کر دے
ہر ایک شخص اپنی زمیں پر
پھر اُگنا چاہتا ہے اور
شہتیروں کے نیچے چھپا ہے یا
ہتھیار ڈال کر ایک مناسب وقت کے انتظار میں ہے

سب اپنے اندر
ایک بجھی ہوئی آگ کو سنبھالے بھاگ رہے ہیں
یہ کوئی بھی قبول نہیں کرے گا
کہ سلگتی چراگاہ میں ایک میمنا چھوڑ دیا گیا ہے
یا ہونٹوں کے بیچ سوئیاں رکھ دی گئی ہیں
اتنا سب جیسے
کہانی ایک سفید جھوٹ کی طرح شروع ہوئی
اور جس کا کوئی آخری لفظ نہیں ہوتا

●●

باردار

علی امام

جس وقت دھواں آسمان سے ٹکرا کر رہا تھا۔ زمین گرد و غبار کا محل بنی بیٹھی تھی۔ آدمی شور کے بحرانوں میں گم توانائی کے کاندھوں پر بھاگا جا رہا تھا۔

اسی وقت ماہر نفس ڈرامائی انداز میں الف کے کمرے میں داخل ہوا اور صوفہ سٹ کے ایک کونے سے چپک گیا۔

الف کتاب کے اوراق کو آتش دان میں ڈال کر اس کے شعلے سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔

آگ : میری ماں تو نے اپنے اندر کن ساعتوں کے پھپھوڑے میں ....

آگ : میرا باپ ، تو نے کبھی کرب کو لذت میں تبدیل کرنے کے لئے ....

جو بھی ہوا ٹھیک ہی ہوا لیکن ایسا کیوں ہوا کہ کروڑوں جراثیم میں قابل اشتراک بیراہی میں نکلا۔

شائد اوپر والے کا کچھ

یا کیمیائی تعامل کا ہیر پھیر ہو۔

لیکن سنا ہے اوپر والا اب ہر جگہ رہنے لگا ہے اور نیچے والا اوپر اٹھ کر زمیں ژاں کر رہا ہے۔

مادے کو چنگاریاں چھوتی ہیں تو ان کی حالت تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہم بھی مادے ہیں،

ہماری حالت میں بھی اندر اندر تبدیلی آ رہی ہے۔

اور اب تو معلوم ہے کہ ہوا کا مقام خلا میں نہیں ،

خلا کا مقام ہوا میں نہیں اور ہمارا مقام کہیں نہیں۔

الف بکتے بکتے کرسی پر دراز ہو گیا ہے۔ نفس کے دماغ کے پردے باتوں کے ٹکراؤ سے جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ پھر بھی وہ اسٹیج ایکٹنگ میں مشغول ہے۔ اس کی آنکھیں تھکی ہوئی ہیں۔ اس کا چہرہ نقش و نگار کا پیکر بنا ہے۔ وہ اپنے شانے اچھال رہا ہے لب ہلنے کو تیار کھڑے ہیں۔ کروٹ پہ کروٹ لے رہا ہے۔ آخر کسمساہٹ کی دیوار توڑ کر وہ بول پڑا۔

" آپ کا نام ؟ "

" انام " ۔ یہ سنتے ہی حرارت کچھ کم ہو جاتی ہے لیکن فوراً پوچھتا ہے۔ " آپ کی پیدائش کا زمانہ ؟ "

" خون و غارت گری کے درمیان جسم کا تقسیم ہونا۔ "

" گھریلو ماحول ؟ "

" روایتی کٹر مذہبی۔ "

" تعلیم ؟ "

" نباتات ، حیوانات اور کیمیا کے بارے میں شاید کچھ جانتا تھا۔ یہ مجھے یاد ہے۔ "

" آپ کی زندگی ؟ "

میری زندگی کی سالمیت اپنے ذہن کے اندر دب کر مر گئی۔ میں اپنی تلاش میں تھا لیکن کیا کروں ؛ میری تلاش پر تلواریں چمک رہی ہیں۔ پولس زدہ قانون کو ٹھو کر مار کر بھی میں ٹھوکر نہیں مار سکتا ہوں کیونکہ میں زندہ ہوں ہی نہیں۔ زندہ تو وہ ہے جو اپنے وجود کو مجھ پر ، اس پر اور تم پر مسلط کر چکا ہے۔ "

نظریہ ؟ نفس آنکھوں کو چمکاتے ہوئے رازدارانہ لہجے
میں بولا۔ "وہ ابھی اپنی طویل خونی مسافت طے کرنے میں مشغول ہے
فی الحال جس موڑ پر کھڑا ہے ۔ وہاں جیت کی لعنت اور ہار کی
دیانت داری نے مختلف صورتوں کی طرف راغب کیا ہے جو شاید
اسباب کے اپاہج دلائل کو اپنی ہستی رد کرنے میں کارآمد ثابت ہو۔"
وہ ابھی چپ ہوا ہی تھا کہ نفس نے دوسرا سوال اس
کی طرف غیرارادی انداز میں پھینکا ۔
آپ کا شغل ؟
میرا ہاتھ کاٹ لیا گیا ۔
ایک ہاتھ ۔
دو ہاتھ ۔
ہاتھ پر ہاتھ ۔
کئی ہاتھ
ان گنت ہاتھ ۔
اور پھر ہاتھوں کے ڈھیر کا ایک خودکار مشین بنا دیا گیا۔
لیکن تم ہو کون ؟ مجھ سے ایسے ایسے سوالات کیوں
کر رہے ہو اور تعجب ہے کہ جواب غور سے سن رہے ہو۔
میں ماہر نفس ہوں ۔
اچھا، اچھا تو بتاؤ ــــــــــــ
میرے اندر کیا ہوتا رہتا ہے ؟
میرے اندر کیا کیا ہو رہا ہے ؟
میرے اندر یہ ... چیز پیدا ہو گئی ہے ؟
اندر، اندر ... ہونے والی چیز طویل حرارتوں
کی بھٹی کیسے بنی ؟

نفس : تمہارے سوالات اچھے ہیں لیکن کچھ ایسا لگتا
ہے کہ تم اچھے نہیں ہو ۔

الف : آپ کی تفتیش کا شکریہ لیکن یہ بتائیے کہ
حادثے کی پیدائش کا عمل باہر ہوتا ہے۔ کیا پکنے کا عمل
اندر رہتا ہے ۔

نفس : ہاں

الف : ایسا لگتا ہے کہ وہی داخل میں ابھی ابھی
کی دھڑکن ریشہ ریشہ تانا بانا بن کر پھیل رہی ہیں ۔ لیکن ابھی ابھی
کی کیفیت تو ایسی نہیں ہے جس میں میرا سارا میں ڈوب کر رہ
جائے کیونکہ انگلیوں پر گنے جانے والے وقفے اور حادثے
غیر معین تناسب میں وقت کے لاسلکی چہرے بنا رہے ہیں ۔
تو پھر ایسا ہوا کہ اس رات نیند نہیں آئی ۔

نفس : کب نیند آئی ؟

الف : کبھی نہیں ۔

نفس : تو پھر اس رات کیوں ؟

الف : رات، رات ہے نفس اس رات میں نے
نیند کو محسوس کیا تھا رات کو نہیں حالانکہ اکثر راتیں رات کو
محسوس کرتے ہوئے گذری ہیں ۔
لیکن یہ میرے اندر کیا ہو رہا ہے ؟
یہ میرے اندر کیا ہوتا رہتا ہے ؟
تمہیں بتاؤ نفس یہ میرے اندر کیا ہو رہا ہے ۔

نفس : عجیب بات کرتے ہو تمہیں بتاؤ نا کہ تمہارے
اندر کیا ہو رہا ہے ۔ کچھ مجھے بھی لگتا ہے لیکن کچھ بتاؤ تو سمجھوں۔

الف : میں کیا بتاؤں نفس کہ میرے اندر کیا ہو رہا
ہے ۔ بس یہ جان لو کہ میرے اندر ہو رہا ہے ۔ عجیب، عجیب قسم
کی چیزیں۔

نفس : کیا ہو رہا ہے ، کیوں ہو رہا ہے ۔ [illegible] میں
بھی محسوس کر رہا ہوں ۔ لیکن تم چاہتے کیا ہو ۔

الف : [illegible] صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرے اندر
کیا ہو رہا ہے ۔

نفس : تمہارے اندر کچھ نہیں ہو رہا ہے ۔ صرف حرارت
کی مقدار بڑھ گئی ہے ۔

الف : اس دن جب شام سوگ کا البم بنی کھڑی
تھی نفس [illegible] پھر وہ بھی تم
[illegible] اندر ہو
[illegible] کی
تھاہ سمندر میں ڈوب گئی - میں تمہارے اندر بھی داخل نہیں
ہو سکتی ہوں لیکن تم میرے اندر ...... وہ آخری لفظ ادا
کرنے سے پہلے اپنے آنسوؤں میں گم ہو گئی نفس - تم بتا سکتے ہو
بتاؤ کہ میرے اندر کیا ہو رہا ہے -
نفس : تم کچھ بھی تو نہ کہہ رہے ہو ... بتاؤ - کچھ سمجھ میں
آتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے - کچھ کہو -
الف : میں کیا بتاؤں نفس ـــــ
نمک کھاتا ہوں ـــــ نمک جیسی بات ہوتی تو
نمکین کہہ دیتا - میٹھی بات ہوتی تو میٹھا س کہہ دیتا تیتی بات
ہوتی تو تیتا س کہہ دیتا -
کوئی مزہ، کوئی بو، کوئی رنگ، کوئی صورت،
بالکل کچھ نہیں
نفس : تم سچ نہیں کہہ رہے ہو -
الف : جھوٹ پر یقین رکھتا ہوں بھائی ـــــ
لیکن ابھی عام طور پر سچ کہہ رہا ہوں -
نفس : مسرت سے دوچار ہوئے ہو - ؟
الف : کبھی نہیں -
نفس : کھاتے ہو
الف : نہیں -
نفس : جتنا کھانا چاہتے ہو کھاتے ہو ؟
الف : نہیں -
نفس : چند نوالے میں طبیعت بھر جاتی ہے -
الف : ہاں -
نفس : کیوں

الف : وہی کچھ ایسا لگتا ہے - کچھ ایسا ہوتا ہے -
نفس : کپڑا پہنتے ہو -
الف : یقیناً
نفس : خوب اچھا اچھا پہننا چاہتے ہو -
الف : ہاں
نفس : کیوں نہیں پہنتے ؟
الف : وہی ایسا لگتا ہے کہ میں آدمی ہوں بھی یا نہیں
کیا ہوں - کیوں ہوں - مجھے ہونا چاہئے تھا ـــــ اس
بھیڑ میں ـــــ کون کس کو پہچانتا ہے ـــــ کون سمجھنا چاہتا ہے
سائے بھی کتراتے ہیں - محبت کاغذ - دوستی فریب، اخلاق کھوکھو
میں بکھرا، ٹوٹا، خانہ اندر خانہ دھنسا ہوا - عجیب لگتا
ہے نفس - کھویا، کھویا - بھولا بھٹکا - کچھ یاد ہے کچھ یاد
نہیں - کہاں ہے - کیسے ہے - کب چلا تھا - کہاں پہنچا ہے
کچھ عجب عجب سا لگتا ہے - کچھ ایسا لگتا ہے کہ کچھ ہو گیا ہے
نفس : کیا ہو گیا ہے - میں جانتا ہوں - بالکل جانتا ہوں
یقیناً جانتا ہوں -
اور نفس قہقہہ لگاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتا ہے -
باہر جو لوگ اس کے منتظر تھے انہیں چیخ کر کہتا ہے کچھ نہیں
ہوا ہے - صرف وہ ہوا ہے جو ہونا چاہئے تھا - وہ پاگل نہیں
ہے - تم پاگل ہو - میں پاگل ہوں -
لیکن یہ میرے اندر کیا ہو رہا ہے بھائیو - مجھے فیس نہیں
چاہئے ـــــ مجھے چھوڑ دو -
ـــــ مجھے آزاد کر دو -
میرے اندر کا لباس اُتر چکا ہے -
میں ننگا ہوں -
میں ننگا ہوں -
ننگ ...... ننگ ......

ممتاز راشد

غزلیں

تھک گیا ہوں کسی آندھی کا پتہ دے کوئی
بوجھ ہے جسم کی دیوار گرا دے کوئی

دور تک برف ہے احساس کے ویرانوں میں
پھر کسی آگ میں جلنے کی سزا دے کوئی

جسم و جاں کب سے ہیں جلتے ہوئے صحرا کا سکوت
کوئی جھونکا ہی سہی مجھ میں صدا دے کوئی

ورقِ سنگ سے تحریر ابھاروں کب تک
میرے ہاتھوں کی لکیروں کو مٹا دے کوئی

جب ہوا آئے تو یہ راکھ کہیں لے جائے گی
آتشِ سرد [illegible] میں دبا دے کوئی

●●

بچیں جو ابر سے گیلی زمین دھنستی ہے
یہ وقت وہ ہے کہ مٹی بھی پاؤں کستی ہے

مجھے بھی دی ہے اُسی نے شبوں کی تاریکی
وہ شخص جس کے لیے روشنی ترستی ہے

نہیں یہ دُکھ کہ ہوا شاخ سے ہیں آوارہ
یہ رنج ہے کہ ہوا آج بھی سسکتی ہے

جلائیں کتنا ہی صحرا کے [illegible]
وہیں کھلوں گا جہاں [illegible] برستی ہے

رہوں جو گھر میں تو روتی ہے دل کی تنہائی
جو گھر سے نکلوں تو سڑکوں پہ رات ہنستی ہے

سلگتی رہتی ہیں راشد بدن کی دیواریں
مرے لہو کی حرارت مجھی کو ڈستی ہے

ابرار اعظمی

غزل

اشک آنکھوں سے بہا، کوئی سمندر نہ اٹھا
خونِ رگِ سنگ سے ٹپکا، و پیمبر نہ اٹھا

ذہن یخ بستہ ہوا، حادثہ کچھ بھی نہ ہوا
جسم انگارہ بنا، کوئی بھی محشر نہ اٹھا

ذہن اور جسم کی واماندگیٔ شوق تو دیکھ
بارِ ساغر تو اٹھا، بارِ مقدر نہ اٹھا

خوف، تنہائی، پریشاں فکری، تاریکی
ہوش وہ بارِ امانت تھا جو اکثر نہ اٹھا

کاوش و فکر و تخئیل سبھی ناکام ہوئے
لمس کے سرحدِ ادراک سے پیکر نہ اٹھا

تو خردمند ہے، اک شیش محل اور بنا
میں تو مجنوں ہوں، مجنوں پہ پتھر نہ اٹھا

جرأتِ عرضِ ہنر، روکشِ صہبائے بہار
فکرِ فردا ہے اگر، سر نہ اٹھا، سر نہ اٹھا

●●

شاہد کبیر

غزل

کبھی جو ٹوٹ کے بکھروں تو اطمینان ملے
کہیں تو بڑھتی ہوئی موج کو چٹان ملے

زمیں پہ سب کو کہاں سائبان ملتے ہیں
یہی بہت ہے اگر سر پہ آسمان ملے

اُتر گیا تھا میں اک اجنبی جزیرے پر
پلٹ کے دیکھا تو کشتی نہ سائبان ملے

مرے سفر کی تو منزل نہیں ہے، رستہ ہے
گذر کے جس سے بدن کو ذرا تکان ملے

فصیلِ شہر کی زینت ہے اب لہو میرا
یہ آرزو بھی ترے شہر میں امان ملے

ہوس کے لمس سے کیسے بچے گا وہ شاہد
کنول وہی ہے جو کیچڑ کے درمیان ملے

●●

دوسرا قصہ، دھند میں کھوئی رہگذر کا

حسین الحق

افواہیں تو شانے شانے اچھلتی ہوئی پھیلتی ہیں اور اپنا سفر طے کرتی ہیں یہ افواہ بھی جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ لیکن ذرا ٹھہریئے! افواہ اسے کہتے ہیں جس میں جھوٹ کا بھی شائبہ ہو جب کہ یہ کانوں سُنی نہیں بلکہ آنکھوں دیکھی بات ہے۔ اس لئے میں اپنے اوپر کے بیان میں ذرا سی تبدیلی یوں کرنا چاہتا ہوں کہ آپ حضرات لفظ افواہ کو خبر کے معنوں میں لیں۔

تو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی "وہ" ظاہر ہو گئے ہیں۔

میں نے بھی سنی اور کوشش کی کہ اس خبر کو بھی بہت ساری خبروں کی طرح ایک کان سے سنوں اور اس کان سے اڑا دوں لیکن مشکل یہ درپیش ہوئی کہ میرے بہت ہی عزیز دوست بھی اس مسئلے پر میرے ہم نوا نہ ہو سکے، ان کا کہنا تھا کہ اس خبر سے پہلے کی دوسری ساری خبروں یا افواہوں کا معاملہ الگ رکھو اور اس خبر کو الگ رکھو کہ یہ کانوں سنی نہیں بلکہ آنکھوں دیکھی بات ہے، کچھ دوستوں نے مجھے اس کا مشورہ بھی دیا کہ بزرگوں کی شان میں گستاخی کوئی بہت اچھی بات نہیں ہے اور نہ اسے وسیع النظری کہا جا سکتا ہے بلکہ اس قسم کی حرکتوں کی سرحدیں "بدعقیدگی" سے جا ملتی ہیں۔

میں چپ تھا اور [illegible] کیا کہ

"جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے"

پھر بھی شاید میں اس خموشی کے سہارے اس افواہ (یا خبر) کو بھی پی جاتا مگر اس دن مجھے سخت تشویش ہوئی جب میرا آٹھ برس کا بچہ مجھ سے پوچھ بیٹھا "ابو "وہ" کون ہیں؟"

"وہ" بیٹے! "وہ" "وہ" ہیں!" گھبرا کر میرے منھ سے نکل گیا۔

"کیا ابو؟ کیا ہیں وہ؟" میرے بچے نے کچھ نہ سمجھ کر دوبارہ سوال کیا اور میں نے ڈانٹ کر اُسے بھگا دیا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ بات اب اپنی حد سے نکل چلی ہے اس لئے اس کا [illegible] ہونا چاہئے یا کم از کم بچے کو "اُن" کے بارے میں کچھ [illegible] تو دے دینی چاہئے۔

اس سلسلے میں جب میں نے ظفر صاحب سے لی تو انہوں نے صرف یہ بتایا کہ "یہ وہی ہیں جن کے ہم منتظر تھے"

"ہم کن کے منتظر تھے؟" میں نے پوچھنا چاہا لیکن یہ سوچ کر خموش رہا کہ یہ سوال ہمارے محلے کے لوگوں کے لئے نہیں ہے کہ اس سوال سے اجنبیت کی بُو آتی ہے۔

لیکن بات تو پھر بھی اپنی جگہ قائم تھی کہ "وہ ہیں کون؟"

آخر میں نے یہ طے کیا کہ یہ جاننے کے لئے کہ وہ کون ہیں؟ خود مجھے ان تک پہنچنا ہی پڑے گا، پھر میں نے ان کے جائے ورود کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ ریلوے لائن کے اس پار پیر جی کے مقبرے کے پاس جو کنواں ہے اسی میں وہ ظاہر ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف رائیں تھیں، بعض حضرات کا کہنا تھا کہ وہیں ظہور ہوا ہے۔ بعض کی رائے تھی کہ وہ پہلے سے وہیں مدفون تھے اب اچانک [illegible] ہوئے ہیں اور بعض کا خیال تھا کہ اس خطۂ مخصوص پہ ان کا نزول

ہوتے ہیں مگر چونکہ خشکی پہ فی زمانہ آتش زدگی کے واقعات کثیر تعداد میں ہونے لگے ہیں اس لیے وہ مستقل طور پر چاہ پذیر ہو گئے ہیں تاکہ اطمینان کے ساتھ اپنے مشن کی تکمیل کر سکیں۔ بہر حال! جو بھی صورت حال ہو مجھے اس سے بحث نہیں، قابل غور بات یہ تھی کہ میں ان تک پہنچوں کیسے؟ میں نے خوب غور کیا تو معلوم ہوا کہ "اُن" تک پہنچنے کے لئے چار راستے ہیں۔ پہلا اور آسان ترین راستہ تو مین روڈ سے ہوتا ہوا "پیر جی" کے مقبرے تک پہنچتا ہے اور اس راستے میں اسکول، پوسٹ آفس، کچہری، میونسپلٹی، بس ڈپو اور ٹاؤن ہال وغیرہ ملتا ہے۔ یہ پختہ سڑک ہے جس سے رکشہ، ٹرام، سائیکل، موٹر ہر سواری جا سکتی ہے۔ دوسرا راستہ شیر شاہ کے روضے سے ہو کر گزرتا ہے جو شیر شاہ کے روضے کی آخری حد تک تو پختہ ہے مگر اس کے بعد کچا ہو جاتا ہے۔ اور رکشہ، ٹرام یا موٹر وغیرہ نہیں جا سکتی، صرف سائیکل جا سکتی ہے کیونکہ پتلی پتلی کیاریاں اور پتلے پتلے رستے ہیں جن کے دونوں طرف لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گڑھوں میں پانی جمع ہے جس میں بھینسیں، کتے اور سور نہاتے ہیں اور دھوبی سارے شہر کے کپڑے دھوتے ہیں۔

تیسرا راستہ کھیت کے بالکل بیچ سے گزرتا ہے جو بہر حال راستہ تو نہیں ہے البتہ بوقت ضرورت راستہ بنایا جا سکتا ہے لیکن اس راستے سے صرف پیدل ہی گزرا جا سکتا ہے۔

چوتھا راستہ بہت پیچ و خم کا حامل ہے جو "جانی کا بازار" سے ہو کر "لکھنؤ سرائے" سے ہوتا ہوا اس طرف آتا ہے اور اس راستے میں بیک وقت بلند و بالا عمارتیں، پُر رونق شاہراہیں، گندی گلیاں، چھوٹے چھوٹے جوہڑ، سرسبز و شاداب کھیت، پگڈنڈیاں، کیاریاں سبھی کچھ ملتی ہیں لیکن یہ بات عجیب ہوئی کہ جب میں اُن تک پہنچنے کے لئے تیار ہوا تو تمام راستوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں اور ہر راستہ مسدود کر دیا گیا۔

لیکن اب تو بہر حال بات بہت آگے بڑھ چکی تھی اور ان کی تلاش بہر حال ایک ضروری عمل بن چکی تھی مگر اسی کے ساتھ ساتھ میرے لئے ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ میں نے چونکہ اس چہرے کا مذاق اڑایا تھا اس لئے دن کی روشنی اور لوگوں کے اژدہام میں اُن کو دیکھنے کی ہمت نہ ہو سکی لہٰذا اپنی عزت نفس کی خاطر ایک شب جب ساری دنیا اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور پورے شہر پہ موت طاری تھی۔ میں نے آہستہ سے اپنا گھر چھوڑ دیا ——

لیکن صاحب! یہ عجیب بات ہوئی کہ جب میں اپنے گھر سے محلے کے موڑ تک پہنچا تو ایک مرتبہ اچانک ایک شدید طوفان نے مجھے آ لیا۔ طوفان اتنا شدید تھا کہ میں اس طوفان میں ایک کمزور و ناتواں ذرّے کی طرح اِدھر سے اُدھر اُڑ رہا تھا یوں کہئے کہ یہ طوفان مجھے گیند کی طرح اچھال رہا تھا، میں اس اندھیری اور طوفانی رات میں بے سر و سامان اور بے بس و مجبور تنکے کی طرح ہواؤں کا شکار بن چکا تھا۔

ہوائیں مجھے کہاں لئے جا رہی تھیں اس کا مجھے پتہ نہیں تھا میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں ہواؤں کی قید میں تھا اور ہوائیں مجھے اڑائے لئے جا رہی تھیں۔

ایک لمحے کے لئے مجھے ایسا احساس ہوا کہ میں شہزادہ گلفام ہوں اور مجھ پر کوئی سبز پری عاشق ہو گئی ہے اور وہ مجھے اُڑن کھٹولے پر اڑائے لئے جا رہی ہے لیکن پھر آتی جاتی خوف کی لہروں نے اس خیال کو طوفانوں کی نذر کر دیا، اور جب مجھے ٹھہراؤ نصیب ہوا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک شہر کے ملبے پر کھڑا ہوں۔

میں متحیر تھا اور متوحش کہ یہ کون سا شہر ہے جو مصر، اجنتا، ایلورا اور ٹیکسلا کے کھنڈرات کی یاد دلا رہا ہے؟ اور یہ کون تھا جو مجھے یہاں لے آیا؟ اور وہ کون ہیں جن کی زیارت کی تمنا نے مجھ پر یہ حرکت طاری کی ہے؟

لیکن سارے سوالات کا جواب میں تھا اور میرے اردگرد پھیلا ہوا شہر کا ملبہ۔

میں نے سوچا کہ اب اُن کی زیارت کا خیال بیکار ہے لیکن پھر فوراً ہی خیال آیا کہ اب تو میں اُس جگہ پہنچ چکا ہوں جہاں اپنے شہر کا نقشہ ملنا ممکن ہے اِن نقشے میں اپنا شہر ملنا مشکل ہے، پھر اُسی تمنا کو جوان کیوں نہ کیا جائے، جو ان ساری جنون سامانی و وحشت سرائی کا باعث بنی ہے۔

اور تب جیسے اچانک کہیں کچھ عجب سا ہونے لگا: میں نہیں جانتا کہ کیا کچھ ہوا لیکن مجھے ایسا احساس ہوا کہ کچھ ہو ضرور اور تب اُسی لمحہ میں نے فیصلہ کیا کہ اُن کی زیارت میرا پہلا فریضہ ہے اور اپنے شہر کی جستجو بعد کا مرحلہ۔

تو میں جنوں میں اس اندھیری رات میں "اُن" کی تلاش میں نکل پڑا۔ دوست تو گم ہو چکا تھا اور اب رہنمائی کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا اس لئے میں نے طے کیا کہ جدھر کی ہوا ہو گی اُدھر ہی چلوں گا، ہواؤں کا رُخ جاننے کے لئے میں نے دھول اٹھائی کہ دھول جس سمت اڑے گی میں اُسی سمت چلوں گا مگر ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرتی ہوئی دھول اندھیرے کا مقدر بن گئی۔

اور تب میں نے فیصلہ کیا کہ اب میرا سفر سمتوں کے تعین کے بغیر شروع ہوگا

میں ایک قدم چلتا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راستے کو دیکھتا۔ جب بہت دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا تو آنکھیں بھی اندھیروں سے مانوس ہو گئیں اور راہ بھی کچھ واضح ہوتی گئی، پھر بھی اونچے نیچے ٹیلے، اوبڑ کھابڑ میدان، پتھریلی زمین اور صف در صف پہاڑی سلسلے بار بار میری راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے تھے لیکن میں ایک پہاڑ کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا پہاڑ سر کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ٹھٹھک کر رک جانا پڑا۔

بہت زور سے پانی کے بہنے کی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی چشمہ کسی بہت اونچی جگہ سے گر رہا ہو یا کوئی تیز رفتار پہاڑی ندی پتھروں سے ٹکراتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہو۔

یہ عجیب مقام تھا اور عجیب فضا اور میں اس فضا کا اسیر کہ ہر سمت اندھیرا ..... سیاہی ..... کہر ..... دھند۔ کہیں کہیں سے ذرا ذرا سی پھوٹتی ہوئی روشنی جسے روشنی کا نام دینا بھی بے وقوفی ہے اور میرے پیچھے صف در صف پہاڑ، گہری گہری کھائیاں، پُر خطر راستے، اور آگے اندھیرا، اور اس اندھیرے سے اُبھرتی ہوئی پانی کے پر زور ریلے کی آواز۔ جیسے کوئی چشمہ کسی بہت اونچی جگہ سے گر رہا ہو یا کوئی تیز رفتار پہاڑی ندی پتھروں سے ٹکراتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہو۔

میں نے اپنی تمام تر قوتِ بصارت و احساس کو یکجا کیا آگے کی طرف دیکھنے اور محسوس کرنے کی کوشش کی تو جتنا دیکھ نہ سکا اس سے زیادہ ایسا محسوس ہوا کہ میں جہاں پر کھڑا ہوں اس سے تھوڑی ہی دور پر ایک بہت ہی تیز رفتار اور پُر شور ندی اپنی بھرپور روانی کے ساتھ رواں دواں ہے۔

میں چند لمحوں تک مبہوت کھڑا رہا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ایک خواہش یہ بھی دل میں پیدا ہوئی کہ واپس لوٹ چلوں لیکن فوراً ہی کسی نے مجھے یہ احساس دلایا کہ "اُن سے اسی راستے پر ملاقات ہو سکتی ہے۔" پھر سوچا راستہ بدل دوں لیکن جب اس خواہش کے تحت نظریں دوڑائیں تو دور دور تک بس پانی ..... پانی ..... پانی .....

"تو گویا مجھے اسی راستے سے جانا ہے" اور میں اس پُر شور ندی کو پار کرنے کے طریقوں پر غور کرنے لگا اور تب اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں جہاں پر کھڑا ہوں اسی کے سامنے ایک لکڑی کا پل ندی کے اس کنارے کو اس کنارے سے ملاتا۔ خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں اور میں ہنستا مسکراتا گنگناتا اس پل کی طرف بڑھا لیکن جیسے ہی اس پل پر میرا قدم پڑا تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اچانک زلزلہ آ گیا ہو یا کوئی [illegible] لمبے چوڑے، بے جڑ کے درخت پر کوئی بہت وزنی چیز رکھ [illegible]

گئی ہو۔

"مجررررررر..." میں تو جامد لیو کی طرح ایک جگہ کھڑا، تند و بلاخیز حادثہ کا منتظر تھا، مجھے یقین ہو گیا تھا کہ بس اب چند لمحوں میں یہ پل ٹوٹ کر مجھے نئے دُکھ عذاب پہنچائیگا لیکن پیا اٹھا تو پانی تھمی کر پل بہت دیر تک ہچکولے کھا کر پھر اپنی جگہ ٹھہر گیا۔

میں مزید احتیاط کی خاطر آہستہ سے پل پر لیٹ گیا اور سینے کے بل سانپ کی طرح رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

نیچے تیز رفتار پُرشور ندی ... آگے پانی ...
پیچھے پانی ..... دائیں پانی .... بائیں پانی .... اور پھر یوں کہ اس اژدہام میں بیچوں بیچ ایک کمزور و ناتواں پل جو ذرا سی حرکت پر بید کی طرح لرزنے لگتا ہے اور کانپنے لگتا ہے .... اور اس کمزور و ناتواں پل پر سینے کے بل سانپ کی طرح رینگتا ہوا میں...... ڈرتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں ..... من ہی من میں اس پل کی طرح کانپتا اور لرزتا ہوا ہے......"

میں نے آہستہ سے سر اٹھا کر دور دور تک دیکھنے کی کوشش کی ... ہر طرف وہی ندی ... وہی ندی ...... وہی پانی .... وہی ہرررر کی آواز .... صدیاں بیت گئیں اور اسی طرح رات رہی ... صدیاں بیت گئیں اور اسی طرح سب کچھ رہا ... سب کچھ......"

میرے رینگنے کی صورت حال کچھ یوں تھی کہ میں نے سینے کے بل لیٹ کر دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلا دیئے تھے تاکہ ہر اگلے قدم کا کم از کم دھندلے طور پر ہی سہی لیکن اندازہ تو ہو سکے...... تو میں سینے کے بل لیٹ کر یوں رینگ رہا تھا کہ جو جو بھر رینگنے کے لئے برسوں کی مدت صرف ہو رہی تھی ... اسی طرح آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا کہ اچانک مجھے سکتہ سا ہو گیا۔

میرے سر سے آگے پھیلے ہوئے دونوں ہاتھ خلا میں جھول رہے تھے۔

"اب کیا ہو گا؟" میرے اندر زلزلہ آ چکا تھا.....
پیچھے پانی ... دائیں پانی .... بائیں پانی .... بس کمزور و ناتواں پل پر میں ...... اور یہ پل بیچ راستے میں ختم ہو گیا کبھی تو ... نیچے ... بیچ کا ... میں پہنچ سکا ہوں یا نہیں۔

جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں لیکن آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں تھا اس لئے میں نے رونے کا پروگرام ترک کر کے آگے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

ایک مرتبہ پھر میں نے دیکھنے کے بجائے محسوس کرنے کی طاقت سے کام لیا اور اپنے تمام احساسات کو یکجا کیا تو یہ احساس ہوا کہ اس پل کی سرحدیں یہاں تک ختم ہو جاتی ہیں اور اس کے آگے سے شکستہ دیواروں اور منڈیروں کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جن کی جڑیں مضبوط ہیں مگر بلند و بالا عماروں کے اوپری کنگورے ایک ایک کر کے تباہ ہو چکے ہیں اور آگے جو کچھ بھی ہے وہ بیک وقت ندی میں رہے اور ندی سے الگ بھی ——

لیکن سوال یہ تھا کہ میں اس کانپنے لرزنے اور چرچر کرتے پل سے اس منڈیر تک کیسے پہنچ سکوں گا کہ اس کمزور و ناتواں پل اور اس شکستہ دیوار کے بیچ خلا اور اس خلا کے اوپر آسمان اور نیچے پانی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس پل پر سیدھے کھڑے ہونے کی کوشش کیسے کروں کیونکہ ایک مرتبہ یہ کوشش اس پل کی تباہی کا سبب بنتے بنتے رہ گئی تھی اور اگر اب کے بھی یہی ہوا تو میں کہاں کا رہوں گا کہ چاروں طرف پانی اور بیچ میں خدا .....

لیکن اس کے علاوہ اور دوسرا چارہ کار بھی کیا تھا پس راجو! کیا میں نے یہ کہ نہایت آہستگی کے ساتھ پھر رینگنا شروع کیا ...... پہلے میرا ہاتھ خلا میں جھولنے لگا۔

پھر سر خلا کی امانت بنا ...... پھر گردن ...... پھر سینہ پھر ناف ...... اور جب کر تک میں پل سے الگ ہو کر خلا میں لٹکنے لگا تو میرے آگے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو اُن منڈیروں کا لمس محسوس ہوا جن کی جڑوں کی مضبوطی میں نے صرف محسوس کی تھی۔ اور تب ایک مرتبہ میں نے آتی جاتی ہواؤں کو پرنام کیا اور کسی کا نام لئے بغیر چھلانگ دی۔

"ہڑڑڑڑڑ ...... دھڑڑڑڑڑڑڑ ......

چھڑرررر ...... تڑل ل ل ل ل ل ــ" ایک زوردار آواز ...... ایک زلزلہ ...... ایک قیامت ...... اپنی جڑوں سے اُکھڑتا ہوا پیڑ ...... ندی کے تیز رفتار اور پُر شور پانیوں میں بہتا ہوا پل ...... بہت دیر تک بہت کچھ بہتا رہا اور میں منڈیر کی "کگر" (کنارا) پکڑے لٹکا ہوا وہ سب کچھ سنتا رہا جو شاید میری وجہ سے وجود میں آیا یا شاید جس کی وجہ سے میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوا۔

اور پھر جب سب کچھ شانت ہو گیا تو میں آہستہ سے ہاتھوں کے سہارے منڈیر کے اوپر پہنچا اور بہت دیر تک ساکت پڑا رہا پھر جب خود اپنے من میں کچھ شانتی کا اودھو ہوا تو آہستہ سے اُٹھا اور چلنے کا ارادہ کیا۔ تب یہ جانا کہ میں جس جگہ کھڑا ہوں اس کے آگے بڑھنے کے لئے بغیر سیڑھیوں کے اوپر کی طرف چڑھنا ہوگا

"جب اتنا کچھ سہار لیا تو یہ تو بہت تھوڑا سا ہے حسین پیارے!" میں نے اپنے آپ کو سمجھایا اور چھوٹے چھوٹے نشانات کے سہارے آگے بڑھتا گیا۔

اور اب یہاں سے کہانی اچانک مختصر ہونے لگتی ہے چند ہی لمحوں بعد میں نے ایسا محسوس کیا کہ میں "بیر جی" کے مقبرے کے پاس پہنچ گیا۔ شاید اب میں یہ جان سکوں گا کہ "وہ" کون ہیں؟

میں نے یہاں پر پہنچ کر کچھ جانا، کچھ سمجھا اور کچھ محسوس کیا

وہاں پر لوگ دور رویہ انداز میں صف بنائے کھڑے تھے۔ میں بھی اُس صف میں کھڑا ہو گیا اور چاروں طرف نظر میں دوڑا دوڑا کر حاضرین کی انجان آنکھوں میں شناسائی کے رنگ تلاش کرنے لگا اور تب مجھے احساس ہوا کہ یہاں پر میرے ابو کے علاوہ شہر کے دوسرے "معززین" بھی موجود تھے مثلاً شاہ صاحب، ڈاکٹر صاحب، پروفیسر صاحب، وکیل صاحب ماسٹر صاحب وغیرہ وغیرہ۔

جب میں کچھ قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سامنے ایک کنواں ہے (جو حقیقت میں نہیں ہے) وہاں پر دائرہ کی مسجد کا موذن کھڑا ہے اور جس کا نمبر آجاتا ہے اس کا منہ دکھن کی طرف کر کے اس کی گردن پہ دایاں ہاتھ اور کمر پر بایاں ہاتھ رکھ کر کنویں کے منہ پر ذرا سا جھکاتا ہے اور پھر ہٹا دیتا ہے

میرا جب نمبر آیا تو میرے ساتھ بھی موذن نے وہی سلوک کرنا چاہا لیکن میں نے اس کے خلاف احتجاج کیا، میری خواہش تھی کہ میں اپنی مرضی سے "اُن" کی زیارت کروں، شاہ صاحب میری اس خواہش کا احترام کرتے ہیں اور موذن کو ہاتھ سے اشارہ کرتے ہیں کہ وہ ہٹ جائے اور مجھے اپنی خواہش کے مطابق اُن کی زیارت کرنے دے۔

موذن ہٹ جاتا ہے اور میں پورب کی طرف سے پچھم کی طرف منہ کر کے کنویں میں جھانکتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اندر کنویں کی زمین خشک ہے اور اس پر ایک بزرگ صرف لنگی باندھے لیٹے ہوئے ہیں، اوپر کے حصے پر کوئی لباس نہیں ہے، آنکھیں بند ہیں، میانہ قد ہے، کلین شیو چہرہ ہے۔ چہرے پہ ایشیائی رنگ کی آتی جاتی گرمی ہے اور اچھی صحت ہے اور یہ ہے، اور وہ ہے؟

میرے من میں ایک بدگمانی پیدا ہوئی۔ میں سوچتا ہوں ہو سکتا ہے یہ کنواں پہلے سے خشک ہو اور ان کو اس میں لٹا دیا گیا ہو، اور تب اسی لمحہ وہ آنکھیں کھول دیتے ہیں اور میری طرف دیکھ کر پوچھتے ہیں۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام حسین الحق ہے حضور!"

"کس لئے آئے ہو؟"

"آپ کی زیارت کے لئے حضور!"

یہ دو سوالات اور دو جوابات مجھے اچھی طرح سے یاد ہیں اس کے بعد بھی کچھ باتیں ضرور ہوئیں لیکن میں آپ سے یہ حلفیہ عرض کر رہا ہوں کہ آگے کی ایک بات بھی میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ البتہ بعد کا صرف دو منظر میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

پہلا منظر: جب بات ختم ہو گئی تو ان کے پیروں سے پانی جھل مل جھل مل کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا اور پھر آہستہ آہستہ ان کا پورا جسم اس پانی میں چھپ گیا، وہ غائب ہو گئے۔ اور کنواں اپنی پچھلی صورت پر واپس آ گیا اور اس کے بعد سبھی لوگ واپس ہونے لگے، وہ لوگ بھی جو میرے پیچھے کیو میں کھڑے تھے۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ یہ سارا اکھڑاگ صرف میرے لئے پھیلایا گیا تھا اور میرے بعد بساط پھیلے رہنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

دوسرا منظر: واپسی کے لئے ہم سب سے سہل اور آسان راستوں کی طرف بڑھے، خود میرے ہاتھ بھی نہ جانے کہاں سے ایک سائیکل آ گئی تھی۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس سہلے راستے پر بھی (جو سہل ترین راستہ تھا) مجھے بڑی دشواریاں مشکلات درپیش ہوئیں اور اس سڑک پر جو "بیرجی" کے مقبرے سے ایک دم ملی ہوئی ہے پہنچنے کے لئے کافی اونچائی طے کرنی پڑی اور تب کہیں جا کر ہم شہر کی طرف رواں دواں ہو سکے۔

میں نے اس خواب کی تعبیر ابا جان سے پوچھی تو انہوں نے کہا کہ پانی دیکھنا مبارک ہے، البتہ ہزار دشواریوں کے بعد وہاں تک پہنچنا اور پھر واپسی میں بھی دشواریوں کا سامنا کرنا اس بات کی علامت ہے کہ تم کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے کچھ محنت کرنی ہوگی، اور مرات بزرگ کی شبیہ ایک موہوم تجسیمت ہے

ابا نے اس خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ وہ بزرگ حضرت خضر تھے اور دشواریوں کے بعد پہنچنا اور پھر واپسی میں بلندیوں پر چڑھنا اس بات کی علامت ہے کہ تزکیۂ نفس کے بعد تم روحانی سربلندیاں پا سکو گے۔

شفق نے یہ خواب سنا تو مسکرانے لگا اور آئینے کی گرد صاف کرتے ہوئے اس نے دوسری باتیں چھیڑ دیں۔

اور جب میرے بیٹے نے ایک مرتبہ پھر پوچھا "ابو وہ کون ہیں؟" تو میں نے گڑبڑا کر پھر یہی جواب دیا کہ "وہ بیٹے! وہ وہ ہیں۔"

اور جب اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا کہ "وہ کیا ہیں ابو؟" تو میں نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔!

بقیہ: بازی گر کا دوسرا سفر

ہو گئے۔ میری کھوپڑی کا پٹ تڑاخ سے کھل گیا اور اس نے مغز میں منہ گاڑ دیا۔

میں قدموں کی چاپ سن رہا ہوں، لوگ خوشی خوشی مبارک باد دینے میرے پاس آ رہے ہیں اور وہ نوچ نوچ کر میرا مغز کھا رہا ہے۔

میں بھاگ رہا ہوں، درد سے کراہ رہا ہوں، لوگ خوشی میں زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں۔

وہ خون پی رہا ہے، قہقہے لگا رہا ہے، سورج نکل رہا ہے، روشنی پھیل رہی ہے۔

اور میں اپنی کشتی کی طرف بھاگ رہا ہوں۔

غزلیں

آجاؤ زمانے سے ہیں پھیلی ہوئی باہیں
شوکیس سے کہتی ہیں مجھے اُس کی نگاہیں

کچھ اور گرفتارِ وفا قید سے چھوٹے
کچھ اور بڑھیں میری طرف درد کی باہیں

دکھ گھر سے بچھڑنے کا ہمیشہ سے لئے ہے
آدم کی طرح آوارہ سے ہم بھی تباہیں

اُس نے تو بہت موت کی آنکھوں سے چھپایا
دشمن ہوئیں اعجاز مری اپنی کراہیں

••

بجھ گئے جب شام کو دن کے حروف
دل سے آچمٹے ہیں زہریلے حروف

آنکھ سے بہنے لگا میری لہو
چبھ گئے ہیں تیز نوکیلے حروف

کوئی تو سمجھے گا، پرکھے گا انھیں
اِس صدی کا کرب ہیں میرے حروف

رات بھر تھے منجمد، بے جان سے
صبح کو اَوراق پہ پھیلے حروف

بالشت بھر رات

اظہار الاسلام

فری لانس جرنلسٹ مس شبانہ میرے تکون کمرے کی چوکور میز پر بیٹھی تھی۔ میں کھڑکی پر کھڑا اسے تک رہا تھا۔
سورج کی تیچھٹ اس کے چہرے پر پڑ کے نیچے گر پڑی۔
میں نے چاہا کہ اس ڈوبتی آگ کو پکڑ کر کھینچ لوں۔ مگر میرا ہاتھ کھڑکی سے باہر جانے کے بجائے کسی جلتی چیز سے چھوگیا۔ گردن موڑی تو مس شبانہ کا چہرہ خون ہو رہا تھا۔
میز پر گلاس میں بیئر گرم ہو رہی تھی۔ میں نے نزدیک جا کر اٹھالیا۔ اس میں اس کا وجود اُتر آیا تھا۔ جوں ہی میں نے ہونٹوں کے راستے اسے پیٹ میں اُتارنا چاہا وہ جھلملا یا۔
میں نے جھنجھلا کر اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔
وہ رومال سے اپنا چہرہ پونچھ رہی تھی۔

قیمتیں!

وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ شانوں پر سے دو عریاں لکیریں دونوں طرف کھنچ گئی تھیں۔ جی چاہتا کہ اپنے ہونٹوں سے ان لکیروں کو مٹادوں۔ رات کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوئی۔ پہلے معلوم ہوتا تو فوراً کھڑکی بند کر دیتا۔ کیا ضرورت تھی اس بے حیا ننگی رات کو میرے کمرے میں آنے کی۔ اتنی کریہہ اور اتنا ناز۔

بے روزگاری!

گلابی پگڈنڈی پر دو جزیرے تھے۔ دونوں ڈوب اُبھر رہے تھے۔ ہر سو لال پیلی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ کبھی کبھی اُبھرتے جزیروں کی چوٹیوں پر مچھلیاں اپنا منہ مارتیں۔ جزیرے یک لخت ڈوب جاتے۔ بے اختیار میں نے ڈوبتے ہوئے جزیروں کو باہر کھینچ نکالنا چاہا مگر میرا ہاتھ مرتبان سے ٹکرا گیا اور مچھلیاں فرش پر برہنگی کا ناچ دکھانے لگیں۔ جزیرے اب تیزی سے ڈوبنے اُبھرنے لگے۔ کہیں دور سانسوں کا دریا بہتے بہتے اُترنے لگا۔ لوہا گرم ہو چلا تھا۔

فرسٹریشن!

وہ میز پر جھکی ہوئی تھی، اس کا اسکرٹ پھڑپھڑا رہا تھا۔ میں نے پنکھے کا ریگولیٹر تین درجہ اور بڑھا دیا۔ زمین سے ٹکے ہوئے دو گلابی تنے اور تمتما اٹھے۔ ان تنوں پر بلا کی پھسلن تھی۔ نظر ایسی چیز بھی ان پر ٹک نہ پا رہی تھی۔ میں نے گٹ گٹ کر کے بیئر کے تین گھونٹ اور لئے، پھر مونچھوں سے لگی بیئر کو کلمے کی انگلی میں سمیٹ کر ان تنوں پر چھڑک دی۔ ان میں لرزش ہوئی اور وہ پہلے سے زیادہ تمتما گئے۔ بوندیں بھی چمچما اٹھیں۔ میں نے لپلپاتی زبان سے انہیں سونگھ لیا۔ تنوں کی گرمی سے میرے ہونٹ جل اُٹھے۔

بے چینی!

کھڑکی سے باہر رات پاؤں پسارے لیٹی تھی۔ زمین اچک اُچک کر اس کے تلوں سے موتی چوس رہی تھی۔ زرد موم سے

اس کا سینہ پھٹ رہا تھا۔ چاند کی معصوم نظر اس پر چھا رہی تھی۔ نیم خوابیدہ پیڑوں پر سے اداس پتے مجھے گھور رہے تھے۔ میرے دل میں رہ رہ کر خراش پیدا ہو رہی تھی۔ میں زیادہ دیر انھیں نہیں تک پا رہا تھا۔ جیسے میری نظریں چکنا چور ہو جائیں گی۔ پتے بھی خود داری کے بوجھ سے نیچے ٹپک پڑتے۔ زمین بھٹی سے منہ نکال کر اوپر دیکھتی اور انھیں نگل لیتی، پھر گھٹن کو چوسنے میں محو ہو جاتی۔ رات بھی دوسری اور کروٹ لے کر اونگھنے لگی اور زمین کو خواب میں حمل ٹھہر گیا۔

انتشار!

بھک!

شاید بین سوچ سے، نہیں! ڈائریکٹ پاور ہاؤس سے۔ روز کا معمول۔ اندھیرے کا قیدی۔ جب ہی میری نظریں اس اجالے کو تک رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے میں نے اجالے کو ننگا کر دیا۔ بریسیر، بلاؤز، اسکرٹ سب میز پر شرمار ہے تھے اسے ابھی میں الف ننگا نہیں کہہ سکتا کیوں کہ اجالے کے جسم پر ابھی جانگیہ کا بوجھ تھا۔ میرے ہاتھ کئی بار بڑھے مگر کانپ کر سو گئے میں نے سوئے ہوئے ہاتھ کو جگا کر میز کے نیچے لے گیا اور اپنے بوٹ اور موزے اتار دیئے۔ ایک دفعہ پیروں پر ہاتھ پھیرا۔ کتنا سخت اور کھردرا ہو چلا تھا۔ آہستہ سے وہ خود چل کر ہیل والے پنجے پر چڑھ بیٹھا۔ سفر ناخن سے شروع ہو کر ٹخنے پر دم لے رہا تھا۔ کہیں دور اسٹیشن پر ریل چنگھاڑتی اور بھک بھک کرکے سرکنے لگی ٹخنے سلگ اٹھتے۔ میرے پنجوں میں بھی حرارت بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنا گداز سفر شروع کر چکے تھے۔ ریل بھی قریب آتی جا رہی تھی پنڈلیاں بالکل انگارہ ہو رہی تھیں۔ میرے پنجوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ریل سامنے والے پل سے گزرنے والی تھی۔ انگلیاں کوئی چکنی سی چیز پر پھسلنے لگیں۔ اجالے کی سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کا چہرہ کسی شعلے کی طرح تمتما رہا تھا۔ ریل پل پر سے گزر رہی تھی۔ پیروں میں جیسے کسی نے انگارے بھر دیے ہوں۔ انجن تیزی سے دھواں اگل رہا تھا اور ڈھیر ساری چنگاریاں پٹریوں پر بکھرتی جا رہی تھیں۔ پنجے اب تیزی سے ہانپ رہے تھے۔ ریل نے خوب زور سے وسل دی۔ میں لرز اٹھا۔ روشنی آ چکی تھی۔ اجالا اطمینان سے میز پر دراز تھا۔ میں نے اپنے بوٹ اتار کر باہر پھینک دیئے اور کھڑکی سے ہٹ آیا۔

افراتفری!

وہ میز پر قلم تراش سے کھیل رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ میز کی سطح کو ناخن سے کرید رہی تھی۔ میں اس کی پشت پر اوندھے منہ ٹہل رہا تھا۔ مجھے اپنے چہرے کو اٹھا کر سیدھا کرنے میں کافی دقت ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی نظروں کو پھر پوری قوت سے اٹھایا مگر جلد ہی تھک گیا اور سہارا لینے کے لئے نظروں کو اس کی کمر سے ٹکا دی۔ نیلو اسکرٹ اور سفید بلاؤز پر میری نظریں ہانپ رہی تھیں۔ تھوڑا دم لینے کے بعد جب سانسیں درست ہوئیں، تو انہوں نے پھر اوپر اٹھنے کا قصد کیا اور ریڑھ کی ہڈی پر اپنے پیر جما جما کر اٹھتی گئیں پھر جلد ہی دو کالی سلاخوں سے ٹکرا کر بڑے زور سے پھسلیں اور نیچے چلی آئیں۔ ان پر مجھے بڑا ترس آیا۔ میں نے چمکار کر انہیں اٹھایا اور دوبارہ پیٹھ پر جما دی۔ نظریں اب کافی پر اعتماد ہیں۔ اپنا سفر طے کر رہی تھیں۔ ان کے گندے پیروں سے تلچھٹ چھوٹ کر سفید بلاؤز پر بوند بوند داغ پیدا کر رہی تھی۔ نظریں بڑھتیں پھر نیچے چلی آتیں اور داغوں کو چاٹ کر دوبارہ سفر شروع کر دیتیں۔ اس داغ داغ سفر سے ان کے پاؤں شل ہو رہے تھے۔ مگر داغوں میں کسی طرح کمی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ پھر گر پڑتیں مگر جلد ہی کالی سلاخوں سے پھوٹنے والی بو سے وہ سنبھل گئیں جیسے ان میں روح پھونک دی گئی تھی۔ وہ پھر بڑھیں لیکن اس بار ذرا گھوم کر آڑی ترچھی چالوں سے اپنا سفر شروع کیا۔ سفر طے ہوتا گیا اور سفید گھاس کا میدان ختم ہوتا گیا۔

[illegible] تھا وہاں جاکر نظریں برہنہ ہوکر آ بی
[illegible] پر گردن پھر ڈھلک گئی۔

کرپشن !

گھڑی کے دونوں بازو اداس و مضمحل تھے۔ لیکن پنڈولم
[illegible] ادھر لچک کر انھیں بالکل سرد ہونے سے بچا
[illegible] باہر آسمان پر ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے اور کبھی کبھی ان
[illegible] چمک دار دانت دور تک تیر جاتے۔ میں کمرے کی فرش پر
[illegible] پھیلائے اس خوش بخت تل چٹے کو گھور رہا تھا جو دیوار
[illegible] ہوئے چھپکلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ٹیوب لائٹ کی اوٹ میں
چھپکلی دبکی زبان نکال رہی تھی۔ خوش بخت تل چٹا لنگڑاتا ہوا
[illegible] سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ چھپکلی نے اپنی دم کو سکیڑا مگر
تل چٹا اس کی قسمت میں نہ تھا کیوں وہ مرجھو کی چھپکلی زبان لٹکا
[illegible] ہٹ سے زمین پر گر پڑی اور مس شبانہ اچھل پڑی۔ چھپکلی عین اس
کے بلاؤز میں سما گئی۔ کرسی پیچھے الٹ گئی اور وہ سارے کمرے
میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ میں اس زولو قبیلے کے ناچ سے مسرور
ہو رہا تھا۔ اس دوران اس نے سینہ سے بلاؤز اتار کر پھینک دیا
تھا۔ چھپکلی آہستہ سے آگے بڑھ کر دیوار پر چڑھ گئی۔ اس کے سینہ پر
صرف بریسیر تھا جس کی ڈوریں تیز ہانپنے سے تنتنا رہی تھی۔ میں نے
بیئر کے گلاس کو اس کے سیلے ہوئے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ آدھی
سانس ہی میں پوری انڈیل گئی۔ گلاس کو ہٹاتے ہوئے بچی کچی بیئر اس
کے [illegible] ہونٹوں سے نکل کر سرخ گلے سے ہوتی ہوئی بریسیر میں آگئی
اور اسے تر کرتی ہوئی ناف کے نیچے اسکرٹ میں چھپ گئی۔ میں
[illegible] ٹھنڈی بیئر اس کے جسم پر چھڑک دی۔ تاکہ چھپکلی کا اثر
[illegible] جاتا رہے۔ اچانک اسے زور کی چھینک آئی اور ڈور ٹوٹ گئی
[illegible] زمین پر گر پڑا۔ جزیروں میں پھر ایک بار ہلچل پیدا ہوئی
[illegible] ابھرنے کا سوال پھر ابھرا۔ بریسیر کو اٹھا کر میں نے پتلون
[illegible] رکھ لی۔ اور رومال نکال کر ان جزیروں پر پھیلا دیا۔

خوش بخت تل چٹا اس بار چھپکلی کی آغوش میں تھا۔

بھوک !

باہر رات نے ایک زور کی انگڑائی لی اور آنکھیں
مل کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ زمین کا سینہ چٹک رہا تھا۔
اوپر سے بوندیں گر گر کر سوراخوں میں جانے لگیں۔ پتے آہ و
زاری میں مبتلا ہو گئے۔ میں میز پر دوزانوں بیٹھ گیا۔ پتلون
ہینگر پر ٹنگی ہوئی تھی۔ پاس ہی بلاؤز، بریسیر، بنیان اور
شرٹ بھی اونگھ رہے تھے۔ وہ کھڑکی پر کھڑی سیاہی کو نظروں سے
کرید رہی تھی۔ مجھے بڑے زور کی الٹی آئی۔ میں باتھ روم کی طرف
تیزی سے لپکا۔ وہ واش بیسن پر جھکی ابکائیوں سے چھٹکارہ
پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے کہیں جگہ نہ پاکر اس کا اسکرٹ
الٹ کر اس میں بھرپور قے کی۔ کھٹی کھٹی قے جس سے بھاپ
اٹھ رہی تھی۔ واش بیسن سے بھی قے کی بو اٹھ رہی تھی لیکن میٹھی
میٹھی۔ میں نے اسکرٹ واش بیسن میں الٹ دیا۔ اب کھٹی میٹھی
بو دونوں کو لبھا رہی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر پانی چھڑک کر
میرے انڈرویر سے اپنا منہ پونچھا۔ اس کا اسکرٹ باتھ ٹب
میں اپھار رہا تھا۔ میرا انڈرویر خون بھاری ہو گیا۔ میں نے فوراً ٹب
میں غوطہ مار دیا۔ وہ شاور کے نیچے اکڑوں بیٹھی تھی۔ میں بھی جاکر
ٹائلٹ پر فروکش ہو گیا۔ تب میں اسکرٹ اور انڈرویر ایک
دوسرے کو آنکھیں مار رہے تھے۔ میں جلدی سے ٹائلٹ پیپر پھینک
کر، شاور کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہ میرے سر پر سوار تھی۔ مجھے مجبوراً اٹھ جانا
پڑا۔ شاور کا نیلگوں پانی میرے جسم کو چھید رہا تھا۔ وہ ٹب میں تیر رہی
تھی۔ اس کی ایک ران میں اسکرٹ اور دوسری میں انڈرویر تھا۔
میں نے قریب جاکر اسکرٹ کی زپ انڈرویر سے ملا دیا تو ٹب کا پانی
کھول اٹھا اور میں گھبرا کر باتھ روم سے نکل آیا۔ وہ بھی کھڑکی سے
ہٹ آئی تھی۔

اقربا پروری!

کمرے کی زرد دیوار پر ایم۔ ایف حسین کی پینٹنگ دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی۔ ایک عورت جس کے پیٹ میں ہاتھی کا بچہ تھا۔ عورت کی آنکھوں میں تمکنت لہرا رہی تھی۔ اچانک مس شبانہ کا پیٹ پھولنا شروع ہو گیا۔ اسکرٹ کا گھیر بھی کافی پھیل گیا تھا مگر کہیں سے زپ کے ٹوٹنے کی آواز نہیں آئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس کے پیٹ میں پیپر ویٹ، قلم تراش، پن، کلپ، ایریزر، پنچ مشین، اور قلم دان بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ قلم دان میں وہ سنہرا ونگ سن پن بھی تھا جس سے میں نے دفتر کے اوقات میں کتنے خواب تراشے تھے۔ میں نے دیکھا میرا عزیز قلم مجھے دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک کرب سا تھا۔ جیسے ہی میں نے ہاتھ بڑھانا چاہا۔ وہ اچھل کر پنچ مشین کے پیچھے چھپ گیا۔ اور جھانک جھانک کر مجھے چڑھانے لگا۔ اس کے آس پاس کی دوسری چیزوں نے ایک منٹ تک خوب زور سے قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد آپس میں سرگوشی کر کے ماتم سرا ہو گئیں۔ قلم اب بھی چھپا بیٹھا تھا۔ میں نے جھک کر اسے پکڑنا چاہا مگر جیسے ہی میں جھکا، مجھے اپنے پیٹ میں ڈھیر سارے سنلٹ بونڈ پیپرز پھڑپھڑاتے نظر آئے۔ انہوں نے تیزی سے رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ لال، سبز، کاسنی، بسنتی پھر زرد رنگ سب پر غالب آ گیا۔ میں گھبرا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ قلم جو پنچ مشین کے پیچھے چھپا ہوا تھا، اب کیپ سے اپنا منہ نکال کر مجھے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ وہ زور سے سامنے آتا اور اپنے ہی حصار سے ٹکرا کر لوٹ جاتا لیکن ہر بار واپسی میں اس کے ساتھ ایک نیا قلم ہوتا۔ اس کے پیٹ میں قلموں کی تعداد بڑھنے لگی۔ دھیرے دھیرے دوسری چیزیں سرک کر ان کے لئے جگہ بنانے لگیں۔ میں اس بہتات سے گھبرا کر زور سے پیچھے ہٹا۔ عین اسی وقت پینٹنگ سے ہاتھی کا بچہ نکل کر میرے اور اس کے درمیان آ گیا۔ وہ اپنی سونڈ سے ڈھیر سارے پمفلٹ نکال رہا تھا۔

ذخیرہ اندوزی!

مس شبانہ اوندھے منہ فرش پر پڑی تھی۔ کولہے پر سے لہراتے ہوئے دونوں پاؤں کی پنڈلیاں سلگ رہی تھیں۔ بیئر ختم ہو گئی تھی۔ کپیٹ سے بھی الماری سے بھی۔ دراز میں صرف شیمپین تھی۔ میں نے خمیدہ کمر ہو کر اسے گلے سے پکڑ کر نکال لیا۔ پھر تین گلاسوں میں انڈیل کر میں اس کے سامنے دوزانو ہو گیا۔ بازوؤں میں سے سر نکال کر اس نے گلاس کو دیکھا، ساتھ ہی اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے تینوں میں سے ایک ایک گھونٹ لیا۔ میں چپ چاپ تھا۔ اس نے ایک گلاس سے منہ دھویا دوسرے سے پنڈلیاں اور بقیہ کو تیسرے گلاس میں ڈھال کر ناف کے راستے پیٹ میں اتار لیا۔ کچھ بوندیں جو ناف پر تیر رہی تھیں میں نے انھیں پھونک کر اڑا دیا۔ کمرے کا فرش دھیرے دھیرے ہل رہا تھا ساتھ ہی جھٹکوں سے میں بھی اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ اس پر غشی طاری تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے ڈائری پر چل رہے تھے۔ انگلیوں سے سہ رنگی روشنی پھوٹ کر ڈائری پر پھیلتی جا رہی تھی۔ ان رنگ برنگی لکیروں کی مہک سے میں بوجھل ہوا جا رہا تھا۔ برداشت سے بے قابو ہو کر میں نے ان انگلیوں کو اپنی زبان کی گرفت میں لے لیا۔ انگلیاں پہلے تو سکڑیں پھر بچائیں اور ہتھیار ڈال دیا۔ لوہا ایک بار پھر گرم ہو چلا تھا۔ صرف وار کرنا باقی تھا۔ میں نے اس کے سر پر سلطنت بار کو بکھیر دیا۔ میری انگلیاں دلدل میں دھنستی چلی گئیں۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اندر سے ٹوٹ رہی ہو اور اس ٹوٹ پھوٹ میں وہ اندر اندر مرتی جا رہی ہو۔ میں نے بچتے نوٹ کو مچوڑ مچوڑ کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور بقیہ حصہ دراز میں گھسیڑ دیا۔ وہ پھر لکوری ہنی کی طرح بکھرا گئی۔

ملاوٹ!

باہر نیم کی شاخ پر کوئی پرندہ شدید اذیت کا شکار تھا

اس کی ہر چیخ پر مس شبانہ کا بدن تھرتھرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خون نچڑ رہا تھا۔ سینہ اس تیزی سے پھول پچک رہا تھا جیسے بلاؤز کی قید سے آزاد ہونا چاہتا ہو۔ میں نے میز سے اس کے بیگ کو اٹھا کر ہیٹر پر پھینک دیا۔ ہیٹر سہم کر خاموش ہوگیا۔ مس شبانہ کا جسم بھی اپنے خول میں واپس جا رہا تھا۔ اونگھتی رات نے پھر کروٹ بدلی۔ زمین نے پھر لپک کر اس کے کھتے سے منہ لگا دیا۔ وہ اب کرسی کے دستے پر بیٹھی تھی دستے پر اس کی ران پھسل کر ڈبل ہوگئی تھی۔ منی اسکرٹ بھوک سے بلبلا رہا تھا۔ اچانک وہ دستے کے ساتھ زمین پر آرہی۔ اس کی ران پر ایک سرخ سی لکیر نظر آرہی تھی۔ ایک دائرہ سمٹتا جا رہا تھا۔ میں نے فوراً ہنگر سے بریسیئر کھینچا اور اسے اوڈی کلون میں تر کر کے دائرے پر لپیٹ دیا۔ اس کی آنکھیں کچھ جھپک سی چلی تھیں۔ میں نے بچی کچی شمپین اس کی آنکھوں پر چھڑک دی۔ وہ ایک ہلکی سی انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے جسم کے مختلف حصے ہوگئے ہیں۔ رانیں الماری سے ٹنگی ہیں، بازو کھڑکی پر لٹکا ہے، سینہ ہنگر سے جھول رہا ہے، سر میز کے نیچے پڑا ہے۔ کمر زمین پر کراہ رہی ہے۔ انگلیاں ہوا میں تیر رہی ہیں، آنکھیں دیوار سے چپکی قہقہہ زن ہیں۔ میں نے بھی اپنے جسم کے مختلف حصے کر کے ان کے ہم شکلوں کے پاس پہنچا دیا۔ باقی کو چھوڑ کر صرف دو حصے [illegible] گئے۔ دیر تک تو تکرار ہوتی رہی۔ کبھی اتنا اوپر آجاتی کبھی عرش چت ہو جاتا۔ اس جوڑ جوڑ کی لڑائی سے میرا وجود دکھیل رہا تھا کمرے سے زلزلے کا زور بھی ٹوٹ رہا تھا۔ چھت کبھی بیٹھ جاتی کبھی اٹھ جاتی۔ تینوں دیواریں آپس میں آکر مل جاتیں پھر ایک ہی جھٹکے سے جدا ہو جاتیں۔ ادھر پنڈولم دونوں کڑیوں کی گرفت میں سسک رہا تھا۔

سدِ باب!

تکون کمرے کو کھسکا کر میں باہر پیڑ کے سائے میں لے گیا۔ وہ چوکور میز، بیئر کی بوتلیں، ایم۔ ایف حسین کا شاہکار اب کھلیان میں پڑے تھے۔ اب میں تھا اور کمرہ کمرے کی ہم آغوشی میں رات کو میں نے لتھیڑ دیا۔ زمین کا پیٹ اب بھی خالی تھا۔ فرش پر کوئی چیز چمک رہی تھی۔ شاید اسکرٹ کی زپ تھی۔ میں نے اسے دھرتی کے ادھ کھلے ہونٹوں پر پھینک دیا۔ میرا جوڑ جوڑ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا برقی روشنی نیزے برسا رہی تھی۔ میں نے کمرے کی ایک دیوار سے اپنے دونوں ہاتھ ٹکا دیئے اور دوسری سے پیر۔ اب میں بالشت بالشت اوپر اٹھ رہا تھا۔ روشن دان کے قریب پہنچ کر میں ملائکہ سے لٹک گیا۔ پھر جب اس سے سر نکال کر باہر دیکھا تو زمین اپنا ڈھانچہ بدل رہی تھی۔ اور رات اس کے خوف کے تیزی سے دور بھاگتی جا رہی تھی۔ کچھ بوسیدہ مخلوق ادھر سے ادھر ٹھیک کر فجر کی تیاری کر رہے تھے۔ پھر میں نے زمین کو غائب ہوتے دیکھا اس کی جگہ پانی ہی پانی نے لے لیا۔ پانی کا ریلا روشن دان سے قریب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جیسے ہی ریلا قریب آیا میں چھپاک سے نیچے کود پڑا۔ لیکن یہ کیا؟ میرا تکون کمرہ بھی چھت تک پانی سے بھرا ہوا تھا۔ میں فرش پر سر ہنوڑائے بیٹھا آنے والے واقعہ پر غور کر رہا تھا کہ اچانک کمرے میں ایک بڑی سی مچھلی داخل ہوئی۔ میں نے چاہا کہ اس کی دم پکڑ کر باہر نکل جاؤں مگر میرے ہاتھ میں اس کا اسکرٹ آگیا۔ برہنہ مچھلی گھوم کر میری طرف خشم گیں نگاہوں سے دیکھا تب میں نے بھی دیکھا کہ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ■

کاغذ کی قلت اور ہوشربا گرانی کی وجہ سے ہم ہندوستان و بیرون ہندوستان کے ہزاروں قارئین کی فرمائشیں پوری کرنے سے قاصر ہیں لہٰذا آپ اپنا رسالہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا موقع دیں

(ادارہ)

غزلیں

رشید افروز

خوش رہنے کی جرأت کہاں سے لاؤں گا
بجھے گی آگ دھواں بن کے پھیل جاؤں گا

یہ سِل جو سینہ پہ رکھی ہے ایک مدت سے
میں اس کا بوجھ کہاں تک بھلا اٹھاؤں گا

تمام شہر میں پھیلی ہے روشنی، لیکن
میں اِس مکاں کے اندھیروں میں ڈوب جاؤں گا

کچھ اور روز ٹھہر زیست کا تقاضا ہے
میں اپنے دل سے تیرا درد بھی مٹاؤں گا

تمام عمر یونہی خاک چھانتے گزری
یہ آرزو ہی رہی آسماں بناؤں گا

ہر اک لمحہ اذیت ہے اس اذیت سے
کوئی بتائے میں کب تک نجات پاؤں گا

ابھی میں اپنی حقیقت سے آشنا ہو لوں
پھر اس کے بعد تجھے آئینہ دکھاؤں گا

●●

اپنی بستی اپنے لوگ
ہم تنہا کیسا سنجوگ

جانے کیسا خطرہ تھا
چلتے چلتے رہ گئے لوگ

ہم شطرنج کے مہرے تھے
ہار گئے اب کیسا سوگ

ہنس دیجے تو کچھ بھی نہیں
چپ رہیے تو جیون روگ

ساری دنیا دشمن ہے
اپنے آپ سے خوش ہیں لوگ

شاخ سے گرتے پتوں نے
مٹی سے مانگا سہوگ

جیون بھر کی بپتا کو
دو لفظوں میں کہہ گئے لوگ

●●

بات اور سرِ محفل
ہم کہاں تھے اس قابل

ضبط ہم پہ لازم تھا
خواہ مخواہ ہوئے بزدل

بوجھ سر پہ بھاری ہے
اور راستہ مشکل

جس جگہ ٹھہر جائے
قافلہ وہی منزل

ایک کو ضرب دیجے
ایک سے تو کیا حاصل

ہاتھ کی لکیروں میں
تار تار مستقبل

جو ہوا سو بہتر ہے
سوچنے سے کیا حاصل

رات خواب میں دیکھا
ڈوبتا ہوا ساحل

●●

بے وقوف!

نشاط الایمان

وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف جا گرا اور اس کے منہ سے پھول جھڑیاں چھٹنے لگیں۔ "ابے او سالے اندھا ہے دیکھ کر نہیں چلتا ہے۔ ٹھہر تیری خیریت پوچھتا ہوں۔" اور وہ نشے میں لپٹے ہوئے اپنے وجود کو زمین سے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ جاڑے کا دم توڑتا ہوا دور تھا لیکن اس روز کہاسے کا بادبان اتنا دبیز تھا کہ سامنے کی کوئی چیز سوجھائی نہیں دیتی تھی۔ اس پر اوپر سے گزرتا ہوا ریلوے پل کے شیڈ نے وہاں اور بھی تاریکی پیدا کر دی تھی۔

"ابے کدھر گیا، سالے ذرا سہارا بھی نہیں دے پڑا۔" وہ اتنی دیر میں صرف بیٹھ سکا تھا۔

"آتا ہوں بیٹے!" ذرا فاصلے سے آواز ابھری "میں بھی زمین پر آ رہا تھا۔"

"ابے بیٹے کا باپ جلدی آ نہیں تو مزاج ٹھیک کر دوں گا۔" وہ نشہ میں غرایا۔

اور اسی وقت کسی نے ٹوٹتے ہوئے اس کے بھرے بھرے کاندھے کو تھاما۔ "اچھا اب اٹھو۔ زبان خراب نہ کرو۔ اللہ ناراض ہوگا۔" اور اس کے ہاتھوں نے کسی طرح اسے پیروں پر کھڑا کر دیا۔

"تو کون ہے بے۔ کہاں جا رہا ہے؟" وہ جھومتے ہوئے بولا۔

"میں پل پار مسجد کا خادم ہوں۔ وہیں جا رہا ہوں۔ اچھا اب تم آہستہ آہستہ چلے جاؤ۔ نہیں تو کہو، میں تمہیں گھر تک پہنچا دوں۔ کہاں رہتے ہو؟"

"محلہ داروغہ میں، چلو میرے ساتھ۔" اس نے کسی داروغہ کی طرح حکم دیا۔

اور ڈھیلے ڈھالے ہاتھ نے اس کے کسے ہوئے بازو کو پکڑا اور اس کو سہارا دے کر محلہ داروغہ کی طرف بڑھنے لگا جو وہاں سے نزدیک ہی تھا۔ وہ خود اس سے کچھ فاصلہ کے دوسرے محلہ میں بود و باش کرتا تھا۔

"بیٹے! آج تم نے بہت پی لی ہے۔ یہ ......"

"ہاں سالی نے خوب پلائی اور خوب کھیلی بھی۔ بڑا..."

"اچھا اب چپ ہو جاؤ اور ذرا سنبھل کر چلو۔ دیکھو سامنے سے موٹر آ رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے ساتھ مجھے بھی اس بار یکدم سڑک پر لے جاؤ۔ اور دونوں جان سے جائیں۔"

"ابے تو موت سے ڈرتا ہے؟"

"نہیں، لیکن بے موت مرنا کیا معنی۔ جلتے ہوئے چراغ کو تیز ہوا میں لے جاؤ گے تو کیا وہ بجھے گا نہیں؟"

"ابے تو تو بڑا ٹھاٹ کی بات کرتا ہے۔ تو ہے کون سچ بتا۔؟"

"کہہ دیا ہے پل پار مسجد کا خادم ہوں۔"

"ابے تو نے پہلے کہا تھا کہ پل پار مستان کا خادم ہوں۔ اب کہہ رہا ہے مسجد کا۔ مجھ پر رعب گانٹھتا ہے۔"

"تم کو سننے میں غلطی ہوئی ہے۔"

اتنی دیر میں داروغہ محلہ آگیا تھا اور جب وہ فٹ پاتھ سے اُتر کر محلہ کی گلی میں داخل ہوئے تو ایک کتا بھونکنے لگا۔
" ابے حرام زادے تو بھونکتا ہے۔ تیرا باپ آرہا ہے۔ ہٹ جا سامنے سے، نہیں تو ایک ہی لات میں کیں کیں کرتا ہوا لڑھک جائے گا۔"

اس کی اس بات پر سہارا دے کر لانے والے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اسی دوران میں سامنے سے کوئی نمودار ہوگا۔

" کون ہے؟ "

" تیرا باپ اور کون؟ " وہ تنکتے ہوئے بولا۔

" اوہو، تو ہے ڈمنک۔" اس کی آواز پہچان کر آنے والا بولا اور پھر جب نزدیک آیا اور غور سے دیکھا تو ٹھٹھک کر ذرا پیچھے ہٹا۔ " مولانا صاحب، آپ! "

" ابے تو کس سے بات کرنے لگا۔ یہاں مولوی مولانا کہاں سے آگیا؟ "

" تم پر ہزار لعنت ہو ڈمنک۔ تو مولانا نظام جیسے ضعیف اور پاکیزہ آدمی کو تکلیف دے رہا ہے۔ خدا کی پناہ! تو سیدھا دوزخ میں جائے گا۔"

" ایسا مت کہو بھائی۔" مولانا صاحب بولے۔ "خدا اسے نیک راستہ پر لگا دے۔ اچھا اب یہاں سے آپ اس کو پہنچا دیں۔ کہا سا کی وجہ سے وقت کا اندازہ کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ مگر فجر کی نماز کا ٹائم قریب ہے۔"

" جائیے حضور! " اور اس نے ڈمنک کو تھام لیا۔ جو ڈولتے ڈولتے اب نیند کے دریا میں اُتر رہا تھا۔

" چل بے، آگے بڑھ " اور اس نے ڈمنک کو گھسیٹا

" ابے کون ہوتا ہے؟ " وہ غنودگی سے اُبھرتے اور لڑکھڑا کر چلتے ہوئے بولا۔

" تیرا ٹھکا باپ۔ چپ چاپ سے چل ورنہ نالی میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

" ابے حکما بھائی ہو، چلو چلو، وہی تو میں کہہ رہا تھا کہ اتنی دیر میرا کون ساتھ دے گا۔"

" ابے چپ! "

اور اس ڈانٹ پر وہ سچ مچ چپ ہو گیا۔

صبح کو وہ دن چڑھے بیدار ہوا۔ اس کے کمرے کے دوسرے ساتھی اپنے کام پر جا چکے تھے۔ صرف وہ کتا دروازے کے پاس بیٹھا ہوا تھا جس کو ایک بار اس نے ڈبل روٹی کا ٹکڑا دیا تھا۔ تب سے وہ ہمیشہ اس کے پاس آتا تھا۔ اس وقت وہ کبھی گلی کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی کمرہ کے اندر، جو ذرا سا کھلا ہوا تھا، پھر زبان نکال کر اپنے بدن کے کسی حصہ کو چاٹنے لگتا تھا۔ ڈمنک نے اس کتے کو کچھ جلتی اور کچھ دکھتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا پھر اس کی ٹوٹتی ہوئی نظر کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی پر گئی جہاں سے پردہ کے سوراخ سے سورج کی کرنیں لکیر کی طرح کمرے کے فرش پر گر رہی تھیں۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور [illegible] ہوا کہ اس کا سر بھاری بھاری سا لگ رہا تھا اور بدن میں ایک طرح کے درد کی چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اس نے اپنے سر کو آگے پیچھے اور دائیں بائیں گھمایا پھر اس نے اس طرح اپنے سر کے بھاری پن کو چھونے کی کوشش کی جیسے کوئی گھڑی کی رفتار کو کان کے پاس لے جا کر محسوس کرنے کی سعی کرتا ہے اور اسے اپنی اس حرکت سے پتا چلا کہ اس کا سر جوں کا توں بھاری تھا۔ وہ کمبل کو پاؤں پر سے ہٹاتے ہوئے چوکی سے اُتر آیا اور کھڑا ہو کر اپنے بدن کے درد کا اندازہ لینے لگا اور اسے معلوم ہوا کہ درد کی سوئی بھی کسی گھڑی کے پرزے کی طرح ٹھک ٹک کیے جا رہی تھی۔ وہ بے بسی کے عالم میں دوبارہ بستر پر بیٹھ گیا اور اپنے سر کو ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

اسی وقت کتا جواب تک دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا ، کھڑا ہو کر اپنی دم ہلانے لگا ۔ اور چوکھٹ پر حکما نے قدم رکھا اور ایک ہی ساتھ دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر پڑیں ۔

" آخاہ ! سیٹھ جی اب جاگے ہیں۔" اس نے کمرہ میں قدم رکھتے ہوئے طنز کا وار کیا ۔

ڈمک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی چھپکلی کی ادھ کٹی دم اپنی تڑپ کے آخری دور میں ہو ۔

" کیوں بے زبان نہیں ہے ؟ "

زبان تو اس کے پاس ضرور تھی مگر اس وقت وہ دو تین پیگ کی شدید خواہش اور جستجو میں تھی کیونکہ اس کے کھاتے میں اس کے سر کے بھاری پن اور بدن کے درد کا بھی مداوا لکھا ہوا تھا۔ پہلی بار جب وہ اس طرح کی کیفیت کا شکار ہوا تھا تو راجو نے اسے یہ نسخہ بتایا تھا ۔ آزمایا تو وہ نسخہ زود اثر ثابت ہوا۔ ایک عرصہ کے بعد وہ دوسری مرتبہ اسی درگت کو پہنچا تھا تو اس وقت بھی اس نے راجو کے پریکٹس پر عمل کیا تھا۔ اور اس وقت وہ یہی سوچ رہا تھا کہ وہ " سیکو نربار " میں دوڑ جائے ۔ مگر وہاں تک جانے کے لئے اس کی جیب میں پیسے تھے یا نہیں، یہ اسے پتہ نہیں تھا کیونکہ رات وہ جس پل سے گزر کر آیا تھا اس کے لئے وہ شاہ خرچ بن گیا تھا۔ اگر اس کی جیب میں رقم ہوگی بھی تو ٹوڈی ہاؤس تک جانے کے لئے اور ٹوڈی ہاؤس سے اب اس کا جی اچاٹ تھا ۔ رہا ٹھرا، جب سے اس نے بی انگوری سے راہ و رسم پیدا کی تھی وہ خالی ٹھرا نہیں پیتا تھا۔ پیتا ہو تو کسی دوسری شراب کا ایک دو حصّہ اس میں ضرور ملا لیتا تھا اور جولیا اور رمّن کے ہونٹوں کی شراب کی طرح اپنے اس نیو برانڈ مرکب کو بھی خوب مزے سے چڑھا تا تھا ۔

" ابے بولے گا یا لگاؤں ایک تھاپ ۔"

" یار تمہارے پاس کچھ ہے ۔ پہلے میں سیکو لر سے ہو آؤں۔"

وہ بولا" سر سے پیر تک بوجھ اور درد میں گرفتار ہوں۔"

" ایک شرط پر ...... "

" پیارے تمہاری ہر شرط منظور ہیگی ...... "

" پہلے میری شرط سن لو ۔ آج سے تم کو پینا کھانا ہے تو میری طرح پابندی کرنی ہوگی. ایسا نہ ہو کہ مقدر بن جاؤ ۔ اور تم جانتے ہو کہ میں دنیا میں سب سے زیادہ سور سے نفرت کرتا ہوں اور تم نے ذات سور بن کر سور کو بھی مات کر دیا...... "

" کہہ دیا تمہاری تمام شرطیں قبول ۔ اب جلدی کرو ۔ دو کچھ رقم ۔ "

" رقم نہیں، یہ لو ۔" اور حکما نے اپنی پتلون کی جیب سے ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر اس کے سامنے کر دی ۔" اسے میں اپنے لئے لایا تھا ۔ "

" ڈمک نے جلدی سے بوتل کو پکڑا اور اس کا کارک کھول کر منہ سے لگا لیا ۔ اور جب اس نے اس کی ساری شراب کو اپنے حلق کے نیچے اتار لیا تو اس کے منہ سے ایک لمبی ڈکار نکلی ۔ اس نے بوتل کو چوکی کے نیچے لڑھکا دیا اور کہا ۔" میرے یار، تم ہزار برس جیو ۔ "

" تمہاری شرابی دعا کی مجھے ضرورت نہیں ۔ ہاں تم میری شرط کو نہ بھولنا ورنہ میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔"

" نہیں یار ایسا مت کہہ ۔ آخر بات مجھ سے ایسی کیا حرکت ہوگئی جو تم اس قدر ناراض ہو ، ویسے اتنا احساس ہے سالی جولیا نے شراب اور شباب کے اتنے ساغر تڑوائے کہ میں اپنے آپے میں نہیں رہا ۔ "

" لیکن تم اس حالت میں وہاں سے نکلے کیوں ؟ "

" پتہ نہیں، کس ترنگ میں آکر نکل پڑا تھا ۔ اس میں جولیا کا کوئی قصور نہیں ۔ بس میں اپنے ہی اُبال اور ترنگ کا شکار ہوا ہوں ۔ "

" اب تم اپنے اس اُبال کو بھی قابو میں رکھو۔ "

" منظور، لیکن تم نے بتایا نہیں کہ تم میری رات کی کس حرکت پر اتنے برہم ہو۔ "

" جب تم ہوش ہی میں نہیں تھے تو کیا کہوں۔ ویسے میرے دل میں اس انسان کی عزت اور احترام کا جذبہ اور بڑھ گیا ہے۔ "

" یار پہیلی کی طرح بات مت بولو۔ بتاؤ وہ کون تھا؟ "

" میں مولانا قیام صاحب کی بات کر رہا ہوں جو تمہیں گلی تک سہارا دے کر لائے تھے۔ اور ان کے ...... "

" بکواس۔ تم مجھ پر رعب مت جماؤ۔ ایک مولانا شرابی کو سہارا دے، انوکھی بات۔ ایسے لوگوں کے لئے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ میں مولوی مولانا سب سے خوب واقف ہوں یہ طبقہ پرلے درجہ کا خود غرض ہے..... "

" ابے زبان سنبھال"۔ حکما کو تاؤ آ گیا۔ " سالے پانچوں اُنگلیاں برابر ہوتی ہیں؟ "

" مگر اُنگلیاں ایک دوسری سے جڑی ضرور ہوتی ہیں"۔

" تو نے قیام صاحب کو کٹھ ملا سمجھا ہے، جو ہذیان بکے جا رہا ہے۔ "

" چلو وہ ولایا ہو گا بھئے، اب قصہ ختم کرو۔" ڈمنک اس کے تیور کو دیکھ کر بولا۔ " مجھے اب بھوک لگی ہے۔ جاتا مت۔ غسل کر لوں پہلے۔ "

" میں جا رہا ہوں۔ "

" نہیں یار غصہ مت ہو، اطمینان سے بتاؤں گا کہ مولوی ملا سے مجھے کیوں چڑھ ہے۔ "

" دیر کروگے تو چلا جاؤں گا۔ سینما کے منیجر سے ملنے کا وقت ہو رہا ہے۔ "

" ابھی آیا۔" اور وہ تولیہ صابن لے کر باہر نکل گیا۔

وہ دونوں ایک ہی پیشے کے مسافر تھے۔ اور ان کا بزنس تھا سینما کے ٹکٹ کو بلیک سے بیچنا اور دونوں بلیک ٹکٹ کے ٹھیکہ دار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں شہر کے تین چار سینما گھر تھے۔ جہاں سے وہ روزانہ سینما کے منیجر، بکنگ کلرک پولس کے آدمیوں اور اپنے " مزدوروں " کو دے دلا کر اتنا بچا لیتے تھے کہ اگر وہ دو تین دن تک اُدھر کا رُخ نہ بھی کرتے تو ان کے لئے تب بھی ہولی اور دیوالی تھی۔ مگر ان دونوں کے مزاج اور طور طریقہ میں فرق تھا۔ حکم اللہ عرف حکما بال بچے دار آدمی تھا۔ اس لئے اس کا قدم ہمیشہ نپا تلا اُٹھتا تھا۔ کبھی کبھار وہ بھی بہک جاتا تھا لیکن اتنا نہیں کہ کسی نالی میں جا گرتا۔ اسے اچھے برے کی پہچان تھی اور وہ اچھوں کی قدر کرنا جانتا تھا۔ اور محمد داؤد عرف ڈمنک بقول حکما، دل کا گرانڈ تھا مگر کردار کی رو سے لنگڑا تھا۔ وہ سماجی بندھن سے آزاد تھا۔ اس کے والدین اور بھائی بہن ضرور تھے لیکن وہ سالہا سال سے ان لوگوں سے اتنی دور تھا کہ وہ سب اس کو دفنا چکے تھے۔ اس کی زندگی،

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

کے تابع ہو کر رہ گئی تھی۔ دوسرے روپ میں وہ آج کے معاشرہ کی مکمل نظیر تھا۔

" لو یار پہنچ گیا۔" وہ کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے بولا وہ نہانے کے بعد بڑا خوش و خرم اور چاق و چوبند لگ رہا تھا۔ ویسے بھی اس کا گٹھا ہوا سانولا خد و خال جاذب نظر تھا۔ اس کی عمر تیس کے قریب تھی لیکن سیلانی مزاج اور بے فکری کی وجہ سے چھبیس سال سے زیادہ نہیں لگتا تھا۔ وہ اپنی صحت اور لباس کا فلمی ہیرو کی طرح خیال رکھتا تھا اور عام طور پر وہ فلمی پوشاک کا شائق تھا۔ ان دنوں وہ بل باٹم پر چھینٹ دار ہوائی شرٹ اور چست پنگون پر بیل بوٹے سے مزین پٹی دار کرتا زیب تن کئے رہتا تھا۔

اس وقت وہ وہی لباس پہن کر تیار ہوا تو حکما نے

کہا " ابے تیرے ابا حضور نے کبھی بھی اس قسم کا کپڑا پہنا ہے ؟ "
پہلے وہ قہقہہ [illegible] کے ہنسا، پھر بولا " ہو سکتا ہے
فیشن تو بدلتا رہتا ہے۔ اس نے کلکتہ میں ہوٹل کی بیراگیری
سائیکل رکشا چلانے اور توڑی ہاؤس کا گلاس چڑھانے کے
دوران، اپنی جوانی میں پہنا ہو۔ مگر اب تو وہ گاؤں میں
سر پر عمامہ، بھر کلے کی داڑھی، گھٹنے تک کلی دار کرتا اور
شرعی پاجامہ میں ملبوس مذہبی ایکٹنگ کر رہا ہوگا۔ میں نے
آخری مرتبہ اس کو اسی بھیس میں دیکھا تھا۔ "

" یہ مذہبی ایکٹنگ کیا معنی ؟ "

" اب میں اپنا پیٹ بھروں گا اور تیرے کو سینما کے
مینجر سے ملنا ہے۔ اب باہر چل۔ "

[illegible] تالا لگا کر دونوں گلی میں آگئے اور اس ہوٹل
[illegible] چائے [illegible] پیسہ فی پیالی چائے ملتی
تھی اور اسی حساب سے دوسری چیزیں دستیاب ہوتی تھیں
مگر اب چائے ۲۵ پیسہ اور دیگر چیزیں آسمان کا منہ چڑھاتی
تھیں۔ پہلے اس کے گاہک رنگا رنگ کے تھے۔ لیکن اب
اس کے کسٹمرز میں ایک ہی کمپنی کے مختلف شعبہ کے لوگ تھے
رشوت خور، بلیک مارکیٹیر، ذخیرہ اندوز، اسمگلر، جیب
کترے، چمچہ گیری کرنے والے اور ان سبھوں کے لڑکے لڑکیاں
ڈمک اس کا مستقل گاہک تھا۔

ان کے پیچھے پیچھے کتا بھی آرہا تھا۔

جب ان کے پاس سے ایک رکشا والا گھنٹی بجاتا ہوا
گذر گیا تو حکما بولا۔ " اب تو کہتا چل، مذہبی ایکٹنگ سے
تیرا کیا مراد ہے ؟ "

" اچھا تو، تیرا دماغ اسی میں الجھا ہوا ہے۔ " اور
وہ پھر ہنسا۔ " ابے میرا وہ باپ سر سے پیر تک جھوٹ کا
پلندہ اور خودغرضی کا پیکر ہے۔ مگر اس نے ان دونوں
عیبوں کو بڑی ہشیاری سے مذہبی لبادے میں چھپا رکھا ہے
وہ گاؤں کے مدرسہ میں بچوں کو پڑھاتا ہے، مسجد کی امامت کرتا
ہے اور میلاد خوانی کا ایسا پارٹ ادا کرتا ہے کہ اسے دیکھ کر
دلیپ کمار کو پسینہ آجائے اور پران تو میرے باپ کی شاگردی
قبول کئے بغیر نہیں رہے گا۔ "

" ابے دوزخی! اپنے باپ کو اس طرح یاد کرتا ہے! "
حکما نے جل کر کہا۔

" اس کی اسی مولوی اور ملاگیری سے میں جل گیا تھا۔ وہ مجھے
بھی اس کی ٹریننگ دینے چلا تھا۔ لیکن میں بھاگ نکلا۔ "

" اور اب تک تو اسی نظر سے ہر مولوی اور مولانا کو دیکھتا
ہے۔؟ "

" درست۔ مگر اس کے بعد بھی جن مولویوں سے پالا پڑا،
وہ سب کے سب میرے باپ ہی کی طرح ریاکار نکلے۔ "

" مگر تو کبھی قیام صاحب جیسے انسان سے نہیں ملا؟ "

" مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔ "

" ان سے ملوگے ؟ "

" ہرگز نہیں۔ "

حکما اس کے " ہرگز نہیں " پر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

" یار تو ہنسا کس بات پر ؟ " اور ڈمک چلتے چلتے
اسے دیکھنے لگا۔

" لو ہوٹل آگیا، پہلے کھا لو، خالی پیٹ میں میرا جواب
چبھن سے لگے گا۔ "

وہ دونوں ہوٹل میں داخل ہوگئے اور کتا ہوٹل
کے باہر ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

جب وہ باہر نکلے تو کتا اپنی جگہ سے اٹھ کر دُم
ہلانے لگا۔ ڈمک کتا کو بھولا نہیں تھا۔ اس نے کاغذ میں
لپٹے ہوئے روٹی اور شامی کباب کو کتے کے سامنے ڈال دیا
جنھیں وہ دُم ہلا ہلا کر کھانے لگا اور وہ دونوں ہوٹل کے
سائڈ میں ایک پان سگریٹ کی دکان پر جا کھڑے ہوئے۔ چار

مینار کا ایک ڈبہ خریدا۔ حکما ڈبہ سے سگریٹ نکالنے لگا اور ڈمک سڑک پار فلم "بابی" کا لمبا چوڑا پوسٹر دیکھنے لگا۔

"لے یار" اس نے سگریٹ کا ڈبہ ڈمک کو تھمایا اور جیب سے لائٹر نکال کر سگریٹ جلایا اور ایک کش لے کر بولا۔

"اچھا اب میں چلا ڈیوٹی پر۔"

"او کے۔ مگر سن جا۔ تو نے قیام صاحب کے بارے میں ہوٹل کی میز پر جو کچھ کہا، مان لیا۔ لیکن میں ان سے ملوں گا نہیں۔"

"او کے" حکما ہنسا۔ "مگر ان کے بارے میں تمہارا پھکڑ لہجہ بند ہو جانا چاہئے۔"

"تمہاری یہ شرط بھی منظور۔" اور ڈبہ سے سگریٹ نکالنے لگا۔

اور حکما خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

بارہ بج رہا تھا۔ اور اس کے بزنس کی ڈیوٹی ڈیڑھ دو بجے سے شروع ہوتی تھی۔ اس وقت وہ کہاں جائے۔ وہ سگریٹ کا کش لیتا ہوا سوچنے لگا۔ یہ لمحہ اس کی زندگی میں بہت دن بعد آیا تھا۔ ورنہ اسے وقت کی کیا پروا تھی۔ وہ اپنے وقت کی ہر گھڑی کو ... سیلانی خواہش پر چھاور کر لیتا تھا اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ وقت کے لمحے کیسے آئے اور کدھر چلے گئے۔ اس کے سامنے وہ تمام چیزیں تھیں۔ یہ دنیا، یہ لمبی سڑک اور سڑک پر رینگتی اور دوڑتی ہوئی گاڑیاں، فٹ پاتھ اور اس پر آتے جاتے رقم رقم کے ابن آدم اور بنت حوا۔ قسم قسم کی دکانیں اور دکانوں کی رنگا رنگی۔ وسیع آسمان اور وہاں سے بادبان کی طرح پھیلتی ہوئی دھوپ اور ہوا اور اس کے نغمے گاتے ہوئے جھونکے۔ مگر یہ تمام چیزیں اس کی نگاہوں سے دور تھیں۔ اس کا دماغ الجھا ہوا تھا، اس کے دل میں ایک بے چینی تھی۔

اور اس کا وہ وقت گذر نہیں رہا تھا!

اس نے جھنجھلا کر سگریٹ کو سڑک پر پھینک دیا اور یکبارگی اپنے آپ بڑبڑایا۔ "لعنت ہے حکما پر، کم بخت نے ایک بوجھ میرے سر پر ڈال دیا ہے۔ اسے میں جتنا پھینکنے کی کوشش کرتا ہوں وہ اتنا ہی جمتا جاتا ہے۔ اور وہ مولانا بھی یکدم الو کی دم ہے کہ رات میرے راستے میں آپڑا۔ بھاڑ میں جائے وہ۔" اور وہ ... کہہ کر سڑک عبور کرنے لگا۔

جب وہ دوسر... پر پہنچا تو بوجھ کو بدستور اپنے سر پر مسلط پایا۔ وہ اور جھنجھلا گیا اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اپنے سر کو قلم کر ڈالتا۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ وہ اپنے اس دھیان کو دفن کرنے کے لئے پان کی دکان پر چلا گیا۔ جو سامنے اور بالکل قریب تھی اور پنواڑی کو زعفرانی پتی والا پان لگانے کا حکم دے کر ادھر ادھر نظر دوڑانے لگا۔ مگر اس کی نظر مایوس ہو کر لوٹ آئی۔ وہاں ایسا کوئی نہیں تھا جس میں اپنے کو الجھا کر اس وقت کو بھول جاتا۔ پنواڑی نے اسے پان دیا۔ اس کا جی چاہا پان کی گلوری کو نالی میں پھینک دے۔ لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکا۔ اس نے پیسے چکائے اور پان کو منہ میں رکھتے ہوئے بے وجہ ایک طرف مڑ کر چلنے لگا۔

وہ کچھ ہی فاصلہ تک گیا تھا کہ اس کا شانہ کسی سے ٹکرایا۔

"اجی ہیرو صاحب، راستہ دیکھ کر چلو۔" اور پھر ایک ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا۔

وہ راجو تھا، اس کا یار۔ ڈمک نے زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی اور پان چباتا رہا۔

"اماں آج تو کچھ بدلا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ خیر تو ہے۔"؟

پہلے اس نے پان کی پیک کو پھینکا پھر بولا۔ "لعنت ہے حکما پر۔"

"ارے حکما بھائی نے تجھے کیا کیا؟" اسے کچھ کھٹکا ہوا۔

"وہ کہتا ہے میں مولانا قیام سے جاکر معافی مانگوں اور شکریہ ادا کروں۔"

راجو کو اطمینان خاطر ہوا کہ بات اُلٹ پھیر کی نہیں تھی۔ "آخر بات کیا ہے؟"

ڈمک نے رات کا واقعہ دوہرایا جو حکما نے دیکھا تھا۔

"تیرے پر [illegible] کوئی دباؤ ڈالا ہے؟"

"نہیں!"

"تو تیرے جیسا سانڈ کیوں اس چکر میں ہے۔ گولی مار۔"

"مگر اس کم بخت نے مولانا کی ایسی تصویر اُتار کر دی ہے کہ میں اس کے اثر کے شکنجے میں پھنس گیا ہوں۔ کتنی دیر سے کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن چھٹکارا نہیں مل رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے؟"

"تو بیار [illegible] اس مولانا کے پاس جانے میں ہے کیا۔ اگر [illegible] وقت ہوتا تو تجھے اسی وقت وہاں لے جاتا [illegible] ان کے پاس نہیں۔ چلے جانا۔" اور وہ اپنے بزنس سے متعلق دو تین باتیں کہہ کر چلا گیا۔

وہ ایک پل تک راجو کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

اس کا دل قیام صاحب سے ملنے کو چاہ رہا تھا مگر اس کا دماغ اس چاہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ جب وہ خیال کرتا۔ سامنا ہونے پر وہ مولانا اس سے [illegible] گا اور [illegible] نظر سے تاکے گا۔ اگر اس کے کہنے اور [illegible] میں تذلیل کا پہلو ہوا تو کیا وہ برداشت کر سکے گا، جب کہ وہ مولانا قسم کے لوگوں کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔

لیکن جب حکما کے یہ جملے "مان لو، وہ نہ ہوتے تو نشہ کی جھونک میں سڑک پر جاگرتا اور تجھ پر کوئی موٹر چڑھ جاتی تو تیری لاش کو اس اندھیرے میں کوئی آوارہ کتا

نوچتا ہوتا، اسے کیوں بھولتا ہے۔" اس کے کانوں میں گونجنے لگتے تو اسے جھرجھری سی محسوس ہونے لگتی تھی اور اسے اپنا کردار کھوکھلا بھرا ہوا معلوم ہوتا۔

اور اس وقت بھی جب وہ راجو کو دیکھتا ہوا چھوڑ کر اپنے آپ میں آیا تو حکما کی وہ باتیں پھر اس کے سامنے آگئیں۔

"تو سچ کہتا ہے حکما بھائی!" اس مرتبہ اس کے دماغ نے بھی اس کے دل کا ساتھ دے کر سرگوشی کی۔ "میں مولانا صاحب کی جگہ ہوتا تو اس سالے شرابی کو تین چار لاتیں اپنی طرف سے جماتا اور اسے نالی میں لڑھکاتا ہوا اپنی راہ لیتا۔ سالے کو۔"

عین اسی وقت اس کے ٹخنے پر گرم گرم سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس کا خیال بٹ گیا۔ اور فوراً اس کی نگاہ پیروں کی طرف گئی اور پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "اپنے تو بھی تک پیچھے لگا ہوا ہے۔" اس کے پاؤں کے پاس وہ کتا تھا جو اس کے کمرے سے اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ جھک کر اپنے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن کو گدگدانے لگا۔

اور ٹھیک اسی اثناء جب وہ کتے پر اپنا پیار چھڑک رہا تھا، سڑک کے مقابل فٹ پاتھ کے کنارے ایک سرکاری بس رُکی اور اس میں سے شور کرتے ہوئے مسافر اُترنے لگے۔

کتا بجلی سی تیزی سے اُٹھ کر 'بھوں بھوں' کرنے لگا۔

اور وہاں "مارو سالے کو خوب مارو..." کے شور کے ساتھ ساتھ جلد ہی ایک بھیڑ جمع ہو گئی۔

جب ڈمک وہاں پہنچا تو بھیڑ کے اندر سے آتی ہوئی آواز سنی۔ "ہائے مر گیا۔"

"مر جا سالا۔" دوسری آواز آئی۔

"پولس کے حوالے کر دو۔"

"پولس!" کوئی زور سے ہنسا۔ "پولس ہی کی بدولت تو ان سالوں کا روزگار چلتا ہے۔"

"ارے اس کے منہ سے خون نکل رہا ہے۔" کسی نے کہا۔

"مرجائے یہ" ۔ کوئی دوسرا بولا۔ "ذرا اس کے
کپڑے کو دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے کسی نواب کے گھر میں پیدا ہوا ہے
اور یہ کرتوت!"
"اماں، نواب کہاں کے شریف ہوتے تھے، سب
سالے چار سو بیس اور چور جیسے آج ہمارے ملک کے سفید لیڈر
ہیں ــــ"

اب بہت ہو گیا۔ اب چھوڑ دو، روپیہ ملنے سے رہا۔
روپیہ تو اس نے اپنے ساتھی کو پاس کر دیا ہوگا۔"

بھیڑ چھٹنے لگی تھی۔ اسی لمحے ایک بوڑھا آدمی اس
بکھرتی ہوئی بھیڑ کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ساتھ دس
گیارہ سال کا ایک معصوم سا لڑکا تھا۔

"کیسی بھیڑ ہے بھائی؟" اس نے ایک نوجوان سے
جو لنگی اور قمیص پہنے ہوئے تھا، پوچھا۔

"مولانا! آپ کہاں اِدھر آئے؟"

مولانا کا لفظ ڈمک کے کانوں تک پہونچا اور وہ
چونک اُٹھا اور جس طرف سے آواز آئی تھی ادھر بڑھتے ہوئے
کھوج کی نگاہیں ڈالنے لگا۔

"ڈیرے پر جا رہا تھا، بھیڑ دیکھی تو ادھر چلا آیا۔" بوڑھا
آدمی کہہ رہا تھا۔

اس کی عمر ساٹھ، پینسٹھ کے درمیان ہوگی۔ مگر جو اس
عمر میں خوش رو، خوش مزاج اور دردمند دکھائی دے رہا تھا
حالانکہ اس منزل پر آدمی چڑچڑا، پراگندہ اور اپنے وجود سے
بیزار نظر آتا ہے۔ لیکن وہ تھا کہ مجمع کو دیکھ کر اس کی طرف چلا
آیا تھا اور وہ مولانا تو کسی زاویے سے معلوم نہیں ہوتا تھا۔ شاید
اس نوجوان نے موجودہ سماجی زبان، چلن اور لہجے کے مطابق
اسی معنی میں اسے مولانا سے مخاطب کیا تھا جیسے کوئی اپنے کسی شناسا
کو اُستاد، ماسٹر اور دادا کہہ کر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ڈمک نے
اس بوڑھے کے خدوخال اور حلیہ کو دیکھ کر سوچا۔ کیونکہ نہ اس کے
سر پر پگڑی تھی: گھٹنے تک لمبا کرتا تھا۔ اور ٹخنے سے کافی اوپر
پائجامہ رہتا۔ نہ آنکھوں میں سُرمہ اور نہ منہ میں پان۔ ہاں تازہ
تازہ روئی کی طرح سفید داڑھی اس کے چہرے پر ضرور تھی۔
اور جو اس کے گیہواں چہرے پر اتنی بھلی لگ رہی تھی جیسے رنگ
برنگ پھولوں کے درمیان گلاب کا سفید پھول کھل رہا ہو اور
اس کا لباس ۔ سر پر معمولی سی سفید ٹوپی، بدن پر پٹی دار
کالر کی سفید قمیص اور کھلی مہری کا پائجامہ اور کاندھے پر ایک
چھوٹا سا تولیہ۔ لیکن اس سادہ اور عام لباس میں بھی اس کی
شخصیت بہتروں سے جدا اور بلند نظر آ رہی تھی۔ مگر وہ مولانا
ہرگز نہیں تھا۔

ڈمک نے دل ہی دل میں کہا۔ "ارے میں نے اس
بوڑھے کو تو کئی دفعہ دیکھا ہے۔"

"آئیے حضور، چھوڑیئے۔" نوجوان نے احترام سے کہا۔
"نہیں بھائی، ذرا میں بھی دیکھوں وہ کون ہے؟"

اب وہاں چھ سات آدمی اس جیب کترے کے گرد کھڑے
تھے اور وہ جیب کترا اپنے بگڑے ہوئے حلیہ اور داغدار لباس
میں کہیں کہیں سے جلی ہوئی لکڑی کا کندہ معلوم ہو رہا تھا۔

ضعیف آدمی تھوڑا آگے بڑھا اور اسے دیکھتے ہی
بول پڑا۔ "ارے تو ہے نندو، توبہ توبہ۔"

پاکٹ مار نے آواز سن کر اپنے سر کو گھمایا، بوڑھے کو
دیکھا اور کراہتے ہوئے بولا۔ "بابا، چور تو نکل گیا اور
لوگوں نے پکڑ کر مجھے مارا۔"

"بُرا کام کرنے والا خود ہو یا اس کا ساتھ دینے والا،
دونوں بُرے ہیں۔"

"لیکن میں....."

"نندو بیٹے! جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے، مگر زبان
ہوتی ہے۔ اچھا اُٹھ، چل میرے ساتھ، دو دن سے تیری
ماں بخار میں بھن رہی ہے اور تو ہے کہ شیطان کے چکر میں پڑا ہے۔"

ضعیف آدمی نے اپنے ساتھ کے بچے کے ہاتھ کو پکڑا
جھوم کر جانے لگا۔ نندو کراہتے ہوئے اٹھا اور اس کے
چل پڑا۔

وہ سب تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ڈمک نے
نوجوان کو آواز دی جو ضعیف سے وہاں پر مخاطب ہوا
اور جو خود بھی نندو کے پیچھے ہو لیا تھا۔ نوجوان رک گیا۔

ڈمک اس کے قریب گیا اور پوچھا۔ "بھائی صاحب
یہ ضعیف آدمی مولانا ہیں؟"

"ہاں، ہیں تو؟"

"کیا نام ہے؟"

"قیام الدین صاحب"

"اوہو!" اور اس کے دل و دماغ میں ایک
طوفان برپا ہو گیا۔ کتنی دیر سے قیام کا پہاڑ اس کے سر پر
مسلط تھا۔ لیکن مولانا قیام کو پہچان کر اسے محسوس ہوا کہ وہ
مصری کی ڈلی ہیں۔ ان کی باتیں کتنی مختصر لیکن ان میں
غم خواریت اور پیار تھا۔

ڈمک نے دیکھا، وہ چھوٹا سا کارواں اپنے امیر
ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

اس کے دل نے اس سے سرگوشی کی۔ "میاں داؤد!
نہر کا ٹھنڈا پانی لہریں کھاتا ہوا تمہارے پاؤں تک
تم نے اپنی پیاس نہ بجھائی، جاؤ آگے بڑھ کر اپنی
روح تر کر لو۔"

لیکن اس کے بگڑے دماغ نے اسے بہکایا۔ "ابے
مک، وہ تجھے مذہب کا بکرا بنا کر رکھ دے گا اور بکرا
انجام تجھے معلوم ہوا ہے۔"

وہ کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ اور ابھی وہ اسی
شدید الجھن میں گرفتار تھا کہ ایک ٹیکسی اس سے کچھ دوری
رکی۔ اس کا دروازہ کھلا اور ٹیری کاٹن کی بیبے چھاپ
والی رنگین ساڑی میں ملبوس جولیا نکلی۔ قیامت کے روپ
اور رنگ میں!

اس کی بے چین نظر پلٹی اور جولیا کے قاتل نینوں سے
ٹکرائی۔ "ارے تم!" اس کی زبان سے نکلا۔

وہ اس کے نزدیک آئی۔ "تم بہت خراب ہو گئے
ہو، تم اس حالت میں کیوں چلے آئے تھے؟"

"پتہ نہیں۔"

"میں جاگی تو تمہیں ڈھونڈا۔ نہ ملے تو نوکر کو تمہارے
گھر دوڑایا۔ معلوم ہوا تم کسی کے ساتھ باہر نکل گئے ہو۔ جان
میں جان آئی۔"

"شکریہ!" اور لفظ شکریہ پر وہ چونکا، پھر اس
کی نگاہ کارواں پر گئی۔

"ارے ادھر کیا دیکھنے لگے۔ آؤ چلو۔"

"نہیں، ٹیکسی کا کرایہ دے دو اور میرے ساتھ آؤ۔"
پھر کچھ سوچ کر جلدی سے بولا۔ "نہیں نہیں جولیا تم گھر جاؤ، میں
وہیں آ رہا ہوں۔"

"ارے تمہیں ہوا کیا؟"

"میں مولانا صاحب سے مل لوں اور ان کا شکر....."

"تم مولانا سے ملوگے۔" جولیا اس کی بات کاٹ کر بولی
اور مسکرائی۔ اس کے لہجے اور مسکراہٹ میں طنز ہی طنز تھا۔

مگر اب وہ یکدم سے اپنے دل کے گداز بازوؤں
میں سما گیا تھا۔ اس نے جولیا کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں
دیا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا اس قافلہ کی طرف جانے لگا۔

جولیا اس کے اس برتاؤ سے ششدر رہ گئی اور پھر
اسے برا سا لگا۔ وہ بڑی بے دلی سے چپ چاپ ٹیکسی میں
آ کر بیٹھ گئی اور اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

وہ کتا بھی اس کے پیچھے پیچھے ایک فرماں بردار غلام
کی طرح جا رہا تھا۔

"مولانا صاحب!" اس نے نزدیک پہنچتے پہنچتے آواز دی۔

قافلہ رک گیا۔ سبھوں نے پلٹ کر دیکھا۔

"میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔" وہ یکایک بول پڑا۔ حالانکہ اس نے سوچا تھا کہ پہلے وہ ان کا شکریہ ادا کرے گا اس کے بعد اپنے مذموم فعل کی معافی چاہے گا۔

"ارے آپ ہیں کون، ویسے صورت ذرا جانی پہچانی لگتی ہے اور کس بات کی معافی؟" وہ کچھ حیرت میں پڑتے ہوئے مسکرائے تو دُمنک کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ عجیب آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں وہی شرابی ہوں جسے آپ نے آج بھور میں اس کی گلی تک پہنچایا تھا۔"

اچانک ان کے ممتا سے بھرے ہوئے چہرہ پر خوشی کے پھول کھل اٹھے۔ وہ بولے۔ "آؤ میرے قریب آؤ۔" اور جب وہ ان کے بالکل پاس پہنچا تو انہوں نے اس کو اپنے سینے سے لگایا۔ "تم پر خدا کی سلامتی ہو۔" اسے اپنے سینہ سے جدا کرتے ہوئے بولے۔ "تمہارا یہ قدم رب عالم کو بہت پسند آیا ہوگا۔"

دُمنک کا سر یوں جھکا ہوا تھا جیسے کوئی پکے پکے رس دار پھلوں سے لدی ہوئی شاخ جھکی رہتی ہے۔

"بیٹے! اگر تمہارے پاس وقت ہے تو تم بھی میرے ساتھ چلو!"

اور جب وہ بغیر کسی پس و پیش کے ان کے ساتھ جانے لگا تو دور ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی جولیا کی نظر یک دم بجھ گئیں اور وہ بد بدائی، "بے وقوف!"

وضاحت

"آہنگ" فروری ۸۴ء کے شمارے میں میری جو غزل چھپی ہے اس میں دو جگہ ترمیم کرنا چاہتا ہوں۔ مطلع کو میں نے اس طرح بدل دیا ہے ؎

نہ پوچھے گردِ پسِ کارواں بھی نام تو کیا
چراغِ رہ کو ہے جلنا، نہ ہو دوام تو کیا

پہلے میں نے مصرعِ ثانی میں قافیہ 'مقام' رکھا تھا اور اسی طرح آہنگ میں چھپا بھی ہے۔

ایک اور شعر میں مجھ سے ایک لفظ کے سلسلے میں سہو ہوا ہے۔ 'تزک' میں 'ز' متحرک ہے، ساکن نہیں اس مصرع کو اس طرح بدلا ہے ؏

ملا کسی کو بہت جاہ و احتشام تو کیا

وحید اختر

بقیہ: سمندر کیا کہتا ہے؟

اور میرے ہانپنے کی آواز سے کمرہ گونج رہا تھا۔ بڑی بڑی مشکلوں اور بڑی بڑی کوششوں سے میں یہ ہیاں طے کر سکا ایک ایک قدم کو میں نے ایک ایک صدی میں طے کیا۔ اپنے اوپر والے کمرے میں پہنچتے پہنچتے میں اس قابل بھی نہیں تھا کہ کھڑا رہ سکتا۔ وہاں پہنچتے ہی میں زمین پر گر گیا اور میرا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

باہر سمندر کا پانی شور مچا مچا کر کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس کی بات سمجھنے والا کوئی نہ تھا!

صفدر

غزل

قہقہوں سے بھی ڈر جائیں گے لوگ
بات کی تہہ میں اُتر جائیں گے لوگ

ہاتھ ہل جائیں گے، بے باق حساب
ریل کی طرح گذر جائیں گے لوگ

آج بھی جب میں پہنچ جاؤں گا گھر
شہر ڈھ جائے گا، مر جائیں گے لوگ

خواب ڈھوتی ہیں یہاں سب آنکھیں
خامشی ٹوٹتے ڈر جائیں گے لوگ

جاگتی آنکھ جو منظر چھو لے
خوف سونگھیں گے بکھر جائیں گے لوگ

اے سنو! انت نہیں رستوں کا
میں پکاروں بھی مگر جائیں گے لوگ

تم الگ ہو کے چلو، طنز تو کیا
خوف کی چاپ سے بھر جائیں گے لوگ

●

عین تابش

غزل

انجان صداؤں پہ کبھی کان نہ دھریے
اک بار تو اس غار کے سینے میں اُتریے

بوسیدہ تعلق کا دھواں بن کے بکھریے
بے جان سی تصویروں سے اس درجہ نہ ڈریے

ہنستے ہوئے لوگوں میں تو جی کھول کے ہنسیے
روتے ہوئے، روتی ہوئی بستی سے گذریے

قبروں پہ اُگ آئی ہے ہری گھاس کی کائی
ان دھندلی سی تصویروں میں اب رنگ نہ بھریے

کچھ دور تک قدموں پہ عجب موڑ تھا طاری
لوگوں نے پکارا تو بہت تھا کہ ٹھہریے

●

سمندر کیا کہتا ہے ـــــــ؟

عبدالصمد

باہر سمندر کا پانی شور مچا مچا کر کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس کی بات سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ سمندر کے پاس جو زبان تھی اسے سمجھنے سے قاصر تھے اور سمندر شور مچائے جا رہا تھا۔

میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی تو سمندر کی تیز و تند ہوائیں میرے کمرے میں داخل ہو کر دھمال مچانے لگیں۔ میں نے کھڑکی کھلی ہی چھوڑ دی اور اپنی حالت پہ غور کرنے لگا ـــــــ روز یہی کرتا ہوں۔

میرا کمرہ بھی عجیب ہے، بلکہ پورا مکان ہی، دو منزلہ مکان ہے۔ ایک کمرہ نیچے ایک اوپر۔ لیکن میں نیچے والے کمرے میں اب تک نہیں گیا۔ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں اوپر والے کمرے میں رہتا ہوں۔ یہاں میری ضرورت کی تمام چیزیں مل جاتی ہیں بس ایک ذرا حرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کافی بڑا کمرہ ہے اور اس میں صرف دو دروازے ہیں۔ ایک آنے کے لئے، دوسرا جانے کے لئے۔ جانے کی تو ضرورت ہی مجھے اب تک نہیں پڑی اور آنے کا قصہ یہ ہے کہ مجھے یاد ہی نہیں میں کب آیا اور کیسے آیا، بس میں خود کو ہمیشہ سے اس کمرے میں پا رہا ہوں اور ایسا لگتا ہے کہ شاید ہمیشہ پاتا رہوں گا۔ میں اکثر حیران ہوا ہوں کہ میں اکیلا کیوں ہوں۔ یوں اکثر کچھ لوگ مجھ سے ملنے چلے آتے ہیں، آنے والے دروازے سے آتے ہیں اور جانے والے دروازے سے چلے جاتے ہیں۔ اور میں پھر اکیلا رہ جاتا ہوں۔ اکثر ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی چکر میں پھنس گیا ہوں اور اس سے نکلنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔

کمرے میں میری ضرورت کی سبھی چیزیں موجود ہیں۔ ایک طرف بستر لگا ہے اسی سے لگا ہوا ایک صوفہ ہے اور بیچوں بیچ ایک لمبی سی میز ہے جس پر دبیز شیشہ فٹ ہے۔ اس میز پہ بہت ساری چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ بہت سے رسائل و اخبارات ایش ٹرے، پیپر ویٹ، گلدان۔ اور بھی بہت سی چیزیں۔ ان ہی چیزوں سے میں اپنے ملنے والوں کی ضیافت کرتا ہوں۔

کمرے میں چند مناسب نامناسب جگہوں پہ کچھ مورتیاں نصب ہیں، بڑی خوبصورت۔ ان کا مقصد شاید کمرے کی خوبصورتی بڑھانا ہے۔

کمرے کے ایک کونے میں، میں نے ایک پردہ تان دیا ہے جس کے پیچھے میں اپنا کھانا تیار کرتا ہوں۔ کھانے پکانے کی تمام چیزیں پردے کے پیچھے ہی رہتی ہیں۔

دوسرے کونے میں میرے باتھ روم کا دروازہ کھلتا ہے یہ ایک بہت ہی سکون و عافیت کی جگہ ہے۔ میں اکثر یہاں گھنٹوں بیٹھا رہا ہوں۔

کمرے میں کھڑکیاں کئی ہیں اور یہ سب کی سب سمندر کی طرف کھلتی ہیں۔ میں تازہ ہوا ان ہی کھڑکیوں سے پاتا ہوں۔ یہ کھڑکیاں میری بہترین رفیق ہیں اور جب بھی میرا دل گھبرایا ہے میں ان ہی کھڑکیوں سے لگ کر کھڑا رہا ہوں۔ ان کے ذریعہ میرے کمرے کی گھٹن اور حبس نکل نکل بھاگا ہے اور تازہ اور صحت مند ہوا کے جھونکے یہاں پہنچے ہیں۔

کبھی کبھی ہوا کے جھونکے اتنے شوخ و شریر ہو جاتے ہیں کہ میرے

کمرے میں رکھی ہوئی بہت سی چیزیں الٹ پلٹ ہو جاتی ہیں۔ لیکن میں ان سے لطف اندوز ہوا کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ تیز و تند جھونکے سمندر سے ہوتے ہوئے آتے ہیں اور دور دراز کا پیغام لاتے ہیں۔ لیکن میرے ملنے والوں کو یہ جھونکے پسند نہیں اور ان کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے کھڑکی بند کر دینی پڑتی ہے۔ لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے کیونکہ میرے ملنے والے بھی کبھی کبھی آتے ہیں

میرے ملنے والے صرف تاجر حضرات ہوتے ہیں۔ سوداگران! اور یہ سب مجھ سے بزنس کی بات کرتے ہیں۔ دو اور دو چار کی باتیں کرتے ہیں۔ ایک کے بدلے ایک کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کے خالص تاجرانہ سلوک سے میں کبھی کبھی چڑھ جاتا ہوں لیکن میرا چڑھنا ایک فضول سی بات ہے کیونکہ سوداگر بزنس کی بات نہ کرے گا تو کیا پھول کی خوشبو پر لکچر دے گا۔ اور ایسا سوچ کر میں اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہوں اور میں بھی اُن سے بزنس کی باتیں کرنے لگتا ہوں۔ دو اور دو کتنے ہوئے۔؟

یہ سوداگر بڑے چالاک ہیں، بڑے چاق و چوبند اور ہوشیار۔ اُن سے باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی تو ڈر معلوم ہونے لگتا ہے کہ پتہ نہیں کہاں پر لغزش ہو جائے اور یہ اس سے فائدہ اُٹھالیں اور ان سے معاملہ کرنا ——— خدا کی پناہ!

لیکن ایک بات ہے۔ یہ کبھی دھوکہ نہیں دیتے صرف زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک کامیاب بزنس مین کی پہچان بھی کیا ہے۔ یہ تو اُن سے معاملہ کرنے والوں کا کام ہے کہ وہ بھی ہمیشہ ہوشیار رہیں اور اپنے کانوں اور دماغوں کو ہمیشہ کھلا رکھیں ——— ان سوداگروں کو دھوکا دینا بھی بڑا مہنگا پڑتا ہے کیونکہ ان کا اصول کچھ ایسا ہے کہ دھوکہ دینے والا خود ہی دھوکہ کھا جاتا اور یہ چپ چاپ کھڑے مسکراتے رہتے ہیں۔

یہ تمام سوداگر روز یہاں نہیں آتے ہیں، لیکن میں نے ان سب سے معاملہ کیا ہوا ہے۔ وہ آتے ہیں اپنی مطلوبہ چیز لے جاتے ہیں اور قیمت مجھے دے جاتے ہیں۔ کبھی قیمت مجھے دینی پڑتی ہے اور چیز وہ دے جاتے ہیں۔ اور تب تو میرا کام چل رہا ہے ورنہ میں تو کب کا مر کھپ چکا ہوتا۔ بھلا یہ اکیلاپن مجھے زندہ چھوڑتا۔؟ اور پھر زندہ رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے ـــ کچھ معاملہ، کچھ بزنس!

لیکن زندگی صرف بزنس ہی نہیں ہے اس لئے میرے اندر کی گہرائی سے کبھی کبھی کوئی چیز اوپر اُٹھتی معلوم ہوتی ہے جو مجھے اس ماحول۔ اس پیشہ ورانہ اور تاجرانہ ماحول سے بغاوت پر اکساتی ہے اور میں پھڑپھڑا کر رہ جاتا ہوں کیوں کہ کچھ کر نہیں سکتا ـ یوں کرنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں لیکن اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتا ہوں۔ اب تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ اس کمرے کو چھوڑ کر نیچے والے کمرے میں چلا جاؤں، لیکن یہ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے سوداگروں سے نیچے نہ جانے کا معاہدہ کیا ہوا ہے۔ میرا معاملہ ان سے ہمیشہ برقرار رہتا ہے، ایک ختم ہوتا ہے تو دوسرا شروع ہو جاتا ہے اور یہ چکر چلتا ہی رہتا ہے اور میں ایسی حالت میں نیچے نہیں جا سکتا اگر میں ایسا نہ کروں تو پھر سوداگروں سے میری نہیں نبھے اور سوداگروں کا کیا ہے، ان کے لئے گاہکوں کی کیا کمی،

تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی!

اپنی مجبوریوں پر بہت بار مجھے رونا آگیا ہے۔ کس قدر بے بسی کی زندگی ہے کہ فرار کی کوئی صورت ہی نہیں۔...... ـــ صرف بزنس، صرف تجارت ـ لو اور دو ـــ دو اور لو ـ!

سامنے حد نظر تک پھیلا ہوا سمندر اپنی ساری رعنائیوں اور نیرنگیوں کے ساتھ موجزن رہتا ہے اور اس کی آزادی کو حسرت سے دیکھ کر میں گھنٹوں رو دیا ہوں۔ کس قدر خوش ہے یہ سمندر۔ اسے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں، بس اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔ اس کا آپا اتنا بڑا ہے کہ یہ اپنے میں دوسری بہت

ساری چیزوں کو پناہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک میں ہوں کہ جسے زندہ رہنے کے لئے لین دین کرنا پڑتا ہے۔!

یا گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا بجز اس کے کہ آسمان کی وسعتوں میں بہت سارے پرندے اٹھکھیلیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ آسمان بڑی فراخ دلی سے ان کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار رہتا ہے لیکن اگر آسمان دور ہے تو صرف میرے لئے۔ گھٹ گھٹ کے مر جاؤں یہی مرضی میرے صیاد کی ہے۔

جب میں سوداگروں سے اپنی رہائی کی بات کرتا ہوں تو وہ بگڑ جاتے ہیں اور دھمکی دے دیتے ہیں کہ معاہدے کی موجودگی میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا لیکن اس کا چکر ایسا ہے کہ وہ ختم ہی نہیں ہو پاتا اور میں ہمیشہ انتظار ہی کرتا رہ جاتا ہوں وقت گزرتا جاتا ہے اور میری بے چینی و بے قراری بڑھتی جاتی ہے۔

———

جب میں سوداگروں سے سوال کرتا ہوں کہ وہ میری تنہائی ہی کو دور کر دیں تو وہ کہتے ہیں کہ تم تنہا کہاں ہو، یہ اتنی ساری چیزیں جو تمہارے پاس موجود ہیں۔ جب میں ضد کرنے لگتا ہوں تو وہ چڑ کر کہہ دیتے ہیں کہ تم تو ازل سے ابد تک تنہا ہو ــــ

وہ کہتے ہیں، میں تنہا کہاں ہوں یہ اتنی ساری چیزیں جو میرے پاس موجود ہیں پتہ نہیں وہ کون سی نظر سے یہ سب کچھ دیکھتے ہیں، کبھی میری نظر سے بھی تو دیکھیں۔ یہ سب بے جان چیزیں بھلا کیا کسی کی رفیق بن سکتی ہیں۔ یہ سب بے چاریاں تو خود ہی تنہا ہیں، اپنی اپنی جگہ پر منجمد۔ اور ساکت۔ ان کی تنہائی تو مجھ سے بھی زیادہ گھمبیر ہے۔ میں تو پھر بھی کبھی کبھی ان کے پاس آ کھڑا ہوتا ہوں۔ وہ تو یہ بھی نہیں کر سکتیں۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوائیں میرے لئے آتی ہیں البتہ ایک چیز ان کے لے آتی ہے۔ سمندر کے پانی کا شور، جسے میں تو نہیں سمجھ پاتا، شاید یہ سمجھتی ہوں۔!

نیچے والے کمرے میں کشش کی شاید کوئی لہر سی ہے جو کھینچتی رہتی ہے۔ کئی بار یہ خواہش میرے دل میں بے پناہ جذبے کے ساتھ ابھری ہے کہ ذرا دیکھوں تو نیچے کیسا ہے لیکن مجبوری قدم روک لیتی ہے۔ میں نے اوپر سے کئی کئی بار جھک جھک کر نیچے دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن بھلا اوپر سے کیا خاک دکھائی دے گا۔ کئی بار میرے قدم باہر جانے والے دروازے کی جانب اٹھے ہیں اور وہاں جا کر رک گئے ہیں۔ دروازے کی زنجیر کو بے کھٹکھٹا کر میں کئی بار رہ گیا ہوں۔ میری بے چینی انتہا کو پہنچتی ہے تو میں کمرے کے چکر کاٹنے لگتا ہوں۔ کتنی محدود ہے دنیا میں تو خود کچھ کر نہیں سکتا۔ کہیں آ نہیں سکتا، کہیں جا نہیں

سمندر کی چنگھاڑ بھی بعض مرتبہ مجھے بری لگتی ہے جب طبیعت بے چین ہوتی ہے، جب دل گھبرانے لگتا ہے تو اس کم بخت کو بھی جوش آنے لگتا ہے اور خواہ مخواہ شور مچانے لگتا ہے۔ ایسے موقع پر میں غور کرتا ہوں تو مجھے سمندر کی بے بسی دکھائی دیتی ہے۔ کس قدر مجبور ہے یہ بھی، بے بس، پانی کی دیواروں میں مقید۔ ایک خاص حلقے میں محدود۔ اور تب سمجھ میں آتا ہے کہ ہر چیز بے بس ہے اور محتاج!

سمندر کی چنگھاڑ اور اس کا شور اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب میری بے چینی اپنے عروج پر پہنچتی ہے۔ نیچے جانے کی خواہش کو چاروں طرف سے دبائے، دبوچے میں اس کمرے کے چکر کاٹنے لگتا ہوں اور سمندر کا شور میرے لئے پریشانی کا باعث بن جاتا ہے اور میرے لئے ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں ایسے موقع پر کسی کمزور لمحے سے ڈرتا ہوں ایک کمزور لمحہ ـــــــ اس پل صراط سے کسی وقت بھی نیچے گرا سکتا ہے۔ یہ ہر ایک کے ساتھ لگا رہتا ہے اور کبھی بھی آ کر دبوچ لے، اسے کوئی نہیں جانتا۔

میری بدقسمتی ——— کہ ایک کمرہ ملے نے مجھے اگر جکڑ ہی لیا۔ نجانے کیسے، کیونکہ مجھے ہوش تو تھا نہیں۔ میں نے جانے والا دروازہ ایک جھٹکے میں کھول دیا اور نیچے اترنے لگا بہت سی سیڑھیاں تھیں اور نچلا کمرہ کافی نیچے تھا۔ میں اطمینان سے اترتا گیا اور پھر جلد ہی میں تھک کے فرش پہ بیٹھا اور تب مجھے معلوم ہوا کہ نیچے آنا کتنا آسان تھا۔ یہ تو کچھ بھی نہ تھا۔ ایک خواہ مخواہ کا ہوا اور خوف میں نے اپنے اوپر طاری کر لیا تھا۔ ایک ایسا ڈر جس کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ میں اپنی بے وقوفی پر دل کھول کر قہقہہ لگانا چاہتا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

میں کمرے میں آ کر بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ کمرے میں ایک بڑی خرابی یہ تھی کہ یہاں کوئی کھڑکی نہ تھی، اور تازہ ہوا کے آنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ یوں دروازے بہت سے تھے، لاتعداد لیکن سب کے سب بند تھے بالکل سیل کیے ہوئے کمرہ بالکل خالی تھا اور اس میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ میں ایک دروازے کی طرف بڑھا اور اسے کھولنے لگا۔ بڑی زبردست محنت کرنی پڑی کیونکہ دروازہ بہت مضبوطی سے بند تھا اور اسے کھولنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن میں کھولنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد دروازہ کھلا، اور کھلتے ہی ایک زوردار آواز آئی۔

" تم .... قاتل ہو ! "

میں نے گھبرا کر دروازہ بند کر دیا اور دوسرا دروازہ کھولنے لگا۔ اس میں بھی ویسی ہی محنت کرنی پڑی اور اس میں سے بھی کھلتے ہی آواز آئی۔

" تم .... ظالم ہو ! "

اب میں نے تیسرا دروازہ کھولا ———

" تم .... ڈاکو ...... ! "

دروازہ ———

" تم .... خونی .... ! "

اور ——— پھر تو سبھی دروازوں سے آوازیں آنے لگیں

" تم .... ہو ! "

" تم .... ہو ! "

" تم .... ! "

" تم .... ! "

" .... ! "

" .... ! "

میں سبھی دروازے بند کرتے کرتے ہانپنے لگا اور تھک ہار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ سبھی دروازے بند تھے، لیکن کمرے میں آواز گونج رہی تھی۔

" تم قاتل .... ! "

" تم ظالم .... ! "

" تم .... ! "

" .... ہو ! "

آوازیں میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں اور میں ان سے فرار چاہ رہا تھا لیکن فرار کی کوئی صورت نہ تھی۔ دروازوں کو تو میں نے خود بند کیا تھا اور اوپر سے نیچے بھی خود ہی آیا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں اور میں ان آوازوں کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ آخر تھک ہار کر میں نے اوپر جانے کی ٹھانی کیونکہ عافیت کی وہی ایک جگہ تھی، جسے میں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے اوپر کی طرف قدم بڑھائے لیکن یہ کیا ——؟ میرے قدم تو سو سو من کے ہو گئے اور ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سا ہو گیا ——— میں نے اپنا سارا زور، ساری طاقت لگا دی، اور اس کھینچا تانی میں میں ایک ایک سیڑھی پر سو سو بار گرا اور سو سو بار لڑھکا۔ پتہ نہیں ہو کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زمین نے میرے قدم پکڑ لئے ہوں۔ میں پسینے سے تربتر ہو رہا تھا (بقیہ صـ۵۹ـ پر)

P.T. Regd. No. 155
PHONE NO. OFF. 682 RES. 53
THE [illegible] Urdu Monthly
Editor: KALAN HAIDRI
BAIRAGI, GAYA.

Hind Litho Press, Gaya.

کلچرل اکادمی، رینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا

مئی، جون ۱۹۷۴ء

شمارہ ۴۷، ۴۸

دفتر کا پتہ:
ماہنامہ آہنگ، بیراگی گیا

فون:
دفتر: ۶۶۲
رہائش: ۵۳

کتابت:
قمر نظامی

مطبع:
ہند لیتھو پریس میکلوڈ گنج گیا

شرح خریداری

سال کے لئے	۱۵ روپے
دو سال کے لئے	۲۸ روپے
تین سال کے لئے	۴۰ روپے

عام شمارہ
ایک روپیہ پچیس پیسے

مرتبین

کلام حیدری، پرکاش فکری

محتویات

مزامیر

مضمون

ڈرامہ

افسانے

غزلیں

نظمیں

تبصرے

مہندر ناتھ نہیں رہا!

موت بڑی کٹھور ہوتی ہے۔ اس کٹھور موت نے صرف باون سال کی عمر میں مہندر ناتھ کو اس کے پیاروں سے چھین لیا۔ ۵۲ سال میں تو آدمی جوان ہوتا ہے، مہندر ناتھ ہمیشہ جوان بن کر جیا اور مرا تو بھی جوان ہی رہا۔

مہندر ناتھ ۱۹ مارچ تک ہر جیتے جاگتے فرد کی طرح تندرست و توانا مصروف و مشغول تھا۔ اس نے شام کو ایک شادی میں شرکت کی۔ گھر لوٹا تو اپنے عزیز دوست سی کپور کو دورۂ قلب کا شکار پایا۔ جواں ہمت، مردانہ وقار اور فقیرانہ شعار رکھنے والے مہندر ناتھ کی گداز گی قلب کا یہ عالم ہوا کہ اپنے یک جان دو قالب دوست کی بے چینی اور اذیت نہ دیکھی گئی، رات پوری دوست کے اضطراب میں کٹی۔ ایسی رات کا صبح کرنا مہندر ناتھ کا گداز دل برداشت نہ کر سکا اور اس پر خود دل کا دورہ پڑ گیا۔ پورا دن (۲۰ مارچ) موت و حیات کی کشمکش میں کٹا، شام کو سکونِ قبل طوفان ہوا اور نو بجے رات میں وہ طوفان آیا جو مہندر ناتھ کو اس کے تمام چاہنے والوں سے دور لے گیا۔

ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سوگواروں نے جیسا تو دم بخود رہ گئے، لگا کوئی بے صدا پیام آ گیا۔

چتا کی لپکتی لہکتی لمبی زبانوں نے مہندر ناتھ کو ۳ بجے دن (۲۱ مارچ) میں کرشن چندر، سرلا دیوی اور اُوم کے بھائی مہندر ناتھ کو ہضم کر لیا۔ دُرگا بھابی کا سہاگ سیندوریوں میں گم ہو کر ساری دنیا کو تاریک کر گیا۔

اُردو نے مہندر ناتھ سے محروم ہو کر کیا کھویا؟ اُردو کی تاریخ کئی اعتبار سے مہندر ناتھ کے بغیر نامکمل رہے گی۔

... ناتھ کا مزاج فقیرانہ تھا۔ وہ اگر دولت حاصل کرنے کو اپنا مقصد بنا لیتا تو بمبئی میں اس کی بھی سمندر کے کنارے کوئی بلڈنگ کھڑی ہوتی۔

مہندر ناتھ کے افسانوں کے ۹ مجموعے اور چودہ پندرہ ناول شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے فلموں کے مکالمے لکھے، منظر نامے لکھے، کہانیاں لکھیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے روحِ رواں رہے۔ بارہ سال تک فلمی دنیا کے مظلوم طبقے یعنی ادیبوں کے ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری رہ کر ادیبوں کے حقوق کی حفاظت کی۔

ہم کرشن چندر، سرلا دیوی اور سب سے بڑھ کر دُرگا بھابی کو کن الفاظ میں تسکین کی تلقین کریں اور اُن کے غم کو ہلکا کریں؟ خدایا! کرشن چندر کو لاکھوں چاہنے والوں کے لئے، غریب اُردو کے لئے زندہ رکھ، سرلا بہن کو زندہ رکھ، دُرگا بھابی کو مہندر ناتھ کی نمائندہ بنا کر ہمارے لئے زندہ رکھ ————

[illegible] کون تھا؟ میں مہندر ناتھ کے لئے کس رشتے سے رویا؟ اس رشتے کے تقدس، اس کی حرارت اور اس کی صداقت کے طفیل میرے کرشن چندر کو حیاتِ خضری دینا۔

———— کلام حیدری

شمس الرحمٰن فاروقی

غزل

گم ہوئے اسرارِ عیاں کس طرف
شام کدھر، کوہِ گراں کس طرف

تیز تھی شمشیرِ یقیں کی نمود
کٹ کے گری شاخِ گماں کس طرف

پھول کھلے، آنکھ ہنسی، دل جلا
اُڑ کے چلا تختِ رواں کس طرف

سر میں شفق رنگ ہوا اُڑ چلی
دفن کروں روشنیاں کس طرف

سارا ہی میداں تہِ خاکِ خطر
خشک ہوا بادۂ جاں کس طرف

دل بھی اک افعی تھا گرہ پیچ و تاب
بھول گئی زہرِ زباں کس طرف

ادب اور عقیدہ

مترجم : سعادت شمیم
مصنف : نرمل ورما

دوسری جنگ عظیم کے بعد ہم ایک خوف کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ پھر بھی ہم اتنے زیادہ خوف زدہ نہیں ہیں کیونکہ جنگ کو ختم ہوئے ایک عرصہ گذر چکا ہے اور جنگ کی یاد ہمیشہ کے لئے مُردوں کے ساتھ دفن ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ادبی موضوعات بھی دفن ہو گئے ہیں جو کسی زمانے میں فن کاروں کو شدید طور پر متحرک کیا کرتے تھے۔ ایسے موضوعات میں جمالیاتی خود مختاری، فن کی اصلیت کا سوال اور ذاتی تعلقات میں BLOOMSBURY کے اعتقاد شامل ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ خیالات کے وہ آسیبی پیکر جو ذہن پر ہمیشہ سوار ہیں اور مسلسل پریشان کر رہے ہیں ان سے کس طرح نجات حاصل کی جائے؟ دراصل وہ خیالات ہمیں اس لئے پریشان کر رہے ہیں کہ ادب میں کسی بار [illegible] ہی غیر مقبول اور غیر معروف ہو جائے جیسا کہ [illegible] ادب کا نظریہ ہو چکا ہے (ایسے ہم قطعی طور پر [illegible] قرار نہیں دے سکتے۔ اس بات کی کوئی بھی گارنٹی نہیں کہ کوئی موضوع جس کو ایک نئی نسل نے مردہ قرار دے دیا ہو، دوسری نسل کے لئے دلچسپ [illegible] نہ ہو۔ یقیناً دوسرے مختلف حالات میں ان موضوعات [illegible] جاتی ہے۔

ہر عہد میں وقت کے دروازے پر ویسی دستک ہوتی ہے جیسے فن کار پڑے غور سے سنتا ہے۔ مردہ زندگی کی اُس پکار کا جواب دیتا ہے جو فن کار کے موجودہ (COMMITMENT) میں داخل ہونے کے لئے مُردوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن بہت کم فن کار ایسے ہوتے ہیں جو اس دستک پر کان دھرتے ہوں کیونکہ اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہنچیں انھیں اس بات کا جواب ڈھونڈنا چاہئے کہ میں کیوں لکھتا ہوں؟ اور وہ کون سی شے ہے جس کی میں تخلیق کرتا ہوں؟؟

عام طور پر "ادب" اور "قدروں" کے بیچ جو تصادم ہوتے ہیں وہ مصالحتوں کے ذریعہ حل کئے جاتے ہیں۔ تخلیقی عمل میں جو قدریں پوشیدہ ہیں انھیں اس حد تک اپنایا جاتا ہے کہ ادب خود اپنی اصلیت کا مذاق بن جاتا ہے یا پھر لینن کے الفاظ میں :

"عوامی خدمت کا آلۂ کار"

یا پھر سارتر کے الفاظ میں :

"تخلیق کا یہ کام خود ایک اخلاقی فیصلہ ہو جاتا ہے"

یہ دونوں حالات اُن لوگوں کے ذریعہ اپنائے جاتے ہیں جو فن کے اندر جمالیاتی دلچسپی سے بڑھ کر کچھ اور ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس پس وپیش کی حالت کا جرأت سے مقابلہ کرنے کے لئے وہ فرار کی راہ تلاش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک تخلیقی عمل کو حصولِ مقصد کا ذریعہ بنالیتا ہے اور دوسرا مقصد کو تخلیقی عمل سے منسلک کر دیتا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ادب کے اندر پیدا ہونے والے تصادم کے مسئلے کو ختم کر دینے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ اور اگرچہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ہی فن اور اخلاقی اعتقاد کے متعلق نظریئے اپنی چمک

کھو چکے ہیں اور ذہنی سمجھوتے ختم ہو چکے ہیں مگر مسئلے نے اپنی اصل اہمیت نہیں کھوئی ہے ۔

درحقیقت وقت کے دروازے پر جو دستک ہو رہی ہے وہ مجبور کر رہی ہے کہ ہم اس پر توجہ دیں ۔ جدید فن کار کے لئے جو مسئلے کے آسان حل سے واقف ہیں ان کا ذاتی تجربہ ہی واحد قابل وثوق کسوٹی معلوم پڑتا ہے ۔ آج ادب سمٹ کر ایک تجرباتی اصلیت کے خطے تک پہنچ چکا ہے جہاں سے وہ اپنے آپ کو خارجی دنیا کے تمام اُلٹ پھیر سے بچا سکتا ہے لیکن خارجی دنیا کا اپنا وجود برقرار ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اس شعور اور واقفیت نے ایک نئے رجحان کو جنم دیا ہے جو ادب کے اندر تجربے کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا لیکن ایک اہم فن کے لئے ایک واحد کسوٹی کی حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے ۔ اور اس کے بجائے وقت کے مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے نظریوں کے لحاظ سے تجربوں کی قیمت متعین کرتا ہے ۔ اور پھر بعد میں ادب کے لئے اس کی موزونیت طے کرتا ہے ۔

ظاہری طور پر تو یہ دونوں نظریے اٹل اور خود میں مکمل معلوم پڑتے ہیں تاہم ہر کوئی ایک ناقص ضمیر کے عکس کو بہ آسانی دیکھ سکتا ہے جو زندگی سے بھرپور خط زمین میں منڈلا رہے ہوتے ہیں ۔ یہ وہ خطہ زمین ہے جو خالص تجربے سے پاک ہے اور RATIONAL نظریات سے بری ہے ۔ دراصل یہ اعتقاد اور بھروسے کا خطہ ہے ۔ ایک ایسا اعتقاد اور بھروسہ جو تجربات کے جال میں بُنا ہوا ہو ۔ یہ ایسا اعتقاد ہے جو تجربات کے باہر کی فضا کا کوئی عکس فراہم نہیں کرتا پھر بھی بکھرے اور منتشر تجربات کی کڑیاں ڈھونڈنے اور ان کا ایک باقاعدہ معنی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اور وہ اس لئے کہ وہ تجربات سے باہر کی فضا کو دیکھنے پر قادر ہے جو فن کار کے ذاتی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ ہے اور جسے تجربات سے کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ صرف ایک اپنے آپ سے سوال کرنے والا SELF QUESTIONING اعتقاد جو آدھا شک میں دفن ہے کسی حد تک مصنف کو تجربات کی معنی کی گہرائی تک پہنچنے میں مدد دے سکتا ہے جس طرح کہ دوستووسکی نے کریلوو (KIRILOV) کے کردار کے ذریعہ جس کو کہ خدا کے اوپر اعتقاد نہ تھا، خدا کے اوپر زبردست ذاتی عقیدے کا اظہار کیا ہے ۔ دوستووسکی اپنے اعتقاد کے دوسرے پہلو سے یقین کرنا چاہتا تھا ۔ ایک ایسے اعتقاد کے پہلو سے جو شک میں دفن ہے ۔

اس طرح اعتقاد، یقین کرنے کی ایک خواہش ہے اور کسی چیز پر اعتقاد لانا گویا یہ یقین کرنا ہے کہ اس چیز کا وجود قائم ہے ۔ یہ خواہش یقین سے نہیں بلکہ شک سے پیدا ہوتی ہے ۔ جیسا کہ سارتر نے کہا ہے کہ "کوئی فنی تخلیق بذات خود کوئی اخلاقی کام نہیں بلکہ اس کی اخلاقیات شک اور یقین کے آپسی میل جول سے پیدا ہوتی ہے"۔ دراصل اخلاقیات کی اہم خصوصیت اس کا زبردست دوڑخا پن ہے ۔ یہ مذہبی اعتقاد سے مختلف ہے جس میں خدا پر عقیدے کی خواہش، اعتقاد کے ساتھ اس طرح منسلک ہوتی ہے کہ دونوں کو الگ کرنا ناممکن ہے خواہ یہ عقیدہ صحیح ہو یا غلط ۔ جہاں تک معتقد کو مفہوم دینے کا سوال ہے تو مفہوم کو تصدیق کی ضرورت نہیں ۔

جب ہم کسی ادب یا فن کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ طریقہ بالکل اُلٹ جاتا ہے ۔ ایک مصنف اپنے ذاتی تجربات، تعلیم اور سماجی طبقہ کے ذریعہ ایک مخصوص اعتقاد کو اپناتا ہے اور یہ اعتقاد اُسے موزوں اور یکساں خیال اور رائے قائم کرنے میں مدد دیتا ہے لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ اس کے عقیدے تخلیق کے عمل میں جھوٹ اور نقل ثابت نہ ہوں ۔

اس طرح ایک مذہبی عقیدے کا احساس اور اس کی تصدیق
جینے کے عمل سے ہوتی ہے لیکن ایک مصنف کا عقیدہ جو کہ اس کے
دائرۂ تخیل میں محفوظ ہے اپنی اصلیت کھو سکتا ہے اور غلط اور
مبہم ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسا اس لئے نہیں ہوتا کہ عقیدے
منتشر اور غیر قابل قبول ہوتے ہیں بلکہ جب کوئی عقیدہ مصنف کے
ضابطۂ اصول سے الگ ہو جاتا ہے تو اسے بہت سے دوسرے تجربات
اور دوسرے عقیدوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ تجربے اور عقیدے
یا تو اس کو بالکل رد کر دیتے ہیں یا پھر اس میں اس طرح تبدیلی
پیدا کر دیتے ہیں کہ پہچان ہی میں نہ آسکے۔

تخلیق کے عمل میں عقیدہ، تخیل کے اس خطرناک
سمندر میں منتقل ہو جاتا ہے جہاں اسے تیرنے کے لئے آزاد چھوڑ
دیا جاتا ہے اور جہاں یہ اپنے تعصب اور دھوکے سے پاک
ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف تجربات سے جو لہریں پیدا
ہوتی ہیں ان کا بھی وہ مقابلہ کرتا ہے اور یا تو پھر تخلیق کے عمل
کے دوران ہی ختم ہو جاتا ہے اور یا پھر مکمل طور سے کمزور اور مبہم
ہو کر باہر نکلتا ہے جس طرح وہ زندگی میں تھا جب اس نے
اپنے چاروں طرف یقین، امید اور دھوکے کے پرت کو جمع
کر لیا تھا۔ تمام فنی شاہکار اس تضاد کا اظہار ہیں جس میں ایک
جانب تو فن کا عقیدے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو دوسری
جانب اس جھوٹے شعور کا جو عقیدے کو جنم دیتا ہے اور اسی
سے اپنی جدوجہد کرتا ہے۔ جس حد تک کوئی مصنف اس
تضاد سے واقف ہوگا اور اپنے عقیدے پر شک کرنا شروع
کرے گا، اس کی تخلیق اتنا ہی زندگی کے قریب تر ہوگی
اور یہاں پر وہ سرحد جو زندگی کو فن سے الگ کرتی ہے،
مٹ جاتی ہے اور تب تخلیقی کام کے مرکز ہی میں ہم اس
دستک کو سنتے ہیں۔ اسی طرح فلابیر (FLAUBERT)
نے "جنگ و امن" کے ابتدائی ابواب کو پڑھنے کے بعد
بے ساختہ کہا تھا "یہ تو فن نہیں زندگی ہے۔" یہ کوئی
خراج تحسین نہیں تھا کیونکہ فلابیر اور فرانسیسی ہم عصروں کے
لئے فن ایک ایسی چیز تھی جو تخلیق کی جا سکتی ہے۔ دراصل فن
ایک روپ اور ایک شکل ہے جو زندگی کے منتشر عناصر کو یکجا
کر کے ایک صورت بخشتا ہے۔ لیکن ٹالسٹائی نے فن کو ایک مختلف
زاویے سے دیکھا تھا۔ ٹالسٹائی کا عقیدہ ہے کہ ہر (انتشار)
CHAOS کے بعد ایک نظم ہوتا ہے اور اسی انتشار کے
اندر پوشیدہ امن و چین جو ہماری اخلاقی پسند، ناپسند، نیکی
فیصلے کی جانبداری اور اندرونی قوتوں کا تعین کرتے ہیں
ان کی ناقابل تشریح پیچیدگیوں کے اظہار کے لئے فن بہترین
ذریعہ ہے۔ اس معاملے میں ٹالسٹائی کا یہ پس و پیش اس
مسئلے کی تہ تک پہنچتا ہے جو فنی تخیل اور اعتقاد کی خواہش کو
منصفانہ طور پر منسلک کرتا ہے۔

ایسیا برلن (ISIAH BURLIN) نے
ٹالسٹائی کی شخصیت کا جو مخصوص مطالعہ کیا ہے اس سے یہ
پتہ چلتا ہے کہ یہ ٹالسٹائی تک محدود نہیں بلکہ یہ بنیادی
تصادم ہے جو تمام تخلیقی فن میں موجود ہوتا ہے اور فنکار
اپنے اندر ہونے والے تصادم کے درمیان کسی نہ کسی حد تک
منقسم رہتا ہے۔

ہم کبھی کبھی اس تصادم کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے
ہیں۔ کبھی تو اپنے اعتقاد کو تجربے کے اوپر فوقیت دے کر
جیسا کہ ٹالسٹائی نے کیا تھا یا پھر تجربات کو تخیل کے اوپر قابض
دکھلا کر جیسا کہ آج کے بہت سے جدید فنکار کر رہے ہیں۔
دونوں حالتوں میں تخلیقی فن کے اندر یا تو خود کے ساتھ یا خارجی
دنیا کے ساتھ جو تصادم ہوتے ہیں انھیں حل کرنے کی صلاحیت
زائل ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہم ان سرحدوں سے واپس
آ چکے ہیں جس کے باہر کوئی عقیدہ یا تو مذہبی اعتقاد کی حیثیت
اختیار کر لیتا ہے یا پھر کوئی RATIONAL نظریہ کا
روپ دھار لیتا ہے۔ ہم لوگ ایک ایسی دنیا میں داخل

ہو چکے ہیں جو تجرباتی ہے اور جس کو WITTGENSTIEN نے کہا ہو کہ یہ گویا اس طرح ہے جیسے کوئی نیم دیدہ تجربہ اور نیم خیالی پہلو ہم پر اچانک روشن ہو جائے۔ یہ بات بڑی حد تک گمراہ کن ہوگی کہ ہم کسی مصنف کے بے ترتیب، مشکوک اور منتشر خیال کو جو کسی حد تک نیم دریدہ، تجربہ کی شکل میں ہو یا پھر نیم خیالی تصور ہو اسے فنکار کے خارجی خیال، دنیاوی یا ذاتی نظریے کے ساتھ ملا دیں۔ یہ غلطی بدقسمتی سے لوکاچ LUCACKS اس وقت کرتا ہے جب ہمیں وہ یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ فن کار کے عقیدے REACTIONARY ہو سکتے ہیں اور وہ خلوص فن کی بدولت اس پر قابو حاصل کر سکتا ہے۔ لوکاچ LUCACKS غلطی سے عقیدے کو نظریے کے ساتھ ملا دیتا ہے اور ان میں فرق نہیں سمجھتا لیکن ایک عقیدہ جو شک میں ڈوبا ہے بذات خود تنقیدی شعور کی جانب ایک قدم ہے۔ لہٰذا یہ بات غیر موزوں ہو جاتی ہے کہ یہ عقیدہ ترقی پسند ہے یا REACTIONARY جب تک کہ وہ مصنف کو وہ عرفان INSIGHT حاصل نہ کروائے جس سے کہ کوئی بڑا آرٹ جنم لیتا ہے۔ غلط عقیدے تخلیقی عمل کے دوران رد ہو سکتے ہیں لیکن یہ عقیدوں کا رد ہونا نہیں جس سے کسی فن کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے —

آج کل نظریات کی حقیقت شناسی نے فن کار کو کسی عقیدے کے متعلق اتنا خوف زدہ کر دیا ہے گویا اس کی فنکارانہ آزادی محدود کی جا رہی ہو یا تجربات کی پاکیزگی کو گندہ کیا جا رہا ہو۔ اس سلسلے میں ادب کے تمام نظریاتی مطالعے ان تمام چیزوں کے ساتھ اشتراک کرتے ہیں جن کے لئے کوئی تجربہ خواہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اُلٹا نظر آتا ہو اور یہ ان تمام چیزوں کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جن کا تعلق انسان کے ضمیر یا اس کے اخلاقی عقیدوں سے ہے۔

مثال کے طور پر ہم روسی ادیب BORIS PASTERNAK کو لے سکتے ہیں جن کا شمار اس عہد کے ممتاز ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی بعد کی شاعری گہرے اخلاقی جذبات میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جہاں دو ہرے چیلنج کا سامنا ہوتا ہے۔ پہلا اپنے ملک کا نظریاتی مطالعہ جس نے تجربات کی شدت کو ایک کٹر عقیدے کی شکل میں کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک مناسب چیلنج تھا کیونکہ کوئی بھی نظریہ جو اخلاقی جذبے سے پاک ہے۔ ایک CULT کی شکل میں ادب کے لئے مردہ ہے اگرچہ وہ بے حس بصیرت کو متحرک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دراصل ہم ایک ایسے وقت میں سانس لے رہے ہیں جبکہ مصنف اور فن کار اپنے عمل میں عاہر دورا ہو نظر آ رہے ہیں۔ آج ہم صرف اپنے تجربات یا کٹر عقیدے یا ٹکنالوجی کے ذاتی باغیچے میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں جو کہ صحیح نہیں۔ آج کل مشکل ہی سے HERZOG کی طرح کوئی کردار لے جو ہواؤں کو ہدایت دے، تاریکی اور ظلمت کی دنیا میں کودنے کے لئے تمام حد بندیوں کو توڑے اور اپنے خبطی پن کا ثبوت پیش کرے۔

اس سے ہم جدید ہندوستانی تحریروں کی تہہ تک تو نہیں پہنچتے ہیں لیکن اس حادثہ کو دیکھ لیتے ہیں جو گزشتہ پچاس برسوں سے اس کی طاقت کو کمزور کر رہا ہے۔ آج ہمیں کوئی عقیدت کی کمی کی خاطر الزام نہیں دے سکتا کیونکہ آج ہم سوائے ادب کے ہر چیز میں اپنے عقیدے کا اظہار کرتے ہیں۔ عقیدت کے ذریعے ادب کی خدمت کرنا ہماری روایت رہی ہے۔ لیکن ادب میں عقیدت کی آزادانہ اظہار یہ ہم لوگوں کا عقیدہ اتنا مضبوط نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کے تکنیکی معاشرے میں ادب ایک خود مختار اور نصیحت آمیز عمل ہو کر رہ گیا ہو تو ہندوستانی ادب دوسری جانب ان تمام چیزوں کے

ماتحت ہے جس پر ہمارا عقیدہ ہے۔ یہ ایک آزاد AGENT نہیں بلکہ ایسے دوسرے ضابطے اور اصولوں کے اوپر اس کا انحصار ہے جن کا براہ راست تعلق ہماری روزانہ زندگی سے ہے۔ ادب ہمارے ملک میں مشکل ترین صورت حال سے گزر رہا ہے اور وہ ایک ایسے کمرے میں داخل ہو رہا ہے جہاں تل رکھنے کی جگہ نہیں اور ہمارے لئے کوئی جگہ نہیں رہ گئی ہے۔ اگر ہمارے ملک میں ادب کو زندہ رہنا ہے تو اسے مذہب، روایتی اخلاق اور سماجیات کے ساتھ مصالحت کرنی ہوگی اور باری باری ہر کو موزوں بنانا ہوگا۔

آج مسئلہ جمالیاتی احساس کو جدا کرنے، اسے سرفراز کرنے، اور پھر اسے ایک فن کی شکل دینے کا نہیں اور نہ ہی ہم ایک ایسے طریقے کو اپنا سکتے ہیں جس کے ذریعہ ادب کو ایک خود مختار عمل میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے جس سے کہ ہم خود انکار کر دیں۔ آج سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ کسی فرقے یا جماعت کی اجتماعی زندگی میں تخیل کا کیا مخصوص رول ہے۔ اس طرح ہمارا یقین ہے کہ ہندوستانی ادب ان تمام دوسری ادبوں کی روح کے قریب ہو جائے گا اور ایک ایسا رول ادا کرے گا جس سے کہ کسی قوم کی معاشرتی بیداری کو بڑھانے میں اخلاقی طاقت حاصل ہوتی ہے۔

یہ بڑی اہم بات ہے کہ لوکاچ LUCASKS نے ایک ہندوستانی ادیب سے تبادلۂ خیال کے دوران اس بات پر امید ظاہر کی کہ ہو سکتا ہے کہ موجودہ سماجی صورت حال میں ہندوستانی ادب کو ان مسئلوں کا سامنا کرنا پڑے جو انیسویں صدی کے روسی ادب کی خاص روح ہے۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے ہمارے ادب میں کسی ٹالسٹائی یا کسی دوستو وسکی کی تلاش ہے۔ وہ اس بات پر زور دینا چاہتا تھا کہ مفہوم زندگی کی جستجو کے دوران ادب انسان کے ضمیر کا عکس پیش کرنے میں [illegible] رول ادا کر سکتا ہے۔ لیکن وہ سب سے

ضمیر کی حیثیت سے کام کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ادب خود پہلے اپنے ضمیر کی کھوج کرے اور ایک آزاد AGENT کی حیثیت سے کام کرے۔ اس کے علاوہ اس طرح کی ساری ایسی بنی بنائی قدروں، نظریاتی پیچیدگیوں اور اخلاقی تعصبوں سے پاک ہے جو ان جڑوں کو کاٹتی نظر آتی ہیں جن سے فن کارانہ تخیل پھوٹتا ہے۔

غزل

حرمت الاکرام

یارانِ بے نشاں کا پتہ پوچھتے چلیں
کچھ تو سراغ دے گی صبا پوچھتے چلیں

ایسا بھی کیا کہ رسمِ مروت نہ ہو ادا
اک کج ادا کا حال ذرا پوچھتے چلیں

بڑھنے لگی تھیں رنجشِ پنہاں کی شدّتیں
پھر کیا ہوا مآلِ وفا؟ پوچھتے چلیں

جائیں تو ان کے شہر سے کیا لے کے جائیں ہم
لائیں گے شہرِ غیر سے کیا؟ پوچھتے چلیں

گھر کے چراغ پر تو ہوا مہرباں تھی
دل کا چراغ کیسے بُجھا؟ پوچھتے چلیے

کیا آنسوؤں سے بھی نہ بُجھا شعلۂ وفا
کیوں دل جلوں کا ہاتھ جلا؟ پوچھتے چلیں

کیوں کہہ دیا کہ خاک کی منزل ہے آسماں
کیا جرم تھا کہ دی یہ سزا؟ پوچھتے چلیں

چٹکی کلی کہ شاخ سے پھوٹا کوئی سوال
کس حیلہ گر کی تھی یہ صدا؟ پوچھتے چلیں

حرمتؔ نہ ٹوٹ جائے کہیں روشنی کی ڈور
محفل سے اُٹھ کے کون چلا؟ پوچھتے چلیں

لطف الرحمٰن

غزلیں

ہر اک نظر میں ہے لرزاں کسی فغاں کی چپ
یہ اوڑھ لی ہے کسی نے ابھی کہاں کی چپ
کہ مجھ پہ کھلنے لگے راستوں کے سب اسرار
یقیں سے کم تو نہیں ہے مرے گماں کی چپ
میں سنگسار ہوا، اس کا غم نہ تھا مجھ کو
تمام دکھ تھا مرا ایک رازداں کی چپ
زمیں کے شور و شغب میں بھی حسن ہے لیکن
کشش کچھ اور ہی رکھتی ہے آسماں کی چپ
نظر نظر سے ہوئی ہم کلام، دل سے دل
عجیب ذریعۂ اظہار تھی زباں کی چپ
سروں کو حوصلۂ خود سری نہ ہو جائے
کسی طرح بھی نہ ٹوٹے یہ آستاں کی چپ
نہ جانے کس نئے طوفاں کا پیش خیمہ ہو
بہت طویل ہوئی بحرِ بیکراں کی چپ
اب اور کس کے لہو کی طلب ہوئی بیدار
کہ ٹوٹنے کو ہے پھر خنجر و سناں کی چپ
کسی کی آبلہ پائی کا دکھ سمیٹے ہوئے
ہے کس شکست کی غمّاز سائباں کی چپ

--

بنا گئی ہے مجھے شام کس سحر کی چپ
کہ لگ گئی ہے مجھے اب تو رات بھر کی چپ
سلوکِ اہلِ زمانہ سے کس کو شکوہ ہے
مگر وہ چپ وہ کسی ایک باخبر کی چپ
کہ تم نے پوچھا نہ ان راستوں کا دکھ بھی کبھی
عجب فسانہ سناتی ہے رہگزر کی چپ
یہ میرا دل بھی کہیں سیکھ لے نہ چپ کی ادا
بنا نہ سوچ کو تو اس طرح نظر کی چپ
اسے بھی کر گئی شرمندہ ساتھ میرے
دعا کی چپ تھی ادھر اور ادھر اثر کی چپ
اسی سبب سے یہ سناٹا رہ گیا حائل
صدف کی چپ کو نہ پہونچی کبھی گہر کی چپ
کبھی ملے تجھے فرصت تو دیکھ لے آکر
یہ کس کے شور سے ٹوٹی ہے دشت و در کی چپ
تمہارے بعد بھی دستک ملی صدائیں مگر
اٹھا سکی کوئی احساں نہ میرے گھر کی چپ
کسی صدا سے نہ ٹوٹا یہ شش جہت کا سکوت
بکھر سکی نہ کبھی دشتِ معتبر کی چپ

--

ہے دیکھئے تو وہی بحرِ بے کنار کی چپ
وہ درد جس سے عبارت ہے رہگزار کی چپ
گئے دنوں کا وہ موسم کبھی تو لوٹ آئے
ہر ایک پیڑ سراپا ہے انتظار کی چپ
کوئی صدا تو کہیں سے ملے، وہ غم کی ہو
عجیب بوجھ ہوئی دشتِ اعتبار کی چپ
دلا رہی ہے یقیں سب کو بے گناہی کا
لئے ہے مرہمی لہجہ، گناہ گار کی چپ
یہاں سے خاک بسر کتنی ہی صدا ٹوٹی
پکار کر یہی کہتی ہے کوہسار کی چپ
بڑے عجیب سے لہجے میں داستانِ سفر
سنا گئی ہے کسی ڈوبتی پکار کی چپ
جو سن سکا نہ کبھی میری حسرتِ تعمیر
وہ چپ بیٹھے دیکھ کے اب میرے انتشار کی چپ
تو مجھ پہ کھل جا کسی ایک لفظ میں چھپ کر
کہ توڑ دے گی مجھے تیری بار بار کی چپ
سحر کی کھوج میں اب شام بن چکا ہوں میں
رفیقِ شب ہوئی اب قلبِ سوگوار کی چپ

--

لطف الرحمٰن

غزلیں

ہے اپنے لٹنے کا اک سانحہ کسی کی چپ
کچھ اجنبی بھی نہیں ہے یہ اجنبی کی چپ
نظر کی راہ میں کوئی سراب ہی رکھ دے
کہ حد سے گزری ہے اب میری تشنگی کی چپ
یہ کس مقام پہ ٹھہرا ہوا زمانہ ہے
کہ بڑھ گئی ہے خدائی سے بندگی کی چپ
لٹے لٹے کسی لمحے کی بن گئی پہچان
کسی کو دیکھ کے ٹوٹی جو یہ کبھی کی چپ
میں تجھ کو پانے کا اک شور بن کے ابھرا تھا
یہ خود کو کھونے کا حاصل ہے آگہی کی چپ
میں تیری راہ میں کتنا لہولہان ہوں دیکھ
یہ سن تو کہتی ہے کیا میری بے کسی کی چپ
بکھرتے جانے کا اب کتنا دکھ سمیٹوں میں
کہ ڈھل گئی ہے گلوں میں کلی کلی کی چپ
تمام شہر میں ظلمت کی حکمرانی ہے
میں چپ ہوں دیکھ کے ایسے میں روشنی کی چپ
تو آج شب میں وہی رت جگا نصیب ہوا
کہ جاگنے لگی قدموں سے اب گلی کی چپ

--

بہت دنوں سے نہ ٹوٹی ترے کرم کی چپ
اک امتحاں سی ہوئی ہے مرے بھرم کی چپ
یہ وقت ہے تو زباں کی نظر سے دیکھ مجھے
ہوئی ہے زیب بدن اب جنم جنم کی چپ
کوئی پکار کے میری سحر سے یہ کہہ دے
ہزار رات پہ بھاری ہے شام غم کی چپ
پڑی تھی مجھ پہ وہ افتاد بھی عجیب بہت
خدا کی یاد دلاتی رہی صنم کی چپ
بکھیرنا ہے تو اچھی طرح بکھیر مجھے
یہ کون سہتا رہے انتشار کم کی چپ
ہر ایک چہرہ ہے بے چہرگی کی زد پہ یہاں
ہر اک صدا کے تعاقب میں ہے عدم کی چپ
بڑی عجیب شہادت ہے بے گناہی کی
ستم کے بعد کسی صاحب ستم کی چپ
ہزار رنگ سخن بھی جسے ہلا نہ سکا
اسی کو کر گئی ویران چشم نم کی چپ
ہے منتظر اسی رہ میں کہیں وہ ساعت دید
ذرا تو دے تو صدا توڑ کر قدم کی چپ

--

کہیں کا درد ہے دل میں تو ہے کہیں کی چپ
کہ بے نیاز مکاں سے ہوئی مکیں کی چپ
بجھا کے زہر میں رکھا ہو جیسے خنجر کو
ہے اب کے تلخ بہت اس کی آستیں کی چپ
وہاں سے آئے ہوئے لٹ لٹا کے جگ بیتے
قدم قدم پہ مگر ساتھ ہے وہیں کی چپ
نہ جانے کتنے گل و غنچہ توڑ لیتی ہے
ہر ایک پل یہی بڑھتی ہوئی زمیں کی چپ
تھے اور لوگ بھی اس جشن میں خموش مگر
ہر اک نظر میں کھٹکتی رہی ہمیں کی چپ
فلک کو ٹوٹ کے دیکھا زمیں پہ گرتے ہوئے
عجیب غم کی علامت تھی ہم نشیں کی چپ
تھی بے نیاز جو خود سے تو مجھ سے بیگانہ
وہاں کی چپ تھی تری یا تری نہیں کی چپ
گماں کے دشت میں سب چاک پیرہن تھے مگر
پہن کے پھر تا رہا میں ترے یقیں کی چپ
سبب نہ پوچھ خموشی کا، مجھ پہ ظلم نہ کر
یہیں لگی تھی مجھے چپ یہ ہے یہیں کی چپ

--

بہت جانی پہچانی راہیں

احمد یوسف

میں نے اپنے اوپر لی بھی پرتیں اُتار پھینکی تھیں۔ اور ہر پرت کے اُترنے کے بعد یوں محسوس ہوا تھا کہ میں ہلکا پھلکا، سبک سا ہوگیا ہوں، جیسے یہ گوشت و پوست کا مادی جسم، شیشے جیسا، غیر مرئی سا بنتا جا رہا ہے۔ اور تب جی چاہتا تھا کہ ابھی ابھی میں اپنی گردن بلند کر دوں، دونوں ایڑیوں کو اٹھاؤں، بلند اور بلند اور اسی طرح ایک غیر آشنا جسم کو اٹھائے میں دُور دُور تک نکل جاؤں۔

میں ایک سڑک پر چل کھڑا ہوا ہوں جو میری پشت پر ایک طویل سفر کا سلسلہ شروع کر رہی تھی۔ اور میرے آگے آگے یہ کہتی جا رہی تھی کہ آپ خود د[illegible] ہے؟ میں آپ کو کہاں کہاں پہنچاتی ہوں۔

یہ کہاں اونچے اونچے درختوں سے شروع ہوتا تھا، جو دو رویہ صفیں بنائے یہاں سے وہاں تک کھڑے تھے۔ ان سے بس اتنا ہی تعارف کافی تھا کہ وہ بے حد خوب صورت تھے۔ انہوں نے سڑک کو تازہ ہوائیں دی تھیں اور کہیں تو وہ جھک کر گھنی چھاؤں بن گئے تھے اور کہیں اپنے سر بلند کیے بے نیازانہ آسمان سے باتیں کرتے دکھائی دیتے تھے۔

یہ ایک ایسی دنیا ہے جس کی ایک ایک شے، جس کا ایک ایک جلوہ خدائی کا دعویدار ہے [illegible] اپنے پیچھے جس دنیا کو چھوڑ آیا ہوں وہ تو کسی [illegible] کے لیے وا[illegible] بنا ہے، جہاں شر بھی مجبور ہے اور خیر بھی مجبور [illegible] او[illegible] [illegible] کیفیت ہے کہ برق کے دوش پر چلتی ہوئی یہ سواری جہاں سے سفر شروع کرتی ہے وہیں پھر لوٹ آتی ہے۔ پھر سفر شروع کرتی ہے، پھر لوٹ آتی ہے۔ نزول۔ نزول۔ نزول۔ نیچے سے اوپر، اوپر سے نیچے۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

محکومی اور مجبوری کا یہ سفر۔

لیکن کتنی پرتیں تھیں۔ میں آخر کس پرت میں بستا ہوں۔ آج جب خدا خدا کر کے یہ ساری پرتیں اُتر گئی ہیں تو یوں لگ رہا ہے کہ میرے اندر کا بنیادی آدمی ایک سرمدی عیش کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ہے۔

"کتنی بار کہا کہ اخبار سویرے پڑھ لیا کیجیے، دفتر جانا ہے یا نہیں؟" ———— [illegible] ہر پھیلی ہوئی دنیا کو سمیٹ لیتا ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ سویرا ہر روز دو قدم پیچھے چلا جاتا ہے۔

ایک صاف شفاف سا چشمہ میرے سامنے سے بہ رہا تھا۔ میں نے بنیان اور پتلون اُتار کر چشمے کے کنارے رکھ دی مجھے دیکھ کر چشمے نے تالیاں بجائیں، ناچا گایا۔ کتنا الھڑ سا چشمہ تھا ————

جانتی ہوں شاور کے نیچے بیٹھ کر اسی کا راگ سنتا [illegible] ہوتا ہے کہ اس [illegible]۔ نزول۔ نزول کے [illegible] آواز ایک [illegible] مختلف سی ہے۔ رم جھم —

[illegible]

وہ آواز بھی ان بہت آہنی راہوں سے ہو کر آتی ہے۔

[illegible] میرے اس کیف آگیں احساس کا سر کچل دیا۔

میرے پاس وقت کا خزانہ تھا، جسے میں نے اس قیمتی
لگانے چشمے کے اوپر لٹا دیا۔ اب کے لے جانے پھر کبھی ملیں یا
نہ ملیں۔ باہر نکلا تو میں نے یہ جانا کہ جب گھر سے چلا تھا تو ایک
آدھ پرت باقی رہ گئی تھی، یا شاید میں نے دانستہ چھپا لی تھی
وہ بھی اس پانی نے اتار لی اور اب جو میں نکلا ہوں تو بالکل
سی ہلکا پھلکا۔ بے وزنی کے بوجھ تلے دبا دبا سا۔ تب ہی
ایک چمکتی ہوئی بھوک نے مجھ پر وار کیا۔ مجھے سخت حیرت
ہوئی۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

کیا تین سلائس سے آگے نہ بڑھنے کی قسم کھا رکھی ہے؟
ایک اور لیجئے۔ نہیں بس کافی ہے۔_____ نہیں ایک اور۔

بھوک ایک ایسا پرندہ ہے جس کا ٹھہری فضاؤں
میں دم گھٹتا ہے۔

پر آج جانے کیوں بھوک۔ مجھے ایک ایسا بچہ دکھائی
دی، جو اس خاموش خدائی میں میری انگلی پکڑ کر میرے ساتھ
آ گئی تھی۔

سڑک پر کچھ دور چل کر پھوس کی ایک عارضی چھت تلے
کچھ لوگ بیٹھے دکھائی دئے۔ تہ بند باندھے۔ الجھی الجھی
داڑھیاں اور چہرے پر بہت سی لکیریں لئے۔

میں چپ چاپ ایک لمبی بنچ پر جا بیٹھا۔

ایک لڑکے نے میرے آگے ایک آملیٹ، ایک کھیر
کی پلیٹ، ایک تملہ گرم چائے اور ٹھنڈے پانی کا گلاس لاکر
رکھ دیا۔

اے لڑکے سنو، سنو تو کب مانگی ہیں میں نے یہ چیزیں
لیکن وہ تو مشین کی ایجاد سے پہلے کا ایک تیز جھونکا تھا
یہاں سے وہاں تک کھاٹیں بچھی تھیں۔ ان میں سے
کچھ بنچ پر بیٹھے بڑے بڑے گلاسوں میں چائے پی رہے تھے،
کچھ کھاٹوں پر دراز تھے۔ اور کئی ایک ٹرکیں سڑک کے کنارے
دم لے رہی تھیں۔

اس سڑک پر ہر پندرہ بیس کلومیٹر پر ایک ایسی ہی چھت
مل جاتی ہے۔ فکر نہ کرو۔

پتہ نہیں وہ مجھ سے کہہ رہا تھا یا کسی اور نووارد سے۔
مجھے بڑا سکون ملا۔ میرا پیٹ بھرا تھا، سر پر ایک
ٹھنڈی چھاؤں تھی اور بنچ یہاں سے وہاں تک خالی تھی۔
میں آہستہ آہستہ پاؤں پھیلاتا گیا۔

آنکھ کھلی تو کہیں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔
لوہے کی چادریں پانچ ہزار روپے ٹن ہو گئیں۔
شرما جی ان الماریوں کے آرڈر رکا گیا ہوگا۔ قیمتیں تو
وقت سے بھی تیز بھاگنے لگی ہیں۔

لیکن آج میں ان دونوں سے زیادہ تیز بھاگنا چاہتا تھا
سڑک بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ گھنے درختوں نے نشیب
کے منظر کو ڈھانک لیا تھا، لیکن ان کے قریب جا کر دیکھو تو
کیسی پہاڑیاں، کیسے کھیت، کیسا صاف شفاف سا نالہ۔ بلندی
سے پستی کے ان مناظر کو آنکھیں دور دور تک اپنے دائرے
میں سمیٹ لیتی تھیں۔

بوگن ولا کی فصیلوں کے اندر بڑے بڑے گملوں میں ڈیلیا
لیلی، مولی ہاک اور کرائسنتھیمم صفیں بنائے دکھائی دیتے تھے
بے حد سجی سجائی گھاس کا فرش، دیواروں سے لگی عشق پیچاں
کی بیل۔

لیکن اب یہ جو منظر میرے سامنے ہے۔ یہ پھیلا ہوا منظر
اونچے اونچے درختوں کا، بل کھاتی ہوئی راہوں کا، پھیلتی ہوئی
نامانوس خوشبوؤں کا اور نشیب پر لہراتے ہوئے نالوں کا، وہ
سرگوشیوں میں مجھ سے کہتا ہے کہ فطرت کو بوگن [illegible] فصیلوں
میں قید کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

یہ ساری نعمتیں کائنات کے پہلے انسان کے لئے تھیں
اور اب تو میں ہزاروں سال کے بوجھ سے سمٹ کر رہ گیا ہوں۔
بس اکیلی سڑک کا بھی ایک حسن تھا۔ میں چلتے چلتے

ایک لمحے کے لئے اس کے سینے پر بیٹھ گیا اور میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے یہاں سے وہاں تک محسوس کرتے ہوئے کہا۔ جان من شہر میں تو تمہاری صورت ہی نہیں دکھائی دیتی، بل کھاتی ہوئی، لچکتی ہوئی، کتنے ہی نشیب و فراز لئے یہ سڑک جو کہ سوتی تھی، نہ جاگتی تھی، آنکھوں میں کسی کا انتظار لئے۔"

'وکٹیں لگ چکی ہیں۔ اب میں بیٹنگ کروں گا۔'

'بھین ایک SIXER دو۔'

'ڈش۔'

وہ کہہ رہی تھی۔ بچوں کے ساتھ ہنگامے کرتے کچھ اچھے لگتے ہیں۔

پلیز اس سے کچھ نہ بولو کہ آج میں نے اپنی اس تنہا تنہا سی محبوبہ کو پایا ہے اور اب ہمارے سامنے یہ کھیل ہے۔

'بھین ایک SIXER اور۔۔۔'

'ڈش۔'

یہ کھیل دیر تک چلتا رہا۔ تب ہی ہائیں ہائیں کرتی ایک ٹرک ہم دونوں کے درمیان حائل ہوئی اور میں نے سڑک سے کہا۔ 'اب چلتا ہوں' اور اس بات پر مجھے ہنسی آگئی کہ چلنا تو بہر حال اسی کے سینے پر تھا۔

اب سڑک نشیب کی طرف سفر کر رہی تھی۔

چلتے چلتے میں وہاں رکا، جہاں سڑک کے کنارے گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی کھڑی تھی۔ باہر چولھا روشن تھا اور سامنے افق کے دریا میں سورج بتدریج قتل ہوتا دکھائی دے رہا تھا اور اسی کا خون تھا کہ یہاں سے وہاں تک پھیل گیا تھا۔

اس درمیان مٹی کی ایک مورت نے میرے خیالوں کی ڈور کاٹ دی۔ اس کے استفسار پر میں صرف 'تم' کہہ سکا کہ وہاں ہر فراز فراز تھا اور ہر نشیب نشیب۔ صاف صاف دکھائی دینے والا۔

میں ابھی ابھی ایک اور رسمی سڑک کا سفر طے کرکے آرہا ہوں۔ لیکن میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا کہ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ ایسی سخت مٹی کی مورت شہر میں کیوں نظر نہیں آئی۔ اتنی بجلیاں خوابیدہ تھیں اس میں کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اگر وہ چھوٹی تو سارے تار جھنجھنا اٹھیں گے اور اعضاء دیر تک معطل رہیں گے۔

حق کے ایک برتن میں کچھ روٹیاں تھیں۔ پتہ نہیں کس چیز کی۔ جو کبھی منہ میں ایک میٹھا مزہ بھر دیتیں اور کبھی کسیلا سا۔ ساتھ میں کوئی نا مانوس ساگ بھی تھا۔ دراصل اسی وقت مجھے بھوک کی نعمت میسر تھی اور اس نعمت کے آگے سبھی نعمتیں ہیچ دکھائی دیتی ہیں۔

گھر میں ایک مرد بھی تھا۔ چولھے سے چارپائی کا رشتہ ہوتا ہے اور چارپائی سے چولھے کا۔ پہلے آدمی کے پاس یہی ایک فکر ہوگی، لیکن ہر سنگ میل کے گذرنے پر اس نے ایک اور چولھے ایک اور فکر کی قبا زیب تن کرلی۔ تا آنکہ چولھے سے چارپائی کا فاصلہ صدیوں کا فاصلہ بن گیا۔

تب ہی اس ویرانے میں چپکے سے وہ در آئی۔

'تم جب دیواروں کے شہر کو بیچ دئے گئے تھے تو یہ احساس مجھے بار بار کچوکے لگاتا تھا کہ زمین کے فرش پر تمہیں نیند کیسے آتی ہوگی۔ میں نے اس گنگوتری کو اپنے ہونٹوں میں بھر لیا۔ جواب میں اس نے کئی بار کہا، تم میرے ہو، تم میرے ہو، اور وہ راتیں جب سمندر دیوانہ وار ساحل پر چڑھ آتا تھا جب ساحل وفور شوق میں سمندر میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔

یہ ساحل اور سمندر کا جنم جنم کا میل۔

" بھئی آفس سے آتے ہی کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔"

بس ابھی آیا ذرا برش کر رہا ہوں۔ باتھ روم سے یہ آواز بلند ہوئی۔

ساری پرتیں میرے جسم پر لوٹ آئی تھیں۔ ■

فضا ابن فیضی

غزلیں

سراغِ منزلِ ذات وصفات پاؤں کیا
طلسمِ خود ہوں تو اس سے نجات پاؤں کیا

عذاب ہے مجھے بیداریٔ بصیرت بھی
جو شب بھی آئے تو خوابوں کا سات پاؤں کیا

ابھی تو روح میں ہلکی خراش تک بھی نہیں
تجھے شعورِ غمِ کائنات پاؤں کیا

رفیقو! میں کبھی شیرازۂ دل وجاں تھا
بکھر چکا ہوں تو دادِ حیات پاؤں کیا

خود آگہی کا ہے منصب، عطائے دل ریشی
لہو نہ تھوکوں تو شہد و نبات پاؤں کیا

فشارِ کرب سے خود موج ریزہ ریزہ ہوئی
بجز غبار، کنارِ فرات پاؤں کیا

شکستگی میں بھی رکھتا ہے مطمئن مجھ کو
یہ انتظار، پسِ حادثات پاؤں کیا

شعورِ ذات ہے پتھر کے ہونٹ کا نغمہ
نہ تیشہ رکھوں تو سازو ثبات پاؤں کیا

خود اجنبی نظر آئے ہے اپنا چہرا بھی
تجھے اب اے نگہِ التفات پاؤں کیا

دقیقہ سنج نہیں اس قدر بھی میری نظر
ترے بدن کے رموز و نکات پاؤں کیا

رباب چھیڑوں، نفس کو کنول کنول رکھوں
یہی کروں تو تجھے کربِ ذات پاؤں کیا

ترے شعور کی لے کا قضایہ دھیما پن
جو زیرِ لب ہی رہے تھا وہ بات پاؤں کیا

■ ■

نفس کو نطق، نگہہ کو زبان کر آئے
ہم اس سے اپنی تمنا بیان کر آئے

کہیں نہ اپنا پریشان قافلہ ٹھہرا
غبارِ راہ کی صورت اُڑان کر آئے

کچھ اس قدر رہے وہ تہ دار اس سے مل کر ہم
خود اپنے آپ کا بھی امتحان کر آئے

کبھی تو کوئی مسافر ادھر سے گزرے گا
ملی جو دھوپ اسے سائبان کر آئے

خدا کا شکر کہ چہرے پہ گرد ہے نہ تھکن
کہاں کہاں کی نہ ہم خاک چھان کر آئے

ہمیں سے مانگے ہے اپنی ہابندیوں کا خراج
تری زمیں جسے ہم آسمان کر آئے

تمام عمر کٹی حرفِ دلبراں لکھتے
ہم ایسے لوگ تجھے داستان کر آئے

ہمارے بعد سرابوں کا دور ختم ہوا
جو وہم تھا اسے پختہ گمان کر آئے

وجود اپنا ہے خالی مکان کی صورت
نثار اُس پہ تمام آن بان کر آئے

قبول عام کی آخر سند اسی کو ملی
جو فیصلہ مرے نا مہربان کر آئے

یہی کہو گے قضا سے اگر ملو گے کبھی
کہ ہم بھی سیرِ زمان و مکان کر آئے

■ ■

غلام مرتضیٰ راہی

غزلیں

میں خیر مناتا ہوں تری شر سے نکل آ
اس [illegible] چھوڑ کے پتھر سے نکل آ

دشمن [illegible]
اے خون کے دریا رگِ خنجر سے نکل آ

دستک پہ نہ دے زور کہ نازک ہے زمانہ
آتی ہوئی آہٹ پہ مری گھر سے نکل آ

موقوف ہے ہنگامہ بس اک ذات پہ تیری
میدان ابھی دور ہے لشکر سے نکل آ

موجیں ترے حالات کا رُخ دیکھ رہی ہیں
ٹھہرا ہوا پانی ہے سمندر سے نکل آ

اس شہر میں سورج کا بھروسہ نہیں کوئی
تو اپنی گھڑی دیکھ کے بستر سے نکل آ

[illegible] ہوئے نہیں بیٹھا میں
اپنے سائے سے نکل آیا میں

کس بلندی پہ مجھے ٹھیس لگی
کہ ستارے کی طرح ٹوٹا میں

اک ذرا ہاتھ لگایا اُس نے
اور بجلی کی طرح دوڑا میں

آئی تھی فرصتِ ہستی سرِ راہ
یک نفس بیش نہیں ٹھہرا میں

لکڑیاں اس نے اکٹھا کر لیں
آگ لینے کے لئے نکلا میں

میرے آگے نہ جلا اپنا چراغ
کہ اندھیرے میں نہیں رہتا میں

ہر طرف میرے مقابل ہے کوئی
اور [illegible] تنہا میں

عبداللہ کمال

غزل

کہ اب بنا کے گرا نا نشاں ٹھہرتا ہے
ہوا کے دوش پہ کس کا مکاں ٹھہرتا ہے

نہ جانے کتنے تناور درخت پھیلتی ہیں
گزرتے لمحوں کا نیزہ کہاں ٹھہرتا ہے

پروں کا پھیلتا سایہ جہاں سمٹ جائے
بسیرا لینے کو پنچھی وہاں ٹھہرتا ہے

چلے، تو چاند ستارے بھی ساتھ چلتے ہیں
ٹھہر گئے، تو پھر اک آسماں ٹھہرتا ہے

سیاہ ہو گئے اندر سے ساری دیواریں
کہ بند کمروں میں یوں ہی دھواں ٹھہرتا ہے

ہر ایک شب نئے اسباق یاد کرتا ہوں
ہر ایک روز نیا امتحان ٹھہرتا ہے

[illegible]

غزل

اندر دیواروں میں سیلن فرش [illegible] تھا
باہر لیکن دروازوں پر [illegible] تھا

سورج پہ زردی کیا چھائی ہنگاموں سے بچ نکلے
دھوپ لیے تک چاٹنے والا [illegible] کا پہرا تھا

اونچی اونچی دیواروں سے دھوپ اترتے دیکھی تھی
سایہ دھیرے دھیرے اپنے آنگن میں بھی پھیلا تھا

لال گلابی نیلا اودا ہر منظر بے کیف رہا
پتھرائی آنکھوں کے آگے پھول بھی پتھر جیسا تھا

بن بارش کے سوکھی کائی صحن کی آخر بھیگ گئی
بھرا گھڑا پانی کا اپنے ہاتھوں گر کر ٹوٹا تھا

اس بستی میں میرا ہی گھر ہر کوئی پہچان سکا
بوسیدہ ہو کر بھی دلکش سب سے زیادہ اونچا تھا

اس کے روز و شب

قابلِ تعریف
بھی عکاسی

غیاث احمد گدی

ہر صبح ....!

ہر صبح جیسے ہی میں بالکونی سے جھانک کر نیچے کی سمت دیکھتا ہوں ــــــــ وہ لڑکی، وہ خوب صورت لڑکی سڑک کے سست رفتار ریلے میں بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔

دھوپ اس کے چہرے کو چومتی، اس کی مانگ میں افشاں چنتی، دھوپ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جگاتی تب اس کے دانتوں کی قندیلیں جھلملا اٹھتیں، اس وقت وہ ذرا ٹھہر کر کائنات پر، اس ارض و سما پر نظر ڈالتی جو اسے قدرے ہیچ نظر آتے، کہ جوان لہو، رگوں میں چراغ جلائے رہتا اور دل میں غرور کی کمان تنی ہوتی۔

لیکن شام پڑتے ہی جب وہ دفتر سے واپس آتی، اس کی تنی تنی باہیں ڈھیلی پڑ چکی ہوتیں، گیسوؤں کی گھٹا مٹیالی چہرے پر جھریاں براج چکی ہوتیں اور وہ جوان لڑکی ادھیڑ بلکہ بوڑھی دکھتی۔ نہ اس کی چال میں مستانہ وشی ہوتی، نہ انداز میں شباب کی دمک دیکھائی پڑتی۔

یہ بارہ گھنٹے، اس کی زندگی میں ہر روز بیس پچیس برس کی مدت لے آتے اور اسے بوڑھی کر کے آگے بڑھ جاتے لیکن دوسری صبح وہ اسی طرح جوان، تازہ دم اور خوب صورت دکھائی پڑتی۔ یہ پراسرار کیفیت مجھے پریشان کئے رہتی اور میرا دل رو اٹھتا۔

تب ایک دن میں اپنی بیوی کو بتاتا ہوں، یوں پہلے تو وہ یقین نہیں کرتی، پھر جب میں نے ایک دن صبح و شام اس لڑکی کو دکھایا، اور میری بیوی صبح و شام کے فرق کو اچھی طرح سمجھ چکی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

" یہ کیسے ہو سکتا ہے ...... یہ ہماری آنکھوں کی خطا ہے۔"

نہیں یہ ہماری آنکھوں کی خطا نہیں، شرافت ہے جو لڑکی کی زندگی کی تہوں میں اتر جاتی ہیں، اس کے بعد میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس بات کا پتہ لگاؤں گا کہ رات بھر کی ساری کمائی، وہ دن کے بارہ گھنٹے، اس سے کس طرح چھین لیتے ہیں، اور پھر رات اسے دوسرے دن کے لئے اتنا کچھ کہاں سے دیتی ہے؟

چنانچہ میں اس دن اور رات کی سی کیفیت والی لڑکی سے پوچھتا ہوں۔ بیٹی، یہ جو تم ہر صبح اتنا کچھ لے کر نکلتی ہو، دن کے دس بارہ گھنٹے میں کہاں گنوا دیتی ہو؟

" بابا" اس نے اپنائیت سے جواب دیا۔ اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے، اور حسب معمول وہ ہاتھ میں پلاسٹک کی تھیلی دوسرے میں پرس لئے دفتر کو جا رہی تھی " بابا یہ ایک کہانی ہے، اس کے لئے آپ کو تھوڑی زحمت اٹھانی پڑے گی، اٹھائیے گا زحمت؟"

" ہاں، تھوڑی کا کیا بہت، تم بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

تو بابا چار بجے، جب میرا دفتر بند ہو جاتا ہے آپ کو صدر دروازے پر میرا انتظار کرنا ہوگا، پھر میں آپ کو ان ڈاکوؤں کے پاس لے جاؤں گی جو مجھے چند گھنٹوں میں کنگال

کر دیتے ہیں۔

ڈاکوؤں کے پاس؟

ہاں ڈاکوؤں کے پاس؟

میں اس خوب صورت لڑکی کی رسیلی باتوں کا جام پئے گھر آجاتا ہوں۔ اور اپنی بیوی سے سارا واقعہ کہہ سناتا ہوں پہلے وہ تعجب سے میری طرف دیکھتی ہے پھر ہنس پڑتی ہے وہ لڑکی پاگل ہے۔ یا پھر بہروپیا ہوگی۔ میں آج سارا دن سوچتی رہی ہوں کہ وہ لڑکی ضرور بہروپیا ہے۔" پھر میری بیوی مجھے سمجھاتی ہے کہ وہ آپ کو پھانس رہی ہے۔ ایسی لڑکیاں خوش حال مردوں کو پھانس کر انھیں بلیک میل کرتی ہیں، پیسے لوٹتی ہیں۔

میں بیوی کی بات سن کر خاموش ہو جاتا ہوں۔ مگر میرا دل نہیں مانتا، بار بار اندر سے یہ آواز آتی ہے جیسے کوئی کہہ رہا ہو، یہ لڑکی کھری ہے، کھری ہے، بالکل کندن ہے .....

چنانچہ دوسرے دن میں، مقررہ وقت پر اس کے دفتر کے صدر دروازے پر جا کھڑا ہوتا ہوں اور انتظار کر رہا ہوتا ہوں کہ ابھی جب وہ دن بھر کی محنت کے بعد دفتر سے نکلے گی تو بوڑھی ہو چکی ہوگی اور میں اسے پہچان بھی نہیں پاؤں گا کیونکہ میرا خیال تھا کہ دن بھر کی کڑی مشقت کے سبب ہی اس کی رونق لٹ جاتی ہے۔

مگر ایسا نہیں ہوا، جب وہ دفتر کی سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے اتری تو وہ اور بھی خوب صورت لگ رہی تھی، اس کا چہرہ کھیت میں ہل جوتنے والے کسان کے چہرہ کی طرح دمک رہا تھا یوں جیسے ہیرا دمکتا ہے۔

وہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا میرے من میں سنکھ جاگے۔ میری بیوی کی قیاس آرائی ....

میں ذرا محتاط ہو گیا، (کیونکہ آدمی کا لاشعور جتنا ایماندار ہوتا ہے اتنا ہی بے ایمان بھی)

"چلئے۔" اس نے میرا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا "پہلے کینٹین میں چائے پی جائے۔" وہ خاصی بے تکلف ہو رہی تھی۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ کینٹین میں بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ چائے پیتے پیتے سوچنے لگا۔ لڑکی اتنی بے باک کیوں ہے؟

مگر مجھے اس سوال کا جواب اندر سے نہیں ملا۔ چائے ختم ہو گئی، میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا نکالا۔ اس میں دس دس کے نوٹ تھے۔ لڑکی نے جلدی سے بٹوا چھین کر میری جیب میں ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر میں اٹھا، مگر وہ بدستور بے تکلفی سے ہنستی رہی گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ پھر لڑکی نے اپنے پرس سے چند آنے پیسے نکالے اور کینٹین والے لڑکے کو دے کر مجھے لئے باہر چلی آئی۔

اب میں یہاں سے بازار کی سمت چلتی ہوں، جہاں مجھے رات کے لئے آٹا خریدنا ہے پھر سبزی، پھر چنے، چینی، تیل ...

آٹا، پھر سبزی، چنے، دال تیل ... ... زندگی کا پہیہ انھیں احساس کے بل بوتے چلتا ہے۔ یہ نہ ہو تو، آدمی مر جائے

وہ خوب صورت لڑکی جو ساری کائنات کا حسن سمیٹے، میرے آگے آگے چل رہی ہے، ایک نامعلوم سے غیر مرئی دھاگے میں مجھے باندھے لئے چل رہی ہے۔ کتنی اچھی ہے، میری عمر سے آدھے عمر کی ...... میری بیٹی اگر زندہ رہ جاتی تو شاید ایسی ہی نکلتی۔ اتنی ہی بڑی ایسی ہی ..... خوب صورت ......

مگر ذہن اس سچائی سے پرے بھی دیکھتا ہے۔ میں اپنی عمر سے بیس پچیس برس کم ہو جاتا ہوں اور اب کے اس کی چال میں جو مستانہ روشنی، نظر آتی ہے، وہ کوئی اور چیز ہے، کولہوں میں چلنے سے جو بھنور پڑتے ہیں ان میں میری اپنی کشتی مطلب کشتئ حیات ڈوبتی ابھرتی نظر آتی ہے، اور میں گلے تک پانی میں ڈوبا ہوا کھویا چلا جا رہا ہوں، کہ کائنات کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ ماضی حال بن جاتا ہے اور سچائیاں تخیل کی رنگ آمیزی کے

اختر پیامی

جمود

یہ شامِ شامِ اودھ نہیں ہے جسے تمہاری سیاہ زلفیں چھپا سکیں گی
یہ صبح، صبحِ طرب نہیں ہے
یہ ایک دھند لکا ہے ایک کہرا
اُبھرتے سورج کی گرم کرنوں کے خواب سیال ہو گئے ہیں
زمین اپنی رگوں کی گرمی لُٹا چکی ہے
حیات آنسو بہا رہی ہے
ہر ایک برگ و ثمر پہ موتی جھلک رہے ہیں

تم اپنے آنچل پہ بزمِ پرویں سجا چکی ہو
تم اپنے انفاس کے جلو میں ہزاروں غنچے کھلا چکی ہو
خرامِ نازک کی ساحری سے زمیں کو جنّت بنا چکی ہو
تم ایک تبسّم سے کتنی شمعیں جلا چکی ہو
مگر یہ شامِ اودھ نہیں ہے
کہ شمع اب تک جلی نہیں ہے
یہ صبح صبحِ طرب نہیں ہے
کہ شمع اب تک بجھی نہیں ہے
یہ وقت کا ایک عجیب لمحہ ہے جس کی شریانوں میں خون جمنے لگا ہے
یہ ایک افسونِ دلبری ہے
نہ صبحِ وصلت نہ شامِ ہجراں
نہ بوئے یوسف نہ چاکِ داماں

تمہاری آنچل کی بزمِ پرویں اُجڑ چکی ہے
تمہاری موجِ نفس سے کتنے گلوں کے چہرے اُتر گئے ہیں
تمہارے قدموں کی آہٹوں نے چمن کو ویراں بنا دیا ہے

اے نگارِ وطن

اختر پیامی

تجھے کچھ اس کی خبر بھی ہے اے نگارِ وطن
ترے لئے کوئی سینہ فگار ہے اب بھی

اُٹھا چکا ہوں فریبِ وفا کے داغ مگر
شکستہ دل کو ترا اعتبار ہے اب بھی

ہزاروں کاہکشاں نے بچھائے جال مگر
مری نظر میں تری رہگزار ہے اب بھی

وہ ایک قطرہ جو ٹپکا تھا تیرے دامن پر
وہ ایک نقش مرا شاہکار ہے اب بھی

وہ ایک لمحہ ترے غم میں جو گزارا تھا
سکونِ خاطرِ بے اختیار ہے اب بھی

وہ کشتِ دل کہ جسے آنسوؤں نے سینچا تھا
حریفِ چشمکِ برق و شرار ہے اب بھی

خزاں نے یوں تو کئی سبز باغ دکھلائے
بہار منتظرِ نو بہار ہے اب بھی

روش روش پہ ہیں چرچے خزاں نصیبی کے
کلی کلی کی نظر سوگوار ہے اب بھی

لہو ٹپکتا ہے گلچیں کی آستینوں سے
قبائے لالہ و گل داغدار ہے اب بھی

بہت قریب ہیں اب بھی قفس کی دیواریں
بہت بلند سرِ شاخسار ہے اب بھی

قطعہ

قصۂ کاکل و رخسار لئے آیا ہوں
عشق کی گرمئ بازار لئے آیا ہوں
مجھ کو سینے سے لگا لے میرے محبوب وطن
اپنا ٹوٹا ہوا پندار لئے آیا ہوں

گنگ وجمن

اختر پیامی

[یک بیک رات کی خموشی میں
ظلمتوں کی نقاب اوڑھے ہوئے
روحِ گنگ وجمن چلی آئی]

کتنی یادوں کے قافلے آئے / ذہن میں رینگنے لگے سائے
کتنی صبحیں سمٹ کے آپہنچیں / کتنی شامیں فضا میں گھلنے لگیں
کتنے چہروں پہ آگئیں موجیں / کتنی زلفوں کی کھل گئیں گرہیں
عارضوں کے گلاب بھی مہکے / اور ہونٹوں سے پھول جھڑنے لگے

روحِ گنگ وجمن نے مجھ سے کہا

جانے کب سے اداس رہتی ہوں / زحمتِ انتظار سہتی ہوں
مجھ کو آبادیاں ستاتی ہیں / مجھ کو ویرانیاں ڈراتی ہیں
لذتِ اضطراب مت پوچھو / دل ہے خانہ خراب مت پوچھو
چاندنی رات اب بھی آتی ہے / تیرگی مجھ کو کاٹے کھاتی ہے
آرزوؤں کے کتنے شیش محل / کتنی دوشیزہ حسرتوں کے کنول
میری لہروں پہ اب بھی بہتے ہیں / رازدارانہ مجھ سے کہتے ہیں
زورِ طوفاں جھکا نہ دے ہم کو / موج کوئی مٹا نہ دے ہم کو
اور تاریکیاں نہ چھا جائیں / چاند پر بدلیاں نہ آجائیں
میں یہ سنتی ہوں مسکراتی ہوں / حال پر اپنے چونک جاتی ہوں
یوں تو پہلے بھی شمع جلتی تھی / رات آہیں کہاں مچلتی تھی
سازشیں آندھیاں نہ بنتی تھیں / تیلیاں بجلیاں نہ بنتی تھیں
تیرگی اس طرح سے امڈی ہے / آج شمعِ وفا لرزتی ہے
اب تقدس کہاں ہے لہروں میں / اپنی عصمت بھی کھو چکیں موجیں
آگ پانی نے بھی لگائی ہے / زندگی خون میں نہائی ہے
میرا دامن لہو سے رنگیں ہے / آئینہ دارِ عکس خونیں ہے
کتنے روشن چراغ بجھنے لگے / قافلے تیرگی میں لٹنے لگے
کتنے سینوں سے اٹھ رہا تھا دھواں / کتنی مانگوں سے ڈھل گئی افشاں

کتنے لعل و گہر گنوا ڈالے
کتنے پاؤں میں پڑ گئے چھالے
وہ بھی لیل و نہار دیکھ چکی
گردشِ روزگار دیکھ چکی
آہوؤں نے ختن کو چھوڑ دیا
تم نے صحنِ چمن کو چھوڑ دیا
کون ہوتا ہے بادیہ پیما
قیس ہے اب نہ محملِ لیلےٰ
پھول کھلا گئے بہاروں میں
خوں اُبلتا ہے لالہ زاروں میں
خاک اُڑتی ہے صحنِ گلشن میں
آگ سی ایک لگی ہے خرمن میں
ہجر کا غم اُٹھا نہیں سکتی
اپنے موتی لُٹا نہیں سکتی
پھر بھی شکوہ نہ کچھ شکایت ہے
ہجر سے بھی مجھے محبت ہے
ایک نئے دیس کو سدھالے ہو
تم جہاں بھی رہو ہمارے ہو

میں کلی کی قبا میں آؤں گی
عطر بن کر فضا میں آؤں گی
فکر کی خلوتوں میں آؤں گی
غم کے سائے میں گنگناؤں گی
نظم کی روح بن کے آؤں گی
گیت کی تان میں سماؤں گی
شوخ انزس میں رنگ لاؤں گی
ناریل کی نمی بڑھاؤں گی
جوٹ کی کھیتیوں میں آؤں گی
جہد کی وادیوں میں آؤں گی
چاند سورج کی ضو میں آؤں گی
بوڑھی گنگا کی رَو میں آؤں گی
ماہی گیروں کی لَے میں آؤں گی
اور پدما کے ساتھ گاؤں گی
اک نئے دیس کو سدھالے ہو
تم کہیں بھی رہو ہمارے ہو

(ظلمتوں کی نقاب اوڑھے ہوئے
روحِ گنگ و جمن خموش ہوئی)

سچّے لوگ

اندرسن رائے

وہ حیرت سے بند دروازے پر بیٹھے ہوئے 'ر' کی طرف دیکھ رہے تھے ان کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں چہروں پر گرد میں اٹی ہوئی سفید داڑھیاں اور ڈھیلے ڈھالے لباس پہنے وہ اس طرح بے حس خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ان پر مردہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی روشن آنکھیں ہی ان کے زندہ ہونے کی علامت تھیں۔

وہاں وہ اپنے فرضی ناموں سے تھے۔ اور یوں بھی ان کے نزدیک نام کی کوئی اہمیت نہ تھی ان کا خیال تھا۔ نام غیر ضروری اضافت ہوتے ہیں۔

وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔

نام کی طرح ان کے نزدیک کسی تعلق کا ہونا بھی غیر ضروری تھا تعلق کے لئے ان کے پاس ایک شے قدر تھی۔ اور وہ اس وقت بھی ان کے درمیان قدر مشترک تھی وہ چیزوں اور باتوں سے متعلق سوچنے یا سوچنے کے لئے چیزیں تلاش کرتے۔

ان میں دروازے سے نزدیک بیٹھا ہوا۔ سب سے کم عمر تھا "ر" کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ایسا خوف اور اضطراب تھا۔ جو اچانک سچی بات کے جھوٹ ثابت ہونے پر کسی کم عمر بچے کی آنکھوں میں چند لمحوں کے لئے پیدا ہوتا ہے۔

"ر" نے دروازے کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا۔

"دروازہ بند ہے؟ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔" ب" "ج" اور "ا" نے چونکتے ہوئے "ر" کی طرف دیکھا اور بہت آہستہ سے بولے تم ٹھیک سمجھے دروازہ بند ہے۔ ہم گواہی دیتے ہیں مگر ہمیں افسوس ہے، تم ابھی تک دروازے سے متعلق ہی سوچ رہے ہو۔ جبکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اب کبھی دروازہ کسی پر نہیں کھلے گا۔ 'ر' نے کہا۔ تو۔" 'ا' ان سب میں بزرگ تھا۔

ہم 'ا' کی تائید کرتے ہیں۔ کہ 'ر' ہم میں بزرگ ہے، ب اور ج، آہستہ سے ایک ساتھ بولے۔ ان کی آواز بھی بہت دھیمی تھی۔

"ر" غمزدہ تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دروازے سے ہٹ کر کچھ نہیں سوچ سکتا اس نے ایک بار پھر تمام لفظوں کو اکٹھا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اور سوچا۔ "جب دروازہ آخری بار کھلا تھا"

ابھی وہ یہیں تک سوچ پایا تھا۔ کہ وہ پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ "ر" کو خود حیرت ہو رہی تھی کہ جو کچھ وہ سوچتا تھا وہ لفظوں کی صورت خود از خود صوتی شکل کیسے اختیار کر لیتا ہے۔ دراصل "ر" یہ چاہتا تھا کہ وہ پہلے خود اچھی طرح اپنے کھڑے ہوئے لفظ اکٹھے کر لے۔

"ر" سوچ رہا تھا۔ جب مجھے مالک نے اپنی زمین پر نمائندہ مقرر کیا تھا تو مجھ سے کیا کہا تھا۔ ؟

"ر" کی یادداشت اس کے آگے لفظوں سے محروم تھی۔

ب۔ ج۔ اور ا، نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں دکھ نمایاں تھا۔

" ا " کا خیال تھا کہ " ر " بہت معصوم ہے۔ سوا " نے بہت نرمی سے " ر " کو مخاطب کیا۔ تمہیں یقین ہے کہ دروازہ آخری بار تم نے خود کھلتے ہوئے دیکھا؟ اور مالک نے تمہیں اپنی زمین پر نمائندہ مقرر کیا؟ ذرا اچھی طرح سوچو " ا " کا لہجہ انتہائی ہمدردانہ تھا۔

" ر " نے پھر ایک بھرپور کوشش کر کے لفظ اکٹھا کئے اور بولا۔ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے مجھے اس کا مکمل یقین ہے۔

اب " ب " اور " ج " ا ، کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھ رہے تھے ا ، نے ان کی طرف دیکھا تو آہستہ سے بولا ، دراصل " د " ، کا مالک اپنے مکان کا راستہ بھول گیا ہے۔ یوں سمجھ لو " د " کا مالک گم ہو چکا ہے۔

ر ، نے ا ، کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں شدید غصہ تھا۔ حالانکہ وہ ا ، کا احترام کرنا چاہتا تھا ——

وہ پہلے تو ا ، کو گھورتا رہا ، پھر دروازے کی طرف مڑا اور بولا مجھے کچھ یاد کیوں نہیں آرہا۔ مالک نے آخری بار مجھ سے جو کچھ کہا تھا۔

شاید ا ، نے ر ، کے رویہ کو محسوس کر لیا تھا مگر وہ پھر بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کی روشن آنکھیں کچھ اور زیادہ چمکنے لگیں اس نے ر ، کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

" اب تمہیں چاہئے کہ تم اس بات پر یقین کر لو کہ تمہارا مالک خود کو کھو چکا ہے۔ "

ر ، نے بہت کرب سے ا ، کی طرف دیکھا اسے افسوس تھا کہ ا ، نے اس کی بات پر یقین نہ کیا۔ مگر ابھی کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس لفظوں میں گہری سچائی تھی " ر " نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ میں تمہاری تائید نہیں کر سکتا نہیں کر سکتا۔ تم مجھے جھوٹا سمجھتے ہو۔

مجھے افسوس ہے میں تمہیں بس اس قدر مزید کہوں گا کہ تم سفر کرو۔ سچائی تم پر کھل جائے گی مجھے بھی دکھ ہے کہ تم میری بات سمجھ نہیں رہے۔ یہ کیا ہوا۔ " ا " اس راستہ کی طرف مڑ گیا جس کے گہری کہر کی دیوار کھڑی تھی۔ ب ، اور ج بھی اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔ جب تک ا ، نظر آتا رہا وہ کھڑے اس کو دیکھتے رہے۔

د ، زمین پر بیٹھا آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا۔ اس نے کتنی بار چور نظروں سے دور جاتے ہوئے ا ، کو بھی دیکھا۔

کافی دیر خاموشی کے بعد ر ، اٹھا ، اور " ب " کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تمہارا کیا خیال ہے ا ، کا رویہ بہتر تھا یا میرا ، اس کی آواز میں دکھ تھا۔

ا ، نے تم سے زیادہ سفر کیا ہے مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ تمہارا رویہ کچھ زیادہ بہتر نہیں تھا " ب " نے کہا کچھ دیر خاموشی رہی اور اس کے بعد " ب " دوبارہ بولو ، میرا خیال تو یہ ہے کہ تمہیں حقائق کو قبول کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے ، اور مجھ سے پوچھو تو حقیقت یہ ہے کہ تمہارا مالک...... مجھے تم سے مکمل ہمدردی ہے کہ تم سوچتے ہو۔ تمہارا مالک صرف گم ہی نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اپنے تئیں .... مجھے یقین ہے تم اس بات کا برا نہیں مانو گے۔ ویسے افسوس ہے تمہیں اس بات کا غم ہو گا۔ " ب " کی آواز میں دکھ نمایاں تھا۔ تم سن رہے ہو نا۔ تمہارا مالک خود کو گم ہی نہیں کر چکا بلکہ وہ مر چکا ہے۔ اور مرے ہوؤں سے امیدیں وابستہ کرنا۔ تم سمجھ رہے ہو نا ....

اس سے پہلے کہ " ب " اپنی بات مکمل کرتا۔ د ، نے چلا کر کہا ختم کرو یہ سب میں ....

" د " دوڑتا ہوا دروازے تک گیا اور اپنی جگہ لوٹ آیا اور زمین پر بیٹھ کر تیزی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اٹھا اور " ج " کے پاس (بقیہ ص ۳۴)

آہنگ / ۴۷/۴/۴۴

احمد آباد

بمل کرشن اشک

وہ یوں مرگیا جیسے زندہ نہیں تھا
وہ یوں مرگیا جیسے اس میں اور اس کے سبھی قاتلوں میں بڑا فرق تھا

وہ یوں مرگیا جیسے اس کا لہو ذائقہ میں نہیں تھا
وہ یوں مرگیا جیسے اس کے بدن میں ہوس بھی نہیں تھی

میں تقریر کے دائرے میں مقیّد رہا اور وہ مرگیا
میں احساس کی گود میں سانس لیتے ہوئے جی پڑا
تو کچھ ایسے لگا
جیسے میں مرگیا
جیسے میں قتل ہوکر ہوس کھو چکا ہوں
جیسے میرا لہو ذائقہ سے مبرّا ہوا ہے
جیسے میں مارتے مارتے مرگیا

جنم دِن

حمید الماس

تمام ہو گئی اک اور عمر کی منزل
تم آج زینۂ لمحاتِ نو پہ استادہ
مجھے کچھ اور شگفتہ دکھائی دیتی ہو
نئی سحر نئے جذبات کی حرارت سے
رگوں میں تیز ہوئی اور خون کی گردش
دہکتے جسم کی سرخی سے ہے فضا رنگیں
کرن کرن میں تمہارا ہی رنگ ملتا ہے
خموش ذہن میں کروٹ بدل رہے ہیں خیال
(تمہارے واسطے اک نظم بھی تو کہنی ہے)
سمٹ کے آئے ہیں یادوں کے وہ حسیں لمحے
بہت عزیز تھے جو عمر بھر کا حاصل تھے
یہ سچ ہے میرے لئے دور بھی ہونا اس سے
مگر یہ قرب کا احساس ہی نہیں مٹتا
تم آج زینۂ لمحاتِ نو سے دیکھو گی
تمہارے لوگ تمہارے رفیقِ دیرینہ
تمہارے واسطے کیا کچھ نہ لے کے آئیں گے
اگرچہ بیچ میں حائل ہیں دوریاں لیکن
تمہاری بات میں سایہ ہوں یاد آتی ہے
اور اپنے آپ سے تنہائیوں میں کہتا ہوں
ملاؤ ہاتھ جنم دن تمہیں مبارک ہو

اکرام باگ

رائیگاں

پتّیوں کے طلسماتی دستِ شوریدہ نے بھی آخر دیا ہے
نیند کو پیکر کبھی

رفتِ صبا کی انگلیوں میں
چپ چپ سے منظر کے علاوہ اور کیا ہے
رات بھر تکتے رہے دیوار پر
لیکن تیرا سایہ کہاں
اک فقط باقی بچا ہے اونگھتا بلب
یا نیم کے پتّوں سے ملبوس شب بھری یہ آنکھ تھک کر
مندماتی بے نمازی صبح میں جاگر پڑی ہے
اب نہ کوئی دید ہے نہ راہ بست رائیگاں
پھر دھات کی پیشانیوں سے گفتگو کرتی ہوئی
جی اُٹھے گی میری عمرِ مجبوس

کیا کٹے گا سر سے یہ معلق آشوب
یوں اب تلک وابستہ ہے وہ گوشۂ قلب
جس کی شاخوں سے اُگا تھا تیرا وعدہ ثمر
.. لیکن پلنگ کے روزنوں میں
جانے کیسے روز ٹپکاتے رہوگے ؛ چند عکسیدہ قمر

••

اکرام باگ

روزن

مَیں کہ اک اندیشۂ دستک ہوں اب
چارسُو پھیلی ہوئی اِس جاہ میں
راستہ کوئی نہیں دیوار ہی دیوار ہے
تم کبھی غلطی کرو تو کھڑکیاں کھُل سکتی ہیں
اے کہ وہ لمحہ مگر زندان کا باعث بھی ہے : تیرے لئے
ماسوا روزن سے ہٹ کر
ہر کوئی منظر
تیری پرچھائیوں سے خود تراشا اک گماں ہے : میرے لئے
مَیں جو اک آنکھوں بھرا اندھا ہوں اب
باہر کو جب جب آنکھ تھی ..
تب کوئی وقوعہ ہی مجھ کو مضطرب کر لیتا تھا
یعنی وہ مرقوم چہرہ نیم شب کو ڈھونڈتا کر
تیری بغل کو سونگھ لیتا تھا : کِس لئے
جب کبھی تم سوچ لو تو یاد کرنا کون تھا وہ تیسرا مفرور
جو ہمیں ہی قتل کرکے
اب یہاں پر منجمد و منہمک مقتول ہے
کھڑکیاں کیا کھُل سکیں گی ! ؟

••

ویرانہ

اے خیام

اس شہر میں وہ نووارد تھا۔ کوئی اس کا شناسا نہ تھا اور کوئی اس کا شناسا ہوتا بھی تو وہ پہچان نہ پاتا۔ ناموں کی تبدیلی سے فرق بھی کیا پڑتا۔ ہر چہرہ یکساں، ایک نقش۔ ایک رنگ، ایک قد، ایک آواز، ایک لباس اور ——— اور ایک ہی نام۔ ہاں نام بھی سب کے ایک ہی تھے۔ چند حروف تھے جن کو الٹ پھیر کر سب نے اپنے آپ پر چپکا یا ہوا تھا۔ کپاس کے چند تار تھے جن کو مختلف رنگوں میں رنگ کر مختلف طریقوں سے اپنے جسم پر لپیٹا ہوا تھا۔ اتنی ہم آہنگی ——— اتنی یکسانیت۔ یا اللہ۔ یہ لوگ زندہ کیسے ہیں!

اس نے سوچا لیکن وہ اس شہر میں نووارد تھا، بالکل اجنبی، کوئی اس کا شناسا نہ تھا لہٰذا کسی سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اور گو کہ وہ اجنبی تھا اور ان سب سے مختلف بھی لیکن کسی نے اس کی طرف ذرا بھی دھیان نہ دیا۔ وہ راہ چلتے کسی کے قریب ہو جاتا، کھنکھارتا، چونکانے کی کوشش کرتا لیکن وہ سر نیہوڑائے، سہما سہما اپنی راہ پر چلا جاتا کوئی اسے چونک کر، مڑ کر نہ دیکھتا۔ اگر کسی کی نظر اس پر اٹھ بھی جاتی تو ان آنکھوں میں ذرا بھی حیرت نہ ہوتی، ذرا بھی اجنبیت کا اظہار نہ ہوتا۔ کوئی اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ کر کسی اور طرف آنکھیں پھیر لیتا تو اسے بڑی مایوسی ہوتی۔ اسے قدم قدم پر چھوٹی چھوٹی باتوں سے مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اور یہ مایوسیاں اس کی زندگی سے چپک کر رہ گئیں۔

پھر وہ اپنے متعلق سوچنے لگا۔ پہروں اپنے متعلق سوچتا رہتا۔ ان مایوسیوں کے متعلق سوچتا رہتا جو اس شہر میں اس کی زندگی سے ایک روگ کی طرح چپک کر رہ گئی تھیں۔ اسے کبھی کبھی حبس اور گھٹن کا احساس ہوتا۔ وہ بڑی اکتاہٹ کا احساس کرنے لگا۔ راتوں میں کھلی ہوا میں ٹہلتا رہتا۔ اور خنک ہوائیں اس کے سانسوں کے زیر و بم سے بنتی ہوئی آواز " میں کیا کروں میں کیا کروں " کا کوئی جواب نہ دے پاتیں۔

وہ جب ایسی گھٹن اور اکتاہٹوں کا شکار ہوتا تو اسے ایسا لگتا جیسے اس کے اندر کوئی دوسرا شخص موجود ہے اور اس کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا ہے اور دبی دبی آواز میں ہنس رہا ہے۔ اسے دہشت سی ہونے لگتی تھی۔ پھر وہ لوگوں سے گھلنے ملنے کی کوشش کرنے لگا۔ جہاں چند لوگ بیٹھے ہوتے وہ وہیں جا کر بیٹھ جاتا۔ مگر لوگ اس کی موجودگی کو محسوس کر کے خاموش ہو جاتے۔ وہ گفتگو میں حصہ لینے کی کوشش کرتا تو سب اس کا منہ دیکھتے رہ جاتے، خالی خالی نظریں اس کے چہرے کو اور اس کی آنکھوں میں اور اس کے ہونٹوں کی لرزش کو دیکھتیں اور بس، کوئی جواب نہیں، کوئی اختلاف نہیں، کسی بحث کا آغاز نہیں۔ وہ بولتا رہتا اور جب تھک جاتا تو اکتاہٹ سے اٹھ کر چل پڑتا ——— بس اسٹینڈ پر کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان گھس پڑتا کہ شاید کوئی اس کا کالر پکڑ کر پیچھے گھسیٹ لے کوئی اس کے اس طرح گھس پڑنے پر ٹوکے، مگر لوگ اس کو راستہ دیدیتے اور وہ مایوسی سے آگے بڑھتا چلا جاتا ———

بات کسی طرح اس نے بنتے نہ دیکھی تو ایک انوکھا سا

خیال اُس کے ذہن میں آیا ۔۔ دراصل لوگ مجھے اپنے شہر میں نووارد سمجھ کر میرا لحاظ کرتے ہیں۔ خود خاموش ہو جاتے ہیں اور میری باتیں سنتے رہتے ہیں۔ اپنے آپ پر جبر کرتے ہیں۔ قطار میں کھڑے ہوئے لوگ مجھے راستہ دیدیتے ہیں کہ میں اجنبی ہوں اور اس شہر کے قواعد سے ناواقف ـــــــ تو اب ـــــــ اب!!

اس نے یوں کیا کہ خود کو شہر والوں کی سی شکل میں لے آیا۔ تاکہ لوگ اُسے اجنبی نہ سمجھیں اور اس کے قریب آئیں۔ اُسے اپنا دوست بنالیں۔ اس نے چند حروف اُلٹ پھیر کئے اور ایک نام اپنے آپ پر چپکا لیا تاکہ لوگ اُسے اپنائیت سے آواز دیں، مخاطب کریں اور وہ چونکے' اس چونکنے کے لئے اس نے کون کون سے جتن نہ کر ڈالے، انسان چونکے بغیر بھلا کب تک زندہ رہ سکتا ہے' اور اس نے کپاس کے چند تاروں کو مختلف رنگوں میں رنگے اور شہر والوں کے انداز میں اپنے بدن پر لپیٹ لیا۔ اور دیر تک آئینے میں اپنے کو مختلف زاویے سے دیکھتا رہا اور اپنی شکل دیکھتا رہا ـــــ اپنی شکل ،کر اپنے آپ میں سے نکل کر جب وہ شہر کے لوگوں سے ملے گا تو شہر والے اجنبیت کا احساس نہ کریں گے کہ وہ بھی چند حروف سے مخاطب کیا جا سکتا ہے اور اس کی آواز بھی ان لوگوں جیسی ہی ہے، اور اس کا قد بھی، اور نقش بھی اور رنگ بھی اور لباس بھی اور نام بھی، سب کچھ ان لوگوں جیسا ہی ـــــــ

اور جب وہ اپنے آپ میں سے نکل کر شہر میں دوبارہ داخل ہوا تو کوئی بھی اس سے مختلف نہ تھا اور وہ کسی سے مختلف نہ تھا۔ اس نے ایک شخص کو روک کر یونہی راستہ پوچھا تو خاموشی سے بتا کر وہ آگے بڑھ گیا ـــــــ اُسے تھوڑی حیرانی ہوئی۔ تجربے کے طور پر بس اسٹینڈ کی قطار کو روندتا ہوا وہ آگے نکل گیا مگر کسی نے اُسے نہ روکا، نہ ٹوکا، کسی نے اس کا کالر پکڑ کر پیچھے نہ گھسیٹا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا تو لوگ سہمے سہمے سے اس سے نظریں بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ہوٹل میں گھس گیا اور جس میز پر تین افراد بیٹھے چائے پی رہے تھے اور بڑی گرما گرمی سے بحث کر رہے تھے وہ بھی اسی میز کی چوتھی کرسی پر ڈٹ گیا۔ وہ ذرا سا گھبرائے اور آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ پھر جلدی سے چائے پی کر وہ اُٹھ گئے۔ اب اُسے حیرت کے ساتھ ساتھ ڈر بھی لگنے لگا۔ آخر لوگ خوف زدہ کیوں ہیں، کس چیز سے خوف زدہ ہیں ـــــــ اس نے گہری نظروں سے لوگوں کو پڑھنا شروع کیا ۔۔ ہر شخص خوف زدہ ہے ۔ ہر شخص اپنے آپ میں گم ہے۔ ہر شخص حیران ہے ـــــــ آخر کیوں؟ اور وہ اپنے آپ میں گم رہا اور اسباب کا متلاشی رہا اور اُس نے تہیہ کر لیا کہ لوگوں کو حیرانی اور خوف سے نجات دلا کر ہی اس شہر سے واپس جائے گا۔

اور اگلے روز لوگوں کے ایک اجتماع کے سامنے وہ جا کھڑا ہوا اور چلّایا۔

" لوگو! تم کس چیز سے خوف زدہ ہو' مجھے بتاؤ میں تمہارے خوف کو دور کر دوں گا ـــــــ "

اس نے دیکھا لوگ اسے حیرت اور خوف سے دیکھ رہے تھے ـــــــ

" لوگو! تم دراصل مریض ہو۔ "

لوگوں کے چہرے بیلائے ـــــــ " نہیں " ـــــ

" لوگو! میں تمہارے مرض کا علاج کر دوں گا۔ "

لوگوں کے چہرے چلائے ۔۔ " ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو خدارا۔ "

وہ حیرت سے ان سہمے ہوئے چہروں کو دیکھتا رہا، گھورتا رہا، ان میں زندگی کے آثار کہاں ہیں ـــــــ یہ بُت ہیں' اپنی اپنی جگہوں پر ایستادہ بُت، پتھر کے مجسمے، بے جان، پلپلے، روئی کے گالوں کی طرح، ٹھنڈے یخ، برف کے تودوں کی طرح، یہ لوگ ـــ لوگ ـــ اور لوگ

بکھرنے لگے، پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیزی سے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے اور بھاگتے جاتے ———— وہ حیرت اور کسی قدر خوف سے انھیں دیکھتا رہا جو اب اس سے بہت دور کھڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ بے جان سا کھڑا انھیں دیکھتا رہا، خالی خالی نظروں سے ... اس کا جسم سنسنانے لگا، جیسے کوئی چیز اس کے اندر سرایت کر رہی ہو، اُسے ڈر سا محسوس ہوا، یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ اس کے اندر کیا ... ہو رہا ہے، اس کے اندر کون سی چیز گھستی چلی جا رہی ہے۔ بے انتہا گرمی محسوس ہوئی، جیسے اس کی سانسیں رک جائیں گی، اس نے کپاس کے سارے رنگین تار نوچ ڈالے اور برہنہ ہو گیا۔ لوگ اب بھی دور کھڑے اُسے اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے گھٹن کا احساس پھر بھی کم نہ ہوا، جیسے ہوا اچانک رک گئی ہو، اس نے لوگوں کے مخالف سمت میں بھاگنا شروع کیا، لوگوں سے خوف زدہ ہو کر، لوگوں کے مرض سے ڈر کر وہ ان کے مخالف سمت میں بھاگتا رہا۔ اور اسے ایک میدان ملا، لق و دق میدان اور وہاں اُسے ایک بے حد گھنا پیڑ نظر آیا۔ جس کے پتے ہوا کے زور پر جھول رہے تھے، وہ بھاگتا رہا، اور درخت کے دوسری طرف اس کی جڑ میں جا کر بیٹھ گیا اور جھانک کر دور کھڑے ہوئے کیڑوں جیسے لوگوں کو دیکھا اور پاؤں ایک دوسرے پر چڑھایا اور زانوؤں پر اپنے ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور دم سادھ کر مثبت درخت کے تنے سے ٹکا دیا۔

بقیہ: سچے لوگ

جا کر اس کے دونوں بازو پکڑے کچھ دیر تک اس کی آنکھوں میں گھورتے رہنے کے بعد آہستہ سے بولا۔ کیا تم بھی میری سچائی کی گواہی نہیں دے سکتے؟ ...... تم بکھر رہے ہو نا۔ وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔ اس کی آواز میں اضطراب اور دکھ تھا۔

"ج" نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ دوست مجھے افسوس ہے کہ سچائی اٹل ہوتی ہے تمہیں اس بات پر یقین کر لینا چاہیئے کہ صرف تمہارے مالک کی موت ہی ایک سچائی نہیں بلکہ یہ مکان یہ دروازے اور وہ آخری پیغام سب لایعنی ہیں اور تمہیں حقیقت کی طرف لوٹنا ہوگا۔

نہیں نہیں "د" پاگلوں کی طرح دروازے کی طرف دوڑا، مگر دروازے اور "د" کے درمیان فاصلہ مسلسل بڑھتا رہا۔ "د" دوڑ رہا تھا مگر دروازہ دور ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ "د" نے مڑ کر دیکھا۔

وہاں نہ "ب" تھا اور نہ "ج"، صرف "ج" کے کہے ہوئے الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔

جوابی امور کے لئے
ڈاک کے مناسب ٹکٹ ارسال کریں۔

صلاح الدین پرویز

ایک عجیب بات

جانتے بوجھتے اک پری
توڑنے کے لئے اک کلی کو بڑھی
جانتے بوجھتے قہقہہ
ایک ندّی کو آنچل بنانے لگا
ٹوٹتے ہی صدا
ہر کیلنڈر پہ دھبّے سجانے لگی
جنگلوں کی خبر : شہر کی اک سڑک
بن گئی کس طرح ! جائزے ، ذائقے
اجنبی ہوگئے
ایک چوکھٹ پہ بیٹھی ہوئی بلّیاں
سونگھتی ہیں غلاموں کی تنہائیاں
پاپ ، سونا ، پگھلتی پریشانیاں

--

نیک دِل لڑکی کے نام

ہری گدّی
ہری چادر
ہرے پتّے اس کے پردے
مگر آئے کہاں سے
ٹوٹی دیوار و دھرتی پر
گلابی دھوپ کے دھبّے
یہاں پانی کو
تم کیوں ڈالتی ہو ——
یہ دھبّے پھیلتے جائیں گے ہر سو
اور اس کے بعد تم بھی
کیا نظر آؤ گی دھبّے میں
کپاسی رنگ کا دھبّہ ——

--

صلاح الدین پرویز

سفر

موجِ مے میں گھومتا ہو لال پیراہن کا خوف
رینگتا ہو جسم کے شیشے پہ جب سردی کا رنگ
تم بھلا ایسے میں
گلدانوں میں رکھے زرد پھول
[illegible]
کھڑکی کے باہر پھینک سکتے ہو ؟ !

تمہاری سرخ ٹیبل پر دوائیں
[illegible] چپ چپی بو لیے
دوڑتی ہوا کے فرش پر
دیوار پر اور جسم پر
اور تم
اس موڑ پر بھی
پچھلی سانسوں کی سنہری داستانوں کو صدائیں دے رہے ہو
سرخ اور نیلی رگوں میں اونگھتی پرچھائیاں پھیلا رہے ہو
آگ اور پرچھائیں ترچھی خامیاں : تنہائیاں
کھڑکھڑاتی خواہشوں کی ڈالیاں : تنہائیاں
سندرم کی لحظہ لحظہ ٹوٹتی سچائیاں : تنہائیاں
ایک سگریٹ
اور پھر آنکھیں، ورق : نزدیک اور نزدیک تر

چاندی کی گھنٹیاں

ڈاکٹر نریش

بابو صاحب نے اپنی واقفیت کے دم سے ڈوٹیر میں جگہ لے ہی دی تھی ورنہ میرے لئے وہ گاڑی پکڑنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں ویسے بھی بھیڑ بھاڑ سے بہت گھبراتا ہوں۔ فرسٹ یا سیکنڈ کلاس کا کرایہ خرچ کرنے کی ہمت نہیں ہے اور تھرڈ کلاس میں بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بابو صاحب کو کافی پریشانی اٹھانا پڑی تھی۔ ڈوٹیر کا کنڈکٹر ان سے واقف نہ تھا۔ بابو صاحب نے اپنا ریفرنس بھی دیا تھا لیکن وہ معذرت کرکے چلتا بنا۔ دسوں آدمی اس کے پیچھے پیچھے خوشامد کرتے ہوئے۔ تب بابو صاحب بھاگ کر دفتر کی طرف گئے تھے اور وہاں سے ایک سردار صاحب کو پکڑ لائے تھے۔ سردار جی نے کنڈکٹر کے کان میں پھونک دیا تھا اور کنڈکٹر نے جواباً سردار جی کے کان میں۔ سردار جی میری طرف آرہے تھے تو بابو صاحب کے چہرے پر اطمینان کے نقوش نمایاں تھے۔ آتے ہی کہنے لگے "جلدی کیجئے گاڑی چھوٹنے والی ہے۔ اندر چلے جائیے سیٹ مل جائے گی۔" میں ڈبے میں گھس کر کھڑکی کے پاس والی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ کھڑکی میں سے منہ باہر نکال کر میں نے بابو صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"بابو صاحب آپ کو بہت زحمت ہوئی۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو یار۔"

"نہیں بھیا پچھلے تین دنوں سے آپ کو ایک منٹ کے لئے بھی آرام نہیں کرنے دیا۔ آپ کا دفتر، گھر بار، بیوی بچے سبھی سے چھین لیا تھا آپ کو۔"

بابو صاحب نے پیار سے میرا گال تھپتھپاتے ہوئے اور اپنی آنکھوں کو نم ہونے سے بچاتے ہوئے کہا تھا۔

"کون کس سے چپکا رہا ہے تو تم بہتر جانتے ہو۔ تین دن تک پورا گھر بھرا بھرا تھا۔ اب بہت سونا لگے گا۔"

اور گاڑی نے وہسل دے دی تھی۔ دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی ریل گاڑی کے ساتھ ساتھ بابو صاحب چلے آرہے تھے۔ پھر پلیٹ فارم پر رک گئے تھے۔ دور تک ہم ایک دوسرے کے ویو کرتے ہاتھوں کو دیکھتے رہے تھے اور پھر گاڑی کی تیز رفتار نے ہمیں ایک دوسرے کی نظر کی حدوں سے پرے کر دیا تھا۔

میں لکھنؤ سے چنڈی گڑھ لوٹ رہا تھا۔ تین روز لکھنؤ کے ادبی ہنگاموں میں مصروف رہ کر تھک گیا تھا۔ لیکن بابو صاحب کی محبت اور قربت نے تھکن محسوس نہیں ہونے دی۔ میں سوچ رہا تھا لوگ مجھ سے کس درجہ محبت کرتے ہیں۔ میرے دوست احباب بھائی بہن، بیوی بچے مجھ سے کس قدر جڑے ہوئے ہیں کہ ان سے الگ ہوتے ہی یوں لگتا ہے جیسے جسم کا کوئی عضو ٹوٹ رہا ہو لیکن پھر بھی نہ معلوم کیوں اندر کی پیاس نہیں بجھتی۔ پانی کا دھوکا کھا کر چمکتی ہوئی ریت پر [illegible] بھاگتا چلا جاتا ہوں اور جہاں جہاں پانی کا وہم ہوتا ہے وہاں وہاں تپتی ہوئی ریت سے پاؤں جھلس کر لوٹ آتا ہوں۔ خدا جانے میرے اندر کون سا ایسا خلا ہے جس نے پُر نہ ہونے کی قسم کھائی ہے ——

کتاب کھول کر پڑھنے لگتا ہوں۔ دو چار سطریں پڑھنے کے بعد ہی حسبِ عادت اپنے آس پاس کا جائزہ لینے لگتا ہوں۔ سامنے والی بارک میں برتھوں کے درمیانی فاصلہ کو بھاری بھرکم سامان سے پُر کر کے ایک کمرہ سا بنا لیا گیا ہے۔ اس کمرے میں ایک بڑی دری کو دوہرا کر کے بچھا یا گیا ہے۔ اس پر کھانے پینے کا سامان پڑا ہوا ہے۔ دو عورتیں ہیں، تین بچے اور دو ادھیڑ عمر کے پنجابی جاٹ۔ لہک لہک کر پنجابی میں گفتگو کر رہے ہیں۔ میٹھی روٹیوں پر پیاز رکھ کر کھا رہے ہیں۔ صراحی سے بھر بھر کر پلاسٹک کے مگ میں پانی پی رہے ہیں۔ یہ لوگ کلکتہ سے لوٹ رہے ہیں۔ فی الحال ان کی بات چیت سے اتنا ہی جان پایا ہوں۔

میرے بازو والی سیٹ پر ایک صاحب گنجے سر والے بیٹھے ہیں۔ بڑی عاجزی کے ساتھ مجھ سے کتاب مانگ کر پڑھنے لگ جاتے ہیں۔ میں کتاب کے مطالعہ سے وقت کاٹنے کی اپنی ضرورت بیان نہیں کر سکا ہوں۔ شاید میرے چہرے پر ایسے کسی جذبے کا کوئی نقش بھی نہیں ابھرا ہے۔ ورنہ وہ صاحب دیکھنے میں اس قدر شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں کہ فوراً کتاب واپس کر دی ہوتی انھوں نے۔ اوپر کی برتھوں پر دیکھتا ہوں۔ ایک برتھ پر ایک فوجی جوان لمبی تان کر سو رہا ہے۔ اس کے فراٹے کافی پریشان کرنے والے ہیں۔ لمبے سیاہ بوٹوں کا رخ میری جانب ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے ہیں اور اس کی ناک بج رہی ہے۔ دوسری طرف کی برتھ پر ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ گلے میں پہنی سونے کی زنجیر کو بار بار جھلاتی ہے۔ پیلے رنگ کا پھولدار قمیص اس کے گورے بدن پر بہت ہی زیب دے رہا ہے۔ سنتری رنگ کا چوڑیدار پاجامہ۔ سامان رکھنے والے جنگلے پر اس کے سنہری رنگ کے سینڈل پڑے ہوئے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میری نگاہیں اس کی نظر سے ٹکرائی ہیں اور میں گویا بندھ سا گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے اسے دیکھتا رہوں۔ بس دیکھتا ہی رہوں۔

" کتاب کافی دل چسپ ہے۔" کتاب سے نظر ہٹا کر سامنے والے صاحب کہہ رہے ہیں۔

" جی ... ہاں۔"

" آپ کہاں جائیے گا؟"

" چنڈی گڑھ ... اور آپ؟"

" میں تو مراد آباد جا رہا ہوں۔ وہیں کا رہنے والا ہوں گورکھ پور میں ملازمت کرتا ہوں۔ ایک ضروری کام سے جانا پڑ گیا ہے صاحب ورنہ نوکری پیشہ آدمی کے پاس تو نہ اتنی فرصت اور نہ اتنا پیسہ کہ روز روز سفر کر سکے۔"

چاہتا ہوں یہ حضرت دوبارہ اس دل چسپ کتاب کے مطالعہ میں محو ہو جائیں۔ ان سے بات کرنے کی طبیعت قطعی نہیں ہے۔ چاہتا ہوں ان کی نگاہیں فوراً مجھ سے ہٹ جائیں، الگ ہو جائیں، کتاب کے اوراق سے اُلجھ جائیں تاکہ میری اپنی نگاہیں برتھ پر بیٹھی اس نوجوان عورت کے جسم کو، جسم کے اعضا کو چھوتی رہیں اور میرے جسم میں وہی پہلی سی گدگدی ہوتی رہے۔ میٹھی سی گدگدی جو چبھتی نہیں گہرے اُترتی جاتی ہے۔

آنکھیں بند کر کے کھڑکی سے سر ٹکا لیتا ہوں۔ غالباً وہ صاحب سمجھ گئے ہیں کہ مجھے بنیا نا اچھا نہیں لگتا۔ وہ چپ ہو گئے ہیں۔ پھر سے کتاب کی ورق گردانی میں مشغول ہو گئے ہیں۔ چور آنکھ سے انھیں دیکھتا ہوں، وہ پڑھ رہے ہیں۔ سامنے کی بارک والے کنبے کو دیکھتا ہوں۔ سب اپنے میں مست ہیں اوپر کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی ہے

اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ ناچ رہی ہے۔ وہ خاموش ہے۔ اس کی انگلیاں گلے میں پہنی سونے کی چین سے کھیل رہی ہیں۔ اس کے چہرے سے پھسل کر میری نگاہ اس کی چھاتیاں ماپنے لگتی ہے۔ وہ بھی سر جھکا کر اپنے سینے کو دیکھتی ہے۔ گھبرا کر نگاہیں ہٹاتا ہوں تو نظر پھر اس کے چہرے سے ٹکرا جاتی ہے۔ وہ میری پریشانی کو بھانپ لیتی ہے اور میں شرمندہ سا ہو جاتا ہوں لیکن اس کی آنکھوں میں ابھی بھی ایک لطیف سی شرارت ہے مسکراتے ہوئے اس کے ہونٹ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہیں۔ اس کے موتیوں جیسے دانت ایک لمحے کے لئے دیکھ پایا ہوں۔ پھر جیسے شرم سے میری نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ آنکھیں موند کر کھڑکی سے سر ٹکا لیتا ہوں۔ سونے کی ایکٹنگ کرنے لگتا ہوں۔

باہر اندھیرا ہو گیا ہے۔ ہوا میں بھی خنکی آ گئی ہے۔ کھڑکی کا شیشہ بند کر لیتا ہوں۔

"آپ لکھنؤ سے چڑھے تھے نا۔" کنڈکٹر پوچھ رہا ہے۔

"جی ......"

اس کے ہاتھ میں پکڑی کاپی مجھ سے ایک اٹھنی مانگ رہی ہے۔ پچاس پیسے کا سکہ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔ وہ رسید کاٹ کر آگے بڑھ گیا ہے۔ اب کھڑکی کے شیشے میں اس کا عکس دکھائی دے رہا ہے۔ براہ راست اس کی طرف نگاہیں اٹھانے کی بجائے شیشے پر ٹکٹکی باندھ لیتا ہوں۔ اس کی آنکھیں ابھی بھی مجھ پر لگی ہوئی ہیں۔ شیشے میں اس کی نگاہیں پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ پھر دھیرے سے اپنا سر شیشے سے ٹکا دیتا ہوں۔ دل چاہتا ہے وہ اتر کر نیچے آ جائے۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس کے ہمراہ نہیں ہے تو وہ میرے پاس آ کر بیٹھ جائے۔ نہیں تو ٹائلیٹ کی طرف ہی چلی جائے بس ایک منٹ کے لئے اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ بس منٹ بھر کے لئے۔ اس کے ہونٹوں پر ناچتی ہوئی مسکراہٹ کو ہنسی میں تبدیل ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ وہ کھل کر ہنسے گی تو اس کی ہنسی چھنچھنائے گی۔ چاندی کی گھنٹیوں جیسی آواز پیدا ہوگی۔ چاندی کی گھنٹیاں، جو دور کسی اونچے ٹیلے پر بنے مندر میں بج رہی ہوں، دونوں وقت ملنے پر۔ لیکن وہ ویسے ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کا ہاتھ ویسے ہی گلے میں پڑی زنجیر سے کھیل رہا ہے۔ شیشے میں اس کے خد و خال کافی صاف ہو گئے ہیں باہر اندھیرا چاروں پہروں پر اتر آیا ہے۔ شیشے میں منعکس اس کے چہرے پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا ہوں۔ اس کے گالوں پر، اس کے ہونٹوں پر، اس کی آنکھوں پر۔

اب اس نے ٹانگیں پھیلا دی ہیں۔ نیچے پڑی ہوئی گاڑھی چادر کو تہ کر کے سرہانہ بنا لیا ہے۔ وہ لیٹ گئی ہے۔ اس کی بجائے اپنا ہی چہرہ شیشے میں دیکھ کر ندامت سی محسوس کرتا ہوں آنکھیں موند لیتا ہوں۔ گاڑی بھاگے جا رہی ہے۔ پوری رفتار کے ساتھ۔

بریلی کے اسٹیشن پر گاڑی رکی ہے۔ پانچ سات مرلی سے سپاہی ڈبے میں گھس آئے ہیں۔ سامنے والے کیبن کے دونوں مردوں سے پوچھ تاچھ کر رہے ہیں۔ سردار جی لوگ تلاشی دینا نہیں چاہتے اور سپاہی تلاشی لینے پر بضد ہیں۔ وہ بھی باتوں کا شور سن کر اٹھ بیٹھی ہے۔ گھبرائی ہوئی نگاہوں سے نیچے کو دیکھ رہی ہے۔ دو دو سپاہی ایک ایک سردار جی کی تلاشی لے رہے ہیں۔ پتلے دبلے جسم والا سردار گرم ہو رہا ہے۔ اوپر بیٹھی ہوئی وہ پریشان ہو اٹھی ہے۔ بولنے کی بھرپور کوشش میں وہ آں آں آں کے علاوہ کچھ نہیں کہہ پاتی ہے ایک سپاہی اوپر کی طرف منہ اٹھا کر کہہ رہا ہے۔

"چپ رہ گونگی۔ کھا تو نہیں جائیں گے ہم اسے۔ تلاشی

کتاب کھول کر پڑھنے لگتا ہوں۔ دو چار سطریں پڑھنے کے بعد ہی حسب عادت اپنے آس پاس کا جائزہ لینے لگتا ہوں۔ سامنے والی بارک میں برتھوں کے درمیانی فاصلہ کو بھاری بھرکم سامان سے پُر کر کے ایک کمرہ سا بنا لیا گیا ہے۔ اس کمرے میں ایک بڑی دری کو دوہرا کر کے بچھا یا گیا ہے۔ اس پر کھانے پینے کا سامان پڑا ہوا ہے۔ دو عورتیں ہیں، تین بچے اور دو ادھیڑ عمر کے پنجابی جاٹ۔ لہک لہک کر پنجابی میں گفتگو کر رہے ہیں میٹھی روٹیوں پر پیاز رکھ رکھ کر کھا رہے ہیں۔ صراحی سے بھر بھر کر پلاسٹک کے مگ میں پانی پی رہے ہیں۔ یہ لوگ کلکتہ سے لوٹ رہے ہیں۔ فی الحال ان کی بات چیت سے اتنا ہی جان پایا ہوں

میرے پاس کی سامنے والی برتھ پر صاحب گنجے سر والے بیٹھے ہیں۔ بڑی عاجزی کے ساتھ مجھ سے کتاب مانگ کر پڑھنے لگ جاتے ہیں۔ میں کتاب کے مطالعہ سے وقت کاٹنے کی اپنی ضرورت بیان نہیں کر سکا ہوں۔ شاید میرے چہرے پر ایسے کسی جذبے کا کوئی نقش بھی نہیں ابھرا ہے۔ ورنہ وہ صاحب دیکھنے میں اس قدر شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں کہ فوراً کتاب واپس کر دی ہوتی انھوں نے۔ اوپر کی برتھوں پر دیکھتا ہوں۔ ایک برتھ پر ایک فوجی جوان لمبی تان کر سو رہا ہے۔ اس کے فراٹے کافی پریشان کرنے والے ہیں۔ لمبے سیاہ بوٹوں کا رخ میری جانب ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے ہیں اور اس کی ناک بج رہی ہے۔ دوسری طرف کی برتھ پر ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ گلے میں پہنی سونے کی زنجیر کو بار بار جھلاتی ہے۔ پیلے رنگ کا پھولدار قمیص اس کے گورے بدن پر بہت ہی زیب دے رہا ہے۔ سنتری رنگ کا چوڑیدار پاجامہ۔ سامان رکھنے والے جنگلے پر اس کے سنہری رنگ کے سینڈل پڑے ہوئے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میری نگاہیں اس کی نظر سے ٹکرائی ہیں اور میں گویا بندھ سا گیا ہوں جی چاہتا ہے اسے دیکھتا رہوں۔ بس دیکھتا ہی رہوں۔

" کتاب کافی دل چسپ ہے۔" کتاب سے نظر ہٹا کر سامنے والے صاحب کہہ رہے ہیں۔

" جی ... ہاں۔"

" آپ کہاں جائیے گا؟"

" چنڈی گڑھ ..... اور آپ؟"

" میں تو مرادآباد جا رہا ہوں۔ وہیں کا رہنے والا ہوں گورکھ پور میں ملازمت کرتا ہوں۔ ایک ضروری کام سے جانا پڑ گیا ہے صاحب ورنہ نوکری پیشہ آدمی کے پاس تو نہ اتنی فرصت اور نہ اتنا پیسہ کہ روز روز سفر کر سکے۔"

چاہتا ہوں یہ حضرت دوبارہ اس دل چسپ کتاب کے مطالعہ میں محو ہو جائیں۔ ان سے بات کرنے کی طبیعت قطعی نہیں ہے۔ چاہتا ہوں ان کی نگاہیں فوراً مجھ سے ہٹ جائیں، الگ ہو جائیں۔ کتاب کے اوراق سے اُلجھ جائیں تاکہ میری اپنی نگاہیں برتھ پر بیٹھی اس نوجوان عورت کے جسم کو، جسم کے اعضا کو چھوتی رہیں اور میرے جسم میں وہی پہلی سی گدگدی ہوتی رہے۔ میٹھی سی گدگدی جو چھپتی نہیں گہرے اُترتی جاتی ہے۔

آنکھیں بند کر کے کھڑکی سے سر ٹکا لیتا ہوں۔ غالباً وہ صاحب سمجھ گئے ہیں کہ مجھے بتیانا اچھا نہیں لگتا۔ وہ چپ ہو گئے ہیں۔ پھر سے کتاب کی ورق گردانی میں مشغول ہو گئے ہیں۔ چور آنکھ سے انھیں دیکھتا ہوں۔ وہ پڑھ رہے ہیں۔ سامنے کی بارک والے کنبے کو دیکھتا ہوں۔ سب اپنے میں مست ہیں اوپر کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ ابھی بھی میری طرف دیکھ رہی ہے

اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ ناچ رہی ہے۔ وہ خاموش ہے۔ اس کی انگلیاں گلے میں پہنی سونے کی چین سے کھیل رہی ہیں اس کے چہرے سے پھسل کر میری نگاہ اس کی چھاتیاں ماپنے لگتی ہے۔ وہ بھی سر جھکا کر اپنے سینے کو دیکھتی ہے۔ گھبرا کر نگاہیں ہٹاتا ہوں تو نظر پھر اس کے چہرے سے ٹکرا جاتی ہے۔ وہ میری پریشانی کو بھانپ لیتی ہے اور میں شرمندہ سا ہو جاتا ہوں لیکن اس کی آنکھوں میں ابھی بھی ایک لطیف سی شرارت ہے مسکراتے ہوئے اس کے ہونٹ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہیں۔ اس کے موتیوں جیسے دانت ایک لمحے کے لئے دیکھ پایا ہوں۔ پھر جیسے شرم سے میری نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ آنکھیں موند کر کھڑکی سے سر ٹکا بیٹھتا ہوں۔ سونے کی ایکٹنگ کرنے لگتا ہوں۔

باہر اندھیرا ہو گیا ہے۔ ہوا میں بھی خنکی آگئی ہے۔ کھڑکی کا شیشہ بند کر لیتا ہوں۔

"آپ لکھنؤ سے چڑھے تھے نا۔" کنڈکٹر پوچھ رہا ہے

"جی ....."

اس کے ہاتھ میں پکڑی کاپی مجھ سے ایک اٹھنی مانگ رہی ہے۔ پچاس پیسے کا سکہ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔ وہ رسید کاٹ کر آگے بڑھ گیا ہے۔ اب کھڑکی کے شیشے میں اس کا عکس دکھائی دے رہا ہے۔ براہ راست اس کی طرف نگاہیں اٹھانے کی بجائے شیشے پر ٹکٹکی باندھ لیتا ہوں۔ اس کی آنکھیں ابھی بھی مجھ پر لگی ہوئی ہیں۔ شیشے میں اس کی نگاہیں پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ پھر دھیرے سے اپنا سر شیشے سے ٹکا دیتا ہوں۔ دل چاہتا ہے وہ اتر کر نیچے آجائے۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس کے ہمراہ نہیں ہے تو وہ میرے پاس آکر بیٹھ جائے۔ نہیں تو ٹائلٹ کی طرف ہی چلی جائے بس ایک ... کے لئے اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ بس منٹ بھر کے لئے۔ اس کے ہونٹوں پر ناچتی ہوئی مسکراہٹ کو ہنسی میں تبدیل ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ وہ کھل کر ہنسے گی تو اس کی ہنسی چھنچھنائے گی۔ چاندی کی گھنٹیوں جیسی آواز پیدا ہوگی۔ چاندی کی گھنٹیاں، جو دور کسی اونچے ٹیلے پر بنے مندر میں بج رہی ہوں، دونوں وقت ملنے پر۔ لیکن وہ ویسے ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کا ہاتھ ویسے ہی گلے میں پڑی زنجیر سے کھیل رہا ہے۔ شیشے میں اس کے خد و خال کافی صاف ہو گئے ہیں باہر اندھیرا چاروں پیروں پر اتر آیا ہے۔ شیشے میں منعکس اس کے چہرے پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا ہوں۔ اس کے گالوں پر، اس کے ہونٹوں پر، اس کی آنکھوں پر۔

اب اس نے ٹانگیں پھیلا دی ہیں۔ پیچھے پڑی ہوئی گاڑھی چادر کو تہہ کر کے سرہانہ بنا لیا ہے۔ وہ لیٹ گئی ہے۔ اس کی بجائے اپنا ہی چہرہ شیشے میں دیکھ کر ندامت سی محسوس کرتا ہوں آنکھیں موند لیتا ہوں۔ گاڑی بھاگے جا رہی ہے۔ پوری رفتار کے ساتھ۔

بریلی کے اسٹیشن پر گاڑی رکی ہے۔ پانچ سات مرلی سے سپاہی ڈبے میں گھس آئے ہیں۔ سامنے والے کیبن کے دونوں مردوں سے پوچھ تاچھ کر رہے ہیں۔ سردار جی لوگ تلاشی دینا نہیں چاہتے اور سپاہی تلاشی لینے پر بضد ہیں۔ وہ بھی باتوں کا شور سن کر اٹھ بیٹھی ہے۔ گھبرائی ہوئی نگاہوں سے نیچے کو دیکھ رہی ہے۔ دو دو سپاہی ایک ایک سردار جی کی تلاشی لے رہے ہیں۔ پتلے دبلے جسم والا سردار گرم ہو رہا ہے۔ اوپر بیٹھی ہوئی وہ پریشان ہو اٹھی ہے۔ بولنے کی بھرپور کوشش میں وہ آں آں آں کے علاوہ کچھ نہیں کہہ پائی ہے ایک سپاہی اوپر کی طرف منہ اٹھا کر کہہ رہا ہے۔

" چپ رہ گونگی۔ کھا تو نہیں جائیں گے ہم اسے۔ تلاشی

ہی تولے رہے ہیں۔"

"گونگی" لفظ میرے کانوں میں ہتھوڑے سا لگا ہے۔ چاندی کی گھنٹیوں جیسی آواز کا سپنا ٹوٹ گیا ہے۔ ٹیلے پر بنا مندر ٹیلے کی زمین میں دھنسنے لگا ہے۔ تلاشی لے کر سپاہی لوگ اتر گئے ہیں۔ کنبے کے افراد انھیں گالیاں دے رہے ہیں۔ اوپر بیٹھی اس نوجوان عورت کو بھی تسلی دی گئی ہے۔ اور وہ پھر بار بار بھر پور نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ شاید اس کی نگاہیں مجھ سے حمایت کے دو لفظ طلب کر رہی ہیں۔ مگر میرے اندر اب اسے دیکھنے کی ہمت باقی نہیں ہے۔ گاڑی چل دی ہے۔ دھیرے دھیرے تیز ہوتی جا رہی ہے۔ کھڑکی کے شیشے میں اس کی تصویر پھر نمودار ہوگئی ہے۔ گھبرا کر شیشہ اٹھا دیتا ہوں۔ آنکھوں کے سامنے باہر کا بھیانک اندھیرا ہے، سوناپن ہے۔ چاہتا ہوں گاڑی کی رفتار تیز ہو جائے، اور تیز اور زیادہ تاکہ اگلے کسی اسٹیشن پر ڈبے میں کسی دوسری جگہ کوئی سیٹ خالی ہو جائے اور میں یہاں سے اٹھ جاؤں۔ مندر دھنستے دھنستے نظر سے اوجھل ہو رہا ہے اور مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں مندر کے نیچے بیٹھا ہوا ہوں اور مسمار ہو رہے مندر کی مٹی مجھے دبا رہی ہے۔ چاندی کی گھنٹیاں بھی مٹی میں دفن ہوگئی ہیں اور اب ان کی آواز کبھی بھی سنی نہیں جا سکتی۔

عبدالرؤف

○

خون کی سرخ لکیریں افقِ مغرب پر
خطّۂ شرق کے سینے سے دھواں اُٹھتا ہے
اشک خاموش کا ایک سیل رواں
خشک ویران سی آنکھوں کی تہوں میں گم ہے
ریت کی سطح کے نیچے ہو سمندر جیسے

قحط کی، بھوک کی، افلاس کی تاریکی میں
جلتے بجھتے نظر آتے ہیں تعصّب کے شرار
قافلہ بے سر و سامانوں کا
نہ کہیں پھول کھلے ہیں، نہ بیاباں، نہ ببول

کوئی آواز تو آئے کسی ویرانے سے
کوئی تصویر نہیں ذہن کے نہ خانوں میں؟
تابشِ فکر و ہنر، خونِ جگر کا اعجاز
درد لہرائے تو شاید کوئی تصویر بنے

○

۱

درد سینے میں چمکتا تھا
جگر کا خونناب
سرخیٔ عارضِ محبوب کی تابانی میں
نغمہ و شعر کے جادو میں، فسوں کاری میں
نطق کی شعلگی، افکار کی جولانی میں
ایک انداز سے ڈھل جاتا تھا

۲

درد کی شمع جلاؤ گے، پگھل جاؤ گے!
ذہن کا ایک دریچہ بھی نہ کھلنے پائے!
اپنے تہ خانوں میں محبوس رہو!
میں اندھیروں کا پیمبر ہوں، مری بات سنو!

کاغذ کی دھجّی

ابراہیم یوسف

کردار

عاصم ۔ خدیجہ بیگم ، عظمت خالا ، مسلم ، عالیہ ، شارق

منظر :۔ ایک کھاتے پیتے درمیانی طبقہ کا ڈرائنگ روم ۔ دائیں جانب ایک دروازہ ہے جو بیرون مکان جانے کا کام دیتا ہے اور جس پر نیلے رنگ کا پردہ پڑا ہوا ہے اس دروازے کے بائیں جانب ایک کھڑکی ہے اس پر بھی ویسا ہی پردہ ہے جو اس وقت اٹھا ہوا ہے کمرے میں سے کھڑکی میں لگی لوہے کی سلاخیں اور پھر اس کے سامنے ایک برآمدہ کا حصہ نظر آتا ہے ۔ کھڑکی کے نیچے ایک تخت بچھا ہے جس پر سفید فرش ہے اس تخت پر بیٹھ کر باہر سڑک کا منظر دیکھا جا سکتا ہے ۔ کمرے کے عقبی دیوار میں دائیں جانب ایک دروازہ ہے جس پر پردہ تو ہے مگر شاید وہ ہمیشہ اٹھا رہتا ہے ۔ اس دروازے سے ایک کوریڈور نظر آتا ہے جس کے دائیں بائیں کمرے ہیں جن کے دروازوں پر پردے ہیں ۔ اگر کوئی شخص کوریڈور میں ہوتا ہے تو وہ اسٹیج سے نظر آتا ہے اس طرح یہ کوریڈور بھی اسٹیج ہی کا ایک حصّہ ہے ۔ اس عقبی دیوار سے لگا ہوا ایک پرانے طرز کا صوفہ سیٹ اور اس کے سامنے ایک ٹیبل رکھی ہے ۔ دیواروں پر کچھ تصاویر آویزاں ہیں ۔ دروازے سے لگا ہوا ایک فلاور پاٹ اسٹینڈ رکھا ہے جس پر فلاور پاٹ نہیں بلکہ ایک تصویر رکھی ہے جو دور سے صاف نظر نہیں آتی ۔ پاس ہی ایک چھوٹی سی میز اور اس کے پاس [illegible] کی کرسی رکھی ہے اگر کوئی کرسی پر بیٹھ جائے تو اس کی پیٹھ اسٹیج کی طرف ہو جاتی ہے ۔ سردی کا موسم اور شام کا وقت ہے ۔ کمرے میں خدیجہ بیگم ، عاصم اور عظمت خالہ موجود ہیں ۔ ماحول سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے ۔ عاصم کے چہرے پر غصّہ کے آثار ہیں ۔ خدیجہ بیگم بھی غصّہ میں معلوم ہوتی [illegible] عاصم تخت میں کھڑے ہو کر۔

خدیجہ بیگم: عظمت خالا ! ان سے کچھ کہنا سننا فضول ہے ۔ ان کی تو وہی مرغے کی ایک ٹانگ رہتی ہے ۔

عاصم : (غصّہ سے) ہاں رہتی ہے (تیز تیز قدموں سے کوریڈور کی طرف جاتے ہیں۔ دروازے کے پاس رک کر مڑ کر) جب صاحبزادے ایک مرتبہ ناراض ہوکر چلے گئے تھے، تو پھر اب تشریف لانے کی کیا ضرورت تھی۔

خدیجہ بیگم : تمہاری بیماری کا سنا تو چلا آیا۔ کوئی گناہ کیا۔

عاصم : (غصّہ سے) اب ایسی بیماری بھی نہیں کہ میری میت کو ان کے کاندھے کی ضرورت ہو۔

عظمت خالا : خدا کے لئے عاصم میاں نیک زبانی منہ سے نکالو۔ میت کو کاندھا دیا جائے تمہارے دشمنوں کی۔

عاصم : اور میں دشمن ہی ہوں۔ ان کے حقوق جو تار رہا ہوں ــــ

[تیزی سے کوریڈور میں جاتے ہیں اور بائیں جانب ایک کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز آتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر خدیجہ بیگم عظمت خالا کی طرف دیکھ کر]

خدیجہ بیگم : اول تو بڑھاپا، دوسرے بیماری۔ دونوں نے مل کر بالکل دماغ الٹ دیا ہے۔ (عظمت خالا خاموش رہتی ہیں۔ خدیجہ بیگم کچھ دیر خاموش رہ کر افسردہ لہجے میں) اب تم ہی کہو۔ گھر آئے مہمان سے کیسے کوئی کہدے کہ وہ چلا جائے۔

عظمت خالا : ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ شارق میاں اس جائداد پر نظر لگائے ہوئے ہیں بس اسی سے اور چڑچڑے ہوگئے ہیں۔

خدیجہ بیگم : جائداد ان کی ہے جسے چاہیں بانٹ دیں کوئی ہاتھ تو نہیں پکڑ رہا ہے۔ پھر ایسی باتوں سے کیا فائدہ جس سے دوسرے کے دل کو صدمہ پہنچے۔

عظمت خالا : عالیہ بی اپنے میاں کے مزاج کو سمجھتی ہیں۔ ان باتوں سے وہ خود پریشان ہیں ان دونوں کو ہی سمجھنا چاہئے کہ غیروں کے سامنے یہ اچھالے دے نہ ہو۔

خدیجہ بیگم : (حیرت سے) عالیہ اور غیر! کیسی باتیں کرتی ہو عظمت خالا۔ بہن کر اس گھر میں آئی تھی بیٹی بن کر اس گھر سے گئی ہے۔ وہ کیسے غیر ہوسکتی ہے (آنکھوں میں آنسو بھر کر) اگر قسمت نے ہم سے جدا کر دیا تو کیا غیر بھی ہو گئی۔

[عظمت خالا کچھ کہنے ہی والی ہوتی ہیں کہ عالیہ اور مسلم بیرونی دروازے سے کمرے میں آتے ہیں۔ مسلم پرکشش شخصیت کا مالک ہے۔ عمر چالیس سے زیادہ ہے مگر صحت قابل رشک ہے۔ چال ڈھال میں رکھ رکھاؤ اور وقار ہے۔ آنکھوں سے غور و فکر کا عادی معلوم ہوتا ہے۔ خدیجہ بیگم انھیں دیکھ کر]

خدیجہ بیگم : آؤ مسلم میاں۔ کہو گھوم آئے؟

مسلم : جی ہاں۔ یاد نہیں پڑتا کہ کبھی زندگی میں ایسی کھلی فضا کا لطف اٹھایا ہو (مسکرا کر) جی چاہتا ہے کہ یہیں رہ پڑوں۔

خدیجہ بیگم : اور ہماری بھی یہی خواہش ہے کہ تم یہیں رہو (ٹھنڈی سانس بھر کر) اس گھر کی ویرانی کھانے کو دوڑتی ہے۔ (مسلم خاموش رہتا ہے۔ خدیجہ بیگم عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) عظمت خالا، چائے تو بنا لاؤ۔

مسلم : اس وقت چائے کی ......

خدیجہ بیگم : (بات کاٹ کر) دیکھو مسلم میاں۔ (مسکرا کر) تم ہمارے معاملات میں دخل نہ دیا کرو۔ سردی زیادہ ہے (مسلم مسکراتا ہے مگر خاموش رہتا ہے۔ عظمت خالا کوریڈور کی طرف جاتی ہیں) اور ہاں

شمع دان بھی روشن کرکے دے جاؤ۔

[عظمت خالا کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ مسلم چھت میں لگے ہوئے برقی قمقمے کی طرف دیکھ کر]

مسلم : کیوں، کیا آج بجلی..... سڑک پر تو بلب روشن تھے۔

خدیجہ بیگم : (مسکراکر) بجلی میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

(مسلم حیرت اور سوالیہ نظروں سے خدیجہ بیگم کی طرف دیکھتا ہے۔ خدیجہ بیگم عالیہ کی طرف اشارہ کرکے) عالیہ کہہ رہی تھی کہ تم کو موم بتی کی روشنی پسند ہے۔

[مسلم قہقہہ مار کر ہنستا ہے پھر خاموش ہوکر مسکراتے ہوئے۔]

مسلم : تو گویا یہ بھی مہمان نوازی کا ایک حصّہ ہے۔

خدیجہ بیگم : مہمان نوازی! مسلم میاں! تم بھی کمال کرتے ہو (ہنستی ہے) اولاد بھی کہیں مہمان ہوتی ہے، جو مہمان نوازی کی جائے۔

عالیہ : (خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) ابا حضور کہاں ہیں؟

خدیجہ بیگم : اپنے کمرے میں (مسکراکر) بیماری نے تو بالکل ہی الٹ دیا ہے۔ اب شارق میاں آگئے ہیں بس آپے سے باہر ہیں۔

عالیہ : (ہنس کر) چلئے میں انھیں منائے لاتی ہوں۔

[عالیہ کوریڈور کی طرف جاتی ہے]

خدیجہ بیگم : ارے تو کہاں چلی۔ (عالیہ رک جاتی ہے اور مڑکر خدیجہ بیگم کی طرف دیکھتی ہے۔ خدیجہ بیگم مسکراتے ہوئے) ۳۵ سال سے میں ہی مناتی رہی ہوں۔ تو یہیں ٹھہر۔ میں منالوں گی۔

عالیہ : مگر امی .....

خدیجہ بیگم : (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) تو بیٹھ باہر سے تھکی ہوئی آئی ہے۔ (کوریڈور میں چلی جاتی ہیں اور عاصم صاحب کے کمرے کا دروازہ تھپ تھپاکر) اب یہ دروازہ اندر سے کیوں بند کرلیا ہے۔

عاصم : (کمرے کے اندر سے آواز) اب مجھے تھوڑی دیر آرام بھی کرنے دوگی یا نہیں۔ بس آکر سر پر سوار ہوگئیں۔

خدیجہ بیگم : یہ بھی کوئی آرام کرنے کا وقت ہے۔ دروازہ تو کھولو۔ [کچھ دیر بعد دروازہ کھلتا ہے اور خدیجہ بیگم اندر چلی جاتی ہیں]

عالیہ : (مسلم کی طرف دیکھ کر جو سگریٹ جلا رہا ہے ہنستے ہوئے) بڑھاپے میں دونوں بچوں کی طرح ہوگئے ہیں۔ (مسلم خاموش رہتا ہے مگر چہرے پر سنجیدگی کے آثار کچھ گہرے ہوجاتے ہیں۔ عالیہ اس کا چہرہ دیکھ کر) کیا بات ہے۔ آپ کچھ زیادہ سنجیدہ نظر آرہے ہیں۔

[کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتا ہے جس کا پردہ ہوا سے اُڑ رہا ہے اور سرد ہوا کمرے میں آرہی ہے۔ چند سیکنڈ کھڑا رہتا ہے، پھر کھڑکی بند کردیتا ہے جس سے کمرے میں تاریکی کچھ زیادہ ہوجاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ عالیہ کے قریب آتے ہوئے]

مسلم : بھئی، اب کب تک کا یہاں پروگرام ہے۔

عالیہ : (حیرت سے) کیوں! ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی تو آپ کی کافی چھٹیاں باقی ہیں۔

مسلم : ہاں ہیں تو۔ (سگریٹ کا لمبا سا کش لےکر) ان لوگوں کو اپنی وجہ سے کافی پریشانی ہے اور میں بھی جانے کیوں میں غیر لوگوں میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کرسکتا۔

عالیہ : غیر لوگ! خدا کی قسم وہ تو ہم لوگوں کو اپنی ہی اولاد سمجھتے ہیں۔

مسلم : یہ تو سچ ہے۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ آخر ہمارا ان سے کیا تعلق کیا رشتہ ہے۔

عالیہ : ایسا نہ کہئے۔ خدا گواہ ہے کہ وہ دونوں مجھے جو پیار

دے رہے ہیں۔ وہ مجھے اپنے سگے ماں باپ سے بھی نہیں ملا۔

مسلم : یہ تو میں بھی محسوس کرتا ہوں مگر ان کی غیر معمولی محبت اور خلوص کو دیکھ کر میں خود کو چھوٹا سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔

عالیہ : (حیرت سے) چھوٹا۔ چھوٹا۔

مسلم : دونوں اس قدر نیک دل ہیں کہ ان سے بے اختیار محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ (سوچتا ہوا میز کے پاس جاتا ہے پھر مڑ کر عالیہ کو دیکھتا ہے۔ میز سے ٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر) عالیہ! یہ نیک لوگ میری شخصیت اور روح کو ہپناٹائز کرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں خود کچھ نہیں رہا ہوں۔ اور اگر ہوں بھی تو ان کا معمول۔ یا تمھارا سایہ۔

عالیہ : میرا سایہ!

مسلم : ہاں میری عزت، مجھ سے محبت اور خلوص سب تمھاری وجہ سے ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ میں ان کے لئے غیر ہوں۔

عالیہ : یہ آپ کا وہم ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر اسٹینڈ پر رکھی ہوئی تصویر کے پاس جاتی ہے اور اس کی طرف اشارہ کر کے) آپ جانتے ہیں کہ پہلے یہاں کس کی تصویر رکھی تھی۔ (مسلم خاموش رہتا ہے) ان کے مرحوم بیٹے کی اور اب اس کی جگہ آپ کی تصویر ہے۔ یہ ان کی آپ سے محبت ہے (آنکھوں میں آنسو بھر کر) ان کے بوڑھے دلوں کی اس محبت کو یوں مجروح نہ کیجئے۔ کہیں وہ ٹوٹ نہ جائیں۔

[مسلم خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگتا ہے کہ خدیجہ بیگم کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آتی ہیں مڑ کر اس کمرے کی طرف دیکھتی ہیں۔ سوئچ دبا کر کوریڈور میں روشنی کر دیتی ہیں اور بلند آواز سے]

خدیجہ بیگم : ارے عظمت خالا۔ ابھی تک شمع دان نہیں لائیں دیکھو تو کمرے میں کتنا اندھیرا ہے اور عالیہ تجھے بھی خیال نہیں کہ مسلم میاں اندھیرے میں کھڑے ہیں (مڑ کر دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے) غضب کی بے پرواہ ہیں دونوں۔

[کمرے میں چلی جاتی ہیں کہ شارق اسی کمرے سے شمعدان لئے نکلتا ہے اور اس کمرے میں آ کر میز پہ رکھ دیتا ہے جس سے کمرے [illegible] دلکش مگر پُر اسرار روشنی پھیل جاتی ہے۔]

مسلم : آپ نے بلاوجہ تکلیف کی۔

شارق : تکلیف کی کون سی بات ہے۔ عظمت خالا دوسرے کاموں میں لگی ہوئی تھیں۔

مسلم : (مسکرا کر) بھئی شارق صاحب کچھ بھی کہا جائے اس روشنی میں جو نرماہٹ ہے وہ بجلی کی روشنی میں نہیں۔

شارق : جی ہاں کہہ لیجئے کہ اس میں شاعرانہ تصور زیادہ ہے ورنہ آج کی دنیا جگمگاہٹ کے پیچھے ہی دوڑ رہی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے۔

[مسلم کچھ اس انداز سے شارق کو دیکھتا ہے جیسے اندازہ کر رہا ہو کہ کہیں وہ کسی طویل بحث کی تمہید تو شروع نہیں کر رہا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر مسکراتے ہوئے]

مسلم : بھئی حقیقتوں کی بات چھوڑ دو ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ کڑوی ہوتی ہیں۔

[پہلے تو شارق قہقہہ مار کر ہنستا ہے پھر مسکراتے ہوئے]

شارق : اور یہ کڑوی گولیاں ہم کو نگلنا ہی پڑتی ہیں۔ ان سے مفر نہیں۔

مسلم : (ہنس کر) جی ہاں، جی ہاں۔ مگر —

خدیجہ بیگم : (آواز کمرے میں سے) ارے عالیہ بیٹی۔ (دروازے میں آکر) عالیہ بیٹی۔ ذرا ادھر تو آنا۔

عالیہ : بہت اچھا۔ حاضر ہوئی۔

[خدیجہ بیگم پھر کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ عالیہ بھی کوریڈور میں جاکر اسی کمرے میں چلی جاتی ہے۔ مسلم بھی کوریڈور کی طرف جاتا ہے]

شارق : کہیے کدھر چل دیے۔

مسلم : کچھ سردی کا احساس زیادہ ہو رہا ہے اوور کوٹ پہن لوں۔ آپ بھی گرم کوٹ پہن لیجئے۔ یہ سردی صرف سوئٹر کی بس کی نہیں۔

شارق : میں تو ایسی سردیوں کا عادی ہوں۔ ٹورنگ ایجنٹ جو ٹھہرا۔ کوئی یونیورسٹی کا پروفیسر نہیں۔ (مسلم اس انداز سے شارق کو دیکھتا ہے جیسے شارق کے اس طنز سے اسے دکھ ہوا ہو۔ شارق چند سکنڈ رک کر اس کے خیالات کا اندازہ کرکے) شاید آپ غلط سمجھے۔ میرا مقصد کچھ اور نہیں تھا۔ (آگے بڑھتے ہوئے) چلئے میں بھی کوٹ پہنے لیتا ہوں

[آگے آگے مسلم اور اس کے پیچھے شارق کوریڈور میں جاتے ہیں کہ عالیہ چائے کی ٹرے لئے ہوئے کمرے سے نکلتی ہے اور مسلم کو دیکھ کر]

عالیہ : کہاں چل دیئے آپ۔ میں تو چائے لے کر حاضر ہو رہی تھی۔

مسلم : تم چلو۔ میں ابھی آیا۔

[عالیہ آگے بڑھتی ہے اور شارق اسی کمرے میں چلا جاتا ہے۔ عالیہ کوریڈور سے کمرے میں آتی ہے اور چائے کی کشتی میز پر رکھتی ہے کہ خدیجہ بیگم دروازے سے جھانک کر]

خدیجہ بیگم : عالیہ بیٹی۔ (عالیہ مڑ کر کوریڈور کی طرف دیکھتی ہے) ارے مسلم میاں کہاں چلے گئے۔

مسلم : (اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے) یہ ہوں۔ آئیے نا آپ چائے نہیں پئیں گی؟

خدیجہ بیگم : اب تم ہی پی لو۔ ایک پیالہ میں یہیں پی لوں گی۔

[پھر کمرے کے اندر ہو جاتی ہیں۔ مسلم جس نے اوور کوٹ پہن رکھا ہے آہستہ آہستہ کمرے میں عالیہ کے پاس آتا ہے۔ عالیہ صوفے پر بیٹھ کر چائے بنانے لگتی ہے]

مسلم : شارق صاحب کا تو انتظار کر لو۔

عالیہ : (بے التفاتی سے) اگر انھیں آنا ہوگا تو آجائیں گے۔

[مسلم غور سے عالیہ کا چہرہ دیکھتا ہے جو نظریں جھکائے چائے بنا رہی ہے۔ کچھ دیر بعد چائے کی پیالی مسلم کی طرف بڑھاتی ہے۔ مسلم پیالی لے کر میز کے پاس جاتا ہے اور اس سے ٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے عالیہ بھی اپنی پیالی لے کر آہستہ آہستہ اس کے پاس جاتی ہے مسلم چائے کا گھونٹ لے کر]

مسلم : معلوم ہوتا ہے کہ شارق صاحب کی پوزیشن اس گھر میں ان انوائیٹڈ گیسٹ کی سی ہے۔

عالیہ : جی نہیں ایسی بات تو نہیں ہے امی تو ان کا بہت خیال رکھتی ہیں صرف ابا حضور ہی ان سے کچھ ناراض رہتے ہیں۔

مسلم : (سوالیہ نظروں سے عالیہ کو دیکھتے ہوئے) کیوں (عالیہ کوئی جواب نہیں دیتی مسلم چائے کا گھونٹ لے کر) تم تو پہلے سے ان کو جانتی ہوگی۔

الیہ : جی نہیں۔ کچھ زیادہ نہیں۔ وہ "ان کی" موت کے بعد چند دن کے لئے آئے تھے۔

[مسلم سوچتا ہوا صوفے کے پاس جاتا ہے۔ خالی پیالی میز پر رکھتا ہے سگریٹ جلاتا ہے۔ پھر عالیہ کے قریب جاتے ہوئے]

مسلم : مجھے بھی یہ کوئی نیک دل انسان معلوم نہیں ہوتے۔

الیہ : (حیرت سے) کیوں، آپ نے کیسے اندازہ لگایا

مسلم : (طنزیہ مسکراکر) بعض وقت انسان کا ایک جملہ ہی اس کی ساری شخصیت کو ظاہر کردیتا ہے۔ (عالیہ ایسے انداز سے اسے دیکھتی ہے جیسے وہ کچھ اور کہے گا مگر وہ خاموش رہتا ہے۔ سگریٹ کا کش لے کر سوچتے ہوئے) اب ہمیں اجازت لے ہی لینا چاہئے۔

عالیہ : کیسی اجازت!

مسلم : واپس چلنے کی۔ کل صبح ہی ہمیں روانہ ہوجانا چاہئے۔

عالیہ : شاید ہی وہ لوگ ابھی اجازت دیں۔ بلکہ (خاموش ہوجاتی ہے، مسلم سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ عالیہ کچھ دیر خاموش رہ کر) شاید ابھی کچھ دن اور رکنا ہی پڑے گا۔ میں نے امی سے ذکر کیا تھا مگر وہ سن کر ناراض ہوگئیں اور مجھے خاموش ہوجانا پڑا۔

مسلم : اور کبھی ابا حضور ناراض ہوجائیں گے اور تمہیں خاموش ہوجانا پڑے گا۔ سچ پوچھو تو اب میں عجیب سی الجھن محسوس کررہا ہوں۔

عالیہ : الجھن! الجھن کی کیا بات ہے۔

(خدیجہ بیگم کوریڈور سے کمرے میں آتے ہوئے)

خدیجہ بیگم : مسلم میاں۔ کھانا تیار ہوگیا ہے اگر کہو تو میز پر لگوادیا جائے۔

مسلم : جیسی آپ کی مرضی۔ (کلائی پر گھڑی دیکھ کر) ابھی تو ساڑھے سات ہی بجے ہیں۔

خدیجہ بیگم : جب بھوک لگے تب کھا لینا۔ (عالیہ کی طرف دیکھ کر) بیٹی ذرا دیکھو تو۔ جاگ رہے ہوں تو کھانے کا پوچھ لے۔ (مسکراکر) مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کریں گے۔

عالیہ : بہت اچھا (کوریڈور کی طرف جاتے ہوئے) میں پوچھے لیتی ہوں۔

(کوریڈور میں جاکر پہلے تو عاصم کے کمرے میں جھانکتی ہے پھر اندر چلی جاتی ہے۔ خدیجہ بیگم مسکراکر مسلم کی طرف دیکھتے ہوئے۔)

خدیجہ بیگم : بالکل سٹھیا گئے ہیں بات بات میں الجھتے ہیں۔ اب شارق سگا بھتیجا ہے مگر اس کی صورت سے بیزار ہیں۔ اگر میں کچھ بولتی ہوں تو مجھ پر بگڑتے ہیں جب سے تم آئے ہو تو دماغ کچھ سکون پر ہے ہنس کر دو بول بول لیتے ہیں۔ عالیہ کے نکاح کے بعد تو ایسی چپ لگی تھی جیسے بولنا ہی بھول گئے ہوں۔

مسلم : عالیہ سے وہ اولاد کی طرح محبت کرتے ہیں۔ اس کے بچھڑنے کا صدمہ ہونا ہی چاہئے۔ بیماری اور پھر عمر کا تقاضا ہے کہ انھیں مکمل آرام ملے۔

خدیجہ بیگم : تو کہاں کے پہاڑ توڑتے پھرتے ہیں۔ سب ادھر ادھر کرتے ہیں۔ بس ایک بات مرضی کے خلاف ہوجائے دن بھر کے لئے چڑچڑا پن جائے گا۔

[مسلم کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر آہستہ سے]

مسلم : اب ہمیں اجازت دیجئے۔

خدیجہ بیگم : (مسلم کا چہرہ غور سے دیکھ کر) ابھی سے! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ عالیہ تو کہہ رہی تھی ابھی

بہت چھٹیاں باقی ہیں۔

مسلم : جی ہاں چھٹیاں تو باقی ہیں مگر آپ کو بلاوجہ تکلیف ہو رہی ہے۔

خدیجہ بیگم : تکلیف کیسی ! ہمیں غیر سمجھتے ہو ؟

مسلم : جی نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔ مجھے ان چھٹیوں میں کچھ لیکچر تیار کرنا ہیں۔

خدیجہ بیگم : اب لیکچر تو تیار ہوتے رہیں گے۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں پوری چھٹیاں یہیں روکے رکھیں گے۔

مسلم : آپ کا خلوص اور پیار دیکھ کر تو یہی جی چاہتا ہے کہ نہ جاؤں مگر کچھ ضروری کام ہیں جن کی وجہ سے جانا ضروری ہے۔ ورنہ ——

خدیجہ بیگم : تو پھر ان سے اجازت لے لو۔ مگر شاید ابھی کاغذات تیار نہیں ہوئے ان کی تیاری کا تو انتظار کرنا ہی پڑے گا۔

مسلم : (حیرت سے) کیسے کاغذات !

خدیجہ بیگم : تمہیں عالیہ نے نہیں بتلایا۔

مسلم : جی نہیں۔ مجھ سے تو کسی قسم کے کاغذات کی بات چیت نہیں ہوئی۔

خدیجہ بیگم : اب ہم دونوں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں جانے کب بلاوا آجائے۔ اس لئے سوچا کہ جائداد کا فیصلہ اپنی ہی زندگی میں کر جائیں۔

مسلم : (حیرت سے) جائداد کا فیصلہ !

خدیجہ بیگم : ہاں۔ ہمارے آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں۔ عالیہ ہے۔ بہو بن کر اس گھر میں آئی تھی بیٹی بن کر اس گھر سے گئی۔ اس لئے وکیل سے کہا ہے کہ وہ اس کے نام جائداد کے کاغذات مرتب کرا دیں۔

مسلم : جی۔ تو کیا کوئی اور رشتہ دار۔ میرا مطلب ہے کہ شارق صاحب تو اس کے جائز وارث ہیں۔

خدیجہ بیگم : مگر وہ نہیں چاہتے کہ انھیں ایک کوڑی بھی ملے۔

مسلم : مگر یہ تو ——

خدیجہ بیگم : (بات کاٹ کر) میں نے تو کہا تھا کہ ان کا حصہ نکال کر باقی عالیہ کے نام کر دو۔ مگر وہ سننے تک کو تیار نہیں۔

[مسلم کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل ہی دل میں کچھ فیصلے کر رہا ہے اور پھر انھیں رد کر رہا ہے۔ خدیجہ بیگم خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی ہیں۔ مسلم سگریٹ جلا کر دو لمبے کش لیتا ہے اور پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے کہ عالیہ کمرے میں آتی ہے اور خدیجہ بیگم کو دیکھ کر]

عالیہ : ابا حضور اپنی دوائی کی گولیاں مانگ رہے تھے میں نے تو بہت تلاش کیں، کہیں نہیں ملیں۔ آپ نے کہاں رکھ دی ہیں۔

خدیجہ بیگم : ان کے سرہانے جو بستر ہے اس کی دراز میں ہیں۔ (کوریڈور کی طرف جاتے ہوئے) میں جا کر دیتی ہوں۔

[کوریڈور سے گزر کر عاصم صاحب کے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ مسلم اسی طرح غور و فکر کے انداز میں کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے۔ عالیہ کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتی رہتی ہے پھر آہستہ سے

عالیہ : کیا بات ہے۔ آپ کچھ ——

مسلم : (عالیہ کے قریب آتے ہوئے) عالیہ ! یہ جائداد کی منتقلی کا کیا قصہ ہے۔

عالیہ : کیسی جائداد کی منتقلی۔

مسلم : ابھی امی کہہ رہی تھیں کہ یہ جائداد تمہارے نام منتقل کی جا رہی ہے۔

عالیہ : جی ہاں
مسلم : اور تم نے مجھ سے کہا تک نہیں۔
عالیہ : میں نے سوچا تھا کہ جب وہ منتقل ہو جائے گی، تو آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔
مسلم : (کسی قدر تلخ لہجے میں) گویا یہ بات تم مجھ سے چھپانا چاہتی تھیں۔
عالیہ : اس میں چھپانے کی کونسی بات تھی۔ کبھی ایسا موقع ہی نہیں ملا کہ آپ سے کہا جاتا۔ (مسلم پھر کمرے میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سخت ذہنی الجھن میں مبتلا ہیں۔ چہرے سے نہ صرف الجھن بلکہ تکلیف کا بھی احساس ہوتا ہے۔ عالیہ کچھ دیر بعد سہمے ہوئے لہجے میں) آخر اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔
مسلم : (کچھ دیر کھوئے کھوئے انداز میں اپنی نظر میں عالیہ کے چہرے پر گاڑے رہتے ہیں پھر آہستہ سے) عالیہ! کیا تم چاہتی ہو کہ لوگ میرا مذاق اڑائیں۔
عالیہ : (حیرت سے) مذاق!
مسلم : لوگ یہی کہیں گے کہ چالیس سال کی عمر میں میں نے اس جائداد کے لئے ہی شادی کی ہے۔
عالیہ : لیکن نکاح سے پہلے تو یہ جائداد میری نہیں تھی اب اگر مل رہی ہے تو۔
مسلم : لوگ حقیقت تلاش کرنے کی کوشش کم اور تضحیک کا پہلو نکالنے کی کوشش زیادہ کرتے ہیں۔ میں دوسروں کے طعنے برداشت نہیں کر سکتا۔
عالیہ : طعنے! بھلا اس میں طعنے ــــ
مسلم : (بات کاٹ کر) ابھی شارق صاحب مجھے یونیورسٹی کی پروفیسر شپ کا طعنہ دے گئے ہیں اب عاصم صاحب کا خطاب عطا فرمائیں گے۔ (فیصلہ کن لہجے میں) تمہیں اس جائداد کے قبول کرنے سے انکار کرنا ہوگا۔
عالیہ : لیکن ان دونوں کا تو سوچئے جو مجھ ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں ان کے دل کو کس قدر صدمہ پہنچے گا۔
مسلم : عالیہ! تمہارا جذباتی لگاؤ ان لوگوں سے ہے خدا گواہ کہ میں تمہارے اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں۔
عالیہ : مگر ــــ
مسلم : (اپنی ہی رو میں اس کی بات کاٹ کر) یہ دونوں کس قدر نیک اور مخلص ہیں میں بیان نہیں کر سکتا میرے دل میں ان کی کس قدر عزت ہے۔ تم اس کو محسوس بھی نہیں کر سکتیں مگر پھر بھی میں اس احسان کو قبول نہیں کر سکتا۔ جس سے میری خودداری کو ٹھیس پہنچے۔
عالیہ : لیکن یہ احسان آپ پر تو نہیں ہے۔
مسلم : اگر ڈائریکٹ نہیں تو ان ڈائریکٹ ضرور ہے تمہیں اس سے انکار کرنا ہوگا۔
[عالیہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر تیز تیز قدموں سے کوریڈور کی طرف جاتا ہے کہ خدیجہ بیگم، عاصم صاحب کے کمرے سے نکلتی ہیں اور مسلم کو دیکھ کر]
خدیجہ بیگم : مسلم میاں چائے پی
مسلم : جی ہاں
خدیجہ بیگم : جب بھوک لگے کہہ دینا۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ کھانا تیار ہے۔
مسلم : بہت اچھا
[اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے خدیجہ بیگم سامنے والے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے]

خدیجہ بیگم : عظمت خالا یہ چائے کے برتن تو اٹھا لو۔ اب وہ دو دن کے لئے آئی ہے تو کیا برتن دھوتی پھرے۔

[کمرے کے اندر چلی جاتی ہیں۔ عالیہ میز پر رکھے ہوئے برتن اٹھا کر کشتی میں رکھتی ہے پھر صوفے پر بیٹھ کر خلاء میں گھورنے لگتی ہے کہ عظمت خالا کمرے میں آتی ہیں پہلے تو کشتی اٹھاتی ہیں پھر عالیہ کو خاموش بیٹھی دیکھ کر]

عظمت خالا : کیا بات ہے دلہن بیگم۔ یوں خاموش کیوں بیٹھی ہو۔

عالیہ : (پژمردہ لہجے میں) کچھ نہیں عظمت ...

[عظمت خالا پہلے تو عالیہ کے چہرے کو غور سے دیکھتی ہیں کچھ دیر خاموش رہتی ہیں پھر اٹھائی ہوئی کشتی میز پر رکھ کر]

عظمت خالا : مسلم میاں کہاں ہیں۔

عالیہ : (مردہ سی آواز میں) اپنے کمرے میں

عظمت خالا : سچ بتاؤ دلہن بیگم کیا بات ہے۔

عالیہ : کوئی بات نہیں کہہ تو دیا۔

عظمت خالا : کوئی بات ضرور ہے۔ مسلم میاں نے کچھ کہا؟ (عالیہ نفی میں سر ہلاتی ہے مگر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) شارق میاں نے کچھ ایسی ویسی بات تو نہیں کہی۔

عالیہ : نہیں عظمت خالا۔ میں تو ان سے بات بھی نہیں کرتی (آنسو پونچھتے ہوئے) میں نے دوسرا نکاح اس لئے تو نہیں کیا تھا کہ امی بی اور ابا حضور کا دل دکھاؤں۔ خدا گواہ ہے عظمت خالا کہ میں ان کی خواہش پوری کرنے کے لئے نکاح کر لیا ورنہ میں تمام زندگی بیوہ رہ کر ان کی خدمت کر سکتی تھی۔

[پھر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں عظمت خالا اس کے پاس بیٹھ کر]

عظمت خالا : آخر ہوا کیا دلہن بیگم۔ کچھ کہو تو۔ مسلم میاں کے ساتھ خوش نہیں ہو۔؟

عالیہ : نہیں عظمت خالا ویسے مجھے کوئی تکلیف نہیں مگر ___ (خاموش ہو جاتی ہے۔ عظمت خالا خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہتی ہیں) ابا حضور یہ جائداد میرے نام کرنا چاہتے ہیں مگر یہ ان کو پسند نہیں۔

عظمت خالا : کیوں پسند نہیں۔

عالیہ : (کھڑی ہو کر) پتہ نہیں اگر میں نے انکار کیا تو ابا حضور کو کس قدر دکھ ہوگا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) وہ سمجھیں گے کہ میں نے ان کو غیر سمجھا (میز کے پاس جاتی ہے اور کرسی پر اس طرح بیٹھتی ہے کہ اس کا چہرہ اسٹیج کی جانب رہتا ہے) کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

[عظمت خالا کچھ دیر خاموش بیٹھی رہتی ہیں، پھر اٹھ کر عالیہ کے پاس جاتی ہیں کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہیں پھر آہستہ سے]

عظمت خالا : تم انھیں سمجھانے کی کوشش کرو۔ آئی لکشمی کو کون ٹھکراتا ہے۔

عالیہ : ان کا ہر فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا ہے (خلاء میں گھورتے ہوئے) میں ان کا دل دکھانا نہیں چاہتی مجھے طلاق ______

عظمت خالا : (تیزی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر) دلہن بیگم، بدشگونی کے الفاظ زبان پر نہ لانا۔ (ایسے لہجے میں جس میں تھوڑی سی غصہ کی جھلک ہے) کیا تم چاہتی ہو کہ زندگی سے یہ اکتائے ہوئے زندگی

ہی سے بیزار ہو جائیں۔ انھوں نے کس چاؤ سے تمہارا
دوسرا نکاح کیا ہے۔ کبھی تم نے اس پر غور بھی کیا ہے۔

عالیہ : میں ان سے کیسے کہوں کہ مجھے یہ جائداد نہیں چاہئے۔
مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

عظمت خالا : اور اگر تم نے انکار کیا تو جائداد شارق میاں
کو مل جائے گی اور عاصم میاں اس کو برداشت
نہیں کر سکیں گے۔

[عالیہ خاموش رہتی ہے اور اپنے آنسو پلو سے
پونچھتی ہے کچھ دیر خاموشی رہتی ہے کہ عاصم صاحب
اپنے کمرے سے نکل کر اس کمرے میں آتے ہیں۔ عالیہ
انھیں دیکھ کر تیزی سے کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنے
سر پہ دوپٹے کو برابر کرتی ہے۔ عاصم صاحب آکر
صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں کچھ دیر اس طرح خاموش
رہتے ہیں جیسے اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش
کر رہے ہوں پھر عالیہ کی طرف دیکھ کر۔]

عاصم : عالیہ

عالیہ : (عالیہ کے پاس آتے ہوئے) جی ابا حضور۔

عاصم : مسلم یہاں کہاں ہیں۔ کھانا کھا[illegible]

عالیہ : جی ابھی تو نہیں کھایا۔ اپنے کمرے میں ہیں

عاصم : (عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) عظمت خالا!
یہ برتن اٹھا کر لے جاؤ۔ (عظمت خالا برتن
اٹھا کر کوریڈور کی طرف جاتی ہیں) ذرا مسلم میاں
سے کہہ دینا کہ میں بلا رہا ہوں۔

عظمت خالا : اچھا۔ (کوریڈور میں جاکر مسلم کے کمرے کا
دروازہ تھپ تھپا کر) مسلم میاں آپ کو عاصم
میاں بلا رہے ہیں۔

مسلم : (کمرے کے اندر سے آواز) بہت اچھا۔ ابھی حاضر ہوا
(عظمت خالا دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔

(عالیہ، عاصم کی طرف دیکھ کر)

عالیہ : ابا حضور آپ نے دوا پی لی۔

عاصم : (تھکے تھکے سے لہجے میں) ہاں بیٹی۔ مگر یہ زندگی
کہاں تک دواؤں پر پلے گی۔ آخر کو ایک دن دوائیں
بھی ہار تھک کر ساتھ چھوڑ دیں گی۔

عالیہ : (آنکھوں میں آنسو بھر کر) ابا حضور ایسا نہ کہئے
خدا کے لئے ایسا نہ کہئے۔

عاصم : (طنزیہ مسکرا کر) تم کہتی ہو تو نہیں کہتا۔ مگر بیٹی!
بڑھاپا موت کا نقیب ہوتا ہے اس کی آواز پر
کا[illegible] موت ایک سچائی
(ٹھنڈی سا[illegible] بھر کر) [illegible] خاموش رہنے سے یہ
سچائی یہ حقیقت جھٹلائی جا سکتی ہے تو میں خاموش
ہوا جاتا ہوں۔

عالیہ : ابا حضور۔

[عاصم کھڑے ہو کر عالیہ کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر]

عاصم : نہیں بیٹی روتے نہیں ہیں۔ بخدا بوڑھا ہو چکا
ہوں۔ عزم و ارادہ شکست ہو چکا ہے ورنہ تیرے
ان آنسوؤں کے لئے میں موت سے بھی پنجہ لڑا لیتا۔

[مسلم کمرے میں آتا ہے عالیہ کی آنکھوں میں آنسو
دیکھ کر [illegible]

مسلم : [illegible]

عاصم : (عالیہ کو محبت سے صوفے پر بٹھلا کر طنزیہ مسکرا کر)
ایک بوڑھے سے کہہ رہی ہے کہ وہ موت سے ٹکرا جائے
(ٹھنڈی سانس بھر کر) بوڑھا ہو چکا ہوں ورنہ
موت کے منہ پر وہ طمانچہ مارتا کہ خدا کو بھی اپنی اس
تخلیق کا روپ بدلنا پڑتا۔

مسلم : آپ تشریف رکھئے (عاصم کو صوفے پر بٹھلا کر
عالیہ کی طرف دیکھ کر) تمہیں کوئی ایسی بات نہیں

کہنا چاہئے جس سے ان کے اعصاب پر برا اثر پڑے صحت پہلے ہی اچھی نہیں ہے۔

[کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ شارق کوریڈور سے گزر کر دروازے میں آتا ہے۔ پھر ان تینوں کو کمرے میں دیکھ کر دروازے ہی میں رک جاتا ہے۔ اس نے لباس تبدیل کیا ہوا ہے جیسے وہ کہیں باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ کچھ دیر بعد عاصم، مسلم کی طرف دیکھ کر]

عاصم : ابھی خدیجہ نے بتلایا کہ تم واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔

مسلم : جی ہاں کچھ ضروری کام ہیں ورنہ ــــ

عاصم : کوئی بات نہیں۔ تمہارا ہی گھر ہے جب جی چاہے آجا سکتے ہو۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) مسلم میاں۔ میں بیمار ہوں۔ بوڑھا ہوں۔ موت جانے کب دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ اس کے آنے سے پہلے میں ایک فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔

مسلم : فرض سے ! کس فرض سے ؟

عاصم : (کچھ دیر خاموش رہتے ہیں پھر کھڑے ہو کر) مسلم میاں ......

مسلم : آپ تشریف رکھئے۔

عاصم : نہیں۔ یوں بھی ٹھیک ہوں۔ عالیہ کو بہو بنا کر اس گھر میں لایا تھا مگر خدا کی مرضی کچھ اور ہی تھی۔ پھر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور اسے بیٹی کی طرح تمہارے سپرد کر دیا۔ اب سوچتا ہوں کہ جو کچھ اور ہے وہ بھی عالیہ کے سپرد کر کے خود سبکدوش ہو جاؤں۔

مسلم : آپ کی محبت اور آپ کا خلوص ہمارے لئے سب سے بڑی دولت ہے۔

عاصم : یہ تمہاری سیر چشمی ہے مسلم میاں (بلند آواز سے) عظمت خالا۔ عظمت خالا (عظمت خالا کوریڈور میں آتی ہیں۔ عاصم انھیں دیکھ کر) میرے سرہانے ایک بڑا سا لفافہ رکھا ہے وہ اٹھا لاؤ۔ (عظمت خالا، عاصم صاحب کے کمرے میں چلی جاتی ہیں) عالیہ۔ میرے بعد عظمت خالا کا خیال رکھنا۔ میں نے انھیں نوکرانی کبھی نہیں سمجھا۔ ماں کی طرح عزت کی ہے۔

عالیہ : اباحضور! (کھڑی ہو کر) یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔

عاصم : ایک تھکا ہوا راہگیر جلد از جلد اپنا بوجھ اتار دینا چاہتا ہے (عظمت خالا ایک لفافہ لا کر عاصم کو دیتی ہیں) اچھا لے آئیں (مسلم کی طرف دیکھ کر) میں نے وکیل سے کاغذات تیار کروا دیئے ہیں۔ عدالتی کارروائی بھی مکمل ہے۔

مسلم : ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی آپ ــــ

عاصم : دیکھو میاں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے مگر موت کا نہیں۔

عالیہ : (جذباتی انداز میں) موت، موت، موت ! آخر اباحضور آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ نہیں چاہئے مجھے ایسی جائداد جس کا تعلق آپ کی ــــ

عاصم : (پھیکی سی مسکراہٹ سے بات کاٹ کر) موت سے کس کو رستگاری ہے تمہارے انکار سے مجھے دکھ ہوگا عالیہ۔

عالیہ : خدا کے لئے اباحضور آپ مجھے ــــ

عاصم : (بات کاٹ کر) تو پھر تم ہمیں غیر سمجھتی ہو۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) بخدا ہم تو تمہیں اپنی بیٹی سمجھتے رہے۔

عالیہ : اباحضور ــــ

[صوفے پر بیٹھ جاتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو

آجاتے ہیں۔ کچھ بے بسی سے کبھی مسلم اور کبھی عاصم کو دیکھتی ہے۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بڑی کشمکش میں مبتلا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ پھر مسلم۔ عاصم صاحب کے پاس جاکر]

مسلم : دیکھئے بات دراصل یہ ہے کہ اس کے جائز حق دار ــــــ

عاصم : (کسی قدر ناگواری کے لہجے میں مسلم کا قطع کلام کرکے) یہ میری جائداد ہے جسے چاہوں دے دوں وہی جائز حق دار ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر شکست خوردہ لہجے میں) میں جانتا ہوں کہ یہ تحفہ تمہارے لئے بہت حقیر ہے مگر ــــ

[عالیہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ عاصم ایک دم خاموش ہو جاتے ہیں۔ عظمت خالا عاصم کے پاس آکر]

عظمت خالا : عاصم میاں ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ اس وقت دلہن بیگم کا جی قابو میں نہیں ہے۔ ابھی اس بات کو چھوڑ دو۔ پھر کبھی ــــ

[شارق آگے بڑھ کر ان کے قریب آتے ہوئے]

شارق : تو اس کاغذ کی دھجی کو قبول کر لینے میں کونسی برائی ہے۔

عاصم : (مڑ کر شارق کو دیکھ کر) کاغذ کی دھجی۔ مردود میری وصیت کو کاغذ کی دھجی کہتے شرم نہیں آتی۔

شارق : کسی کا حق مار کر کوئی وصیت کی جائے تو اس کی اہمیت کاغذ کی دھجی سے زیادہ نہیں ہوتی۔

عاصم : (غصے سے کانپتے ہوئے) نکل جا میرے گھر سے مردود۔ تیرا حق ــــ کاغذ کی دھجی۔

[غصے سے کانپتے ہوئے لڑکھڑا کر صوفے کی طرف بڑھتے ہیں۔ مسلم تیزی سے بڑھ کر انھیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں مگر عاصم صوفے پر گر جاتے ہیں۔ مسلم ان کی نبض پر ہاتھ رکھ کر شارق سے]

مسلم : جلدی سے کسی ڈاکٹر کو بلائیے۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ (شارق بے تعلق سا کھڑا رہتا ہے۔ مسلم اس کا چہرہ دیکھ کر نفرت سے) آپ کو اتنی بھی تمیز نہیں کہ کس وقت کس سے کونسی بات کرنا چاہئے ــــ (عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) پاس میں کوئی ڈاکٹر ملے گا۔

عظمت خالا : (گھبرائے ہوئے انداز میں) ہاں میاں، یہ سڑک جہاں سیدھے ہاتھ کو مڑی ہے وہیں ایک ڈاکٹر کا دواخانہ ہے۔ (مسلم تیزی سے کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ (عظمت خالا بلند آواز سے) بہو بیگم ــــ بہو بیگم ــــــ ذرا جلدی سے ادھر تو آؤ۔

پردہ

امیج

بشیر بدر

شمس الرحمٰن فاروقی

(ایک تبصرہ)

اکائی کی اشاعت کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے دو مجموعوں میں اگر زیادہ فصل نہ ہو تو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ پہلے مجموعے کے فوراً بعد شاعر کے یہاں کوئی اہم یا قابل ذکر تبدیلی رونما ہوئی ہے اور اس تبدیلی کو پہچاننے، پرکھنے، شاعر کے پورے کارنامے اور اس کے تناظر کو READJUST کرنے کے لئے دوسرے مجموعے کی اشاعت ناگزیر ہو گئی تھی۔ ورنہ اگر دوسرا مجموعہ بھی اسی ذہنی سطح اور اسی شاعرانہ پہنچ کا اظہار کرے جس سے پچھلا مجموعہ عبارت تھا، تو تازہ مجموعے کی کوئی خاص وجہ وجود نہیں رہ جاتی۔

مندرجہ بالا مفروضے کی روشنی میں دیکھئے تو امیج کی مطالعہ عمومی طور پر مایوس کن ہی رہتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اکائی کے مقابلے میں امیج کی زبان زیادہ بے جھجک ہے، یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نئے الفاظ تلاش کرنے سے تھکتا نہیں، بلکہ کوشش کرتا رہتا ہے کہ وہ رسوماتی الفاظ و محاورہ سے اجتناب کرے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ زبان کے سلسلے میں تخلیقی بغاوت اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب شاعر کو زبان پر پورا قابو ہو اور پھر وہ اس قابو کا فنی اظہار بھی کر سکے۔ وہ تمام عیوب جو اکائی میں نمایاں تھے (حرفوں کا دبنا، برائے بیت الفاظ اور فقرے، تخلیقی معنویت سے خالی الفاظ کی تکرار، قواعد اور بیان کی غلطیاں، عروضی ڈگمگاہٹیں) امیج میں بھی اسی کثرت اور شدت سے جلوہ گر ہیں۔ اغلاط اور بے ڈول پن کے نمونوں کی اس کثرت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ بشیر بدر نے زبان کے منھ زور گھوڑے کو اتنا سدھا لیا ہے کہ وہ ان کے اشارے پر کسی بھی قسم کا کرتب دکھا سکتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے ؎

سکتے آب میں کس کی صدا ہے — کوئی دریا کی تہ میں رو رہا ہے

سکتے آب کے بھونڈے پن سے قطع نظر، مصرع اولیٰ غیر ضروری ہے، پہلے مصرع میں استفہامی کیفیت کی توسیع کرتا ہوا کوئی استفہام دوسرے مصرعے میں بھی ہوتا تو بات بن سکتی تھی۔ اس وقت شعر دو لخت ہے۔

> سویرے میری ان آنکھوں نے دیکھا
> خدا چاروں طرف بکھرا پڑا ہے

"ان" غیر ضروری ہے۔

> اندھیری رات کا تنہا مسافر
> مری پلکوں پہ اب سہما ہوا ہے

"سہما ہوا" کا یہ استعمال نامناسب ہے۔ "اب" غیر ضروری ہے۔

> عجیب شہر ہے یہ اس کے آسمان پہ بھی
> لہو میں ڈوبے ہوئے سرخ سرخ کپڑے ہیں

مصرع اولیٰ میں "یہ" غیر ضروری ہے۔ مصرع ثانی سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر سرخ سرخ کپڑے ہیں۔ بادل کے ساتھ تو آسمان کا لفظ "پر" کا حرف جار قبول کر لیتا ہے، لیکن کپڑے کے ساتھ کسی اور فعل (مثلاً اُڑ رہے ہیں، ٹنگے ہیں وغیرہ) کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

عرق نچوڑنے والی مشین پیاسی ہے
ابھی ہمارے بدن سبز کچے کچے ہیں

"کچے" کی تکرار غیر ضروری ہے۔ لیکن اس قسم کی تکرار بشیر بدر کو بہت پیاری ہے۔ پچھلے شعر میں سرخ سرخ کپڑے آپ دیکھ چکے ہیں۔ اب یہ شعر دیکھئے ؎

گیلے گیلے مندروں میں بال کھولے دیویاں
سوچتی ہیں ان کے سورج دیوتا کب آئیں گے

خوش بو کو تتلیوں کے پروں میں چھپاؤں گا
پھر نیلے نیلے بادلوں میں لوٹ جاؤں گا

دیوانہ وار مجھ سے لپٹ جائے گی ہوا
میں سرخ سرخ پھولوں میں جب مسکراؤں گا

سونے کے پھول پتے گریں گے زمیں پر
میں زرد زرد شاخوں پہ جب گنگناؤں گا

جامنوں کے باغ پر چھائی گھٹا
اودی اودی لڑکیاں ہنسنے لگیں

میں یہ سمجھا کر لوٹ آئے تم
دھوپ کل اتنی اجلی اجلی تھی

ہم کو دعائیں دیتے تھے باہم یوں ہی لو
شاخوں پہ اجلے اجلے فرشتے کھلے ہوئے

سالے بدن کا تناؤ فضا میں!
کسے کسے کپڑوں میں پھنسی پھنسی شام
کھڑے کھڑے سوکھ گئے پانی کے برتن
سویا ہوا انل دیکھو کب کنمنائے

سارا کلام ایسی تکراروں سے بھرا پڑا ہے۔ بعض بے محل ہیں بعض برمحل۔ لیکن تکرار سے اس شغف کی فنی توجیہہ یہی ہو سکتی ہے کہ شاعر PADDING کر رہا ہے۔ اور نفسیاتی توجیہہ یہ کہ شاعر کا ذہنی رویہ بچوں سے بہت قریب ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ تکرار الفاظ بچوں کا، جو قدرت اظہار کم رکھتے ہیں، مخصوص ذریعۂ اظہار ہے۔

اب ایک اور طرح کی تکرار دیکھئے:

حقیقت سرخ مچھلی جانتی ہے
سمندر کتنا بوڑھا دیوتا ہے

دہکتی دھوپ سمندر ہے یہ جزیرے ہیں
گھنے درخت جو سڑکوں پہ سایہ کرتے ہیں

کہانیوں کی کئی باتیں سچ ہوئیں۔ جیسے
سنہرے شہر سمندر میں بہتے رہتے ہیں

سبز پتے دھوپ کی یہ آگ جب پی جائیں گے
اجلے فر کے کوٹ پہنے ہلکے جاڑے آئیں گے

سرخ نیلے چاند تارے دوڑتے ہیں برف پر
کل ہماری طرح یہ بھی دھند میں کھو جائیں گے

دھل جائیں گی بدن پر دھوپ کی تہیں
اپنے لہو میں آج میں ایسا نہاؤں گا

اس دن بجائے اوس کے ٹپکے گا سرخ خون
تلوار لے کے جب میں خلاؤں میں جاؤں گا

اڑتی کرنوں کی رفتار سے تیز نیلے بادل کے اک گاؤں میں جائیں گے
دھوپ ماتھے پہ اپنے سجا لائیں گے سائے پلکوں کے پیچھے چھپا لائیں گے
برف پر تیرتے روشنی کے بدن چلتی گھڑیوں کی دو سوئیوں کی طرح
دائرے میں سدا گھومنے کے لئے آہنی محوروں میں جڑے جائیں گے
مختلف پیچ میں اک کسی شخصیت کی یاد کا پھول بن کر بکھر جائے گی
دھوپ کے جھلملاتے ہوئے ہاتھ جب نیم کے پھول سڑکوں پہ برسائیں گے
میرے بچپن کے مندر کی وہ مورتی دھوپ کے آسماں پر کھڑی تھی مگر
ایک دن جب مرا قد مکمل ہوا اس کا سارا بدن برف میں دھنس گیا
بید کے زرد مونڈھے پہ بیٹھی ہوئی شام نے آٹھ کے بتی جلائی نہیں
روشنی کا فرشتہ بڑی دیر تک دستکیں دے کے واپس چلا بھی گیا

جب ذرا شام ہوئی بے تکلف ہوئی برگزیدہ فرشتوں کے پر بج گئے
رات کا ٹیپ سورج بجا دے اگر موم کے پاک چہرے پگھل جائیں گے

آنگن میں ننھے ننھے فرشتے لڑیں گے جب
بھوری شفیق آنکھوں میں میں مسکراؤں گا
وہ جاگے خوشبوؤں کا بدن چوم آئیں گے
رنگوں کے وہ فرشتے ہوا میں اڑاؤں گا

وہ کوئی اور تھا شب خون مارنے والا
ہمیں نہ مارو کہ ہم بے ضرر فرشتے ہیں

ان گنت کالے کالے پرندوں کے پر ٹوٹ کر زرد پانی کو ڈھکنے لگے
فاختہ دھوپ کے پل پہ بیٹھی رہی رات کا ہاتھ چپ چاپ بڑھتا رہا

بند پلکوں پہ جو پھول رکھ کر کہے آؤ ہم برف کی چوٹیوں پر چلیں
سبز قالین پر دھوپ لیٹی ہوئی سوچتی ہے نہ جانے وہ کب آئے گا

معتدل کر دیتی ہیں سرد موسم کا مزاج
برف کے ٹیلوں پہ چڑھتی دھوپ جیسی عورتیں
سبز نارنجی سنہری کھٹی میٹھی لڑکیاں
بھاری جسموں والی ٹپکے آم جیسی عورتیں
سڑکوں بازاروں مکانوں دفتروں میں رات دن
لال پیلی سبز نیلی جلتی بجھتی عورتیں

لان میں طیارے پر اڑنے لگے
سرخ نیلی گاڑیاں چلنے لگیں

لہروں نے گھیر رکھا تھا سارے مکان کو
مچھلی کدھر سے کمرے کے اندر چلی گئی

تھرکتی مچھلی نکل کر سرکتے کپڑوں سے
تمام رات کو اب بے لباس کر دے گی

پتھر جیسے مچھلی کے کولھے چمکے
گنگا جل میں آگ لگا کر چلے گئے

ریت میں آگ دفن ہے شاید
منجمد مچھلیاں پگھلنے لگیں

شعلوں کے کپڑے مچھلی نے پھینک دیئے
سرخ شیشے میں زہر کا جسم دہکتا ہے

ایک کرتے کے بائیں کاندھے پر
پیار کی سرخ تتلی بیٹھی تھی
رنگ سارے انگیٹھیوں میں گئے
دھوپ میں الگنی اکیلی تھی

تیر رہی ہے آگ مچھلی کے سینے میں
تم سمجھے تھے شاید برف کی برنی ہے

کس روشنی کے شہر سے گذرے ہیں تیز رو
نیلے سمندروں پہ سنہرا غبار ہے

اگر بارشیں آ گئیں راہ میں
سمندر کی تہ میں اتر جاؤں گا

سمندروں پہ لہو نے کہانیاں لکھ دیں
تم ان کے برف کے اوراق میں دبا دو گے

سنہری مچھلیاں یا دل میں کوندجاتی ہیں
بدن وہی ہے جو بندش میں بھی قبا سے لڑے

ہم کو دعائیں دیتے تھے باہم یوں ہی ملو
شاخوں پہ اُجلے اُجلے فرشتے کھلے ہوئے

زرد گُتے کی سُرخ جیبھ کبھی
سرمئی رات کی تھکن چاٹے

مجھے خوف ہے کہ تکرار الفاظ کی ایسی مثالیں نقل کرنے کی کوشش مجھ سے بشیر بدر کا سارا دیوان نقل کرادے گی۔ یہ بات اب واضح ہوگئی ہوگی کہ بشیر بدر کے اشعار میں، جو ایک خوش گوار اجنبیت کی فضا ملتی ہے وہ چند الفاظ (مثلاً سمندر، برف دھوپ، مچھلی، سُرخ، زرد، سنہرا، نیلا، فرشتہ وغیرہ) کی مرہونِ منت ہے --- جب کسی معنوی یا استعاراتی یا علامتی توسیع کے بغیر محض ان الفاظ کی بوچھار ہم پر پڑتی ہے تو تھوڑی ہی دیر میں خوش گوار استعجاب کی جگہ گھبراہٹ اور اکتاہٹ کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ ہر قدم پر خوف لاحق رہتا ہے کہ پھر کسی سرخ مچھلی یا دھوپ جیسی لڑکی یا برف جیسی عورت یا سُرخ زرد، نیلے، سنہرے بادل، پتے، پھول یا معصوم فرشتے سے پالا پڑے گا۔

وزیر آغا پر تنقید کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ ان کی اکثر نظمیں کچھ مخصوص الفاظ سے شروع ہوتی ہیں۔ ان الفاظ کے ذریعہ ایک فضا تو خلق ہوتی ہے، لیکن تمام نظموں پر ایک ہی نظم کا گمان ہوتا ہے۔ اس کو تخلیقی قوت کی کمزوری ہی کہا جائے گا۔ ہاں اگر ان الفاظ کے ذریعہ کوئی وسیع تر علامتی نظام خلق ہوسکے تو بات اور ہے۔ غزل کا معاملہ اور بھی مشکل ہے۔ نظم میں تو اولین مصرعوں کی کیفیت یا فضا کی تکرار یا تفصیلی توسیع کے ذریعہ ایک ڈرامائی ہیئت خلق ہوسکتی ہے۔ لیکن غزل کا ہر شعر فل اسٹاپ پر ختم ہوتا ہے، لہٰذا چند مخصوص الفاظ یا مخصوص قسم کے الفاظ کا مسلسل استعمال اسی وقت قابلِ قبول ہوسکتا ہے جب خود ہر شعر کسی علامتی منظر کا حامل ہو اور جن الفاظ کو علامت کے طور پر برتا جارہا ہے ان کی نئی سے نئی جہتیں ہمہ وقت پھوٹتی رہیں۔ بشیر بدر کے یہاں سپاٹ تکرار کا جو عمل اکائی میں نظر آتا ہے، اس کی انتہا امیج میں ملتی ہے۔

اسی طرح اور بھی عیوب شعری ہیں۔ لیکن ان سب کا تفصیلی یا محض مثالاً بھی تذکرہ محض تطویل کا باعث ہوگا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ فنی اور تخیلی دسترس کے اعتبار سے 'اکائی' کے بشیر بدر، 'امیج' کے بشیر بدر سے بہت مختلف نظر نہیں آتے۔ رہا سوال شعری تجربے میں نئی حیثیتوں یا خارجی یا داخلی دنیا کے احساس و علم میں نئی گہرائیوں کا، تو اکائی کے بشیر بدر میں رومانی عشقیت (جس کا سلسلہ مجاز سے ہوتا ہوا اختر شیرانی تک پہنچتا ہے) نمایاں تھی۔ امیج کے بشیر بدر بھی رومانی عشقیہ شاعر ہیں لیکن اس روایتی، نم افسردہ، رومانی ہیرو کی یاد میں دل خون کرنے والی معصوم حسینہ کے توسط سے رومانی ہیرو کی تمجید اور توصیف کرنے والی شاعری میں ایک ایسی ہوسناکی کا عنصر شامل ہوگیا ہے جسے نظیر اکبرآبادی یا میر کی بے لاگ، بے جھجک اور LIBIDINOUS جنسیت سے مشابہ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اس میں اس قسم کی نفسیاتی بے چارگی کا عمل دخل نظر آتا ہے جو بند مذہبی تعلیم گاہوں میں پڑھنے والے نوجوان لڑکوں کے جاگتے سوتے خوابوں میں ہوتا ہے۔ ظفر اقبال نے زیادہ تر اینٹی غزل میں، (اور کبھی کبھی باقاعدہ غزل میں) جنسی عمل سے اپنے شغف، نفسیاتی نامردی اور جنسی عمل یا اس کے اختتام پر نفسیاتی ردعمل کی پیدا کردہ گھن کا انتہائی پیچیدہ اظہار کیا ہے۔ ظفر اقبال کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اکثر ان تمام کیفیات کو بہ یک وقت بیان کرتے ہیں

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ ان کے یہاں اس لڑکے کا نوبالغانہ جھوٹا شرمیلا پن نہیں ہے جو ننگی تصویروں والے رسالوں کو آنکھ بچاکر پڑھتا ہے۔ لیکن اپنے ہم جماعتوں کے کھلے جنسی اظہارات پر ان کو لعن طعن کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جنسی تجربات جدید ذہن کے مکمل عکاس ہیں۔ بشیر بدر کے یہاں ہوس ناکانہ منظر کے پیچھے وہ نفسیاتی کیفیت نظر آتی ہے جو عصمت چغتائی کے بعض نسائی کرداروں کا خاصہ ہے ؎

مرد اس سمت دیکھتے رہی نہیں
گانے جب گائے کا بدن چاٹے
آئینہ خانے میں اکیلا سانپ
جھوم جھوم آج اپنا پھن چاٹے

اگر مجھ کو کرنوں کے نیزے لگے
میں کتے کو کچا چبا جاؤں گا

پتھر جیسے مچھلی کے کوٹے چمکے
گنگا جل میں آگ لگا کر چلے گئے

مری نگاہ مخاطب سے بات کرتے ہوئے
تمام جسم کے کپڑے اُتار لیتی ہے

نیلا سفید کوٹ زمیں پر بچھا دیا
پھر مجھ کو آسمان پہ لے کر چلی گئی

شروع کے تین شعروں کی بد مذاقی پر اظہار خیال میں نہ کروں گا آخری تین شعروں کے مقابلے میں ظفر اقبال کے یہ تین شعر رکھئے تو رویے کا فرق صاف کھل جاتا ہے ؎

بدن پہ سبز گہری سبز جرسی
عقب میں گندمی گہرا ہلاوا

کام آئے بڑے میاں ہی وہاں
اس کو لڑکے نہ کر سکے چالو

مزے کی مٹھی میں قید سی ہے وہ خوشہ چیں نرم گرم لڑکی
سڑک کے دونوں طرف کٹی ہوئی فصل میں دودھ پیاس کا ہے

بشیر بدر سخت سڈول، ننگے کولھوں کو دور ہی سے دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ ظفر اقبال کی منی اسکرٹ پوش لونڈیا کے کولھے انھیں پیغام تسخیر دیتے ہیں۔ گندمی گہرا ہلاوا کا ـــــــ استعارہ خود بھی پتھر جیسے کولھوں کے سادہ بیان کے مقابلے میں کس قدر پیچیدہ اور جنسیت آمیز ہے۔ دوسرے شعر میں بشیر بدر ایک ایسی کیفیت خلق کرتے ہیں جو جنسی حیثیت سے مجہول بوڑھوں یا پس ماندہ نوجوانوں میں عام ہے۔ ظفر اقبال کے شعر میں وہی بڑے میاں مجہول ہونے کے بجائے اپنے بہتر اور وسیع تر تجربے کی بنا پر نگاہوں سے کپڑے اُتارنے کی جگہ میدان عمل میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ تیسرے شعر میں بشیر بدر نے طالب علمانہ قسم کا تجربہ بیان کیا ہے جس میں منظر نامہ مفقود ہے اور نہ ہی تجربے کی وہ وسعت ہے جو استعارے کے ذریعہ اور تخلیقی تجربے کی قوت کی بنا پر ظواہر کو بھی اسی کیفیت میں رنگ دیتی ہے۔ بشیر بدر کے شعر میں جنسی عمل یک رنگا اور اکہرا ہے۔ ظفر اقبال نے کٹی ہوئی فصل کی سوندھی خوش بو کو نوجوان جسم کی مہک اور کٹے ہوئے پودوں کی ڈنٹھل کی بھاری لیکن میٹھی مہک اور ان کے سوندھے عرق کو جنسی تحرک اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سرگرانی سے استعارہ کر کے ایک بالغ شعری دنیا خلق کی ہے جو بشیر بدر کی دست رس سے باہر ہے۔ تینوں شعروں میں ظفر اقبال، بشیر بدر سے بہت بہتر ٹھہرتے ہیں۔

نور و مانیت اور مجاز کی طرح معشوق کی

تعریف کے پیچھے اپنی توصیف کے پہلوؤں سے صرف نظر کیجئے تو بشیر بدر کی عشقیہ شاعری میں ایسے لمحے نظر آتے ہیں جو کسی عشقیہ شاعر کے لئے مایۂ امتیاز ہو سکتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ان لمحوں میں بھی بنیادی طور پر وہ عورت کی اداسی یا ناری کا ذکر کرتے ہیں۔ اس طرح یہاں بھی یہ تصور مضمر رہتا ہے کہ خود شاعر ہیرو اگر چاہے تو ان اداس لڑکیوں کی نیم تاریک کوٹھریوں میں اجالا کر سکتا ہے۔ یہ تصور سچی عشقیہ شاعری کے منافی ہے، اس لئے جہاں جہاں یہ ذرا واضح ہو گیا ہے بشیر بدر کے شعروں کو پڑھ کر وہی کیفیت حاصل ہوتی ہے جو نرم کھانا کھاتے وقت دانتوں کے بیچ اچانک پتھر کی روڑی یا سخت ہڈی کی کرچ آ جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جہاں جہاں یہ احساس عورت کی نارسی کے خالص احساس کے نیچے دور تک دور تک دب گیا ہے، واقعی اعلیٰ درجے کی عشقیہ شاعری خلق ہوئی ہے۔ ؎

لان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے
جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بلائے گی واپس چلا جائے گا

ان گنت کالے کالے پرندوں کے پر ٹوٹ کر زرد پانی کو ڈھکنے لگے
فاختہ دھوپ کے پل پہ بیٹھی رہی رات کا ہاتھ چپ چاپ بڑھتا رہا

سرمستی کنگھی چوٹی بھول ہے
سوکھے پتوں پر جو مینا بیٹھی ہے
اس کی طرف چلا تھا کہ رستے میں بار بار
شیشے میں ٹوٹی گڑیا کے ٹکڑے پڑے ملے

سنا ہے اس پہ چہکنے لگے پرندے بھی
وہ ایک پودا جو ہم نے کبھی لگایا تھا

یہ اشعار کاملاً بے عیب نہیں ہیں۔ لیکن ان کی مجموعی خوبی رتی عیوب پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اب کچھ بالکل بے عیب اور انتہائی کامیاب شعر دیکھئے ؎

کبھی جو دوسری جھیلوں کی سمت پیاس بڑھی
ہمارے سینے میں کوئی پرندہ چیخ پڑا

کہاں تک یہ دیا بیمار کمرے کی فضا بدلے
کبھی تم ایک مٹھی دھوپ ان طاقوں میں بکھرانا

یہ خشک شاخ نہ سرسبز ہو سکی، اس نے
مجھے گلے سے لگایا، پلک سے چوما بھی

لیکن ان سب سے بڑھ کر جو عنصر 'ایج' کو 'اکائی' سے الگ کرتا ہے وہ خارجی دنیا اور ظواہر کی لاتعلقی کا شدید احساس ہے جو بعض بعض شعروں میں المیہ کا رنگ اختیار کر گیا ہے۔ افسوس ہے کہ سرخ جھیلوں اور برف اور دھوپ جیسی لڑکیوں کی بھیڑ بھاڑ میں ظواہر کے یہ شدید تجربے اس طرح چھپ گئے ہیں کہ بادی النظر میں معدوم نظر آتے ہیں ؎

انھیں تو حفظ تھے سب اپنے لوگ نام بہ نام
ہمیں کو یاد نہ آیا کسی کا چہرہ بھی

وہ کوئی اور تھا شب خون مارنے والا
ہمیں نہ مارو کہ ہم بے ضرر فرشتے ہیں

پروں کے نیچے درندوں کے نام کس نے لکھے
ہمیں یقین ہے یہ سب ہمارے چہرے ہیں

تمام تاروں کو چھوتا ہوا گذر جاؤں
کمان بن کے مجھے تیر سا رواں کر دے

چٹک گئے مرے تلوؤں سے پھول شیشے کے
زمانہ کھینچ رہا تھا برہنہ پا مجھ کو
وہ شہسوار بڑا رحم دل تھا میرے لئے
بڑھا کے نیزہ زمیں سے اٹھایا مجھ کو

تین سمندر دو صحرا اس کے آگے
ناگن جیسے ایک لکیر چمکتی ہے

انھیں اشعار کو پڑھ کر یقین ہوتا ہے کہ بشیر بدر سچے، اچھے اور اہم شاعر ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ مآل کار انھیں اچھی شاعری اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یا وہ نیم پخت MANNERISM جو انھوں نے شاعری سمجھ کر اختیار کر رکھی ہے۔

--

لاریب

ریڈیائی تبصرہ

ڈاکٹر محمد مثنیٰ

اُردو شاعری میں غزل کی ایک قدیم اور عظیم روایت رہی ہے ۔ میر اور غالب سے فراق اور فیض تک خوبصورت تہ دار اور پُر وقار آوازوں کا ایک سلسلہ ہے جن کی موجودگی میں کسی نئے غزل گو کے لئے اپنی آواز کی انفرادیت کو نمایاں کرنا آسان نہیں ۔ جن شاعروں کے یہاں تجربہ میں سچائی ، انفرادیت اور خلوص کی کمی ہے اُن کے لئے یہ عظیم روایت پیروں کی بیڑی بن گئی ہے مگر یہی روایت ان فن کاروں کے لئے ایک زبردست تخلیقی تحریک ثابت ہوئی جن کے فن کی اساس ذاتی تجربہ اور احساس کی شدت پر ہے ۔ غلام مرتضیٰ راہی کا تعلق شاعروں کے اس گروہ سے ہے جن کی غزلوں میں اس کے سینہ کی آگ اور دل کا گداز نئے عرفان و آگہی کے ساتھ محسوس ہوتا ہے ۔ غزل میں لفظوں اور علامتوں کا میکانکی استعمال شروع ہی سے نہایت کثرت سے ملتا ہے مگر چند برسوں سے یہ نے بہت تیز ہوگئی ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جدید غزل کا ایک بڑا حصہ بے روح ، کھوکھلا اور سطحی ہوکر رہ گیا ہے ۔ مخصوص اور گھسے پٹے الفاظ اور علائم نہایت غیر تخلیقی انداز میں بار بار ملتے ہیں ، جن میں معنویت کا دور دور پتہ نہیں ۔ راہی نے اپنے دامن کو اس مصنوعی پن اور بے معنویت سے محفوظ رکھا ہے ۔ فیشن زدگی کے اس طوفان میں اپنے قدم مضبوطی سے جمائے رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ؎

چیونٹیوں کی طرح اُٹھے بادل — پتھروں کی طرح گرا پانی
اک ذرا ڈھیل دی کناروں نے — پھر دبائے نہیں دبا پانی
پیالہ صبر کا بھر جائے گا کبھی نہ کبھی — سمندروں میں اُتر جائے گا کبھی نہ کبھی
کون ہوگا تری زد پر روشن — دیکھ اے موجِ ہوا ، میرا کیا

ان اشعار میں غزل کی روایتی نفسیات اور رعنائی کے بجائے لب و لہجہ کا تیکھا پن ، کس بل اور تازگی ملتی ہے ۔ انھیں پڑھتے وقت مرزا یاس یگانہ کا نام ذہن میں آجاتا ہے ۔ جس میں بلند آہنگی اور مردانگی نے یگانہ کو لکھنو اور علی گڑھ میں غیر مقبول بنایا ، وہی وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جدید غزل کا طرۂ امتیاز بن گئی ۔ خارجی حقائق کے ردعمل سے پیدا شدہ موضوعیت اور داخلیت کتنی تند و تیز ، طرار اور انانیت سے بھرپور ہوسکتی ہے ۔ اس کا اندازہ راہی کی غزلوں سے ہوسکتا ہے ۔ ؎

سر پہ سورج کو اُٹھائے رکھا — اور ذرّوں کو ہوا دی میں نے
خلاف سمتوں پہ چل کر بہم ہوئے آخر — زمین گول تھی کیا کرتے راستے آخر
اس کا احسان نہ رکھا ہم نے — سجدۂ شکر ادا کر آئے

ہم لوگ پی کے بیٹھ گئے ایک سانس میں ۔۔۔ کوزے میں اب کسی کے سمندر نہیں رہا
دیکھ پتھر کا کلیجہ میرا ۔۔۔ یہ چمک تھی کہاں خنجر پہ ترے

راہی کی غزلیں نئے امکانات کا پتہ دیتی ہیں۔ ان میں ذات کا عرفان کشمکشِ حیات کے شعور کا مرہونِ منت ہے۔ اسی لئے ان میں قوتِ حیات اور ستیزہ کاری کے تیور ملتے ہیں۔ یہ غزل گوئی، اکتساب و انحراف کی منزلوں سے گذر کر اس مقام تک پہنچی ہے۔ اس میں اردو غزل کی روایت کے صحت مند عناصر اور تہذیب جدید کے بطن سے جنم لیتے ہوئے مسائل کے شعور اور آگہی کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

راہی کے اشعار صرف احساس کو نہیں چھوتے، فکر و تامل کی رگوں کو بھی چھیڑتے ہیں۔ "لامکاں" سے "لاریب" تک کا سفر طویل نہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ راہی نے اپنی اصل آواز کو پہچان لیا ہے۔ اس کی انفرادیت نمایاں ہو چکی ہے جدید غزل کے اس نمائندہ مجموعہ میں پرانے رموز و علائم میں نئی معنویت کے ساتھ نئے رموز و علائم اور جدید طرزِ اظہار کا استعمال نہایت سلیقے کے ساتھ ملتا ہے۔ صوری اعتبار سے بھی یہ مجموعہ اطمینان بخش ہے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ) --

P.T. Regd. No. 155
PHONE NO. OFF. 662 RES. 53
THE Aahang Urdu Monthly
Editor: KALAM HAIDRI
BAIRAGI, GAYA.
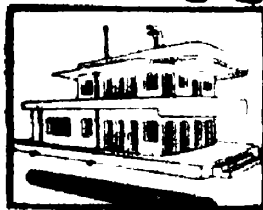
Bairagi, Gaya

: 443

Hind Litho Press GAYA

جولائی ۱۹۷۴ء

شمارہ ۴۹

دفتر کا پتہ:
ماہنامہ آہنگ، بیراگی، گیا

فون:
دفتر: ۶۶۲
رہائش: ۵۳

کتابت:
قمر نظامی

طباعت:
ہند لیتھو پریس میکلوڈ گنج، گیا

شرح خریداری

سال کے لئے	۱۵ روپے
دو سال کے لئے	۲۸ روپے
تین سال کے لئے	۴۰ روپے

فی شمارہ

ایک روپیہ پچیس پیسے

مرتبین

کلام حیدری، پرکاش فکری

محتویات

مزامیر

مضامین

افسانے

نظمیں

تبصرے

غزلیں

مزاحیہ

آہنگ وقت پر اور پابندی سے ہر ماہ شائع نہیں ہوتا ہے تو مجھے ذہنی اور قلبی تکلیف ہوتی ہے۔ آج سے پہلے جتنے دن بھی اس کی پابندی میں فرق آیا ہے مجھے صدمہ اٹھانا پڑا ہے مگر جب اس کی وجہ پر غور کرتا ہوں تو سوائے دفتری بدانتظامی کے اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اس لئے میں نے آہنگ اور مورچہ کے دفتری انتظامات کا مرکز ریڈ ہاؤس کی نچلی منزل کو بنانے کا فیصلہ کیا تاکہ میں روزانہ اس کے کاموں کی نگہداشت کر سکوں۔

۱۸ر اپریل کو رات میں اچانک مجھے دل میں درد محسوس ہوا — دوسرے دن بھی کئی بار درد ہوا۔ مختلف قسم کے طبّی معائنوں نے بتایا کہ انجائنا کا درد ہے، چنانچہ اپریل سے جون تک مکمل آرام اور علاج کا سلسلہ رہا۔ بہت سے کام پڑے رہ گئے۔ کچھ دوسری دقتیں بھی حائل ہوئیں مگر خدا کا شکر ہے جولائی سے آہنگ اور مورچہ کا دفتر ریڈ ہاؤس میں منتقل ہو گیا اور آہنگ کا اپنا ٹیلی فون (نمبر 432) بھی لگ گیا۔

جولائی اور اگست کا مشترک شمارہ شائع کرنے کے بعد ستمبر سے آہنگ ہر ماہ پابندی کے ساتھ قارئین کو ملے گا۔

مجھے خوشی ہے کہ اب اس ادارے سے حسن امام جیسے باذوق محنتی اور ضابطے کے ساتھ کام کرنے والے نوجوان منسلک ہو گئے ہیں۔

——— کلام حیدری

شمارہ ۴۹/۵۰

حسن نعیم

غزل

مرا ہم قدم ہو وہ گل اگر، کوئی اور راہِ فرار لوں
نہ پیامِ بادِ سحر سنوں، نہ سلامِ ابرِ بہار لوں

وہ ہزار شیشۂ درد تھا، وہ بلا سے خوابِ شکستہ ہے
کفِ دل میں اپنے کسی طرح اُسے ریزہ ریزہ اُتار لوں

وہاں کوئی پھول ہی کھل اٹھے، جہاں باغِ تازہ جمال تھا
مری جاں کو ضد ہے کہ ایک بار اُسے نام لے کے پکار لوں

مری آرزو کے تمام خط، ترے خطِ روح سے جب ملیں
ترے نقشِ دست سے لوں دعا، ترے نقشِ پا سے غبار لوں

وہی لحن ہے، وہی نغمگی، وہی سوز ہے، وہی روشنی!
مرا بس چلے تو حسن نعیم، اُسی نازِ فن سے شرار لوں

"نئے کلاسک" پر ایک تنقیدی تبصرہ

عبدالمغنی

(قسط ۱)

مرہٹواڑہ یونی ورسٹی، اورنگ آباد، دکن کے زیرِ اہتمام نئے افسانے اور نئی شاعری کا ایک انتخاب 'نئے کلاسک' کے عنوان سے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ کوشش اس اعتبار سے جراُت مندانہ اور لائقِ خیر مقدم ہے کہ پرانی درسیات میں جمع کی ہوئی چیزوں کو دُہرانے اور گروہ بند ناقدین کی سکہ بند فہرس میں نوازے جانے والے ادبا و شعرا تک محدود رہنے کے بجائے انتخاب کے مرتبین نے زیادہ وسعت کے ساتھ نئی صلاحیتوں کا سراغ لگایا ہے، جب کہ اس سلسلے میں انہوں نے قریبی روایات کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے۔ اس کے علاوہ انتخاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جدید ادب کو ایک مربوط ارتقائی تسلسل میں، مرتب اور منظم طریقے پر، پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ قارئین کے سامنے عہد بہ عہد اور نسل در نسل کے مراحل و میلانات آ جائیں اور انہیں ادب و تہذیب کے باہمی ارتباط کو سمجھنے کے لئے ایک تاریخی پس منظر مل جائے۔ اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہوئے 'نئے کلاسک' کے ایک مرتب بشر نواز نے بہت صحیح کہا ہے:

> "تبدیلیوں کی اپنی ایک منطق اور تاریخ ہوتی ہے۔ کوئی تبدیلی اس سے آزاد نہیں۔ ہر دَور کا ادب ماضی کے ادب سے مختلف ہوتے ہوئے بھی اس سے کسی نہ کسی طرح جڑا ہوا ہوتا ہے۔"

اسی تنقیدی احساس کے پیشِ نظر، افسانہ و شاعری پر مشتمل دونوں الگ الگ حصوں کو مختلف ابواب میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے: پسِ منظر، توازن، اجتہاد، اعتبار، اور ہر باب میں متعدد ادبا و شعرا کی چنی ہوئی تخلیقات درج کی گئی ہیں۔ جن کے متعلق بشر نواز کا خیال ہے:

> "ہر انتخاب کے وقت اس بات پر غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ منتخب کی جانے والی تخلیقات معیار کی دوہری ذمے داری سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ وہ ایک طرف تو اپنے دَور کے مزاج و مسائل کی آئینہ دار ہوں اور دوسری طرف اپنا ایک جمالیاتی اور فنی نظام و معیار قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہوں۔"

سوال یہ ہے کہ تخلیقات کے اپنے دور کے مزاج و مسائل کی آئینہ دار ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اس سوال کا کوئی قطعی جواب مرتبین کی طرف سے نہیں دیا گیا ہے، بس کچھ عمومی قسم کے تجزیے اور تبصرے ہیں جن کا اطلاق مختلف النوع تخلیقات پر کافی وسیع طریقے سے ہو سکتا ہے یہاں تک کہ کسی خاص تخلیق کے روحِ عصر کا ترجمان ہونے کا تعین بہت مشکل ہے۔ بہر حال، بشر نواز کے حسبِ ذیل بیان سے ایک اشارہ لیا جا سکتا ہے:

> "آج کے ادب میں ابہام کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل موجودہ دور کی پیچیدگی ادب میں ابہام کا سبب ہے۔ اگر آج یک سطحی باتیں سیدھے سادے انداز میں کر دی جائیں تو شاید زندگی اور ادب کا رشتہ ٹوٹ جائے۔ آج مصنوعی سادگی کو صرف آورد ہی کہا جا سکتا ہے۔ ابہام آج کی زندگی میں فطری بھی محسوس ہوتا ہے اور نئی معنویت کا اشارہ بھی۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ صرف یہی ہم عصریت کی پہچان نہیں۔ اگر آج کے ادب کی کوئی ایک

پہچان یا زیادہ مناسب لفظوں میں اہم اور مشترک خصوصیت دکھانی اشد ضروری ہی ہو تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج ادب میں زندگی کو قطعی ذاتی اور بڑی حد تک داخلی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔ "

اس بیان سے دریافت ہوتا ہے کہ مرتبِ انتخاب کے پیشِ نظر جو معیارِ رد و قبول ہے اس کے دو عناصر ترکیبی ہیں :

۱ ۔ ابہام ۲ ۔ ذاتی اور داخلی نقطۂ نظر

اس سے قطعِ نظر کہ مرتب نے ان دو نکتوں کو بھی بڑے تاملات و تحفظات کے ساتھ پیش کیا ہے ' خود " ابہام " اور " ذاتی و داخلی نقطۂ نظر " بجائے خود کوئی خاص اور امتیازی عناصر نہیں ہیں ، جن کی بنیاد پر نئے اور پرانے ادب کے درمیان ایک خط فاصل کھینچا جاسکے بلکہ فی الواقع یہ دونوں ہی عناصر ہر دور کے کامیاب ادب میں پائے جاتے رہے ہیں ، اس لئے کہ ذاتی اور داخلی نقطۂ نظر کے بغیر کوئی شخص صحیح اور پورے معنے میں ادیب اور شاعر نہیں ہو سکتا ۔ اور ادب کی لطافت ہر قابل ذکر تجربے کے اظہار میں ایک قسم کی ایمائیت کی متقاضی ہے جو کسی نہ کسی درجے کے ابہام کے بغیر ممکن نہیں ۔

بہر حال ' بشر نواز کے لکھے ہوئے " پیش آہنگ " کے مذکورہ بیانات میں تعیّن اور قطعیت کے فقدان کے باوجود " پس لفظ " میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ :

" نئے کلاسک کی ترتیب و تدوین کا اصل مقصد شاعری اور افسانہ جیسے اہم اصناف کے ذریعے اپنے عہد کے مخصوص ذہنی رویوں کی پیش کشی ہے ۔ اس کے لئے ہم نے انتخاب میں معروضی طریقۂ کار کو اپنایا ہے اور اسے انہی فن کاروں تک محدود رکھا جو ہمارے متعینہ کسوٹی سے قریب ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ کئی اہم معاصرین اس میں شامل نہ ہو سکے ۔ "

وہ " مخصوص ذہنی رویہ " جو معیارِ انتخاب بنایا گیا اور کیا ہے ' اس کی نشان دہی قبل کے ایک اقتباس میں کی جاچکی ہے ۔ جہاں تک " معروضی طریقۂ کار " کا تعلق ہے ، یہ دراصل ایک موضوعی قسم کی چیز ہے ، اس لئے کہ رد و قبول کرنے والے اشخاص بہر حال اپنے ذہنی تحفظات بلکہ تعصبات تک سے کام لیتے ہیں ، گرچہ ان کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ انہوں نے اصولی غیر جانب داری برتی ہے ۔ زیرِ نظر انتخاب بھی اس موضوعیت سے بری نہیں ۔

لہٰذا انتخاب کے لئے فیصلہ کن تنقیدی معیار ایک ہی ہو سکتا ہے ، جس کو بشر نواز نے :-

" اپنا ایک جمالیاتی اور فنی نظام و معیار قائم کرنے کی صلاحیت "

قرار دیا ہے ۔ یہ ایک بے لاگ اور کھرا معیار ہے جس کو کھلے طور پر کوئی بھی استعمال کر سکتا ہے اور پھر ہر شخص اس کو جانچ اور پرکھ کر اس کے مطابق تخلیقات کی صحیح قدر و قیمت معین کر سکتا ہے ۔ یہی ایک بے خطا اصولی اور معروضی معیار ہے ، جس میں اصلاً تعصبات اور تحفظات کی کوئی گنجائش نہیں ۔ چنانچہ کسی بھی معتبر انتخاب میں سب سے پہلے اسی معیار کی کارفرمائی تلاش کی جانی چاہئے اور جب وہ دریافت ہو جائے تب ہی دوسرے امور پر نظر ڈالنی چاہئے ۔

لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ جن حضرات نے یہ معیار پیش کیا ہے ان کا اپنا ذہن اس معاملے میں بالکل الجھا ہوا ہے ۔ بشر نواز کہتے ہیں :

" یہاں یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادب اچھا یا برا نہیں ہوتا ۔ کوئی تحریر ادب ہو گی یا ادب نہیں ہو گی اور جو ادب ہو وہ دوسرے ادب سے مختلف ہو سکتا ہے ، اچھا یا برا نہیں ۔ یہ اضافی اصطلاحیں ہیں جو بہت دور تک ساتھ نہیں دے سکتیں ۔ "

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادب و تنقید کی قدریں بالکل میکانکی اور تکنیکی ہیں اور ہیئت فن کے بے جان قواعد سے آگے ایک ادب پارے کے اوصاف اور اس کی قیمت و عظمت کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ اگر اس عجیب و غریب معیار کو مان لیا جائے تو پھر مختلف ادبی نمونوں کے درمیان تنقیدی موازنہ کرکے ان کے متناسب درجے متعین کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں پیدا ہوگی۔ اس وضاحت سے مترشح ہوتا ہے کہ انتخاب کے مرتبین ادب کے وصف کی بجائے صرف اس کی مقدار کا لحاظ کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط اور مغالطہ انگیز نقطۂ نظر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر کسی انتخاب کا بھی جواز نہیں رہ جائے گا۔ اور "جمالیاتی و فنی نظام و معیار" کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوگا۔ بہرحال، شاید مرتبین ... اس موقف کے تضاد انگیز مضمرات پر غور نہیں کیا۔

'نئے کلاسک' کے مرتبین کے نقطۂ نظر کے مذکورہ بالا تجزیے سے دو بنیادی امور کی وضاحت ہوتی ہے۔ اول یہ کہ ترتیب ایک خاص زاویۂ نگاہ سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوم یہ کہ مذکورہ زاویۂ نگاہ ہنوز متعین اور معتبر نہیں ہے۔ ایسا شاید اس لئے بھی ہو کہ نئی کہی جانے والی تخلیقات خود ہی ابھی تجرباتی ابہام اور ژولیدگی کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکی ہیں، لہٰذا ان کی تنقید کے عناصر بھی واضح اور قطعی صورت نہیں اختیار کر سکے ہیں۔ لیکن نئے افسانے اور نئی شاعری کی اس کیفیت کے باوجود مرتبین نے اپنی منتخب کی ہوئی تخلیقات کو نئے کلاسک کا عنوان دیا ہے۔ جس کا مطلب بداہتہً یہ ہوتا ہے کہ جن تجربوں کو پیش کیا جا رہا ہے انہوں نے اپنا ایک معیار اور روایت اسی طرح بنا لی ہے کہ تاریخ ادب میں ان کا درجہ متعین اور محفوظ ہو چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عنوان بندی صرف ایک دعویٰ اور جسارت ہے، جس کا ارتکاب قبل از وقت اور عجلت میں کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مرتبین اگر ذرا خاکساری اور تحمل سے کام لیتے تو ان کی بہم قدرے آسان ہو جاتی۔ مشک آن ست کہ خود ببوید، نہ آں کہ عطار بگوید۔ عنوان کے سبب انتخاب کے کسی بھی مبصر کی مجبوری یہ ہو جاتی ہے کہ وہ مندرج تخلیقات کو صرف تجربات سمجھ کر ان کی جزوی خوبیوں کا سراغ لگانے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے انھیں اس معیار پر پرکھنا اور اس کے مطابق ان کی قدر و قیمت متعین کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے جس کا دعویٰ عنوان میں کیا گیا ہے۔ جب ہمارے سامنے 'نئے کلاسک' رکھے گئے ہیں تو ہم صرف نئے کو کس طرح دیکھیں گے۔ ہمیں تو کلاسک کو بھی دیکھنا ہی ہوگا، اور کلاسک کا ایک معروف و مسلّم تصور ہے، جس کے عناصر مزعومہ تجربات نہیں بلکہ مسلّمہ روایات پر مبنی نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شائع شدہ ادب، ادب العالیہ نہیں ہوتا، ادب العالیہ کی فہرست ہر ادب کی تاریخ میں بجا طور سے محدود و مختصر ہوتی ہے، اور اس فہرست کی ترتیب میں صرف اوصاف کا لحاظ کیا جاتا ہے، مقدار کا نہیں۔ اس سلسلے میں فیصلہ کن تسلیم شدہ معروضی اصول ہوتے ہیں، نہ کہ ذاتی پسند و ناپسند اور گروہی تعصبات یا علاقائی تعلقات۔

ادب و تنقید کے مذکورہ بالا بنیادی نکات کی روشنی میں جب ہم 'نئے کلاسک' میں منتخب افسانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے 'پس منظر' کے تحت شامل کیے جانے والوں میں راجندر سنگھ بیدی (محقن)، قرۃ العین حیدر (پت جھڑ کی آواز)، کرشن چندر (آدھے گھنٹے کا خدا) اور سعادت حسن منٹو (کھول دو) سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان فن کاروں میں بیدی اور قرۃ العین بعض جہتوں سے مرتبین کے معیار انتخاب سے قریب ہیں اور ان کے اندر نئے افسانے کے اس مخصوص مزاج کی پیش روی کے عناصر پائے جاتے ہیں، جو مرتبین کا مطلوب ہے، اور اس طرح مذکورہ افسانہ نگاروں کی روایات کو نئے تجربوں کا پس منظر قرار دینے کی بات سمجھ میں آ سکتی ہے، گرچہ واقعہ یہ ہے کہ بالکل نئے تجربوں کا سیدھا رشتہ اگر ماضی قریب کے کسی افسانہ نگار سے مل سکتا ہے تو وہ صرف قرۃ العین ہیں، جبکہ بیدی درحقیقت

اپنی انفرادیت اور امتیازی شان کے باوجود، اپنے ہم عصروں اور ہم چشموں ـــــ کرشن چندر اور منٹو ـــــ ہی کے ہم مزاج ہیں۔ لیکن جب مرتبین نے بیدی کے ساتھ منٹو اور کرشن چندر کو بھی پس منظر میں شامل کیا ہے، حالاں کہ آخرالذکر دونوں بڑے ہٹیٹ افسانہ نگار ہیں اور انہوں نے اپنے تجربوں میں پریم چند وغیرہ کی قدیم تر روایات کو بھی پوری طرح سمو لیا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مرتبین نے اپنے نظریات کی شدت کو اپنی عملیات میں خود ہی ترک کر دیا ہے اور اس طرح عقل سلیم اور عملی حکمت کا ثبوت دیا ہے۔ اور اگر وہ عمل انتخاب میں اس وسعت نظر سے کام نہ لیتے تو ان کی کوششِ ترتیب ادھوری اور بھی ناقص ہو جاتی۔ یہ خوشی اور تعریف کی بات ہے کہ نئے کلاسک کی جستجو کرنے والے اپنے ادب کے پورے سرمائے کا تجسس ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر ہمارے فن کار اس تجسس کی داد اپنے عمل سے دے سکیں تو یہ نئے ادب کے لئے فالِ نیک ہوگا۔

بہرحال، پس منظر کے منتخب افسانوں میں جہاں بیدی اور قرۃ العین کے بہترین اور نمائندہ ترین افسانے چُنے گئے ہیں، وہاں منٹو اور کرشن چندر کے معمولی افسانوں کو جگہ دی گئی ہے۔ شاید مرتبین نے اس سلسلے میں اپنے مطلوب مزاج کو پیش نظر رکھا ہو، لیکن ابہام اور داخلیت کا معیارِ مطلوب بھی کرشن اور منٹو کے مذکورہ افسانوں میں موجود نہیں، خاص کر کرشن کا افسانہ تو بس ایک دل چسپ واقعے کا بیان ہے۔ دوسری بات یہ کہ 'پس منظر' میں افسانہ نگاروں کی ترجیحی ترتیب اگر قائم کی جائے تو حروف تہجی کے اعتبار سے کی ہوئی ترتیب صحیح نہیں، نہ تو بیدی ہمارے بہترین افسانہ نگار نمبر ایک ہیں اور نہ قرۃ العین نمبر دو۔ خواہ کوئی مخصوص رجحان اپنے پیش رو عناصر کی تلاش جس جگہ اور جس طرح بھی کرے، تنقیدی بصیرت سے کام لے کر ہر فن کار کی عمومی حیثیت کا لحاظ ضرور کیا جانا چاہئے اُردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کی دوسروں کے مقابلے میں فوقیت بہت واضح ہے۔ بیدی کا نمبر بہرحال مجموعی کارنامے کے لحاظ سے، ان دونوں کے بعد ہی آتا ہے اور قرۃ العین کا مقام ناول نگاری میں جو بھی ہو، افسانہ نگاری میں وہ کئی ایک اہل افسانہ نگاروں سے بھی پیچھے ہیں جن کو زیر نظر انتخاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ تیسری بات یہ کہ پس منظر میں جس قسم کا افسانہ نگاروں اور جس نوعیت کے افسانوں کو شریک کیا گیا ہے اس کے اعتبار سے کچھ اور اہم افسانہ نگار بھی ایسے تھے جنھیں انتخاب میں لازماً شامل کیا جانا چاہئے تھا اور ان کی عدم شمولیت ایک ایسی فرو گذاشت ہے جس کے سبب 'نئے کلاسک' کا 'پس منظر' بالکل ادھورا اور ناقص ہو کر رہ گیا ہے۔ ماضی قریب کی اُردو افسانہ نگاری کی روایات کا کوئی تذکرہ اور مجموعہ اختر اورینوی، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ان عظیم فن کاروں کو نظر انداز کر کے مرتبین نے اپنے ذہن کی نارسائی کا تشویش انگیز ثبوت دیا ہے، ادب میں اس قسم کی عصبیت سخت گمراہ کن ہے۔

افسانوں کے 'نئے کلاسک' کے پس منظر کے بعد خاص نئے افسانوں کو جن ابواب میں منقسم و مرتب کیا گیا ہے ان کے عنوانات یکے بعد دیگرے اس طرح ہیں، توازن، اجتہاد، اعتبار ـــــ سب سے مختصر باب 'اعتبار' کا ہے اور سب سے طویل اجتہاد کا، پہلے باب 'توازن' کا عنوان ناقابل فہم اور بے محل معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ عدم توازن کہاں ہے جس کے بعد کسی توازن کا سوال پیدا ہو؟ کیا روایات کا جو پس منظر دیا گیا ہے وہی عدم توازن کا شکار رہے؟ تب اس کو پس منظر کیسے کہا جا سکتا ہے؟

بہرحال، توازن کے تحت جو لوگ اور چیزیں شامل کی گئی ہیں ـــــ اقبال مجید (دو بھیگے ہوئے لوگ)، اقبال متین (آگہی کے ویرانے)، جیلانی بانو (اجنبی چہرے)، قاضی عبدالستار (پیتل کا گھنٹہ)، کلام حیدری (کس کی کہانی) ـــــ ان میں آخری کہانی عنوان باب کے ساتھ ہم آہنگ، اس میں جو تکنیک برتی گئی ہے وہ تیسرے باب 'اجتہاد' کے تحت آسکتی ہے،

کیونکہ یہ کہانی اپنے مصنف کلام حیدری کی نمائندہ کہانی نہیں ہے، اس لئے کہ ان کے عام انداز میں ہیئت کی وہ پیچیدگی نہیں جو مذکورہ کہانی میں پائی جاتی ہے، اس طرح مصنف تو توازن کا حامل ہے، لیکن تخلیق اجتہاد کی حامل ہے، یعنی افسانہ نگار کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور اس کی مناسب تخلیق نہیں دی گئی۔ دوسرے یہ کہ افسانہ نگاروں کی ترتیب اگر ترجیحی ہو، جیسا کہ تنقید میں سمجھا جاتا ہے، تو حروف تہجی کے لحاظ سے دی ہوئی ترتیب غلط ہے، اس لئے کہ اس صف میں سب سے اہم شخصیت قاضی عبدالستار ہے ادوار کا نام سر فہرست ہونا چاہئے تھا، جب کہ باب میں انھیں چوتھے نمبر پہ دیا گیا ہے، واضح ہو کہ بجائے خود مندرج تخلیق کے اعتبار سے بھی قاضی کا افسانہ اپنے دائرے میں بہترین ہے اور اس کو اولیں ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح جیلانی بانو کو تیسرے کے بجائے دوسرے نمبر پر دینا ہوگا اور کلام حیدری کو بھی آخر کے بجائے بہ وجوہ وسط میں رکھنا بہتر ہوگا۔ تیسرے یہ کہ اس باب میں بعض اور افسانہ نگاروں کو بھی شامل کیا جانا ضروری تھا۔ مثلاً واجدہ تبسم، اور یہ فروگذاشت اتنی نمایاں ہے کہ تخلیق کے حصول میں دشواری یا تاخیر کا عذر قابل قبول نہیں۔ بہرحال، جن لوگوں اور چیزوں کو بھی اس باب میں شامل کیا گیا ہے وہ سب اپنی اپنی جگہ، زیر انتخاب کے عملی معیار کے پیش نظر، مستحق اور شمولیت کے اہل ہیں۔ یہ وہ فن کار ہیں جن کی تخلیقات دوران مطالعہ کچھ مسرت اور کچھ مواد تفکر مہیا کرتی ہیں، ان کی چیزوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اُردو افسانے کا نیا دَور بالکل بنجر نہیں، گرچہ قاضی عبدالستار کے "پیتل کا گھنٹہ" کو چھوڑ کر باب کے دوسرے شرکا کی کچھ بہتر تخلیقات کا انتخاب بھی ممکن تھا۔ اس باب کی مندرجات کو پڑھ کر یہ احساس بہرحال ہوتا ہے کہ باستثنائے قاضی عبدالستار دوسرا کوئی فنکار ہنوز ایسا نظر نہیں آتا جس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہا جا سکے کہ وہ 'پس منظر' کے کمالات سے حاصل ہونے والے فنی توازن کو کم از کم برقرار ہی رکھ سکتا ہے، یعنی مجموعی طور پر موجود اردو افسانہ نگاروں کی دوسری نسل ہنوز اپنے عظیم پیش رووں کے قدم پر قدم نہیں مار سکی ہے اور ان سے آگے قدم بڑھانا تو بس ایک حسرت انگیز تمنا ہے۔

یہی بات اُردو افسانے کے 'نئے کلاسک' کے باب 'اجتہاد' کے بارے میں بھی صحیح ہے، بلکہ صحیح تر ہے، اس لئے کہ اجتہاد کے ذیل میں دیئے جانے والے وہ دو افسانہ نگار ــــ رام لعل ("اکھڑے ہوئے لوگ"، "حیرت زدہ لڑکا") اور غیاث احمد گدی ("نارومنی"، "اندھے پرندے کا سفر") ــــ جو واقعی صاحبِ کمال ہیں، درحقیقت 'توازن' کے باب سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات رام لعل کے تو پہلے افسانے سے ظاہر ہے، جب کہ دوسرا یوں ہی سا ہے، معلوم نہیں اس کو انتخاب میں شامل کرنا کیوں ضروری سمجھا گیا، حالاں کہ رام لعل کے بہتر افسانوں کی کوئی کمی نہیں ہے، لیکن غیاث احمد گدی کی غلط نمائندگی ان کی تخلیقات کے انتخاب میں کی گئی ہے۔ مندرج افسانوں سے بدرجہا بہتر، منفرد قسم کے افسانے گدی نے خاصی تعداد میں لکھے ہیں، ایسے افسانے جو گدی کو 'توازن' کے باب میں قاضی عبدالستار کے بعد، رام لعل کے ساتھ، دوسرا یا کم از کم تیسرا اہم افسانہ نگار ثابت کرتے ہیں۔ بہرحال، گدی کا منتخب افسانہ نمبر دو تو ان کے فن کے ایک کم تر عنصر کو پیش کرتا ہے، جب کہ پہلا افسانہ یوں ہی سا ہے اور اس کا انتخاب رام لعل کے دوسرے افسانے کی طرح ناقابل فہم ہے۔

غیاث احمد گدی اور رام لعل کے علاوہ باب اجتہاد میں شامل کئے جانے والے دوسرے افسانہ نگار یہ ہیں: انور عظیم (قصہ دو سری رات کا) جوگندر پال ('باہر کے بھیتر' اور 'ایک رت اور') رتن سنگھ ('آخری اُداس عمر' اور 'دکھ کی عمر') سریندر پرکاش ('دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم' اور 'رونے کی آواز') شرون کمار ورما ('ایک افسانہ') اور مین را ('آخری کمپوزیشن' اور 'وہ')۔ ان میں رتن سنگھ اپنے صرف ایک منتخب افسانے (دکھ کی عمر) سریندر پرکاش اپنے دونوں افسانوں، شرون کمار ورما اپنے واحد

کہانی، اور مین را، اپنے صرف ایک افسانہ (وہ) کی بنا پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں بھی صرف دو افسانہ نگار، سریندر پرکاش اور مین را ایسے معلوم ہوتے ہیں جن کے امکانات پر نظر رکھی جانی چاہئے، اس لئے کہ ان کی بنیادی صلاحیت سے ترقی کے کچھ اشارے ملتے ہیں، گرچہ ساتھ ہی ان کے فن کی نیم پختگی سے اندیشے بھی ہوتے ہیں۔ مین را کا 'آخری کمپوزیشن' تو محض مہمل ہے اور اگر وہ اس لغویت کے رخ پر چلے تو جوگندر پال کی طرح ایک نومرگ (STILL — BORN) فن کار ہوں گے، لیکن ان کا دوسرا افسانہ 'وہ' بہت کامیاب ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے فن کے اسرار و رموز کی آگاہی حاصل ہے اور وہ ایک درست و چست ہئیت تراشنے کے علاوہ ایک انسان کی ذہنی کیفیت کا پُراثر نقشہ بھی کھینچ سکتے ہیں۔ سریندر پرکاش کے دونوں افسانوں میں انسانی احوال و کوائف کے گہرے اور غیر معمولی احساس کا پتہ ملتا ہے، جس کو اگر فن کار مزید واضح کر سکا تو اس کی تخلیقات تجسس سرار کا ایک دلچسپ اور خیال انگیز مرقع ہوں گی، لیکن اگر اس نے ابہام اور رمزیت میں مزید اضافہ کر دیا تو اس کے افسانے انور عظیم کی چیزوں کی طرح بے معنی اور بے لطف بھول بھلیاں یا پہیلی بن کر رہ جائیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ انور عظیم کو تو اجتہاد کے باب میں شامل کیا ہی نہیں جانا چاہئے تھا، انھوں نے تو آج تک اپنے ترقی پسند ہم عصروں کی تقلید میں بھی کوئی کمال نہیں دکھایا، جب کہ اجتہاد کی کوئی صلاحیت ان کے اندر سرے سے مفقود ہے، ان کی افسانوی تحریروں کا کوئی فکری یا فنی مفہوم بالکل سمجھ میں نہیں آتا، یہاں تک کہ ان کو افسانہ کہنا ہی محلِ نظر ہے۔ جوگندر پال کے دونوں افسانے یکسر لغو ہیں، ان کو نفیِ افسانہ کی مہملات میں شامل کیا جانا چاہئے۔ تعجب ہے کہ ایسے افسانہ شکن کی دو کہانیاں کیوں دی گئیں، جب کہ اصولاً ایک کی بھی شمولیت ناروا ہوتی۔ دوسرے جن افسانہ نگاروں کی بھی دو کہانیاں دی گئی ہیں ان کا جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سے بہتر بلکہ ضروری تھا کہ زیرِ نظر باب میں مزید کچھ افسانہ نگاروں کو شریک کیا جاتا اور ایک ایک افسانے سے ان کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا جاتا۔ جس معیار اور انداز کے افسانہ نگاروں کو اس باب میں شامل کیا گیا ہے اسی انداز و معیار کے دوسرے افسانہ نگاروں کو نظر انداز کر دینا بہت ہی قابلِ اعتراض ہے۔

آخری باب 'اعتبار' ایک سعیِ فاضل ہے۔ اس باب کے دو افسانے ــــ شادکامی کا دوسرا لمحہ (احمد یوسف) اور 'قیادت' (ظفر اوگانوی) ـــ اجتہاد کے ذیل میں دئیے جانے چاہئیں تھے، اس لئے کہ دونوں کی تکنیک میں اشاریت کی اجتہادی شان جھلکتی ہے، گرچہ علامتی ابہام بھی ان میں نمایاں ہے لیکن دونوں میں ماجرا کی ترتیب چابک دستی کے ساتھ کی گئی ہے، جس کے سبب افسانویت کی ایک فسوں انگیز فضا پیدا ہو جاتی ہے اور قاری کا ذہن موضوع کے تجسس میں لگ جاتا ہے۔ ظفر اوگانوی کا افسانہ 'قیادت' ایک بڑے اہم موضوع کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں کی طرف فکر انگیز اشارہ کرتا ہے، اور اس کی ہئیت بھی بڑی تراشیدہ ہے، اسلوب سادہ و پُرکار ہے۔ احمد یوسف کا افسانہ 'شادکامی کا دوسرا لمحہ' ایک بھیانک اور پُراسرار فضا پیش کرتا ہے، جس کی تخلیق فنی طور پر چستی کے ساتھ کی گئی ہے اور بڑے ماہرانہ انداز میں قاری کے سامنے ایک صورتِ حال رکھ دی گئی ہے، اندازِ بیان رواں اور سبک ہے لیکن ان دونوں ہی افسانوں کے سلسلے میں ایک مشکل یہ ہے کہ فن کار کے اصل مفہوم و مقصد کا تعین تخلیق کے دروبست سے نہیں ہو پاتا اور قاری کو ایک ذہنی الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس کو کوشش کے بعد بھی قاری کے لئے تنہا، صرف ماجرا پر غور کر کے سلجھا لینا محال نظر آتا ہے، جب تک مصنف ذاتی طور پر اس کی مدد کر کے اپنے اصل مدعا کا انکشاف نہ کر دے۔ چناں چہ میں نے احمد یوسف سے رجوع کیا تو انہوں نے میری مشکل آسان کر دی اور ان کے صرف ایک بول نے افسانے کی اہمیت مجھ پر اس درجہ واضح کر دی کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ بنگلہ دیش کی جنگ اور مشرقی پاکستان کے خاتمے پر اس سے بہتر سیاسی تبصرہ ممکن نہیں، اس تبصرے کے پیشِ نظر کہانی کا عنوان بڑا ہی کاری طنز بن جاتا ہے۔ ظفر اوگانوی سے ہنوز یہ مدد

بھی نہیں مل سکتی ہے۔ لیکن افسانے کا پورا لطف لینے کے لئے ایک باذوق قاری کو افسانہ نگار کی مدد درکار ہو، یہ بات افسانہ نگار دونوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ پیش کرتی ہے اور فن کے لئے یہ ایک پریشان کن بات ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ تبصرہ احمد یوسف، ظفر اوگانوی وہاں کمانڈر کے دوسروں کو اس امر کی طرف متوجہ کرے گا کہ وہ اپنی فن کاری کے ایک پختہ تر مرحلے کی جانب پیش قدمی کریں اور اپنے فن کو زیادہ محکم و موثر بنانے کی کوشش کریں۔ افسانے کی تکنیک خواہ شعور کی رو ہو یا اشاریت، قاری کے سامنے نمودار ہونے والی تخلیق کو بہرحال افسانہ ہونا چاہیئے، نہ کہ شاعری یا انشائیہ۔

زیرِ نظر باب میں آمنہ ابوالحسن کا "خوشبو کی منزل" یا تو توازن میں ہونا چاہیئے تھا یا اجتہاد میں۔ واقعہ یہ ہے کہ نئے اردو افسانے میں ابھی تو اجتہاد ہی کا مرحلہ طے ہونا باقی ہے۔ کجا یہ کہ اعتبار کی منزل آئے۔ یوں افسانوں کی ترتیب میں جو ابواب قائم کئے گئے ہیں وہ سب کے سب، پسِ منظر کو چھوڑ کر، غیر منطقی اور غیر معقول ہیں، ان کے ذریعے اردو افسانے کے ارتقا کے مراحل واضح اور متعین نہیں ہوتے اس سے بہتر ہوتا کہ مرتبین پسِ منظر کے بعد نئے افسانہ نگاروں کو ان کے زمانے اور نسل کے اعتبار سے یکے بعد دیگرے ایک تسلسل کے ساتھ پیش کر دیتے۔ نوعیت و اہمیت کے لحاظ سے صف بندی جس تنقیدی بصیرت اور محنت نیز غیر جانب داری اور اصول پسندی کی متقاضی ہے وہ ظاہر ہے کہ نئے کلاسک کے مرتبین کو میسر نہیں ہے۔ لہٰذا انہیں عنوان کے بعد ترتیب میں بھی ادعائی انداز نہیں اختیار کرنا چاہیئے تھا۔

'نئے کلاسک' کے افسانوی حصے کی نمایاں ترین فروگذاشت شفق مظفر پوری کی عدم شمولیت ہے۔ شفق اردو کے وہ اہم افسانہ نگار ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ 'پسِ منظر' کی روایت کو سنبھالا ہے بلکہ اس کے 'توازن' کی راہ پر کچھ پیش قدمی کی ہے، فکر و فن دونوں اعتبار سے شفق کی تخلیقات 'نئے کلاسک' کا درجہ حاصل کرنے کی کامل اہلیت رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ موجود اردو افسانہ نگاروں کی دوسری نسل میں شفق مظفر پوری ہی کو پہلی جگہ ملنی چاہیئے، ماجرا کی ترتیب اور اسلوب بیان دونوں کے اعتبار سے شفق کی اردو افسانہ نگاری انہیں 'پسِ منظر' کے دیوقامتوں کے بہت قریب، اپنے دوسرے تمام ہم عصروں اور ہم چشموں سے قریب تر کر دیتی ہے۔ میرے دوسرے مجموعۂ مقالات، 'جادۂ اعتدال' میں شفق کے فن پر مبسوط تنقید کی گئی ہے۔

دوسری قابلِ ذکر فروگذاشتیں یہ ہیں: زکی انور، الیاس احمد گدی۔

میں نے نئے کلاسک کے افسانوی حصے پر اتنی مفصل اور قطعی انداز کی تنقید اس لئے کی ہے کہ معاملہ صرف ایک اچھے انتخاب کا نہیں بلکہ نئے افسانوں میں کلاسک کی تلاش و تعیین کا ہے، جس کا تعلق ادب اور تنقید ادب دونوں کے معیار و اصول سے ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ اتنے اہم اور نازک معاملے میں عام تبصروں کی رعایت اور نرمی کی گنجائش نہیں ہے، بلکہ ضرورت اسی کی ہے کہ اوصاف و حقائق کی صاف صاف اور ٹھیک ٹھیک پرکھ اور جانچ کی جائے تاکہ قارئین اور فنکاروں کے سامنے کوئی غلط مثال قائم نہ ہو، بلکہ ایک معیاری نمونہ رکھ دیا جائے۔ بہرحال، مرتبین کے حوصلے اور کوشش کی داد ضرور دی جانی چاہیئے۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اتنے وسیع پیمانے پر اور اس باضابطگی کے ساتھ نئی تخلیقات کا انتخاب کر کے انہوں نے سنجیدہ قارئین اور ناقدین دونوں کو نئے تجربوں کے مطالعے اور جائزے پر ابھارا ہے جس سے بالآخر ادب کو بہت فائدہ ہوگا اور توقع ہے کہ غور و فکر نیز اقدام و عمل کی نئی راہیں کھلیں گی اور بہتر سمتیں متعین ہوں گی۔ مستقبل میں آج کے اردو افسانے کا جو بھی تذکرہ اور مطالعہ ہوگا اس کے لئے 'نئے کلاسک' کا حوالہ ناگزیر ہوگا۔ کسی بھی کتب خانے میں جدید اردو ادب کی الماری اس کتاب کے بغیر شاید مکمل نہ ہوگی۔

یہی بات زیرِ نظر انتخاب کے شعری حصے کے متعلق بھی صحیح ہے، جس پر تنقیدی تبصرہ آئندہ سطور میں کیا جائے گا۔ — —

غزل

مظہر امام

لبوں پہ جشنِ تبسم بھی، آنکھ تر بھی ہے!
فریب کار ہے یہ غم، کہ معتبر بھی ہے

اُفق اُفق وہی بے منظری کا عالم ہے
میں خوش نظر ہی سہی، حاملِ نظر بھی ہے

جو اَب مڑے تو نگاہیں بھی نور کھو دیں گی
کہ اپنی پُشت پہ گردِ پسِ سفر بھی ہے

نہ رکھ ہر اک سے توقع کہ سر جھکا کے چلے
تری گلی ہی سہی، عام رہ گذر بھی ہے

خوشی سے آگ لگاؤ کہ اس محلے میں
مرا مکاں ہی نہیں ہے، تمہارا گھر بھی ہے

لہو کی شمع بچائے رہیں ہواؤں سے
شکستہ راہ بھی ہے، رات کا سفر بھی ہے

غزل

سلطان اختر

جو کچھ ہوا ہے اس سے سوا اور چاہئے
اپنے کئے کی ہم کو سزا اور چاہئے

پچھلی صعوبتوں سے بدن چور چور ہے
اب کے سفر میں راہ نما اور چاہئے

ہر چند شوخیوں میں وہ محتاط ہے مگر
تھوڑا سا پھر بھی رنگِ حیا اور چاہئے

میں بھی گھٹا گھٹا سا حصارِ ہوس میں ہوں
اس کے لئے بھی آب و ہوا اور چاہئے

اک لمحہ اپنے آپ پہ قابو نہیں مگر
کم ظرف زندگی کو نشہ اور چاہئے

چونکا تو سن کے وہ اثرِ خام ہی سہی
اب کے کچھ اہتمام صدا اور چاہئے

اختر ڈھلی نہیں ہے ابھی گمرہی کی دھوپ
یعنی دلوں میں خوفِ خدا اور چاہئے

اُردو شعرا پر حافظ کا اثر

سید نہال اختر

خواجہ حافظ نے یوں تو شکایت کی ہے کہ ؎

سخندانی وخوش خوانی نمی ورزند در شیراز — بیا حافظ کہ ماخود را بملک دیگر اندازیم

یا پھر یہ کہ ؎

ما آزمودہ ایم دریں شہر بخت خویش — باید برون کشید ازیں ورطہ رخت خویش

مگر درحقیقت مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ؎

زشعر حافظ شیراز می گویند و می رقصم — سیہ چشمان کشمیری و ترکانِ سمرقندی

حافظ کا شمار ایسے شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے شاذ و نادر ہی امرا اور رؤسا کی مدح کی ہے۔ اگر کسی کی مدح بھی کی ہے تو متانت اور عزت نفس کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور غلو اور چاپلوسی سے کام نہیں لیا ہے۔ کسی شعر میں ضرورت کا اظہار کر دیتے اور ادائے حسن طلب پر وظیفہ اور مدد دروازے پر پہنچ جاتی ؎

رسید مژدہ کہ آمد بہار و سبزہ دمید — وظیفہ گر برسد مصرفش گل است و نبید

بہار میگذرد مہرگسترا دریاب — کہ رفت موسم و حافظ ہنوز مے نہ چشید

بنگالہ سے غیاث الدین بن اسکندر نے شیراز کو تحائف کے ساتھ وفد بھیجا اور حافظ کو بنگالہ آنے کی دعوت دی۔ حافظ نے فرمائشی غزل بھیج دی، خود نہیں آئے۔ اُس غزل کے دو اشعار پیش خدمت ہیں ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دیں — خامش مشو کہ کار تو از نالہ می رود

دکن کے حکمراں محمود شاہ بن حسن نے بھی حافظ کو بلانا چاہا۔ انھوں نے آنے کی دعوت دیتے ہوئے زادِ راہ بھی روانہ کیا، مگر حافظ نہ آسکے۔ لیکن ایک غزل لکھ کر بھیج دی، جس کا مطلع ہے ؎

دمی با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد — بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

رضا زادہ شفق رقم طراز ہیں کہ سعدی کے برعکس حافظ نے لمبے لمبے سفر نہیں کئے۔ عمر بھر میں ایک مختصر سا تو انھوں نے بندر ہرمز تک اور ایک سفر یزد تک کیا تھا۔ باقی عمر وہ شیراز ہی میں مقیم رہے اور اِس شہر کی صفائی، حسن و زیبائی اور اِس شہر کے مقام گلگشت اور رود بائے رکنا باد کے ساحل سے ہمیشہ لطف اندوز ہوتے رہے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

نسیم باد مصلیٰ و آب رکن آباد — نمی دہند اجازت مرا بسیر سفر

اس کے باوجود حافظ کی مقبولیت اور شہرت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ حکمراں اور اہل دول طبقہ نے شرفِ قبولیت بخشا، عوام نے حافظ کو سر آنکھوں سے لگایا۔ لسان الغیب کا خطاب دیا اور دیوان حافظ سے تفاول کا کام لیا اور شاعروں نے حافظ کی شاعری کے چراغ اپنی شاعری کو ضیا بخشی۔

حافظ کے دو سو سال بعد ہندوستان کے ایک شیرازی شاعر عرفی کے دیوان پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو ایسے اشعار بکثرت جن پر حافظ کی چھاپ صاف طور پر نظر آئے گی۔ حافظ اور عرفی کے کچھ مماثل اشعار ملاحظہ ہوں۔ حافظ کہتے ہیں ؎

حافظ اگر قدم زنی در راہ خاندانِ عشق — بدرقۂ رہت شود ہمت شاہ نجف

عرفی کا شعر ہے ؎

عرفی اگر رہروی دوری منزل مبیں — رو کہ مددی کند ہمت شاہ نجف

مضمون بالکل ایک ہے، الفاظ کی ترکیب بھی ملتی جلتی ہے۔ البتہ حافظ کے یہاں بدرقۂ رہت زیادہ ہے۔

حافظ ؎ روز اول رفت دینم در سرِ زلفین تو — تا چہ خواہد شد درین سودا سرانجام ہنوز

عرفی ؎ آہم آتش گشت و خاکم شد بہ خاکستر بدل — اندریں رہ کس نمی داند سرانجام ہنوز

دونوں شعر کا دوسرا مصرعہ ہم معنی ہے، الفاظ بھی ملتے جلتے ہیں۔ پہلا مصرعہ حالت کی ابتری کے اعتبار سے قریب قریب ہے۔ البتہ عرفی کے یہاں پانی کا آگ ہونا اور مٹی کا گرد و غبار سے بدل جانا، کچھ زیادہ تاثر انگیز ہے۔

حافظ ؎ ساقیا یک جرعہ دہ زاں آب آتشگوں کہ من — درمیان پختگانِ عشق او را خام ہنوز

عرفی ؎ داغ دارم گرد یاس و طالب کام ہنوز — دو زنے در ہر بن مو دارم و خامم ہنوز

طالب کام ہونا اور پختگان عشق کے درمیان خامی کا احساس اور اس لئے آب آتش گوں کی طلبی، جذبۂ عشق کی ایک ہی شورش ہیں۔ عرفی کو بھی خامی کا احساس ہے اور حافظ کو بھی، اُن کے یہاں بھی شوق طلب ہے اور ان کے یہاں بھی۔ اور معنی میں قریب دونوں ہی برابر ہیں۔

حافظ سے اس طرح کسب فیض کرنے والے عرفی تھے، جن کی معنی آفرینی اور گرمیٔ سخن کا ایک عالم معترف ہے ا کی اَنا کا یہ عالم ہے کہ ؎

تا نجاست فلک را کہ ہمت عرفی — دمادم آب دہانش فگندہ بر رخسار
من کیستم؟ آں سالک کونین میسرم — کز بیختۂ جوہر قدس است خمیرم
نازش سعدی بہ ملک خاک شیراز ار چہ بود — گر نمی دانست باشد مولد و ملجائے من

ہندوستان کی سرکاری زبان عرصہ دراز تک فارسی رہی، اس لئے اردو کا رواج ہونے کے بعد بھی شرفا اور خو کی ادبی زبان فارسی ہی رہی۔ غالب جن کی شہرت بہت کچھ ان کے مختصر اُردو دیوان ہی پر ہے، اپنی اردو شاعری کو باعث سمجھتے تھے ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

سید سلیمان ندوی راوی ہیں کہ شبلی ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ جانے سے پہلے اردو میں خط و کتابت کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

اہل علم کی طرح وہ فارسی میں خط لکھتے تھے اور غالب کی طرح محنت سے لکھتے تھے "انیترۃ النعمان" جس کا سن تصنیف ۱۸۰۸ء ہے اُس میں خود ہی لکھا ہے : "حرف بہ اُردو زدن آئین نہ بود" یعنی اردو میں لکھنا میرا دستور نہ تھا۔ اور تو یہ ہے کہ میر کے دور سے شیفتہ تک اُردو شعرا کے جو تذکرے لکھے گئے وہ فارسی ہی میں ہیں اور اردو قواعد کی ابتدائی کتابیں بھی اُردو میں نہیں لکھی گئیں۔ جب صورت حال یہ تھی تو ہندوستان میں فارسی شاعری کے اساتذہ کی مقبولیت میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ اُن شعرا میں غالباً سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حافظ ہی کو حاصل ہوئی۔ اُردو کے شعرا میں بہتوں نے حافظ کے اثر کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے کھل کر اعتراف تو نہیں کیا ہے لیکن اُن کی شاعری میں الفاظ و تراکیب کا استعمال، طرز ادا وغیرہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ یہ "مے باقی" کا نشہ ہے۔

حافظ کا مکمل دیوان مع اُردو ترجمہ کئی اداروں نے شائع کیا ہے، مگر اکثر میں مترجم کا نام عنقا ہے۔ ابھی حال ہی میں قاضی سجاد حسین میرٹھی کے ترجمہ کے ساتھ سب رنگ کتاب گھر دہلی نے دیوان حافظ مترجم کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ عرصہ ہوا میر ولی اللہ خان وکیل ایبٹ آباد نے دیوان حافظ کی شرح لکھی تھی، جو چار حصوں میں "مکمل دیوان حافظ شرح" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ دہلی سے عزیز حسن بقائی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ "پیشوا" میں حافظ کی غزلیں نائب مدیر کے ترجمہ و تشریح کے ساتھ قسط وار شائع ہوتی تھیں، مگر غالباً یہ شرح مکمل ہو کر کتابی شکل میں طبع نہیں ہو سکی۔ حافظ کے اشعار کا ترجمہ اور ان کی تشریح شیام سندر داس نے "عرفان حافظ" میں پیش کی ہے۔ انہوں نے حافظ کے ایسے متفرق اشعار مختلف عنوانات کے تحت جمع کر دئے ہیں جن میں تصوف و معرفت اور رجوع الی اللہ کے مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ موصوف نے انتخاب کے ساتھ اشعار کا سہل سلیس اور عام فہم اردو ترجمہ کر دیا ہے اور ہر باب کے شروع میں عنوان کی تشریح سے متعلق نوٹ بھی دئے ہیں۔

عام طور سے سلطان محمد قطب قلی شاہ (۹۷۳ء تا ۱۰۲۰ء) کو حافظ کا پہلا مترجم قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور رقم طراز ہیں :

> "محمد قطب قلی شاہ نے حافظ کے جملہ مشکل مضامین کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ وہ حافظ کا پہلا مترجم ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ حافظ کے رنگ کو جس خوبی سے اس نے اپنے کلام میں نبھایا ہے، شاید ہی اُردو کے کسی شاعر کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔"

ڈاکٹر زور نے ترجموں کی لمبی چوڑی تفصیل دی ہے۔ یہاں پر دو ایک مثالیں پیش خدمت ہیں۔ حافظ کی مشہور غزل کا مطلع اور مقطع ہے

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور　　کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور
حافظا در کنج فقر و خلوت شب ہائے تار　　تا بود وردت دعا و درس قرآں غم مخور

قطب قلی شاہ کا ترجمہ ہے

یوسف گم سو پھر آ گا اب کنعاں غم نہ کھا　　گھر ترا اُمید کا ہوگا گلستاں غم نہ کھا
قطب شہ اس کنج فقر و خلوت دینی منے　　تا اچھے وردت دعا و درس قرآں غم نہ کھا

حافظ کہتے ہیں

آنکس کہ بدست جام دارد　　سلطانیِ جم مدام دارد

ترجمہ ہے

جے کو کہ ہتھیلی جام لیتا　　سلطانی جم مدام لیتا

ملا اسد اللہ وجہی نے اپنی فارسی شاعری میں حافظ کے رنگ کو بہت خوبی کے ساتھ اپنایا ہے۔ انہوں نے حافظ کی غزلوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ وجہی کا اُردو کلام اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے، تاہم "سب رس" میں بھی حافظ کے شعر کا ترجمہ موجود ہے۔ حافظ کہتے ہیں ؎

سکندر را نمی بخشید آبے حافظ — بزور و زر میسر نیست ایں کار

وجہی کا ترجمہ ہے ؎

یو سکندر [illegible] نہ پیا یک جام — نہ زور ہور زر سوں تیں یو ہوتا کام

"قطب مشتری" کا فنی جائزہ لیتے ہوئے خان رشید نے لکھا ہے:

"کہیں کہیں فارسی اشعار بھی آئے ہیں، جن کے ہم معنی بلکہ ترجمات خود وجہی کے اشعار ہو سکتے تھے جو قطب مشتری میں موجود ہیں۔ جہاں حافظ کا یہ شعر پیش کیا گیا ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

وہاں وجہی اس شعر کو لکھ سکتا تھا ؎

محبت کیرائے جو پیتا اسے — مرگ اسکوں ہیں جم وہ جیتا اسے

وجہی کا شعر ہر لحاظ سے حافظ کے شعر کا ترجمان ہے۔"

اسی لئے جاوید وششٹ نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ:

"عین ممکن ہے وجہی نے بھی حافظ کی غزلوں کا ترجمہ اُردو غزلوں میں کیا ہو جیسا کہ محمد قلی شاہ نے کیا ہے۔"

وجہی کو اپنے فارسی دیوان کی بدولت محمد قلی قطب شاہ پر سبقت حاصل ہے، لیکن جب تک ان کا دکنی دیوان دستیاب نہیں ہوجاتا محمد قلی قطب شاہ کو حافظ کا اولین مترجم تسلیم کیا جائے گا۔

سلطان محمد قطب شاہ کے زمانہ میں ہی غواصی کی شاعری چمکی۔ غواصی کی شہرت خاص طور پر ان کی مثنویوں "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" کی وجہ سے، یوں ان کی کلیات میں غزلیات و قصائد بھی ہیں۔ سلطان قلی کی طرح غواصی نے بھی حافظ کی غزلوں کا دکنی غزلوں میں ترجمہ کیا ہے۔

۱۹۴۰ء کے آس پاس حافظ کی تقریباً چھ سو غزلوں کا منظوم ترجمہ دہلی کے سید احتشام الدین حقی ایم۔ اے علیگ نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ "لسان الغیب" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ایک مثال دیکھئے۔ حافظ کا شعر ہے ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید — کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزل ہا

حقی ؎ مصلےٰ رنگ لے مے سے اگر پیر مغاں کہہ دے — سمجھ رہبر کو ناواقف نہ رسم و راہ منزل کا

حافظ کے اس شعر کا ترجمہ نادر نے کیا ہے ؎

تو سجادہ کو مے سے رنگ اگر پیر مغاں کہہ دے — کہ سالک باخبر ہوتا ہے راہ و رسم منزل کا

[illegible]: رگھوبر پرشاد نادر ولد منشی منسا رام ناتواں (ولادت سمبت ۱۸۹۰) دہلی کے قدیم باشندے تھے۔ فن شعر میں منشی عزت سنگھ

عیش، حافظ غلام رسول نابینا ویران اور میرزا غلام علی بیگ سالک سے اصلاح لیتے تھے۔ ادب فارسی اور عروض و قوافی کی تعلیم امام بخش صہبائی سے حاصل کی تھی۔ نادر نے حافظ کی کئی غزلوں کا منظوم ترجمہ کیا ہے جو بقول نصیر الدین ہاشمی شاعرانہ خصوصیات کی نادر مثال ہے

حافظ نے غزل کے شاعر تھے مگر رباعی میں بھی ایک خاص رنگ رکھتے تھے، یہ اور بات ہے کہ رباعیات کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو غزلوں کو حاصل ہوئی۔ راگھویندر راؤ جذب حیدرآبادی نے رباعیات کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ "رباعیات حافظ شیرازی (منظوم ترجمہ)" کے نام سے یہ مجموعہ مشورہ پاکٹ بک سیریز میں شائع ہوا ہے۔ اصل رباعی کے ساتھ اس کی تشریح اور مقابل کے صفحہ پر اردو منظوم ترجمہ ہے جسے دیوناگری رسم الخط میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ ایک رباعی کا ترجمہ ملاحظہ ہو ؎

حافظ

سیلاب گرفت گرد ویرانۂ عمر   آغاز پُرے نہاد پیمانۂ عمر
بیدار شو اے خواجہ کہ خوش خوش بکشد   حمّال زمانہ رخت از خانۂ عمر

تشریح

جوانی گئی، پیری آئی، عروج کا زمانہ ختم ہوا، بربادی کے آثار نمایاں ہیں۔ کب تک خواب غفلت جاگو اور طاعت الٰہی میں مصروف ہو جاؤ ؎

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں   اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

غالب

منظوم ترجمہ

ویرانۂ زندگی میں طوفان اٹھا   بھرنے کو ہے تیری عمر کا پیمانہ
ہشیار ہو اے خواجہ کہ حمّال زمان   لے چلے گا زندگی کا سرمایہ

غالب نے براہ راست بیدل اور نظیری سے استفادہ کیا ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ان کے یہاں صائب، کلیم کا ذکر بھی مل جاتا ہے، مگر حافظ کا ذکر خیر نہیں ہے۔ یوں تو غالب نے دعویٰ کیا ہے ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں   غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

مگر غالب کے نکتہ چینوں کا کہنا ہے کہ ان کے اردو کلام کا بیشتر حصہ فارسی شاعری کے اساتذہ کے کلام سے ماخوذ ہے۔ کسی نے اسے سرقہ کہا ہے اور کسی نے توارد کہہ کر اپنی سخن فہمی کا ثبوت دیا ہے، کیونکہ مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالب نے فارسی شعراء کے جن مضامین کو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر لیا ہے انہیں عام طور پر تصرف سے آسمان کر دیا ہے۔ اس دعوے کی دلیل پیش کرنے کا یہ موقع نہیں، یہاں پر صرف حافظ اور غالب کے ہم مضمون اشعار پیش خدمت ہیں۔ حافظ کہتے ہیں ؎

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہر ثواب   کشتۂ غمزدۂ خود را بہ نماز آمدہ

غالب نے تھوڑے سے تصرف سے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

تغزل کے طنزیہ لب ولہجہ کو نمایاں کرنے میں سب سے زیادہ غالب کا ہاتھ ہے۔ اس شعر کی خصوصیت اس کا طنزیہ لہجہ ہے۔ زود پشیماں کی ترکیب میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ غالب کا شعر حافظ سے بڑھ گیا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔

حافظ کا شعر ہے ؎ من کہ ملول گشتمے از نفس فرشتگان　　　قال و مقال عالمے می کشم از برائے تو

غالب کا شعر تاثیر اور حسن ادا میں حافظ کے شعر سے کم نہیں، کہتے ہیں ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　　گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

حافظ ؎ فرصت نگر کہ فتنہ چو در عالم اوفتاد　　　عارف بجام مے زد و از غم کراں گرفت

غالب ؎ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　　اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

غالب کے استاد معنوی بیدل نے حافظ سے استفادہ کیا ہے۔ اس موضوع کو انہوں نے اس طرح پیش کیا ہے ؎

مطلبم از مے پرستی تر دماغیہا نہ بود　　　یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را

حافظ نے غضب کا مطلع کہا ہے ؎

بنال بلبل اگر با منت سر یاری ست　　　کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری ست

اسی مضمون کو غالب نے کس خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں　　　تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

حافظ ؎ چو طفلاں تا کے اے زاہد فریبی　　　بہ سیب بوستان و شہد و شیرم

غالب ؎ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　　دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

حافظ ؎ نشان مہر و وفا نیست در تبسم گل　　　بنال بلبل مسکیں کہ جائے فریاد است

غالب ؎ ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل　　　بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

حافظ ؎ دمی با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد　　　بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

غالب ؎ رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے　　　مدت ہوئی ہے دعوت آب و ہوا کئے

حافظ ؎ حدیث درد من اے مدعی نہ امروز است　　　کہ حافظ از ازل او رند بود و شاہد باز

غالب ؎ اسد اللہ خاں تمام ہوا　　　اے دریغا وہ رند شاہد باز

حافظ ؎ دہ روزہ مہر گردوں افسانہ ایست افسوں　　　نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا

غالب ؎ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد　　　عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی　　　ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

حافظ ؎ چمن حکایت اردی بہشت می گوید　　　نہ عاقل ست کہ نسیہ خرید و نقد بہشت

غالب ؎ نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم　　　لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

حافظ ؎ منم غریب دیار و توئی غریب نواز　　　دمے بحال غریب دیار خود پرداز

غالب ؎	مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا	میں غریب اور تو غریب نواز
حافظ ؎	بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی	جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا
غالب ؎	کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب	گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
حافظ ع	تو خود حجاب خودی، حافظ از میاں برخیز	
غالب ؎	وا کر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن	غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
حافظ ؎	جاں دادمش بمژدہ و خجلت ہمی برم	زیں نقد کم عیار کہ کردم نثار دوست
غالب ؎	جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی،	حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
حافظ ؎	معجز است ایں شعر یا سحر حلال	ہاتف آورد ایں سخن یا جبرئیل
غالب ؎	آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں	غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

انیس نے حافظ کے پہلے مصرع کا باضابطہ ترجمہ کر ڈالا ہے ع

معجزہ گر نہ اسے کہئے تو ہے سحر حلال

حافظ فرماتے ہیں ؎

با خرابات نشیناں ز کرامات ملاف — ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

انیس نے ذرا سی تبدیلی سے دوسرے مصرعہ کو اپنایا ہے ؎

داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد — ہر سخن نکتہ و ہر چیز مقامے دارد

حافظ کہتے ہیں ؎

بریں دو دیدۂ حیران من ہزار افسوس — کہ با دو آئینہ رویش عیاں نمی بینم

انیس کی مشہور رباعی ہے ع — حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

حافظ کی خوشہ چینی ظاہر ہے۔ اور یہ وہ انیس ہیں جنھیں اپنے مضامین نو پر ناز ہے ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار — خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

نواب مصطفےٰ خاں اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ شیفتہ حافظ سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے حافظ کے رنگ میں فارسی اور اردو میں بہت اچھی غزلیں کہی ہیں۔ یوں تو شیفتہ نے دوسرے اساتذہ کی غزلوں پر بھی غزلیں کہی ہیں، لیکن حافظ کا اثر زیادہ گہرا تھا۔ انہوں نے بعض اشعار میں اس کی صراحت بھی کر دی ہے۔ کہتے ہیں ؎

حسرتی نیز ہماں گفت کہ حافظ گفتی — مدعی گر نکند فہم سخن گو سر و خشت

دیوان حسرتی کا آغاز ہی دیوان حافظ کی پہلی غزل کی زمین سے ہوتا ہے۔ یہ تتبع صرف زمینوں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اکثر و بیشتر مضامین، طرز ادا اور الفاظ و تراکیب میں بھی اشتراک پایا جاتا ہے۔ حسرتی کے یہاں بھی وہی زور، وہی جوش اور

وہی اسلوب بیان ہے جو حافظ کا طرۂ امتیاز ہے۔ حسرتی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جزای آنکہ شب ہجر خون دل کردم | بیا بہ ساغر مہتاب آفتاب انداز
ہر چند ز خود بے خبرانند ولیکن | با اہل خرابات ز ہر جا خبری ہست
مرید پیر مغانم کہ پادشاہ و گدا | مراد خویش ازیں آستانہ می خواہد

مرید پیر مغانم ، خوش آں زماں کہ ، کی قسم کے فقرے لسان الغیب کی آواز کی بازگشت ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی نے بزم کی مدح کی ، عباسیوں کی داستان لکھی اور چند سے مقیم آستان غیر ہونے کے بعد سیرت پیغمبر خاتم لکھتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اپنی مورخانہ حیثیت کے ساتھ ہی وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ شیخ علی حزیں اور رودکی کے رنگ میں غزلیں اور قصائد کہتے تھے اور اہل ذوق سے داد پاتے تھے۔ شبلی خود کہتے ہیں کہ میں نے فارسی شاعری میں زبان کو اہل زبان کی طرح برتا۔" شبلی کی غزلوں میں نمایاں رنگ حافظ کا ہے۔ اکثر و بیشتر انہوں نے الفاظ و تراکیب حافظ سے مستعار لیا ہے اور اس کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا ہے۔ مہدی افادی کو بمبئی سے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں ، آدمی ضبط نہیں کر سکتا ، اپالو یہاں عجیب سیرگاہ ہے اور چوپاٹی اس کا جواب ہے۔ خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہے۔

کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را

اس غزل کا ایک شعر ہے ؎

بہر سو از ہجوم دلبران شوخ و بے پروا | گذشتن از سر رہ مشکل افتاد است رہرو را "

اس غزل کا مطلع ہے ؎

نشاد بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را | طراز مسند جمشید و فرق تاج خسرو را

"دستہ گل" کی غزلیں ایسی مست تھیں کہ حالی نے ان کو حافظ کی غزلوں کے برابر رکھا۔ شبلی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

" غزلیں کاہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے۔ جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دل ربائی ہو ، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بھی زیادہ گرم ہیں۔"

شبلی کی فارسی شاعری کا رنگ و آہنگ حافظ کے اتنا قریب ہے کہ پروفیسر نواب علی صاحب " تاریخ صحف سماوی " کے خیال میں " وہ شعر و سخن میں حافظ کے مقابل تھے۔" حافظ کہتے ہیں ؎

ساقی بیار بادہ و با مدعی بگو | انکار ما مکن کہ چنیں جام جم نداشت

شبلی نے کہا ہے ؎

دل مرا بہ ہر کہ عرصہ نمود یم در جہاں | انصاف داد و گفت چنیں جام جم نداشت

خواجہ فرماتے ہیں ؎

عاشق و رند و نظر بازم و می گویم فاش تا بدانی کہ بہ چندیں ہنر آراستہ ام

شبلی کا شعر ہے ؎

رندی و سیہ کاری مستی و نظر بازی زیں گونہ اگر خواہی بسیار ہنر دارم

اہلِ نظر دیکھیں گے کہ شبلی کا شعر بندش کی وجہ سے حافظ کے شعر سے بڑھ گیا ہے ۔

اقبال اپنی شاعری کے متعلق کہتے ہیں ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

" فن شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی، ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودست کہ بر من تہمت شعر و سخن بست "

اقبال کے پیش نظر " حقائق ، اخلاقی و ملّی ہیں : مقصود یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس " یہی وجہ تھی کہ وہ حافظ کو دنیا کا بہترین شاعر مانتے ہوئے بھی حافظ کے مخالف تھے ۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

" اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر تو خواجہ (حافظ) دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں ۔ "

دراصل اقبال اس بات کے قائل تھے کہ ع

جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

حافظ کے خیالات سے اقبال کو جو اختلاف تھا وہ کھل کر ان کی مثنوی " اسرار خودی " میں ظاہر ہوا ۔ اس مثنوی کے پہلے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۱۶ء) میں حافظ پر سخت تنقید تھی ؎

ہوشیار از حافظ صہبا گسار جامش از زہر اجل سرمایہ دار

رہنِ ساقی خرقۂ پرہیز او مے علاج ہول رستاخیز او

محفل او در خور ابرار نیست ساغر او قابل احرار نیست

بے نیاز از محفل حافظ گذر الحذر از گوسفنداں الحذر

اسی قبیل کے پینتیس اشعار تھے ۔ ان اشعار نے حافظ کے معتقدین میں کھلبلی مچا دی ، جنھوں نے اقبال کی مخالفت شروع کر دی ۔ خواجہ حسن نظامی اور اکبر الہ آبادی بھی حافظ کے معتقدین تھے اور اقبال کے مخالفین کی صف میں کھڑے ہو گئے ۔ بالآخر مثنوی کے آئندہ ایڈیشن میں ان اشعار کو خارج کرنا پڑا ، مگر حافظ سے اقبال کا نظریاتی اختلاف باقی رہا ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے حافظ کے

اشعار پر تضمینیں کی ہیں، مگر کہیں حافظ کا با لصراحت نام نہیں لیا ہے۔ جبکہ دوسرے شعرا کے اشعار پر کی گئی تضمینوں میں نام کی صراحت کر دی گئی ہے۔ حافظ کے درج ذیل اشعار پر اقبال نے تضمینیں کی ہیں ؎

بیا تا گل برافشانم و مے در ساغر اندازیم — فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم
شہپر زاغ و زغن زیبائے قید و صید نیست — کیں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند
گرت ہواست کہ با خضر ہم نشیں باشی — نہاں ز چشم سکندر چو آب حیواں باش
عاقبت منزل ما وادی خاموشانست — حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز
دلق حافظ بچہ ارزد بہ میش رنگیں کن — وانگہش مست و خراب از سر بازار بیار
محل نور تجلی ست رائے انور شاہ — چو قرب او طلبی در صفائے نیت کوش
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

ان کے علاوہ "پیام مشرق" میں "ساقی" کے عنوان سے کچھ غزلیں دی گئی ہیں۔ ان غزلوں کے مضامین اقبال کے اپنے رنگ کے ہیں، مگر ان کا رنگ و آہنگ خاص طور پر حافظ سے متاثر ہے۔ زمین و قوافی سے حافظ کا اثر نمایاں ہے۔ "ساقی" کا عنوان ہی حافظ کی یاد دلا رہا ہے ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت — کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلے را

اختر شیرانی حسن و عشق کے شاعر تھے۔ وہ حافظ سے متاثر ہی نہیں تھے بلکہ حافظ کے عاشق تھے۔ انہوں نے اپنے پانچ مجموعوں کے شروع میں حافظ کی پوری پوری غزلیں درج کی ہیں۔ "فلسفۂ حافظ پر ایک شرح" کے عنوان سے اختر کی ایک نظم ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے حافظ کو اچھی طرح پڑھا تھا اور سمجھا تھا اور اپنے ذوق و مزاج کے مطابق اثر بھی قبول کیا تھا۔ "اختر ستان" میں نذر کے عنوان سے حافظ کی غزل درج کی گئی ہے جس کا مطلع ہے ؎

زلف آشفتہ و خوی کردہ و خنداں لب مست — پیرہن چاک و غزل خوان و صراحی در دست

اسی کے ساتھ اختر کی غزل دیکھئے ؎

کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ — زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ
آہ یہ زلف ہے یا ابر سیہ مے خانہ — آہ یہ آنکھ ہے یا جام شراب آلودہ
کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر — کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش یہ حجاب آلودہ
کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو — کس کی ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ
پھر ہم آغوشی کے موسم نے بکھیرے گیسو — پھر فضائیں نظر آتی ہیں سحاب آلودہ

دونوں غزلوں کی مماثلت ظاہر ہے۔ حافظ کا شعر ہے ؎

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید   کہ زانفاس خوشش بوئے کسے می آید

اب اختر کی نظم "خیر مقدم" ملاحظہ فرمائیے جس کا پہلا شعر ہے ؎

سمت دہلی سے ہوا مست فشاں آتی ہے   خبر آتی ہے کہ وہ جانِ جہاں آتی ہے

اختر کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں وہی سرمستی و مدہوشی ہے۔ وہی انداز بیان اور ادائے خیال کا طریقہ ہے جسے دیکھ کر کہنا پڑتا ہے ؎

ز اشعار خوشش بوئے کسے می آید

اختر کے ایک مجموعۂ کلام پر ہمیں یہ الفاظ لکھے ملتے ہیں :

"مشرق میں رومانی شاعری کے تین پیغمبر ہیں۔ ایک امراؤالقیس، دوسرا حافظ شیرازی اور تیسرا اختر شیرانی۔ جس کی زبان حافظ کی تھی اور تخیل امراء القیس کا۔"

بقول سلیم احمد اس رائے کی تنقیدی اہمیت جو کچھ بھی ہو، لیکن یہ ایک عام رائے ضرور رکھتی۔ اختر کو حافظ سے بلند تر درجہ عطا کرنا تو ہمت کا کام ہے۔ لیکن وارث کرمانی کی اس رائے سے کم لوگوں کو اختلاف ہوگا کہ :

"شاعری کی حیثیت سے حافظ کو سمجھنے اور ان کا اثر قبول کرنے میں اردو شاعری میں کوئی ان (اختر) سے زیادہ ذکی الحس نہیں۔"

جگر نے بارہا اعتراف کیا ہے ؎

ہر روز فیض گیرم از روح قدس حافظ   بر من جگر گواہ است ایں جوش وایں معانی

میں نہیں بلبل خیام جگر   حافظ خوش کلام نے مارا

"شعلۂ طور" کے آخر میں جگر کا فارسی کلام بھی تبرکاً درج کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر و بیشتر غزلیں حافظ کی غزلوں کو پیش نظر رکھ کر کہی گئی ہیں۔ حافظ کی غزل ہے ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند   و اندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

اسی زمین میں جگر نے کہا ہے ؎

لب ببستند و بہر موئے زبانم دادند   پا شکستند و بہر سوئے نشانم دادند

تاب از دل بربودند و فغانم دادند   تیر از دست ببردند و کمانم دادند

دل سرگشتہ و چشم نگرانم دادند   انچہ دادند پے شورش جانم دادند

اس طرح کی شاعری جگر کے شایان شان تو نہ تھی، مگر یہ پھر بھی غنیمت تھا۔ کیونکہ بہت سے اپنے اشعار بھی مل جائیں گے جن میں الفاظ و تراکیب اور پورے پورے مصرعے حافظ سے مستعار لئے گئے ہیں ؎

مست و سرشار ز میں بوس صبا می آید   مژدہ اے دل کہ مسیحا بہ قضا می آید

مطرب بزن سرودے "ساقی بیار بادہ"   تا جاں شود منور "تا دل شود کشادہ"

در کوئے مے فروشاں دیدیم زاہداں را   سجادہ رہن کردہ "تقویٰ بہ باد دادہ"

یوسف گم گشتہ ام در مصر عشق | باز سوئے پیر کنعاں می روم
مست است جگر از مے مستی ناب اولیٰ | او خانہ خراب ہست او خانہ خراب اولیٰ
من ساغر مے در کف مطرب تو بگوئی ہوف | صد توبہ و صد طاعت غرق مے ناب اولیٰ
تا کے جگر ایں مستی بشنو سخن حافظ | رندی و خراباتی در عہد شباب اولیٰ

اس طرح کی اور بھی مثالیں مل جائیں گی جن میں جگر نے مکھی پر مکھی بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ان میں حافظ کے اشعار کی تازگی اور رعنائی کی تلاش کرنا تحصیل لاحاصل ہے۔ اس سے جگر کی تنقیص ہوتی ہے۔ اردو شاعری میں جگر کا جو بلند مقام ہے وہ اظہر من الشمس ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جگر نے فارسی شاعری میں حافظ کی پیروی کی ہے مگر نتیجہ بالکل سطحی ہے۔ بقول شاہ معین الدین ندوی "حقیقت یہ ہے کہ یہ ان (جگر) کا میدان نہیں ہے۔"

جوش کے نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی غزلوں اور نظموں کو سن کر محسوس ہونے لگتا ہے کہ بلبل شیراز اردو میں نغمہ سرا ہے، وہی جوش و خروش ہے، وہی انداز بیان، وہی دل نشینی ہے اور وہی طرز کلام۔ جوش نے حافظ اور نظیری کی متعدد غزلوں کو اردو میں اپنا لیا ہے۔ پوری پوری غزلوں کے مضامین، قافیہ اور ردیف کے ساتھ اپنا لئے ہیں، مثلاً حافظ کہتے ہیں ع

مگر تبسم ساقی نمی کند تقصیر

جوش نے من و عن ،———— مگر تبسم ساقی خطا نہیں کرتا

کی شکل میں ترجمہ کر کے اپنا لیا ہے۔ جوش کی نظم نما غزل بعنوان "راز و نیاز کی رات" ہے، اس کا مطلع ہے ؎

نہ جانے رات کو کیا مے کدہ میں مشغلہ تھا | کہ ہر نفس میں قیامت کا جوش و ولولہ تھا

اس کے بعد حافظ کی مشغلہ بود، ولولہ بود، والی غزل دیکھئے، جوش کے یہاں حافظ کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ جوش کا خیال ہے:۔

"میرے غزلیہ اشعار حافظ کی بازگشت نہیں ہیں، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ میں نے حافظ اور نظیری کو پڑھا بہت زیادہ ہے۔ ممکن ہے غیر ارادی طور پر ان شاعروں کا اثر میری غزلوں پر ہو۔"

ایک دوسری جگہ جوش نے لکھا ہے:۔

"فارسی میں ...... سب سے زیادہ حافظ نے دل پر اثر کیا جواب تک ہے اور ہمیشہ رہے گا۔"

'روح ادب' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"حافظ کے ساتھ تو مجھے اس قدر شغف تھا کہ صبح کی نماز سے بہت پیشتر اٹھ کر میں غسل کرتا، تازہ پھول شیشے کی پلیٹ میں رکھتا۔ اگر اور عود جلاتا، اور حافظ کا کلام گنگناتا۔ اور ایک نشے کے عالم میں جھوما کرتا تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حافظ کی روح میرے گرد و پیش رقص کر رہی ہے۔"

حسرت موہانی کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

دل خوب سمجھتا ہے ترے حرف کرم کو   ہر چند وہ اُردو ہے نہ ترکی ہے نہ تازی

اس کے ساتھ حافظ کا شعر دیکھئے

یکیست ترکی و تازی دریں معاملہ حافظ   حدیث عشق بیاں کن بہر زباں کہ تو دانی

حافظ کی مشہور غزل پر حسرت کی تخمیس ملاحظہ ہو

مرے حق میں کیا نہ ہوگا کبھی رحم کا اشارا   نہ کبھی خطاب پنہاں نہ عتاب آشکارا
کہ یہ ہو تو بیکسی کا مجھے غم بھی ہے گوارا   بہ ملازمانِ سلطاں کہ رساند ایں دعا را

کہ بشکر پادشاہی ز نظر مراں گدارا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے غم کی بے پناہی   ہے بیاں کی حد سے بیروں مرے حال کی تباہی
یہی کچھ اور دے رہی ہے مری آرزو گواہی   ہمہ شب اُمید وارم کہ نسیم صبح گاہی

بہ پیام آشنائی بنوازد آشنا را

یہی اب تو التجا ہے کہ بہ زہد نخوت انگیز   یہ جو تھا بصد تکلف مجھے شغل مے سے پرہیز
اُسے کر دے ختم ساقی بہ عطائے رافت آمیز   بخدا کہ جرعۂ دہ تو بہ حافظ سحر خیز

کہ دعائے صبحگاہی اثرے کند شما را

فیض نے دست صبا کے شروع میں حافظ کا یہ شعر دیا ہے

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد   عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد

اور اپنی نظم " اے حبیب عنبر دست " کے آخر بند میں حافظ کے ایک شعر کی تضمین کی ہے

یہ شعر حافظ شیراز اے صبا! کہنا   ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیب عنبر دست
"خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی   بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است"

حافظ کہتے ہیں

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید   قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

داغ دہلوی کے دو شاگردوں آغا شاعر قزلباش اور مبارک عظیم آبادی نے حافظ کے اس شعر کو اُردو میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر دونوں کی نگاہ میں فرق ہے۔ آغا شاعر کہتے ہیں

آہ یہ بار امانت اور یہ مجھ سا ضعیف   کیا کروں بندہ بشر ہے، مجھ کو دھوکا ہوگیا

مبارک عظیم آبادی کا شعر ہے

مرحبا! بار امانت کے اُٹھانے والے   کیا کلیجہ ہے تمہارا کہ یہ بار اُٹھا ہے

حافظ نے کہا ہے

گر ز مسجد بہ خرابات شدم، عیب مکن   مجلس وعظ دراز ست و زماں خواہد شد

شبلی نے شعرالعجم (حصہ دوم) میں حافظ کے اس شعر کے ساتھ قائم کو شعر پیش کیا ہے ؂

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائم — یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

محققین کا کہنا ہے کہ یہ شعر قائم سے غلط منسوب کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ شعر جس کا بھی ہے اس نے مضمون کو بالکل اپنا لیا ہے۔ روانی و برجستگی بھی قابل داد ہے۔

حافظ کا شعر ہے ؂

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست — تو خود حجاب خودی حافظا ازمیاں برخیز

میر، آتش اور راسخ عظیم آبادی کے ہم مضمون اشعار ملاحظہ ہوں۔

میر ؂	ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ	ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں
آتش ؂	نا فہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لئے	ورنہ کوئی حجاب نہیں یار کے لئے
راسخ ؂	پردہ رُخ محبوب کا ہستی ہے ہماری	کیا اپنے تئیں بیچ سے مشکل ہے اُٹھاتا
راسخ ؂	خودی ہے تیری نقاب اس کے روئے زیبا کا	اُٹھادے اس کو اگر شوق ہے تماشا کا

حافظ اور اُردو شعرا کے کچھ اور ہم مضمون اشعار پیش ہیں :—

حافظ ؂	ما در پیالہ عکس رُخ یار دیدہ ایم	اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما
میر ؂	صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا	ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور
حافظ ؂	در عشق خانقاہ و خرابات شرط نیست	ہر جا کہ ہست پرتو روئے حبیب است
عرفی ؂	عارف ہم انا اسلام خراب است وہم از کفر	پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند
میر ؂	کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر	دیر ہو یا کعبہ مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے
راسخ ؂	کفر بھی اک شان جلوے کی اسی دلبر کے ہے	شیخ کیوں تو برہمن سے برسر پیکار تھا
حافظ ؂	گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ	تو در طریق ادب کوش وگو گناہ من است
حافظ ؂	خوش تر از فکر مے و جام چہ خواہد بودن	چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن
حافظ ؂	حاصل کارگہ کون و مکاں ایں ہمہ نیست	بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست
میر ؂	ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی	چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
	یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے	رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا
راسخ ؂	مختاری کا مدعی جو ہے تو	بارے کیا اختیار پایا
راسخ ؂	وے تھے خواہاں مری خرابی کے	میں اسی واسطے خراب رہا
راسخ ؂	وہ جملہ قصور اد سب یہی ہے	ہر چند نہ ہو قصور تیرا
راسخ ؂	وہم کی سی نمود اپنی جہاں میں راسخ	فی الحقیقت کچھ نہیں گرچہ نمودار ہیں ہم

تلاش وجستجو سے اس طرح کی بہتیری مثالیں اُردو کے دوسرے شعراء کے یہاں بھی مل جائیں گی۔ حاصل کلام صرف اتنا ہے کہ اردو شعراء پر حافظ کا ہمہ گیر اثر نمایاں ہے۔ ہر شاعر اپنے اپنے ظرف وذوق کے مطابق متاثر ہوا ہے۔ ایسے شعرا بھی ہیں جنھوں نے اپنی کوششوں کو صرف لفظی ترجمہ تک محدود رکھا ہے یا صرف حافظ کے مخصوص تراکیب اور الفاظ کو اپنایا ہے، ایسے شعرا بھی ہیں جنھوں نے حافظ کے مضامین میں معنوی اضافہ کیا ہے اور حافظ کے رنگ و آہنگ کو جذب کرکے اپنا جداگانہ رنگ اختیار کیا ہے پھر بھی حافظ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں" اور ایسے شعرا بھی ہیں جنھوں نے حافظ کا رنگ سخن اپنا کر اپنے کلام کی رنگینی و رعنائی میں اضافہ کیا ہے مگر اپنے جذبۂ انانیت کے پیش نظر یا نظریاتی اختلاف کی وجہ سے حافظ کا نام بھی لبوں پر نہیں آنے دیتے۔

غزل

مظفر حنفی

بے گھر کے لئے مکان موجود
ہر سمت ہے آسمان موجود

مرگھٹ کے حصارِ جسم توڑا
پھر بھی یہ وبالِ جان موجود

ڈوبو تو حباب کے سفینے
ہر موج کے درمیان موجود

محفوظ رہیں بزرگ نا کیں
کٹنے کے لئے جوان موجود

مقتول کی ڈھال کون بنتا
ماتم کو ہے مکان موجود

پھولوں کا کہیں پتہ نہیں ہے
ہر باغ میں باغبان موجود

بستی میں قدم قدم پہ مجرم
ہر گام پہ افسران موجود

اللہ بچائے رہبروں سے
ہر موڑ پہ مہربان موجود

شاعر وہ نیا نیا ہوا ہے
ہر شعر پہ چائے پان موجود

اب ختم بھی کر غزل مظفر
مصرع تو ہیں بے تکان موجود

غزل

نادم بلخی

دنیا نہ سمجھے سو میں مگر ایک ہم بھی ہیں
یعنی اسیرِ غم بھی ہیں آزادِ غم بھی ہیں

سمجھا تھا جن کو ہم نے سراپا کرم نواز
کچھ لوگ انھیں میں ہیں کہ جو اہلِ ستم بھی ہیں

واعظ کو اہلِ دیر سے شکوہ تو ہے مگر
یادِ صنم لئے ہوئے اہلِ حرم بھی ہیں

مشکل سفر نہیں ہے تو آساں بھی کچھ نہیں
راہِ وفا میں اہلِ ہوس پیچ و خم بھی ہیں

تیرے کرم کے فیض سے محروم ہم سہی
ساقی ہمیں رکھے ہوئے تیرا بھرم بھی ہیں

مثلِ گلِ خزاں تو ہیں گلشن میں ہم مگر
آئینہ دارِ صبحِ بہارِ ارم بھی ہیں

نادم مزاجِ وقت ہے کتنا ستم ظریف
دنیا میں راحتیں ہیں تو رنج و الم بھی ہیں

غزل

ظہیر غازیپوری

زندگی ہے اک سپنا عکس ذہن پر جس کا یوں ابھرتا ہے جیسے آڑ میں درختوں کے چھپ کے چاندنی اپنے زاویے بدلتی ہے
لوگ اس کو یوں اپنی ارتقا سمجھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں آئینوں کے پیچھے تو شکل دیکھنا اپنی سخت بیوقوفی ہے

وقت کا یہ سناٹا زندگی کی تنہائی مضطراب لمحوں کا خونی آہٹوں کا یہ جنگل کرب کی علامت ہے کون اس کو سمجھے گا
ملگجی فضاؤں میں ظلمتوں میں آہوں کی اترے اترے چہروں کا اژدہام ہے ہر سو اپنی ہی سی بستی ہے پھر بھی اجنبی سی ہے

زندگی ہے اک نقطہ جس کے گرد وقت اب تک دائرے بناتا ہے رنگ و نور کا لمحہ کیف بخش دیتا ہے تشنہ تشنہ نظروں کو
پُرفریب ہر منظر اک حصار ہوتا ہے جس کی حد میں ہر انساں یہ بھی بھول جاتا ہے اپنی ذات کا عرفاں آگہی کی وادی ہے

جب سحاب چھٹتا ہے روشنی نکھرتی ہے نیلگی نگی شاخوں پر خود نظر پھسلتی ہے اب برستے موسم کو جذبوں کی حرارت سے
اتنی واقفیت ہے چوٹیوں سے وادی تک ایک سحر افزا سا رنگ پھیل جاتا ہے دل سکون پاتا ہے روح مسکراتی ہے

بے صدا سے پیکر ہیں لفظوں کی اُگرائیں ہیں جسم جیسے پتھر کے پھول جیسے کاغذ کے فکر پیاسی پیاسی ہے فن سراب آلودہ
راہِ فن سے آج اکثر بے نیاز گزرے ہیں ناقدانِ شعر و فن اب قلم کی ناقدری خون تھوکنے والو خود ادب نوازی ہے

کس قدر میں تنہا ہوں مجھ سے میرا سایہ بھی دُور دُور رہتا ہے اجنبی سے لگتے ہیں اپنے بام و در مجھ کو دشتوں کا یہ عالم
سانپ بن کے مدت سے ڈس رہا ہے ہر لمحہ کیا ہوا کہ خود میری آج نبضِ ہستی پر ہر گرفت انگلی کی ڈھیلی ڈھیلی لگتی ہے

میرے شہر میں بھی کل زندگی کے شیدائی کشت و خوں پہ آمادہ کوچہ کوچہ گھومے تھے ذرّہ ذرّہ چیخا تھا شعلے ہر سو بھڑکے تھے
دیکھو میری نظروں سے ہر طرف ظہیر اب تک بھیگی بھیگی آنکھیں ہیں سہمے سہمے لہجے ہیں ہونٹ سوکھے سوکھے ہیں چہروں پر اداسی ہے

غزل

شمیم قاسمی

راہگیروں کا مقدر ہوتا
کاش میں راہ کا پتھر ہوتا

مری آنکھوں میں روانی ہوتی
تری آنکھوں میں سمندر ہوتا

وقت کی دھوپ میں جلتے رہنا
چھاؤں میں رہنے سے بہتر ہوتا

ایک بیوی کئی بچے ہوتے
اپنا چھوٹا سا کوئی گھر ہوتا

رات کے جسم پہ چادر ہوتی
دن کے سینے پہ جو پتھر ہوتا

دوڑتے ریل کے ڈبے ہوتے
ایک منظر پس منظر ہوتا

غزل

نصر قریشی

لذتوں کے صحرا میں، ننگی شاخوں کے نیچے، ننگے سو رہے ہیں لوگ
بھوک جسم کی لے کر، روح کی زمینوں میں، تخم بو رہے ہیں لوگ

آگ ہو گئی ٹھنڈی، پھول بن گئے شعلے ٭ لمحے بن گئے پتھر
وقت کی چٹانوں میں، اپنی کھوئی آوازیں، سن کے رو رہے ہیں لوگ

ذہن و دل کے سناٹے، کاغذوں پہ بکھریں تو، کرب ناک ہو جائیں
آہنی مشینوں کے، تیز شور میں آخر، جذب ہو رہے ہیں لوگ

معبدوں کی خاموشی، لازوال سرگوشی، خوشبوؤں میں ڈوبی سی
گوشۂ اماں پاکر، گوہر ندامت سے، داغ دھو رہے ہیں لوگ

ریت، جھاگ اور ساحل، خونی لہروں کی زد میں، آخرش ہوئے گھائل
بیکراں سمندر میں، سمتوں کا تعین کیا، خود کو کھو رہے ہیں لوگ

رات کے دیاروں میں، بکھرے خوابوں کے پیکر، ٹوٹا چاند کا درپن
صبح دور ہے پھر بھی، صبح کے خیالوں سے، خوش تو ہو رہے ہیں لوگ

موسموں کی سفاکی، گلشنوں میں ویرانی، جنگلوں میں ہریالی
ابر باراں کی صورت، پیاسی دھرتی کے سوکھے لب بھگو رہے ہیں لوگ

نصر یہ ادھوراپن، گھاؤ گہرا ہے لیکن، بھر ہی جائے گا اک دن
بکھرے موتی چن چن کر، ٹوٹی گیت مالائیں، پھر پرو رہے ہیں لوگ

غزل

حسین الحق

ہزار صدیوں سے خود کو ہی پڑھ رہا ہوں میں
کہ اپنے سینے میں آپ ہی چھپا ہوا ہوں میں

رگوں میں ٹیس نہ آنکھوں میں اشک کا سایہ
یہ کیسے درد کا ساتھی بنا ہوا ہوں میں

میں کھودتا ہوں لہو دل کا اپنے ناخن سے
خود اپنی ذات کا قاتل بنا ہوا ہوں میں

کسی نے ہاتھ نہ تھاما کسی نے دکھ نہ سنا
تری نگاہ سے گر کر خدا ہوا ہوں میں

تمہاری یاد کے کوچے میں کب اذاں ہوگی
فصیلِ درد پہ آکر کھڑا ہوا ہوں میں

غزل

فاروق شفق

بدن پہ نئی فصل اگاتے رہیں گے
یہ گرمی یہ جاڑے تو آتے رہیں گے

جو گزرے ہیں وہ حادثے کیا ملیں گے
مہینے کے سب روز آتے رہیں گے

سبھی دھو چکے ہیں سمندر کی مچھلی
اک اک کر کے نیزے اٹھاتے رہیں گے

کبھی خشک سالی کبھی ژالہ باری
یہ موسم یہی تحفے لاتے رہیں گے

پہاڑ اپنی گرمی کہاں لے کے جائیں
پہاڑوں پہ سب لوگ جاتے رہیں گے

ابھی جسم میں اپنے روغن بچا ہے
دیا رات بھر ہم جلاتے رہیں گے

کلف اپنے جسموں میں باقی ہے جب تک
ہمارے بدن چرمراتے رہیں گے

"سفینۂ زرگل" — ایک جائزہ

جمیل ظہیر

"سفینۂ زرگل" فضا ابن فیضی کی غزلوں اور رباعیوں کا ضخیم مجموعہ ہے۔ چونکہ فضا ابن فیضی غزل ہی کے شاعر ہیں اس لئے ان کے فنی خد و خال کو ہم غزل کے آئینہ میں بہت واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

وہ اشعار جو دراصل بلند ہوتے ہیں، وہاں تک قاری کو پہنچنے میں دیر ضرور لگتی ہے، لیکن اس مقام تک پہنچ جانے کے بعد جتنی بار ان اشعار کو وہ پڑھتا ہے۔ کچھ لطف سوا دیتے ہیں۔ فن کی اس بلندی تک پہنچنے کے لئے ہر شاعر کو فنی فکری اور عصری عناصر کے مختلف مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ فضا ابن فیضی کی شاعری میں فن کی چاشنی بھی ہے اور بہ قول خلیل الرحمٰن اعظمی "فکری حجم" بھی ہے۔ عصری عناصر تو دراصل ان کے شعروں کا محرک ہے۔

نہ رکھو جسم کے زنداں میں اس کو	لہو ہے روشنی کا نام لوگو!
بہت موزوں ہے قامت پر تمہارے	قبائے گردشِ ایام لوگو!
ازل سے ہیں وفاداری کا انعام	یہی دار و صلیب و دام لوگو!
تمام نقش جبیں تھے تری توجہ تک	یہ دھوپ اُتری تو ہر جسم سایا سایا تھا
کہیں اس کو بھی نہ اندر کا اندھیرا ڈس لے	روشنی سے کہو فانوس کے باہر اُترے
نفس کو سینے کے اندر ہی نیند رکھئے اب	کہ آدمی اسی حیلے بکھر چکا ہے بہت
وہ جس کو غالب و حافظ کا ذہن چھو نہ سکا	غزل کی حد میں وہ فکر و نکات بھی رکھ دو
فکر کی رو کسی تحریک کی پابند نہیں	سچے شاعر ہو تو ذہنوں کو کشادہ کر لو
نور چہروں پہ، ضمیروں میں اندھیرا ہے یہاں	کوئی کردار نہ تیرا ہے نہ میرا ہے یہاں
مصلحتِ ایام نہ تھی یہ مجبوری حالات کی تھی	ہم ہاتھوں میں پتھر لے کر شیشے سے مرعوب ہوئے

اردو شاعری میں فضا ابن فیضی یقینی طور پر ان چند لوگوں میں ہیں جنھوں نے غیر ضروری حد تک داخلیت کو اپنے اوپر سوار نہیں کیا ہے۔

مطمئن شخص اپنے مسئلوں میں تھا بہت	بستیوں میں جو نہیں وہ جنگلوں میں تھا بہت
تھی دلیلِ راہِ جنون نہ فکر اس کی ذہن سا	اک وہ تنہا شخص ہم سے پاگلوں میں تھا بہت
کہہ سرشت ہے اور گرد گرد ہے وہ شخص	کہ اپنی ذات سے محو نبرد ہے وہ شخص

زندگی خود کو نہ اس روپ میں پہچان سکی　　آدمی لپٹا ہے خوابوں کے تعفن میں ایسا

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے :-

" ان کے استعاروں کی ندرت، الفاظ کی تازگی اور پیکر تراشی اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں اپنے فن پر اعتماد ہے۔ "

اس سلسلے میں یہ انکشاف بھی برمحل ہوگا کہ یہ اعتماد کوئی سال دو سال کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ سالہا سال کی ایثار و قربانی کے بعد ان کے ہاتھ آئی ہے۔ انھیں کا شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ایک لمحے کی ریاضت نہیں یہ طرزِ سخن　　رفتہ رفتہ مرے آئینے میں جوہر اُترے

فضا ابن فیضی کی سالہا سال کی ریاضت نے ان کے فن کو ایسی تراش خراش عطا کر دی ہے کہ بہت سے ماقبل کے ادبی شاہکار کو اپنے شعر سے ماند کر دیتے ہیں۔ فیض احمد فیض کا مشہور قطعہ :-

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے　　کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے　　ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اس میں کوئی شک نہیں کہ پچھلے پندرہ برسوں سے یہ قطعہ غیر معمولی طور پر ہر دلعزیز رہا ہے۔ لیکن یہ قطعہ اگر کسی دوسرے سے موسوم ہوتا تو کبھی اتنی شہرت حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کی ہر دلعزیزی کا سبب فیض کی اپنی ذاتی قربانی ہے۔ جسے وہ جیل کی پابندیوں کی شکل میں دے رہے تھے۔ لیکن فضا ابن فیضی کے ذیل کا شعر ملاحظہ کیجئے جو کسی ذاتی قربانی کا مرہون تو نہیں ہے لیکن ایک عام فنی کرب کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایک شعر ہونے کے باوجود تاثر کے لحاظ سے قطعہ سے آگے ہے۔ کسی ناول کی دلچسپی کا مقام اس کا کلائمکس ہوتا ہے۔ لیکن شعر میں وہ کام ایک ایک لفظ کرتا ہے۔ لفظ " عذاب " کا ذیل کے شعر میں احاطہ کیجئے

قلم بھی لوح بھی حرف و کتاب بھی لے جاؤ　　جو سہہ سکو مرے فن کا عذاب بھی لے جاؤ

فضا ابن فیضی ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے ہم نوا نظر آتے ہیں کہ شاعر کا کام بنیادی طور پر ہمیشہ زبان میں انقلاب پیدا کرنے کا نہیں ہوتا۔ اُردو کی غزل کی خاص طرزِ ادا جس اظہارِ بیان میں غیر یقینی کیفیت کو جزوِ کلام بنایا جاتا ہے، اسے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ مومن کی مشہور غزل

" کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو "

کی شہرت کے پیچھے یہی طلسم کارفرما ہے۔ مولانا حسرت موہانی مرحوم نے اپنی مختصر کتاب " کائناتِ سخن " میں جمع کے استعمال کو محاسنِ سخن میں شمار کیا ہے غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ تغزل کے لئے رمزی اور الہامی کیفیت نہایت ضروری ہے۔ فیض کے مشہور اشعار میں اکثر اسی پیرائے سخن کے حامل ہیں چند اشعار یاد کیجئے ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں　　وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

جانے کس رنگ میں تعبیر کریں اہلِ ہوس

مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

لہٰذا فضا ابن فیضی کے یہاں بھی اسی طلسم کی کارفرمائی ہے۔

ایک طرح کی شہرت ٹھہری عشق میں یہ رسوائی بھی
جس کی تم نے بات نہ پوچھی اس کے چرچے خوب ہوئے

اب جو کچھ ہو موسم گل کے پہلے یہ تیور نہ تھے
کتنے نازک غنچے اپنی شاخوں پر مصلوب ہوئے

میرے فن کی دھڑکنیں چن لو رفیقانِ قلم
کون جانے کب نوا کا یہ سویرا ڈوب جائے

یہ نکہتِ بہار ہے یا کاروانِ درد
لے جا کے دور اس کو چمن سے اتار دے

تم مجھ کو دیکھ کر بھی نہ پہچان پاؤ گے
بے چہرگی کی بزم تماشا میں قید ہوں

خراشِ درد کا آئینہ ہوں مجھے دیکھو
یہ بانکپن بھی کہاں ہے کسی کے چہرے پر

نہ جانے پیاس کا کب زاویہ بدل جائے
سبو کدوں میں چمکتے سراب بھی لے جاؤ

کچھ اور ہو نہ جائیں جنوں والے بے لباس
عریانیِ جنوں کو خرد کی قبا نہ دے

ایک ایک حرف مصلحتوں کی زبان ہے
یہ چیز آبروئے سخن کو گھٹا نہ دے

یہی جگنو شب ہستی کو اجائیں گے فضا
ہاتھ میں شمع نہ لو پلکوں پہ تارے چن لو

ہمت ہو تو آؤ فضا کی کاوش پر تنقید کرو
فن پارہ ہے اس کے قلم کا وہ گیسو اور وہ چہرا

اس انجمن میں جہاں کوئی داستاں نہ ملے
مجھے کہ ہوں صفتِ حرف معتبر لے جا

یہ آئینہ مرے ہاتھوں میں گل رخوں نے دیا
مجھے خبر نہ تھی ورنہ کہ میں بھی چہرہ ہوں

یہی شعور کی تلخی ہے زندگی کی مٹھاس
چھڑک کے زہر سا احساس پر گیا ہے کوئی

زلیں

لبوں کی دھوپ، بدن کا شباب مت پوچھو
جو اس کے ہم پہ ہوئے ہیں عتاب مت پوچھو

میں جس کو ٹوٹ کے چاہوں وہ میرا دشمن ہو
تعلقات کے یہ انقلاب مت پوچھو

بچھڑتی شام کا ہر اقتباس بھول چلو
کہاں پہ کھوئی شکستہ کتاب مت پوچھو

وہ قبر قبر گذرتا ہوا اکیلا پن
وہ سرد، سرد ہوا کا عذاب مت پوچھو

ہر ایک شخص بظاہر خلوص آلودہ
تمام سینوں میں اک اضطراب مت پوچھو

عین تابش

تمام عمر رہے ہم انتظار آلودہ
وہ بے رخی تھی بہت اعتبار آلودہ

بدن پہ ٹھہرا ہوا حادثات کا موسم
دل و نگاہ کی محفل غبار آلودہ

پناہ لیتا ہوا میری رہگذر میں ہے
سراغ شام کا منظر خمار آلودہ

یہاں کوئی بھی کسی تک پہونچ نہیں سکتا
یہ زندگی ہے سراسر حصار آلودہ

وہاں بھی صبح سے گھڑیاں ہی گن رہا ہے کوئی
یہاں بھی ہے رخ شام انتظار آلودہ

غزل

کرشن کمار طور

اُتر رہا ہے وہ لمحہ جو سر بریدہ نہ تھا
مرے وجود کے آگے ہجوم دیدہ نہ تھا

مقامِ قافلۂ عمرِ شاید آ پہنچا
وہ ہے سکوتِ صدا جو کبھی شنیدہ نہ تھا

کھلی قدنا جو ملی ہے شکستہ پر سا گرا
یہ میری ذات کا سیارہ خوں چکیدہ نہ تھا

خود آپ قید رہا ہوں ناک اندھیرے میں
غبارِ سیلِ خلا آفتاب دیدہ نہ تھا

زمیں کی خوشبو ہی پاؤں سے کچھ چپک سی گئی
میں اُڑ سکا نہ کہ ایسا بھی پر بریدہ نہ تھا

کبھی تو بنتا درِ زندگی یہ پیکرِ خواب
بہت اُداس سہی دل غم آفریدہ نہ تھا

جو مُنہ پہ کہتے ہوئے طورؔ تم بجا ہی سہی
مگر یہ وصف کسی دور میں حمیدہ نہ تھا

کوئی پکڑو

جوگندر پال

ٹن !

کلاک کی صدا سُن کر میں نے کتاب سے نظر ہٹا لی ہے۔

ٹن !

مَیں نے کلاک کے چہرے پر آنکھیں ٹکا لی ہیں اور سوچنے لگی ہوں کہ اب تیسری ٹن کی صدا برآمد ہوگی۔

ٹن ! — اور اب چوتھی۔ اب چوتھی۔ اب پانچویں۔ چھٹی — اور اس کے بعد اب ساتویں گھنٹی نہ بجے تو بے یقینی سے میرے حواس مختل ہو کر رہ جائیں۔ آٹھ۔ نو۔ میں یونہی گھنٹیوں کو گنتی جا رہی ہوں۔ گیارہ۔ بارہ مَیں بس گھنٹیاں گنتی رہ گئی ہوں اور اس اثنا میں وقت سرک کر آگے آ گیا ہے۔ بارہ تو اُسی وقت بج گئے تھے جب بجنے شروع ہوئے تھے مگر مَیں گھنٹیاں گنتی رہ گئی —— اب یہ وقت کہاں سے آئے گا؟ ابھی ابھی آیا بھی، اور ٹِک ٹِک چلا بھی گیا۔ ٹِک ! — ٹِک — ٹِک — ! جا رہا ہے۔ بس ایک ٹِک رک کر میری طرف مڑ کر دیکھ لے تو مجھے قرار آ جائے — ٹھہرو ! اپنے ذہن میں مَیں نے اُسے بے اختیار پکارنا چاہا ہے مگر وہ بدستور ٹِک ٹِک چلا جا رہا ہے۔ گزشتہ چھبیس سال سے ایک بار بھی مجھ سے 'ہیلو !' کہنے کو نہیں رُکا۔ میں اُسے جانتی ہوں نہ وہ مجھے، اور — اور مَیں اُس کی اجنبیت کی اس قدر عادی ہو چکی ہوں کہ اگر وہ کبھی واقعی اچانک رک جائے اور میری طرف دیکھنے لگے تو — تو میں بوکھلا کر، دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بھاگ نکلوں۔ میری ساری عمر یوں ہی گزرتی جا رہی ہے کہ وہ مجھ سے کوئی بات کرے، ہماری جان پہچان ہو، مگر جب مجھے خیال آتا ہے کہ وہ سچ مچ کبھی رک کر، میری طرف مُڑ کر دیکھے گا تو میں گھبرا جاتی ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اُس سے کیا کہوں گی، مجھے اُس سے کیا کہنا ہے —

مَیں ابھی تک کلاک کا چہرہ تکے جا رہی ہوں جس پر اُس کے صرف یہی نقوش ہیں کہ ایک سے بارہ تک ہندسے پڑھے جا سکیں۔ کلاک کے دونوں ہاتھ گھوم رہے ہیں کہ اُس کے مُردہ ہونے کا گمان نہ ہو۔ اور — اور اگر آپ مجھے پاگل نہ سمجھیں تو میں کہوں کہ — کہ مجھے اکثر یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُس کے یہ دونوں ہاتھ لمبے ہو ہو کر میری طرف بڑھنے لگیں اور ان کی سوئیاں میرے منجمد وجود میں کھب جائیں اور درد سے بلبلاتے ہوئے خوشی سے میرا دم نکل جائے کہ مَیں ابھی مری نہیں، ابھی میں اپنا درد محسوس کر سکتی ہوں، ابھی رو سکتی ہوں —— مجھے روئے ہوئے نامعلوم کتنے برس بیت چکے ہیں۔ میرا رونے کو جی چاہتا ہے۔ اور ہنسنے کو بھی۔ لیکن مجھے قطعاً یاد نہیں کہ میں کبھی روئی یا ہنسی ہوں گی میرے ساتھ کبھی کوئی ایسا واقعہ — یا حادثہ بھی — پیش نہیں آیا جس سے میں تالیاں بجاؤں یا دھاڑیں مارنے لگوں۔ مجھے بکھر جانے کی، بکھر کر اپنے قابو سے باہر ہو جانے کی شدید خواہش ہے۔ لیکن میرا چہرہ دھوپ یا ابر کی کیفیات سے عاری رہتا ہے، تھکی ماندی شام کا میلا ہوتا ہوا آکاش، جس کی طرف گھور گھور کر بھی دیکھیں تو اس کے خالی پن کے سوا کچھ اور محسوس نہ ہو۔ اب جلدی سے رات کیوں نہیں آ جاتی؟ ٹائم نصف

شب سے بھی آگے بڑھ رہا ہے لیکن رات نہ تو شام کی دھندلاہٹ میں کھوئی پڑی ہے۔ تاریکیاں اُمڈ آئیں تو ستاروں کے غول کے غول کہیں سے میرے چہرے پر آنکلیں، میں آباد ہو جاؤں، اور اپنے ستاروں بھرے آنچل کو کھلی ہواؤں میں اڑا کر اپنے پیچھے پیچھے بھاگنے لگوں اور بھاگ بھاگ کر کبھی نہ تھکوں ــــــ لیکن میں ویسی کی ویسی یہاں اپنے بیڈ پر یم دراز ہوں اور آرام کر کر کے تھکن سے میرا دم نکلا جا رہا ہے مگر نکلتا نہیں ــــ اور وقت کے ہاتھ میرے خالی خولی چہرے کی گولائی میں گھوم رہے ہیں تاکہ میری موت کا گمان نہ ہو ــــــ اور ــــــ اور بس ــــ

بس اسی طرح میں نے اپنی عمر کے چھتیس سال بتا دیئے ہیں ــ ایک سے بارہ ــــ ، ــــ ہر گھنٹے پر میرے وجود سے صدا بلند ہوتی ہے لیکن ہوتا کچھ بھی نہیں۔ میں نے عمر بھر نہ جانے کتنی گھنٹیاں گنی ہیں اور ــ اور اب مجھے ہر گھنٹے کے گزرنے پر خوف محسوس ہوتا ہے کہ ایک اور گھنٹی بجے گی اور ــــ اور کچھ بھی نہ ہوگا۔

رات کے ساڑھے بارہ بجنے کو آرہے ہیں اور پچھلے چند منٹوں میں میری نظر کتاب میں قطار در قطار کھڑے الفاظ میں سے اس طرح گزری ہے جیسے اُن سے گارڈ آف آنر قبول کر رہی ہو اور وہ اپنی اپنی ذات کو ایک ہی وردی میں چھپائے یکساں اور بے ذات معلوم ہو رہے ہوں ــــــ

اچانک میرے کانوں میں کھٹکا سا ہوا ہے اور چونکہ ایسا کھٹکا اکثر ہوتا ہے اس لئے میں نے اس سے بے توجہی برت کر کتاب سے نظر نہیں اُٹھائی ہے اور باوردی الفاظ کو گھورے جا رہی ہوں کہ شاید کسی کی پتلون ڈھیلی ہو اور میرے دیکھتے دیکھتے اپنے آپ نیچے آ گرے اور پھر ــــ اور پھر ــــــ اِس لفظ کی رانوں پر تنومند مچھلیاں بے تحاشہ تیر رہی ہیں۔ میں ان کے اتنی قریب ہوں۔ ذرا سا میری طرف اچھل کر یہ مجھے اپنی ننی ننی تندی سے نوچنا شروع کر دیں تو ــــ تو ــــــ جب بھی

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شے (؟) میرا ریپ کرنے کے لئے میری طرف بڑھ رہی ہے تو میں اپنے آپ کو وہیں کی وہیں ڈال دیتی ہوں ــــ لو، جو چاہو کر لو! لیکن کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تھوڑی دیر میں جوں کی توں وہیں ڈھیلی ڈھالی پڑی رہتی ہوں اور پھر اپنے کپڑے جھاڑتی ہوں سیدھی کھڑی ہو کر اپنے معمول کی جانب متوجہ ہو جاتی ہوں۔

ٹن!

کلاک کی ساڑھے بارہ بجے کی گھنٹی سن کر میں نے پھر اُس کے بے نقش چہرے کی طرف دیکھا ہے، اور چونک کر پھر دیکھا ہے جیسے مجھے لگا ہو کہ میری آنکھ نے وقت کی سدا بہار شکل کو نقاب کے پیچھے چھو لیا ہے ــــ ایک سے بارہ، اور پھر ایک سے بارہ، اور پھر ــ بارہ صرف بارہ تک نہیں، کیونکہ ہر بارہ کے بعد وقت کا سفر از سرِ نو ایک سے بارہ کی جانب شروع ہو جاتا ہے۔

"وقت ہر وقت نو عمر ہے۔"

"بکواس!" میں نے اپنی بوڑھی پروفیسر دوست کو بے صبر جواب دیا تھا۔

"دو قدم چل کر اُس آئینے سے مشورہ کیجئے، وہ وقت کی ایک ایک جھری کھول کر آپ کو دکھا دے گا۔"

"نو مائی ڈیئر میڈم" اُس نے کہا تھا۔ "وقت کی ہر نئی جھری بھی نو عمر ہے اور حیاتِ نو میں اور زیادہ اعتماد اور جرأت سے شریک رہنے پر اصرار کرتی ہے۔"

"اور قدیم جھریاں؟" میرے چہرے پر ابھی ایک بھی جھری نہیں آئی ہے تاہم اپنے چھتیس سالہ چہرے کو آئینے میں دیکھ دیکھ کر کئی بار مجھے لگتا ہے کہ اس کے اندر جھریاں ہی جھریاں ہیں، اُس وقت تک کی جھریاں، جنھیں آخری انسان کے چہرے پر بھی آنا ہے ــــــــ"

"نہیں۔" میری شریک کار نے کالج کے اسٹاف روم میں کافی کے گھونٹ سے اپنی تھکن پر غلبہ پا کے نہایت تحمل اور رجائیت سے

مجھے بتایا تھا۔ آخری انسان ہمیشہ نوجوان ہوتا ہے اور —
اور خدا کا شکر ہے کہ تم اور میں ہی وہ آخری انسان ہیں اور
خدا کا شکر ہے کہ ہم سدا جوان رہیں گے۔۔۔"
میرا جی چاہتا ہے کہ کسی مچھر کے مانند مسرت سے بے نیتا
اُڑ کر کلاک کے چہرے کے آس پاس بھنبھنانا شروع کر دوں۔ لیکن
مجھے کچھ کھڑکا سنائی دیا ہے اور میرے کان بیٹ کھلے بالوں سے باہر
نکل آئے ہیں۔ کون ہے؟
ٹک ٹک — ٹک!

وہی وقت!
نہیں، کلاک کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کر مجھے یک دم
لگا ہے کہ یہ کوئی اور ہے۔
کون ہے؟
کوئی اور! — کلاک چلتے چلتے ٹھہر سا گیا ہے۔
جب اپنی چال چلے جا رہا تھا تو بے جان تھا، جیسے ان گنت
لوگ میری طرف دیکھے بغیر میرے پہلو سے گزر جاتے ہیں اور مجھے
خیال ہی نہیں آتا کہ وہ واقعی زندہ ہیں — لیکن وہ —
وہ جب میرے قریب آ پہنچا تھا تو مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ٹھہر جائے گا
اس قصے کو اب اتنا عرصہ ہو گیا ہے کہ مجھے اُس کی شکل و صورت
بھی یاد نہیں رہی۔ کوئی بھلی سی صورت تھی ورنہ میری اُمید کیوں
بندھ جاتی کہ وہ ٹھہر جائے گا، پر میں نے امیدیں باندھنے میں
ہی سارا وقت گنوا دیا اور وہ چپکے سے گزر گیا، اتنی سی دیر میں
ہی بہت دور پہنچ کر، دھندلا سا ہو کے بھونڈوں میں جا ملا۔ مجھے
اب اُس کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ بڑا بھلا نام تھا — کیا نام تھا؟
ہائے منہ پر آنے سے پہلے ہی میرے اندر کہیں کھو جاتا ہے۔ بڑا تیز
قدم تھا۔ میں بھی لمبے لمبے قدموں سے اُس کے ساتھ ہو لیتی تو اس
وقت جہاں بھی ہوتی اُس کے ساتھ ہی ہوتی، پر میں وہیں پڑی
رہ گئی اور اُسے کھو کر چپ چاپ اپنی بندھی ہوئی امیدوں کی
گانٹھوں کو کھولنے میں لگ گئی، مگر یہ گانٹھیں اتنی کسی ہوئی تھیں

کہ مجھ سے یہ کھلنے میں نہ آتی تھیں اور اپنی لاچاری کے احساس سے
مجھے اپنی رو دینے کی خواہش پر قابو نہ رہا تھا۔
یہ محسوس کر کے مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں سچ مچ کبھی
رو رہی ہوں گی لیکن مجھے شک ہے کہ میں روئی نہ ہوں گی،
اپنی رونے کی خواہش سے نظر بچا کر وہاں سے چل پڑی ہوں گی۔

کون ہے؟
اور دیوار پر کیلوں سے گڑا ہوا کلاک کھلکھلا کر ہنس
پڑا ہے اور ہنستے ہنستے اُس کا متحرک باطن اُس کے چہرے میں
آ بسا ہے اور اُس کا چہرہ جی اُٹھا ہے اور میں نے اپنے آپ سے
کہا ہے کہ واقعی یہ کوئی اور ہے۔
کوئی اور کون؟
وہی! — ہاں، وہی ہے جو میرے پہلو سے گزر گیا تھا
اور میں دیکھتی رہ گئی تھی۔ اُسے آواز دے کر روک لیتی تو شاید
رک جاتا لیکن — ہاں، وہی تو ہے — میں شاید
اپنے ہوش میں نہیں ہوں اور مجھے خوف لاحق ہو رہا ہے کہ ہوش
میں آ گئی اور میری آنکھ کھل گئی تو میں اندھی ہو جاؤں گی اور
یہ کلاک مجھے پھر کلاک کا کلاک دکھائی دینے لگے گا —
مجھے ہوش نہیں لیکن میں اُسے بڑے غور سے دیکھ رہی ہوں۔
ہاں، وہی ہے! — وہی کون؟ — نہیں، مجھے اپنا
اطمینان نہیں کرنا ہے۔ یہ شکل جو بھی ہے، وہی ہے۔ جب میرے
ذہن میں — میرے حواس گم ہیں تو میرا ذہن؟ — میرے
ذہن میں اُس کی کوئی شکل ہی نہیں تو ہر شکل اُسی کی ہے بس وہ آپ
وہی ہو، شکل اُس کی اپنی ہو یا کسی اور کی، یا — کوئی شکل نہ
بھی ہو — نہیں، کوئی نہ کوئی شکل تو ضرور ہو گی۔
کھلکھلاتا ہوا کلاک مصلوب ہونے کے باوجود میری
جانب تکے جا رہا ہے جیسے میری محبت میں اُس کی صلیب کی اذیت
بھی بھول ہو گئی ہو۔ اُسے اپنی طرف یوں دیکھتے ہوئے پا کر مجھے اپنے
ہونے کی بھی خبر نہیں رہی ہے۔ نہیں، وہ جو بھی ہے وہی ہے جو

مجھے دیکھے جا رہا ہے ——— میں کلاک کو نہیں دیکھ رہی ہوں، وہی مجھے دیکھے جا رہا ہے، یا شاید میں — میں ہی کلاک ہو گئی ہوں، وقت ہو گئی ہوں، لامحدود وقت، جو گزر کر پھر لوٹ آیا ہے۔ میرے چاہنے والے نے مجھے اپنی محبت بھری نظروں سے چھو کر میری ساری توانائی لوٹا دی ہے۔ وقت، سارے کا سارا وقت میرے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ میرے نصیب جاگ اُٹھے ہیں۔ میں اکیلی نہیں رہی۔ وہ ہر گھڑی میرے ساتھ ہے، اِس گھڑی بھی!

اپنے فلیٹ کی نچلی منزل سے پھر مجھے کھٹکا سنائی دیا ہے
ٹن!

ایک بج گیا ہے — نہیں، مجھے ڈر محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ میرا ڈر میرے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ کسی معمولی واقعہ سے بھی ڈر سے میرا پسینہ چھوٹنے لگتا — وہ رات — اُن دنوں کی بات ہے جب میں اپنے ام لے کے فوراً بعد نئی نئی کالج کی لیکچرار بنی تھی۔ اس رات کو میں اور کالج کی ایک اور لیکچرار کو کسی فنکشن سے لوٹتے ہوئے بہت رات ہو گئی اور اُس اندھیری، اُجاڑ سڑک پر اپنے ہی قدموں کی آواز سن کر ہمیں یہ گمان ہو رہا تھا کہ کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے — آج اپنے قدموں کی آواز سن کر اکثر مجھے یہ خیال گزرتا ہے کہ میں ہی اپنے پیچھے پیچھے آ رہی ہوں اور میں اپنے قدم آہستہ کر لیتی ہوں لیکن اُسی دم میرے پیچھے میرے قدم بھی از خود آہستہ ہو جاتے ہیں اور میرے اور میرے درمیان یہ فاصلہ کبھی کم ہونے میں نہیں آتا۔ میں ہمیشہ اپنے پڑوس میں ہی کہیں ہوتی ہوں لیکن مجھے کبھی اپنے ساتھ ہونا نصیب نہیں ہوتا۔ ساری عمر ڈر ڈر کر اب میرے لئے ڈرنے کو کچھ رہا ہی نہیں لیکن اس رات میرا اور میری ہم عمر دوست کا برا حال تھا۔ ہمیں اپنا اپنا ڈر محسوس ہو رہا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ اپنے اپنے ڈر سے ہم سبھی مانوس ہوتے ہیں، اپنے ڈر سے کیا ڈر؟ ——— مشکل یہ تھی کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کا ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ ہماری موت دراصل کسی ایسے ہی ڈر سے واقع ہوتی ہے، وہ ڈر، جو باہری جراثیم کی مانند ہمارے اندر گھس کر ہماری باشندگی کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ اپنی ہی ذات کے اندیشوں سے کیا ڈر! ———

میری دوست اور میں تیز تیز چلنا چاہ رہی تھیں لیکن ہمارے قدم اتنے بھاری ہو گئے تھے کہ اُٹھائے نہ اُٹھتے — اُٹھو! جیسے ہمارے پاؤں ہمارے نہ رہے ہوں اور ہم خوف کی شدت سے بے پا ہو کر رہ گئے ہوں اور ہماری منزلیں ہمارے مستقبل کی مانند ہمارے سامنے رات کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہوں اور واقعی اُن کی جانب چلنے کی بجائے ہم دل ہی دل میں چل رہی ہوں ——— اور اتنے سال چل چل کر میں اب یہاں آ پہنچی ہوں، اپنے فلیٹ کے اِس بیڈ۔روم میں اور بدستور اپنی انجانی منزل کی طرف چل رہی ہوں اور میری دوست اپنے دل کے راستے نامعلوم کہاں جا پہنچی ہے۔ اپنی راہ کی اس گھور تاریکی میں ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ ہم کہاں جدا ہو گئیں، کہیں نہ کہیں ہمیں اپنے ہر ہمراہ سے جدا ہونا پڑتا ہے — اور ہمیں معلوم ہی نہ ہو کہ ہم کب جدا ہو گئے تو ہم جدائی کی صعوبت سے بچ جاتے ہیں۔ میری دوست میری بڑی پیاری دوست تھی لیکن اس وقت مجھے لگ رہا ہے کہ اس کا اپنا کوئی وجود تھا ہی نہیں، میں اُسے عالم تصور میں کہیں ملی ہوں گی اور اس وقت اُسے اپنے خیال سے از سر نو برآمد ہوتے ہوئے دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے ——

اب کے میرے فلیٹ کی نچلی منزل پر زور سے کھٹکا ہوا ہے۔ شاید کوئی چور — ! ساری عمر اکیلی رہ رہ کر میں بڑی بے خوف ہو چکی ہوں لیکن — ٹھن — ٹھ ٹھ — ن! کراکری کے گرنے کی آواز سُن کر شاید میں یہاں اپنے بستر میں اچھلی ہوں یا نیچے میرے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں کوئی چور ——— اور پھر سناٹا سا ہو گیا ہے جیسے چور اپنی سانس روک کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا ہو۔ میں چوکس ہو کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی ہوں اور

میرے کان بلے ہو ہو کر دبے پاؤں میرے بیڈ روم کے باہر سیڑھیوں پر آ کھڑے ہوئے ہیں اور سیڑھیوں کے جنگلے پر اس قدر نیچے جھک گئے ہیں کہ میرا دل دھڑکنے لگا ہے کہ وہ جنگلے کے نیچے میرے فلیٹ کے لِونگ روم میں جاگریں گے اور اُن کے ساتھ میں بھی اور ــــ اور ــ میں ہنس پڑی ہوں ـــــ نہیں، کوئی نہیں، بلّی ولّی ہوگی ۔ میں نے اپنی نوکرانی سے کئی بار کہا ہے کہ رات کو اپنے گھر جانے سے پہلے ڈائننگ ٹیبل سے کراکری اُٹھا لیا کرے ۔ بڑی بے پرواعورت ہے ۔ ـــــــــــــ

ٹیبل لیمپ کو اپنی طرف جھکا کر میں پھر لیٹ گئی ہوں اور کتاب میں وہ صفحہ ڈھونڈنے لگی ہوں جہاں تک میں نے پڑھ لیا ہے ۔ یہ گھٹیا سا عشقیہ اور جاسوسی ناول ہے ۔ میرے ساتھ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ اپنے بڑھیا اعمال سے مجھے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے اور میں اپنی بے ہودہ خواہشوں کو بلا لیتی ہوں اور اُن میں سے کسی کم سے کم ضرر مند خواہش کو رات بھر کے لئے روک کر باقیوں کو رخصت کر دیتی ہوں ۔ کتابیں سو بُری ہوں پر کیا بُری ہیں ۔ کبھی کبھی بُرے خیالوں سے ہی کوئی نیک دل بہلے تو اُسے کیوں نہ بہل جانے دیا جائے ؟ جی ہی جی میں بیسیوں برائیاں کر لیتے ہیں ۔ اُن سے کسی کو نقصان تو نہیں پہنچتا ـــــ پرسوں رات کو اس نمائش میں امریکی اسٹال پر وہ نوجوان مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا ۔ میں اُسے اپنے فلیٹ میں لے آئی ـــــ یعنی جی ہی جی میں! میرا ذرا سا دل بہل گیا تو اُس کا کیا بگڑا ؟ مجھ سے کونسا گناہ سرزد ہو گیا ۔ ؟ اُسے تو خبر بھی نہ ہوئی کہ اس اثنا میں وہ میرے ساتھ تھا ! ۔ گناہوں سے بچنا ہو تو اُنھیں سچ مچ کر کے سب کچھ اُتھل پتھل کرنے کی بجائے دل ہی دل میں کر لینا چاہیے ۔

کتاب میں مجھے اپنا صفحہ مل گیا ہے ۔ اپنا صفحہ ۔ ؟ ہاں ! یہ یاد کر کے مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ میں اس کتاب میں کہیں کھو گئی تھی اور کھو کر وہیں کسی سیاق سے جُڑ گئی تھی اور جُڑ کر ان اوراق میں دفن ہو کر رہ گئی تھی اور قبر کو کھود کھود کر اپنے آپ کو ڈھونڈ رہی تھی ـــ بالآخر مجھے اپنا آپ نظر آنے لگا ہے ۔ میں نے اپنے آپ کو مٹی ہونے سے بچا لیا ہے ۔ میں ابھی زندہ ہوں ، یا زندہ نہیں تو کم سے کم میرا وجود ابھی جوں کا توں ہے میں اپنے آپ کو ضائع ہونے سے بچا لوں گی ، بچا کر ہی دم لوں گی میں نے اپنے منہ سے منہ لگا لیا ہے اور ـــــ اور آرٹی فشل ریسپی ریشن کے عمل سے مجھے اچانک اپنی سانسوں کا تواتر محسوس ہونے لگا ہے ، میں بچ گئی ہوں اور مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے اور ـــــــ

اور میں خوشی خوشی پڑھنے میں منہمک ہو گئی ہوں اور پڑھتے پڑھتے تھک گئی ہوں اور پڑھا ہوا بے اختیار پھر پڑھنے لگی ہوں ؛ ایک لڑکی ہے ، پگلی لڑکی ، جو کسی کچے راستے پر اکیلی کھڑی ہے ۔ اُس کے آگے پیچھے کوئی بھی نہیں لیکن وہ لگاتار چیخ چیخ کر گالیاں بکے جا رہی ہے اور اپنی آواز سن سن کر اُس کا پاگل پن بڑھتا جا رہا ہے ـــــــ اور اسی اثنا میں کہیں سے اُس کے سامنے ایک میلا کچیلا نوجوان آ کھڑا ہوتا ہے اور پگلی کی جانب مسکرا مسکرا کر دیکھنے لگتا ہے اور ـــــــ

اور میرے انہماک نے میرا سارے کا سارا وجود چاٹ لیا ہے اور میں اپنے بستر سے غائب ہو گئی ہوں اور الفاظ کتاب کے مدفن سے اُٹھ کر کائنات میں رچ بس کر سانس بھرنے لگے ہیں اور میں بھی کہیں اُنہیں میں کھو کر سانس لے رہی ہوں ۔

وہ میلا کچیلا نوجوان بدستور محبت سے مسکرائے جا رہا ہے اور وہ پگلی اُس کی مسکراہٹ سے چھوتے ہی بولتی بولتی چپ ہو گئی ہے اور اُس کی پاگل اور ویران آنکھیں جھپک جھپک کر ہوش مند نکل آئی ہیں ۔

" اپنی گالیوں کے ٹکڑے کس کے منہ پر پھینک رہی تھی پگلی ؟ "

" کھالی کھولی ہواؤں میں رے ۔ " پگلی نے شرما کر اپنی جھلمل جھلمل ہوشمندی سے سر ڈھانپ لیا ہے ۔

" تو اب چُپ کیوں ہو گئی ہو ؟ "

"اب تو جو آ گیا ہے۔" پگلی نے جواب دیا ہے۔ "آگے
پیچھے کچھ نظر نہ آئے تو پاگل ہو رہے کو گالیوں کے سوا کچھ سوجھتا ہی
نہیں۔ ——"

اپنے خوف کی لہروں سے اچھل کر میں پھر اپنے بستر پہ
آ گری ہوں —— نہیں! —— میں اپنے آپ کو پاگل ہونے سے بچا
لوں گی۔ مجھے پاگل نہیں ہونا ہے، مجھے جینا ہے، جی جی کا اپنی
زندگی کا مکین بننا ہے، لیکن ——

لیکن میں یہاں اپنے شہر کے سب سے بڑے چوراہے پر
کھڑی ہوں اور لوگوں کے جھنڈ کے جھنڈ آ جا رہے ہیں اور ——
اور میں ان سب سے بے حد مانوس ہوں، ان میں سے ایک ایک
کی اجنبیت سے مانوس! —— مجھے کوئی نہیں جانتا، کوئی بھی
مجھ کو جیسے طرف نہیں چلا آتا، سب گزر جاتے ہیں، میرے
پاس سے اس طرح گزر جاتے ہیں گویا میں یہاں ہوں ہی نہیں
مجھے ہونا ہے، ہو جانا ہے۔!

میں جاگ رہی ہوں یا سو رہی ہوں؟ —— اگر سو رہی
ہوں تو —— ٹھک۔ ک —— تو میرے فلیٹ
کے نچلے کمرے میں سیڑھیوں کے قریب کسی کے ٹھوکر کھانے کی یہ
آواز کس نے سنی ہے؟ —— دھپ۔ پ! اس نے یہاں
اوپر آنے کے لئے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہے —— کیا
سو رہی ہوں؟ —— اس نے ایک اور سیڑھی طے کر لی
ہے —— ایک اور —— میرا ذہن اوپر کی آخری سیڑھی کی طرف
تک رہا ہے اور کان نچلی سیڑھیوں پر لگے ہوئے ہیں —— ایک اور
میرا خوف اور میرا انتظار گھم گھتا ہو گئے ہیں —— ایک
اور! —— مجھے اپنے کمزور سے خوف پر ترس آنے
لگا ہے —— دھپ، دھپ! —— دھ —— ! ——
اوپری سیڑھی سے برآمد ہوتی ہوئی شکل کو دیکھ کر میں نے اپنی آنکھیں
موند لی ہیں! —— کیا میں سو رہی ہوں! ——؟!
صبح میری آنکھ بہت دیر سے کھلی ہے۔ میرے بیڈ روم
کی اشیاء اس طرح بکھری پڑی ہیں گویا میں اپنے ذہن میں دیکھ
رہی ہوں —— رات کے چور کے خیال سے میں اچھل کر کھڑی
ہو گئی ہوں اور سرعت سے سبھی اشیاء کو دیکھ کر اپنا اطمینان
کر لینا چاہا ہے —— یہ میرے کپڑے —— اور
یہ زیورات اور —— یہ —— یہ نقدی —— ایک، دو
—— ایک، دو، تین —— دو سو تیں —— ہاں،
اتنے ہی تھے —— میں اطمینان سے واپس اپنے
بستر پر آ بیٹھی ہوں۔ تو پھر وہ لے کیا گیا ہے؟ —— میں لیٹ
گئی ہوں اور اس کی شکل کو اپنی آنکھوں کے سامنے لا رہی ہوں
اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں ——
اور اس کا میلا کچیلا سایہ اتنا بڑا تھا کہ سارے بیڈ روم میں
اس کے سوا کچھ اور نظر ہی نہ آتا تھا —— اور —— اور
وہ مسکرا رہا تھا، مسکراتے ہوئے میرے بستر کی طرف بڑھا تھا،
اور —— اور ——

وہ لے کیا گیا ہے؟
سبھی کچھ جوں کا توں پڑا ہے اور اپنے گلے میں باہیں
ڈالے، آنکھیں موندے میں نامعلوم کہاں پہنچی ہوئی ہوں اور
اور —— چونک پڑی ہوں —— ارے ہاں!
مجھے —— ! میں —— میں کہاں ہوں؟ —— کہاں
گ —— ؟!
میں بڑی بے چین ہو کر گویا چور کا پیچھا کرنے کے لئے
سیڑھیوں کی طرف لپکی ہوں —— ! ——

نسیمہ رحمانی

غزلیں

احساس کے شعلوں سے بدن میں تھی جلن سی
بھر دی تھی کسی نے مری نس نس میں اگن سی

گلپوش ہے رنگین ہے شاداب ہے موسم
پھر کس لئے ہوتی ہے مرے تن میں اگن سی

دیکھا ہے اُجالوں کو سسکتے ہوئے جب سے
کھنچتی رہی ہیں سانسوں میں ہوتی ہے گھٹن سی

کس غم کے تصور سے ہے بوجھل تری پلکیں
نکہت بھرے چہرے پہ نمایاں ہے تھکن سی

جلوؤں کے تبسم میں ترے کھو گیا عالم
جیسے تری یادوں میں بھی خوشبوئے چمن سی

چلتا ہی رہا شوق سمیٹے ہوئے احساس
ہوتی رہی پاؤں کے پھپھولوں میں جلن سی

پلکوں میں تری شام و سحر کے ہیں نظارے
زلفوں میں تری کہکشاں رنگین ہے گگن سی

مشعلِ مقتل پہ مظلوموں کے سر رکھ دیجئے
پھول سے معصوم چہرے آگ پر رکھ دیجئے

کون جانے سلسلہ کب ٹوٹ جائے سانس کا
پاس میرے جرم و عصیاں باندھ کر رکھ دیجئے

غالباً اس کے سوا کچھ بھی نہیں نظمِ جدید
چند لفظوں کے تراشے جوڑ کر رکھ دیجئے

نیم عریاں پیرہن میں شعلۂ جذبات ہے
چاہے مجھ پر تہمتِ ذوقِ نظر رکھ دیجئے

چاند تارے روشنی برسا کے بوڑھے ہو چکے
ایک بتی شام کی دہلیز پر رکھ دیجئے

جلوۂ خوباں کے رنگ اور روپ بکھرا دیجئے
زندگی اور زندگی کے غم ادھر رکھ دیجئے

ہو چکا قصہ پرانا حسن و گیسو کا نسیم
طاق پر اب خون آلودہ جگر رکھ دیجئے

اک اہتمامِ کیفِ مسلسل دکھائی دے
برسات تیرے پاؤں کی پائل دکھائی دے

ایسی گرفتِ شوق ہے میرے خیال پر
ابرِ بہار بھی ترا آنچل دکھائی دے

تیرے بدن کے نور سے روشن مہ و نجوم
شب کی سیاہی آنکھ کا کاجل دکھائی دے

کیا روشنی کا قحط ہوا تیرے شہر میں
ہر سمت تیرگی کی جو دلدل دکھائی دے

احساس کی کرن نے لگا دی ہے آگ سی
میری غزل میں وقت کی ہلچل دکھائی دے

دو میٹھے بول کو میں ترے یوں ترس گیا
پانی کو جس طرح کوئی گھائل دکھائی دے

طوفان میں پناہ ملے گی کہاں نسیم
بستی کا ہر مکان مقفل دکھائی دے

غزل

رئیس باغی

واپس کر دے گی خود قدرت ان کی جانب سارے پتھّر
سوچ سمجھ کر دیوانوں کو یارو کوئی مارے پتھّر

واقف ہے تاریخِ زمانہ سنّتِ اہلِ دل سے یہی
بازیٔ اُلفت میں گل جیتے اور مسلسل ہارے پتھّر

جتنے بھی آتے ہیں اِن تک ہنس کر سینے پر لیتے ہیں
دوست ترے دیوانوں کو تو جان سے بھی ہیں پیارے پتھّر

ایسی سنگ دلی سے ہم تو کیوں کسی کی سمت نہ پھینکیں
دنیا نے جس بیدردی سے شیشوں پر دے مارے پتھّر

ناقدری کی بات الگ ہے لیکن دنیا قدر کرے تو
ہیرے موتی سے بھی مہنگے بک جائیں بے چارے پتھّر

جیسا انھیں ماحول ملے گا، ویسا رنگ چڑھے گا ان پر
پانی میں یہ برف کے ٹکڑے آگ میں ہیں انگارے پتھّر

اس کے سینے سے بھی پھوٹیں پیار کی کلیاں شوق کے غنچے
لیکن شرط ہے اے دل والو خون سے کوئی دھالے پتھّر

ایک انھیں بت خانوں میں جڑ دے ایک کرے تزئین حرم کی
شیخ و برہمن دونوں کو ہیں ہر اک شے سے پیارے پتھّر

اس عالم کی شرح کروں کیا، دل کا کیا ہوتا ہے عالم
جن راتوں میں مجھ کو یارو لگتے ہیں سب تارے پتھّر

غیروں کو تو بیر تھا ہم سے، بدبختوں نے بغض نکالا
اپنوں نے کیا سوچ کے باغی آخر ہم کو مارے پتھّر

مَیں گوتم ہوں

عشرت ظہیر

مَیں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنے داہنے ہاتھ کے کٹ جانے کا کوئی غم ہے بھی یا نہیں۔ مَیں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ آج میں کتنا تنہا ہوں۔ لمحہ بہ لمحہ پھیلتی ہوئی یہ تنہائی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ بہتر۷۲ سال کی عمر کی یہ وسیع تنہائی کیا ہے؟ اور اوروں کی تنہائی کیا ہوتی ہوگی؟ اس خون آشام، شام کی تنہائی کیا تھی جب ہزاروں لاشوں میں عطر کور اپنے شوہر کی لاش تلاش کر رہی تھی۔ اس نے کیسی تنہائی محسوس کی ہوگی ــــ؟

نانک کی دھرتی کی خونیں بیساکھی تاریخ مجھے آج بھی یاد ہے۔

وہ ۱۳ر اپریل ۱۹۱۹ء کی ایک بے رحم شام تھی۔ جب اس مربع نما قطعۂ زمین پر بیس۲۰ ہزار افراد کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جن میں ایک میں بھی تھا۔ پھر اچانک ہی فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ ایک بولٹ میرے بائیں بازو کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس وقت میرا ہاتھ بچ گیا تھا۔ لیکن آج ــــ!

آج میرا ہاتھ میرے پاس نہیں۔ کھڑی ناٹ کھڑی کی گولیوں نے اُسے کھا لیا۔ جو کام غیر نہیں کر سکے وہ اپنوں نے کر دیا۔ آہ ــ! یہ وقت کتنا جابر ہے!

بولٹ کی طرح۔؟

کھڑی ناٹ کھڑی کی طرح ــ؟

اس کنوئیں کی طرح جس میں بھاگتے ہوئے سینکڑوں افراد گرے اور گر کر موت کی وادی میں گم ہو گئے تھے۔؟

یا ــ بورڈر سیکورٹی فورس کے کھڑی ناٹ کھڑی سے لگی ہوئی سنگین کی طرح۔؟؟

جبر و استبداد کا انسان آخر کب تک مقابلہ کرے گا ــ جبر و استبداد کا حوصلہ جوان ہوتا جاتا ہے اور انسان بوڑھا۔ میری طرح ــ اُس وقت میں بیس۲۰ سال کا تھا اور اب۷۲ سال کی عمر کا ــــ

اس وقت میرا ہاتھ بچ گیا تھا، مگر اب میں کافی بوڑھا ہو چکا ہوں، اسے بچا نہ پایا ــ اُف پچھلے چوبیس۲۴ گھنٹوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔ اور کسی کو کچھ پتہ بھی نہیں۔ گھر میں سب کس قدر پریشان ہوں گے۔ اور خاور ــ! وہ کتنا اداس ہوگا۔ کل رات وہ میرے پلنگ پر تنہا سو بھی سکا ہوگا۔؟ کیا اُسے میری یاد نہ آئی ہوگی۔! حسبِ معمول جب میں آٹھ بجے گھر نہ پہنچا ہوں گا تو اس نے کس کس سے میرے بارے میں نہ پوچھا ہوگا ــ!

لیکن کسے پتہ تھا کہ یوں اچانک فائرنگ شروع ہو جائے گی اور لوگوں کا تعاقب کر کر کے مارا جائے گا۔ کئی دن سے تو پُرسکون اور پُرامن تحریک جاری تھی، اس وقت کسی نے یہ سوچا بھی نہ تھا۔ پھر یہ کیسے ہو گیا ــ؟ کون اس کا جواب دیتا۔ لیکن گولی مجھے کیونکر لگی، میں تو فوراً ہی زمین پر لیٹ گیا تھا، اور سینے کے بل کتنی دور تک چلا گیا تھا، غالباً گولیوں کی رینج سے باہر۔ میں نے تو یہی سمجھا تھا۔ پھر ــ پھر ــ اُف اس نے تعاقب کر کے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ گویا انگارہ رکھ دیا تھا، اس نے میری باہوں میں ــــ!

خاور آئے تو اسے بتاؤں گا کہ یہ سماج کتنا بے رحم ہے،

بالکل ٹھری ناٹ ٹھری سے نکلنے والی گولیوں کی طرح، جو بازوؤں
میں گھس کر پورا بازو ہی کھا جاتی ہیں۔ میرے یہ کٹے ہوئے ہاتھ دیکھ کر
خاور کیا سوچے گا۔ کتنے سارے سوالات وہ مجھ سے کر ڈالے گا۔

سوالات ——— ؟

سوالات تو سر مائیکل اوڈوائر سے بھی کئے گئے تھے۔

" جب باغ میں داخل ہوئے تو تم نے کیا کیا ؟ " لارڈ
ہنٹر نے پوچھا تھا۔

" میں نے گولی چلا دی۔ " اس کا جواب تھا۔

" فوراً ——— "

" ہاں ——— "

" تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ فائرنگ شروع کرنے سے پہلے
لوگوں کو منتشر ہونے کے لئے کہنا مناسب تھا۔ "

" نہیں۔ "

" فائرنگ کرانے سے کیا تمہارا یہ مقصد تھا کہ لوگوں کو منتشر
کیا جائے۔ ؟ "

" جناب ! میرا مقصد اس وقت تک فائرنگ کرتے رہنا
تھا جب تک کہ لوگ منتشر نہ ہو جائیں۔ "

" جب عوام کے رویہ سے ظاہر ہو گیا کہ وہ منتشر ہو رہے
ہیں تو تم نے فائرنگ روکی کیوں نہیں۔ ؟ "

" میں نے سوچا، میرا فرض اس وقت تک ختم نہیں ہوتا
جب تک ہجوم منتشر نہیں ہو جاتا۔ اگر میں نے محض تھوڑی فائرنگ
کی ہوتی تو میرا گولی چلوانا بالکل غلط ہوتا ہے۔ "

میں خاور کو کیا جواب دوں گا۔ ؟

جب تک تعاقب کر کر کے انسانوں کے سینے میں بازوؤں
میں گولیاں نہ داغ دی جائیں، سنگین کی نوک سے نہ ہلاک کیا
جاتا، گوتم کی دھرتی سُرخ کیسے ہوتی۔ ؟ پھر تو گولی چلوانا
اسی طرح غلط ہوتا۔

تو کیا اوڈوائر کی چلوائی ہوئی گولیوں کی بخد یہ تھی یہ۔ ؟

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کی اس خون آشام، شام کی یاد
تازہ کرنے کے لئے اوڈوائر کے ہمنوا اس قدر بے چین کیوں تھے کہ
ایک دن قبل ہی یہ سب کچھ کر گذرے۔ ؟ گوتم کی دھرتی ۱۲ اپریل
کو ہی کیوں سُرخ ہو گئی ؟ میرے کاندھے پر ایک دن اور ہاتھ
رہتا تو کیا تھا۔ ؟ گزشتہ فائرنگ میں بچ گئے تھے یہ ہاتھ مگر
اس بار ——— !

گزشتہ جنگ میں تو گھر ہی جلے تھے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

" بابا آپ بہت دکھی لگ رہے ہیں، کیا تکلیف بہت
ہے ؟ " نرس نے انجکشن کی سوئی میرے بائیں بازو میں پیوست کی۔

" نہیں میں سوچ رہا تھا، جب پرچھائیاں جلنے لگیں گی۔
تو کیا ہو گا۔ ؟ "

" آپ کو آرام کی ضرورت ہے بابا، زیادہ مت سوچئے۔ "
اس نے انجکشن کی سوئی بازو سے نکالتے ہوئے کہا۔

" نرس ! یہ کرفیو کب تک رہے گا، چوبیس ۲۴ گھنٹے تو
ہو گئے۔ "

" کل نو بجے دن تک بڑھا دیا گیا ہے۔ "

" اوہ —— کل نو بجے دن تک، تو —— تو پندرہ
گھنٹے اور —— اس سے پہلے کوئی نہ آسکے گا۔ پتہ نہیں خاور
کیا سوچتا ہو گا۔ کتنے سوال اس کے سینے میں مچل رہے ہوں گے
کوئی بات جب یقینی طور پر معلوم نہ ہو تو آدمی کتنا بے چین رہتا ہے۔
اور اس اندھیرے میں کیا کیا دیکھتا ہے۔ ! کبھی روشنی کی کرن
کبھی اور کبھی گہرے اندھیرے۔ خاور کیا کیا سوچتا ہو گا۔ صفدر
کتنا پریشان ہو گا۔ زاہدہ کی آنکھیں ؟ کتنی حوصلہ شکن کیفیتیں
ہوں گی ان سبھوں کی۔ ! نہ موت کا یقین نہ زندگی کی ضمانت !
کش مکش اور اس کے آگے بھی کش مکش، پھر ایک بڑا سوالیہ نشان ؟
اور یہ سب سوچ سوچ کر میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔
ذہن جب بے حد تھک گیا اور آگے کا سفر مشکل معلوم ہوا تو

آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔

دوسرے دن جب میری آنکھیں کھلیں تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ لیکن نو پھر بھی نہیں بجے تھے۔ انتظار ــــــ مجھے انتظار کرنا ہی تھا ــــــ

نو کے سائرن کے ساتھ ہی لوگ آنے شروع ہوئے، سراسیمہ، متوحش لوگ! جانے ان انتالیس ۳۹ گھنٹوں کی قید میں یہ سب کے سب اتنے سوکھ کیوں گئے، اتنے پیلے کیوں ہو گئے، ــــــ کیا خاور بھی ــــــ ؟

سب سے پہلے خاور ہی نے مجھے دیکھا، اور تیر کی طرح میرے بڈ کی طرف چلا آیا۔

"دادا ــــــ" خاور کی کرب ناک چیخ بڑی طویل تھی اور اس کی پھٹی پھٹی معصوم آنکھیں میرے کٹے ہوئے ہاتھ کو تک رہی تھیں ــ

صفدر اور زاہدہ کی سسکیاں میں صاف سن رہا تھا۔

لیکن ــــ خاور میرا بایاں ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔

"مجھے بتاؤ دادا، یہ کیسے ہوا ــ ؟ ہیں .... ہیں ..."

"نہیں بیٹے ــ!" میں نے اسے اپنے بائیں ہاتھ سے اور قریب لاکر کہا ــــ "اودھم سنگھ کی طرح کوئی قسم مت کھانا زندگی بہت لمبی ہوتی ہے، اور اس کی ہر لمحہ بدلتی ہوئی دلچسپیوں میں ایک مقصد کو برقرار رکھنا بڑا کٹھن ہوتا ہے۔"

دن ڈھل چکے ہیں۔ صفدر، زاہدہ اور خاور کو گئے کئی گھنٹے بیت گئے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں۔ گوتم بدھ کہتے تھے؛

"رنج و غم، بار بار جنم لینے اور دنیا کی چیزوں سے محبت کا نتیجہ ہے۔"

اور یہ سوچتے سوچتے میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں، لیکن پھر اچانک ہی ایک شور سا ہونے لگا۔ کسی نے کہا:

"کلکٹر صاحب زخمیوں کا معائنہ کرنے آ رہے ہیں۔"

جانے کیوں میرے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی اپنے وارڈ میں میں اتنا ہی بوڑھا تھا، جتنا اوڈائر کی فائرنگ کے وقت جوان!

کلکٹر صاحب گھومتے گھومتے میرے بڈ کے سامنے آکھڑے ہوئے یہ تو گورا نہیں تھا؟ پھر یہ کلکٹر کیسے تھا؟ یہ ۱۹۱۹ء کا گورا کلکٹر نہیں تھا، یہ ۱۹۷۴ء کا کالا کلکٹر تھا۔ صرف رنگ بدل گیا تھا جیسے جوان سے بوڑھا ہو گیا ہو!

غزلیں

شاہ حسین

چہرۂ زیست پہ پھیلی ہوئی مسکان بنے
کوئی ہے بھی جو نقیبِ سحرستان بنے

مثلِ خورشید لیے سوختہ ساماں دن میں
ہم ستاروں کی طرح شب کے نگہبان بنے

ایک چنگاری سرِ دامنِ لمحات تو ہے
بجھتی جائے نہ کہیں، جینے کا سامان بنے

گہرے ساگر کی طرح سطح پہ پھیلا ہے سکوں
بے تہی تھی کہ سدا رہتے تھے طوفان بنے

ٹوٹی قدروں کا اثاثہ ہی لئے پھرتے ہیں
ہم کہاں آ گئے، کس دور کے انسان بنے

آتشیں مہر کی اک ایک کرن کی مانند
سینۂ دہر میں چبھتا ہوا پیکان بنے

شاہ تو راہ کا پتھر نہیں ہرگز، پھر بھی
کیوں وہ کترا کے نکل جاتے ہیں انجان بنے

پیڑ پر تھے تو نظر آئے رسیلے مجھ کو
چکھ کے دیکھا تو لگے پھل وہی کڑوے مجھ کو

آسماں سے جو نکالا ہے، سرافراز بھی کر
ورنہ ہوں خاک تو مٹی میں ملا دے مجھ کو

تو جو شیشہ ہے تو بچ مجھ سے پتہ گا ہیں ڈھونڈ
اور ہے پتھر تو لگا بڑھ کے ٹھکانے مجھ کو

آگ کے پھول یہاں آج بھی بن سکتے ہیں
کوئی نمرود اٹھے آگ میں پھینکے مجھ کو

میں کہاں آ گیا کس منزلِ بے نام میں ہوں
لوگ آخر یہ ستائے ہیں کہاں کے مجھ کو

اک ستارہ وہ سرِ شام جو تھا ڈوب گیا
روشنی اس کی دکھائی دے کہیں سے مجھ کو

شاہ کیوں آج ہے جھنجھلایا ہوا اس طرح
کل تو ہنس ہنس کے سنائے تھا لطیفے مجھ کو

غزل

جمنا پرشاد راہی

خموش کب ہیں مزاروں کے بے زباں پتھّر
سُنا رہے ہیں کوئی بھولی داستاں پتھّر

یہ شہرِ سنگ دلاں ہے یہاں نہ عمر گنوا
کبھی سمجھ نہ سکیں گے تری زباں پتھّر

بتاؤ کیسے انھیں آئینہ شکن کہہ دوں
بنے ہوئے ہیں مرے دل کے پاسباں پتھّر

میں ٹوٹ جاؤں گا لیکن بکھر نہ پاؤں گا
گرائے کتنے ہی مجھ پر یہ آسماں پتھّر

وفا کے خواب سجاؤ نہ شیش محلوں میں
کسے خبر کہ برس جائیں کب کہاں پتھّر

فسانہ ساز زمانے سے دور صحرا میں
بنائے ہیں ترے غم کے راز داں پتھّر

وہ مسکرا کے چلا تو ہے جانبِ منزل
قدم قدم پہ مگر لیں گے امتحاں پتھّر

یہ اپنی اپنی نظر کا شعور ہے راہی
مری نظر میں نہیں جنسِ رائیگاں پتھّر

غزل

احمد تنویر

بکھرتے وقت کی جانب نہ اس طرح بھاگو
کوئی بھی نقش درختوں کے جسم پر چھوڑو

اداس لمحوں میں کوئی صدا تو گونجے گی
مرے سکوت کو تپتی چٹان پر پٹکو

وہ اپنے رُخ پہ بنا جال روز پھیلائے
ہر ایک شخص سے کہتا ہے مجھ کو پہچانو

مری رگوں میں تمازت ہے سرخ شعلوں کی
مجھے بھی ٹھنڈی ہواؤں کا خول پہنا دو

وہ تھک چکا ہے بہت تیز دھوپ میں چل کے
اسے بھی نیلے سمندر میں جا کے پھینک آؤ

غزلیں

ماہی قریشی

کتنا خاموش ہوں محرومِ صدا ہوں کب سے
میں نگاہوں سے یہاں بول رہا ہوں کب سے

ایک موہوم سی اُمید پہ زندہ ہوں یہاں
ایک سوکھی ہوئی ٹہنی پہ کھِلا ہوں کب سے

یاد کرتی ہے ترے ذکر پہ دنیا مجھ کو
میں ہوں گُمنام، مگر تیرا پتہ ہوں کب سے

داغِ بے نوریِ پیہم نے جلایا ہے بہت
دیکھ اس بزم میں ہوں اور بُجھا ہوں کب سے

اپنے ہی گھر میں دیا کرتا ہوں خود کو آواز
اپنے ہی شہر میں صحرا کی صدا ہوں کب سے

اب چھپا لے مجھے آنچل کے کسی گوشے میں
اشک بن کر تری پلکوں پہ رکا ہوں کب سے

جانے کس لمحہ مٹا دے مجھے دنیا راہی
صفحۂ دہر پہ اک حرفِ وفا ہوں کب سے

حسن رضا

یاد پھر آئی ہے اس کی غم گساروں کی طرح
حسرتوں سے آنچ اُٹھتی ہے شراروں کی طرح

سینۂ کوہِ گراں میں ڈال دیں گے ہم شگاف
ہم بھی رکھتے ہیں جسارت آبشاروں کی طرح

ختم ہو جائیں گی موجیں میرے قدموں کے تلے
احتجاجًا ٹوٹ جاؤں گا کناروں کی طرح

شورشِ محشر بپا کرنا ہی میرا کام ہے
میں پہاڑوں سے گروں گا آبشاروں کی طرح

برگ ہائے زرد اُڑتے ہیں ہوا کے دوش پر
ہم خلاؤں میں بھٹکتے ہیں ستاروں کی

اب نہ بھٹکے گا کوئی اندھیر نگری میں رضا
زخم روشن ہیں مرے دل کے ستاروں کی طرح

ڈوبتے سورج کا کرب

عابد ضمیر

سارے بتوں کے چہرے لہولہان ہو رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ تھیں اور وہ خشمگیں نگاہوں سے اِس طرح بڑے بت کو گھور رہے تھے جیسے اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے یا اپنی نگاہوں کی بجلیاں گرا کر اُسے جلا کر راکھ کر ڈالیں گے۔ بڑے بت کی پیشانی سے بھی لہو کی سُرخ دھاریں پھوٹ کر چہرے پر پھیل رہی تھیں جس سے اس کا چہرہ اور خوفناک ہو گیا تھا اور وہ انگاروں جیسی آنکھوں سے اپنے ماتحت بتوں کی طرف گھور رہا تھا۔

میدان میں پجاریوں کا شور گونج رہا تھا۔ وہ بپھرے ہوئے انداز میں چیخ رہے تھے ــــــــــ

" ہمیں سکھ اور شانتی چاہئے۔؟

" ہمیں ایسے دیوتاؤں کی ضرورت نہیں جو آپس ہی میں لڑتے ہوں۔"

" ہمارا بڑا دیوتا ہمیں واپس کرو جو ہم سے پیار کرتا تھا۔"

" ہمیں نفرت نہیں، محبت چاہئے ـــ محبت چاہئے۔"

پجاریوں کا شور سن کر بڑا بت اپنی جگہ سے آگے بڑھا۔ اُسے پجاریوں کی طرف بڑھتا دیکھ کر دوسری طرف سے کئی چھوٹے بت بھی آگے بڑھے۔ پجاریوں کے سامنے پہنچ کر بڑے بت نے اپنے چہرے پر ہاتھوں کو پھیرا تو گرم اور سرخ لہو میں اُس کے ہاتھ رنگ گئے۔ اُس نے خون میں رنگے ہوئے ہاتھ مجمع کی طرف بلند کرتے ہوئے پجاریوں کو پُرامن رہنے کا اشارہ کیا اور بولا ــــــــــ

میں تم لوگوں کا دشمن نہیں۔ میں تمہاری بھلائی اور کامیابی کے لئے یہاں آیا تھا۔ لیکن تمہارے سکھ اور شانتی کے لئے میں نے جو بھی قدم اُٹھایا اُسے اِن بتوں نے سبوتاژ کر دیا۔ ان لوگوں نے میرے خلاف بھڑکانا شروع کیا ......"

" ڈھونگی دیوتا مُردہ باد "

" ڈھونگی دیوتا واپس جاؤ۔"

مجمع کے سامنے کھڑے ہوئے دو قدآور بت یکایک زور زور سے نعرے لگانے لگے۔ بڑا بت خونخوار نگاہوں سے اُنھیں گھورنے لگا، اور مجمع نے بڑھ کر ... ٹھونس لیں۔ جب دونوں قدآور بُت خاموش ہوئے تو مجمع میں سے کچھ لوگوں نے چیختے ہوئے کہا ــــــــــ

" ہمیں اب کسی پر اعتماد نہیں۔ ہم اب کچھ سُننا نہیں چاہتے ہمیں یہ روشنی نہیں چاہئے۔ ہمارے اندھیرے ہمیں لوٹا دو۔"

" ہمارا بڑا دیوتا ہمیں واپس لا دو جو ہم سے پیار کرتا تھا۔"

" ہمیں نفرت نہیں، محبت چاہئے ـــ ہمیں محبت چاہئے۔"

مجمع جوش و جذبات سے بے قابو ہو کر زور زور سے نعرے لگانے لگا۔ کچھ لوگ نعرے لگاتے ہوئے بڑے بت کی طرف بڑھنے لگے۔ کچھ لوگ چھوٹے بتوں کی طرف بڑھنے لگے۔ اُن کے یہ تیور دیکھ کر سارے بت سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر دبک گئے۔ اُسی وقت مجمع میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور مشتعل پجاریوں کے سامنے آ کر بولا ـــــ

" بھائیو ۔ اِن بتوں سے کچھ نہ ہوگا۔ آؤ ہم سب اپنے بڑے دیوتا کو چل کر منائیں اور انہیں یہاں لے آئیں۔"

یہ سُن کر مجمع خوشی سے تالیاں بجانے لگا اور سب لوگ نعرے لگاتے ہوئے اُس شخص کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ اور جب وہ لوگ

اپنے روٹھے ہوئے دیوتا کو منانے کے لئے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے اُس وقت آگ کی طرح دہکتا ہوا سورج ڈوب رہا تھا۔ پجاریوں کے چہرے دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ اُن کے بال بکھر گئے تھے اور آنکھیں دھول اور جلتے ہوئے سورج کی گرمی سے سُرخ ہو رہی تھیں وہ تھک کر چور ہو گئے تھے۔ لیکن اپنے بڑے دیوتا کو دیکھتے ہی اُن کے چہرے کھل اُٹھے اور وہ خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ نعروں کی آواز سن کر بڑے دیوتا نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اتنے بڑے مجمع کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

مجمع کی رہنمائی کرنے والے شخص نے بڑے دیوتا کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر گلوگیر آواز میں کہا۔

"عظیم چارہ گر! ہمارے اوپر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ہمارے بتوں نے ہماری رہنمائی کرنے کی بجائے ہمیں تباہی کے غار میں دھکیل دیا ہے۔ امن اور شانتی کے پرچار کی بجائے وہ آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور خون خرابہ کرتے ہیں۔ وہ دن دور نہیں کہ وہ اپنے خونخوار جبڑے کھول کر ہمارے جسموں سے خون کا ایک ایک قطرہ چوس لیں۔ اس لئے اے عظیم دیوتا! آپ ہمارے ساتھ چلئے اور ہمیں مصیبتوں سے نجات دلائیے۔"

مجمع خوشی سے بے قابو ہو کر نعرے لگانے لگا۔ چند لمحوں کے بعد جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو بڑے دیوتا نے شفقت آمیز لہجے میں کہا ——

"میں تم لوگوں کی دکھ بھری داستان سُن کر بہت دکھی ہوں میں نے تو یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس عیار اور مکار دنیا سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھوں گا۔ لیکن تم لوگ مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے بضد ہو تو میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ لیکن اس شرط پر کہ میرے مالک مجھے تمہارے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں!"

بڑے دیوتا کی باتیں سن کر مجمع پھر خوشی سے نعرے لگانے لگا۔ اسی وقت کچھ لوگ سنگتراش کو لانے چلے گئے۔ اور جب سنگتراش آیا تو بڑا دیوتا ادب اور احترام سے اُس کے آگے جھک گیا۔

سنگتراش کے پیچھے پیچھے جب بڑا دیوتا اور پجاری شہر کے اندر داخل ہوئے تو لوگ پُرجوش آواز میں نعرے لگانے لگے۔ سنگتراش کی معیت میں جب جلوس اپنی منزل پر پہنچا تو بڑا بت اور چھوٹے بت حیران رہ گئے۔ اسی وقت ایک پتھر بڑے بت کے سینے پر آ کر لگا اور وہ چکرا گیا۔ لیکن جلد ہی وہ سنبھل گیا اور اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے آہنی پنجوں سے سنگتراش کے چہرے کو نوچ کھسوٹ ڈالا —— سنگتراش کے چہرے پر خون کی لکیریں کھنچ گئیں۔ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ اچانک ایک طرف سے کچھ نقاب پوش کچھ تابوت لئے ہوئے آگے بڑھے اور انہوں نے سنگتراش اور دو قد آور بتوں کو اُن تابوتوں کے اندر بند کر دیا۔ اُسی وقت کسی طرف سے ایک بڑا سا پتھر بڑے دیوتا کی پیشانی پر لگا۔ اُس کی پیشانی سے لہو کی دھار پھوٹ نکلی اور دعا کے لئے اُٹھے ہوئے اُس کے ہاتھ نیچے جھول گئے!!

صلاح الدین پرویز

دیو داسی

محبوبوں کی آنکھیں دو
اور دیوانوں کی چار
گرداب ہر دل کا حصار

جاگتے سورج ، جگ اجیارے
تیرے دل کے ہیں امراض
جانے تو کیا سوچ رہی ہے
دُور کسی کمرے میں بیٹھی
یاد تری ہے کتنی اُداس !

رات کی رانی !
کتنی بھینی تیری باس
دیوانوں کی چار آنکھوں پر
اتنا بڑا احسان !!

ایک منظر

ایک بھرے گھر کے آنگن میں
پھُول کھِلے ہیں ، گھاس اُگی ہے
گھاس ہری ، مخمل جیسی ہے
جس کے اوپر جھوم رہی ہیں
ننھی ننھی اوس کی بوندیں

گھر کے دو مینار کہ پاسی
جانے کب سے روک رہے ہیں
سپنوں کے شہزادے کو

کالا / گورا

رات سے ریت تک
ناف سے خواب تک
جسم سے شام تک
میں تمہارے لئے کالے پھولوں کی خوشبو
اکٹھی کروں گا
اور تم !
اُجلے پھولوں کی خوشبو بسائے ہوئے ذہن میں
اپنے پاؤں کی تکلیف کو رنگ دیتے ہوئے
ایک آواز کے
تنکے چننے میں مصروف ہو جاؤ گے

دائرہ نقطہ اور صفر

رونق نعیم

جسم کے اپنے اعضاء کو میں مختلف رنگ سے
رنگ لوں
سیپیوں اور گھونگھوں کی مالا
گلے میں ہو
ہاتھوں میں پتھر کے نوکیلے اوزار
اور پھر
پرندوں، چرندوں، درندوں کے پیچھے بھٹکتے رہیں
میرے لمحے
مُنہ سے غوں غاں کی آواز نکلے مگر
اُس سے لپٹا ہوا کوئی معنی نہ ہو
اضطراری اشارات ہی میرے جذبوں کی ترسیل کے حق میں
معاون بنیں
میں کہاں کھو گیا ؟
وہم کی مکڑیوں کے گھنے جال میں
ذہن، مکھی کی صورت اُلجھتا ہے کیوں ؟
یہ سیہ دائرہ ہے
سیہ دائرہ
اِس کی جو قید سے چھوٹنا چاہتا تھا
وہ نقطہ
مری زندگی بن چکا ہے
اور اگر دائرہ توڑ کر
مَیں نکل بھی گیا تو اسی کا ہے خدشہ
مجھے دیکھتے ہی صفر ہنس پڑے گا

ٹیچر ملیہ بیکاشم

(بنگلہ کہانی)

شنکر داس گپتا
اظہار الاسلام

نہ میں سونا توڑتا ہوں اور نہ چاندی کاٹتا ہوں اور
ے آنگن میں کوئی کالا پیڑ ہے جس میں ہیروں کے پھل لدے
۔ میں تو پرائمری اسکول کا ایک ٹیچر ہوں۔ لیکن ایک زاویہ
ر دیکھا جائے، تو دنیا کے دیگر شعبوں میں کام انجام دینے
ں سے پرائمری اسکول کے ٹیچر زیادہ خوش ہیں اور مطمئن بھی
لئے کہ ان کا کاروبار دنیا کے سب سے زیادہ خوب صورت
صوم فرشتوں کے ساتھ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان
ن ہے جانور نہیں۔ لیکن انسان اور انسان کے درمیان
ہی دوری ہے جتنی گائے کی دونوں سینگوں کے درمیان
جو پاس رہ کر بھی ایک دوسرے سے دور دور ہیں، لیکن
ں کہ بڑی آسانی کے ساتھ قریب آ جاتے ہیں۔

عیسٰی مسیح نے ایک بار کہا تھا:

"بچوں کی ذات ہی سے جنت کی تعمیر عمل میں آتی ہے۔
یہ سادگی اور معصومیت کی علامت ہیں۔ انھیں کسی طرح
ئی Complex نہیں۔"

راہل ہمارے اسکول کے تیسرے درجے کا طالب علم ہے
نے لکھنے کے سلسلے میں وہ جتنا تیز ہے شرارت میں بھی اس
تانی نہیں اس کے گورے چٹے چہرے پر جو دو آنکھیں ہیں
ے ذہانت کی شعاعیں پھوٹتی ہیں اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں
کھلے رہتے ہیں۔ اس بچے کو دیکھ کر بے اختیار پیار
کو جی چاہتا ہے، ہر روز میں اسے اپنے پاس بلاتا ہوں
بڑے پیار سے اس کے گالوں کو دباتا ہوں اور پھر اس کے
ساتھ مختلف قسم کی کہانیاں اوڑ لیتا ہوں، لیکن اب بازار کا بھاؤ
آسمان کی بلندی کو چھونے لگا ہے، چیزیں بازار سے غائب ہونے
لگی ہیں۔ گرانی کا بھوت ہے کہ چھپر پر چڑھ کر ناچنے لگا ہے۔
ایسے میں ہم لوگ کسی طرح زندہ ہیں، خود مجھے بھی حیرت ہے،

ایک روز میں نے راہل سے کہا،

"بابا! اب میں کیا کھاؤں گا؟"

اس نے جواب دیا

"سر! ہم لوگ جو رقم آپ کو دیتے ہیں اسے پہلے بینک
میں جمع کر دیجئے، پھر روپئے نکال کر دکان دار کو دیجئے تو وہ
آپ کو چاول دے گا، دال دے گا اور پھر آپ انھیں پکا کر کھا لیجئے"
مجھے اس کی بات سن کر بڑی ہنسی آئی، سچ مچ بچے کا دل
کتنا سادہ ہوتا ہے۔

راہل ہمارے شہر کے اوسی کا لڑکا ہے۔ وہ اکثر مجھے
اپنے گھر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن اسکول کے بعد جو مجھے
یہاں وہاں ٹیوشنی کرنی پڑتی ہے اس کے بوجھ کے نیچے اتنا دب
جاتا ہوں کہ کہیں آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کبھی ایسا
موقع ہاتھ نہیں آیا کہ میں اس کی معصوم خواہش کی تکمیل کر دوں۔

ایک روز میں نے اسے ایک چار سطری نظم سنائی اور کہا

"اسے یاد کر کے مجھے سناؤ۔"

"راہل نے دوسرے ہی لمحہ حرف بحرف سنا کر مجھے حیرت میں
ڈال دیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کیوں آخر تیسرے درجے کے لڑکوں کو یہ نظم

پسند آئی تھی ۔ اکثر وہ ایک دوسرے کو سناتے ، راہل نے ایک روز مجھ سے کہا :

" سر ! ماں کہتی ہیں کہ اس نظم کا کوئی مقصد نہیں ہے ۔

شاید ماسٹر صاحب تم لوگوں سے مذاق کرتے ہیں ۔ "

یوں بھی اس ترقی یافتہ دور میں ڈھیر سارے مقصدوں کی ایک بھیڑ دل میں جمع ہوتی چلی جا رہی ہے ، مختلف قسم کی مجبوریوں کی زد میں دل کچل کر رہ جاتا ہے ، گاندھی واد ، لینن واد وغیرہ وغیرہ آخر کون سی مجبوری بچی ہے ؟

شاید اسی لئے ایک عظیم مفکر کا قول ہے کہ :

" جس کا جتنا مطالعہ ہوگا وہ اتنا ہی جاہل ہوگا ۔ "

میں تو اسی طرح ننھے منے فرشتوں کے ساتھ ہنس بول کر بے رحم حقائق کی تلخی کو کم کر لیا کرتا ہوں ، مختلف پارٹیوں کے بڑے بڑے بول گرانی کی ماری ہوئی بھارت ماتا کی بیٹیاں فیشن زدہ اَدھ ننگی ناریاں اور مشینی تہذیب کی بناوٹی رنگینیاں عجب دل کو کچوکے لگاتی ہیں ۔ تب بچوں کے بھولے بھالے چہروں کی مسکراہٹوں میں مجھے سادگی اور سچائی کا حسن نظر آتا ہے ۔

اچانک ایک روز راہل نے پاؤں چھو کر مجھے نمسکار کیا اور کہا ۔

" سر ! بابا کے تبادلے کا خط آ گیا ہے ، ہم لوگ پرسوں یہاں سے چلے جائیں گے ۔ "

یہ سن کر میرے دل کو ایک دھکا سا لگا اور میں دیر تک اُداس رہا ۔ اس روز راہل سے آخری بار وہ نظم میں نے سنی تھی ۔ اب شاید وہ چہرہ میں پھر کبھی نہ دیکھ پاؤں گا جسے بار بار میں دیکھا کرتا تھا ۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی آنکھوں کے کونے میں تھرتھراتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے تھے ، دیکھتے ہی دیکھتے آفس کی دیوار پر بیس کلنڈر تبدیل ہو گئے ، جیسے ماضی ایک خواب ہو ، میں زندگی کے آخری لمحوں میں بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا ہوں ، اب میں شعری زبان میں گفتگو کرنے سے معذور رہوں اور نہ وجدانی کیفیت سے مجھے سکون ملتا ہے ۔ اب میں اندیشوں اور وسوسوں کے سخت گھیرے میں سانس لیتا ہوں ، میں تیسرے درجے میں انگریزی کا کلاس لے رہا تھا کہ اچانک کریم ریوالور لشکارکر خاکی وردی میں ملبوس ایک نوجوان نے پاؤں چھو کر مجھے نمسکار کیا اور کہا :

" سر ! آپ مجھے پہچانتے ہیں ۔ "

یادوں کی دھند میں اسے پہچان لینے کی میں نے کوشش کی ۔

" ارے راہل ! یہ تم ہو ! یہ تم ہو ۔ " خوشی سے میں نے اسے دبوچ لیا ۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا بچہ کھڑا تھا ۔ مجھے یہ جان لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ راہل کا لڑکا ہے مجھے ایک شاعر کی بات یاد آئی :

" بچے کا باپ ہر بچے کے اندر محوِ خواب ہے "

راہل اپنے بچے کا داخلہ ہمارے اسکول میں کرنا چاہتا ہے ۔ واقعی ہم لوگ اپنے پیاروں کو رخصت کرتے ہیں انھیں کھونے کے لئے نہیں ، اک نئے طور سے پانے کے لئے اور اچانک وہ پوری نظم میرے ہونٹوں پر تھرک اٹھی :

ہَکَر پھکَر تَلَیَہ بیکاشم
ٹھَکَر ٹھکَر جَلَیہ بیکاشم
دَنےَ زاپے طَشنفَ قَصلِ
دَھکَر جھکَرَ تَلَیہ بِکاشم

--

صبح آئے کہ شب

اکرام باگ

گھانس کی پتّیوں میں جھینگروں کی صدا
پانی میں لٹکے ہوئے
اَن گنت تھکے ہارے پاؤں
اور بھوں رُوں کی لے میں اجاڑیں کچلتا قافلہ
اِحساس تو آئے کہ فصل آجائے
ایک ہی بات ہے
پھر بھی ببول کے سائے اتنے طویل کیوں ہیں
یہ شب ہے کہ شام یا کوئی سوچا منظر
کچھ بھی ہو ـــ
یہ تپی جب تلک سر کے بالوں میں حرارت نہ بنے
میں کہاں پاؤں رکھوں
موت بھی جنونی خواہش کے علاوہ
کچھ بھی نہیں
مَیں نہیں ٹلوں گا فصل کے آنے تک
کتنے بیج کتنے لمحے اور پھر اُداسی کا محشر
سب کچھ بکھر گیا تیری دید میں راستوں پر
صبح تک نہ آواز نہ مَیں نہ شب
وہ امتیاز تیرا ہو کہ میرا ـــ

خدا کوئی نہیں ہے!

فخر رضوی

میری آنکھوں میں بھی ایک تازہ جہاں ہے
جس میں روشن ہیں ستارے، چاند، سورج
میرے سورج سے سلامت ہے مہ و سال
اور رتوں کی مانگ
تاروں سے منور ہے فقط
ایک خواب کی تقدیر
اور مہتاب ہاتھوں کی لکیروں کو جلا دیتے ہیں اکثر
ان ہی ہاتھوں کی لکیروں میں بسی ہے
درد کی بستی
اُداسی کی سڑک
غم کا سمندر
ہونٹ کا سوکھا تبسّم
ان ہی ہاتھوں کی لکیروں سے نکلتا ہے
ہنسی کا چشمہ
فوارہ خوشی کا
قہقہہ کا دودھیا جھرنا
میری دنیا میں سبھی کچھ ہے مگر
میری دنیا کا خدا کوئی نہیں ہے !

دھیرج رکھو

اختر یوسف

دھیرج رکھو .... جان۔ یہ آخری سہارا ہے
ہمارا کیا دوش
دوش ... کسی کا بھی نہیں ... کہنا یہی چاہیے
ساگر ندی، شبنم پھول، سیپی موتی، سرسوں زردی
پنے قصوں کے مانند پھڑپھڑاتے ہیں، قصے لیکن کپڑے نہیں ہوتے
پنے قصوں کے پھڑپھڑاتے ہیں، چاٹتی ہیں پتھر آنکھیں
چاٹتی پتھر آنکھیں، لانبی لانبی پتھر کی دیواریں بنتی ہیں
ہوا نہیں گذرتی، سورج نہیں ٹھہرتا، آوازیں چیخیں

گھٹ نہیں سکتیں، جی نہیں سکتیں
برف ... برف اور برف ہوا سے عاری برف
چاروں اور دیواریں، ماترآبھاس دیواریں
ماترآبھاس دیواریں 'یا تنا سرپ ہوکر لہراتی ہیں

قصے مگر جھوٹے نہیں ہوتے .... چاٹتی پتھر آنکھیں ہوتی ہیں
دھیرج رکھو ——— جان
دو سے پہلے ایک، پھر کچھ بھی نہیں، اس کے بعد پھر ایک
دو سے پہلے کے بعد کچھ بھی نہیں کے بعد کے پہلے

جو ہوتا ہے ...... یا تنا سرپ ہوتا ہے

اک ریت کا سمندر ہوتا ہے
دلدلوں کے مرگھٹ ہوتے ہیں
کتوں کے گاؤں نگر اور شہر ہوتے ہیں
بھوک کی بڑی پھڑپھڑاہٹ ہوتی ہے
دو سے پہلے کے بعد کچھ بھی نہیں کے بعد کے پہلے
کچھ بھی نہیں ہوتا ہے
ایک کبھی دو نہیں ہو سکتا — دھیرج رکھو جان
ساگر ندی، شبنم پھول، سیپی موتی، سرسوں زردی
پنے قصوں کے مانند پھڑپھڑاتے ہیں
دو سے پہلے ایک، اس کے بعد پھر، پھر ایک
سچا ہوتا ہے، یہی سچا ہوتا ہے

تبصرہ

اشعار

خلیل الرحمٰن اعظمی

مصنف : حسن نعیم

ناشر : شالیمار پبلی کیشنز، حیدرآباد

قیمت : آٹھ روپے

حسن نعیم کا یہ شعری مجموعہ اب سے ڈیڑھ برس پہلے شائع ہوا تھا۔ عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کوئی کتاب نئی نئی چھپ کر آتی ہے تو ادبی حلقوں میں اُس پر رائے زنی ہوتی ہے۔ دوست مبالغے کے ساتھ تعریف و توصیف بیان کرتے ہیں اور وہ جو دوست نہیں ہیں نکتہ چینی اور خوردہ گیری کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ نکتہ چینی اور خوردہ گیری جاندار کتاب کے حق میں مفید ہی ہوتی ہے کیونکہ سونا وہی ہے جو کسوٹی پر چڑھ کر اور نکھرتا ہے۔ ورنہ اس زمانے میں شہرت اور مقبولیت بھی بڑی ہی ناپائدار چیزیں ہیں۔ ہم اور آپ سبھی دیکھتے ہیں کہ ہر سال ایک سے ایک شعری مجموعے بڑی دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ بازار میں لائے جاتے ہیں۔ سرورق اور گردپوش کو نقادوں اور مبصروں کی گراں قدر رایوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اشاعت کے بعد رسم اجراء ہوتی ہے۔ کچھ اصلی اور کچھ فرضی ناموں سے تعریفی مضامین لکھے اور لکھوائے جاتے ہیں۔ [بعض شاعر تو یہ مضامین لکھنے کی زحمت بھی خود ہی اٹھاتے ہیں] اور پھر کیا ہوتا ہے کہ اگلے سال اس کتاب کو لوگ بھول جاتے ہیں۔

یہ تمہید میں نے اس لئے اٹھائی ہے کہ حسن نعیم کے اس شعری مجموعے پر میرا تبصرہ بہ ظاہر "بعد از وقت" معلوم ہوتا ہے مگر صحیح معنوں میں بروقت ہے۔ اس لئے کہ حسن نعیم کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت میرے نزدیک یہی ہے کہ وہ "وقت" کی اسیر نہیں ہے۔ "وقت" کی کارفرمائی اس کے بطون میں ہے اور وہ بھی ایک ناقابل تقسیم وحدت کی صورت میں۔ اس لحاظ سے میں انھیں سچا اور کھرا "غزل گو" سمجھتا ہوں۔ غزل کہنے کو تو سبھی کہتے ہیں اور دو ایک صاف شعر نکال لینا ایسا کوئی مشکل کام نہیں۔ لیکن یہ صنف بڑی بے ڈھب۔ یہ سب کو راس نہیں آتی۔ اکہرے مزاج والوں سے تو اسے خدا واسطے کا بیر ہے۔ بڑے سے بڑا استاد یہ مزاج لے کر اس کوچے میں آیا ہے تو "غزل قصیدہ طور" یا "نظم نما غزل" یا "غزل نما نظم" سے آگے نہ جا سکا۔ یا پھر اس کی لفظیات کو تہس نہس کر کے اسے "تجربے" کا نام دیا۔ اور کچھ دنوں کے لئے اشتہاری نقادوں کی مرغوب غذا فراہم کرنے کا کام کرتے رہے۔ چلئے منھ کا مزہ بدلنے کے لئے یہ سب کھیل تماشے گوارا۔ مگر غزل کی تنقید ایسی غزلوں سے اپنے اصول نہیں وضع کر سکتی۔ غزل کا ایک مزاج اور اس کی کچھ دیرپا اور مستقل قدریں ہیں۔ ان کے بنانے میں ایرانی اور ہندوستانی تہذیب نے صدیوں کا سفر کیا ہے اور زر و اندوکو چھانٹ کر ایک ایسا "جوہر" نکالا ہے جو در اصل اس کی روح ہے۔ اس "جوہر" کے بغیر غزل کے شعر میں جان نہیں آتی نہ اس پر دھار چڑھتی ہے۔ بعض شاعر ایسے ہیں جن کی پوری غزل پڑھئے تو مزے دار معلوم ہوتی ہے۔ ایک نئی نئی سی فضا کا احساس ہوتا ہے مگر دوبارہ غور کیجئے تو کچھ نہیں۔ کسی ایک شعر پر نظر نہیں رکتی۔ کوئی نوکیلا کانٹا ایسا نہیں ہوتا جو دامن تھام لے اور کہے کہ ابھی آگے نہ بڑھو، ابھی مجھ پر غور کرو۔ میرے اندر اُتر گئے تو ایک جہانِ معنی آباد پاؤ گے۔ بزرگوں نے ایسے ہی شعروں کو "نشتر" سے تعبیر کیا تھا۔ میر کی عظمت کی بنیاد انھیں نشتروں پر رکھی گئی اور غالب نے ناسخ پر آتش کو اسی بنا پر ترجیح دی تھی۔ اگر غزل میں ایسے نشتروں کا وجود نہیں تو اس کا کیا ہوگا؟ اس کو پڑھنے کی پھر نوبت نہیں آئے گی۔

بار بار اس شاعر کا مجموعہ پڑھا جاتا ہے جس کے شعر بار بار پلٹ کر آپ کو پکارتے ہیں۔ آپ جتنی بار اسے پڑھتے ہیں ایک نئی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ غالب نے اپنے اشعار کو انھیں معنوں میں "تہ دار" اور "پہلو دار" کہا تھا اور میر نے اپنے معاصرین کو اپنے مقابلے میں "نا فہمان بے تہہ" سے تعبیر کیا تھا۔ غزل کی یہی واحد کسوٹی ہے باقی سب "اصطلاحاتِ اسیرانِ تغافل" ہیں۔

حسن نعیم گزشتہ چوتھائی صدی سے غزل کے فن پر ریاض کر رہے ہیں۔ میں اس زمانے سے انھیں جانتا ہوں جب بقول شخصے:

"مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر"

ان کی شخصیت میں جو نفاست، رچاؤ، جو توازن اور جو "گہراؤ" ہے وہ انھیں سے مخصوص ہے۔ اس کا اندازہ محض سرسری ملاقات سے نہیں ہو سکتا۔ ان کی شاعری بھی سرسری مطالعے کی چیز نہیں ہے۔ یہ اپنے پڑھنے والے سے بار بار توجہ کا تقاضا کرتی ہے، تب اس کی تہیں کھلتی ہیں۔ وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی غزل میں کوئی نہ کوئی "کچھ" چھپا کر رکھ دیتے ہیں جو ہم جیسے حساس قاری کو ڈنک مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اپنے بہ ظاہر سادہ شعر میں بہت گہری بات کہہ جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ محفلِ احباب میں تقریباً اس شعر کے بارے میں کرتے ہیں جو نئی امیجری پیدا کرنے کی کوشش میں ایک آنچ سے محروم رہ گیا ہو۔ غزل گو شاعر کے ساتھ یہ بھی ایک مصیبت ہے کہ اسے اپنے بہترین اشعار کا بہت کم پتہ ہوتا ہے۔ وہ بس اپنے لمحۂ تخلیق میں اپنے تجربے کا انکشاف کرتا ہے اور پھر اس سے الگ ہو جاتا ہے۔ غزل کہہ لینے کے بعد شاعر سے شعر کی تشریح و توضیح نہیں کرانی چاہئے۔ ایک تو اس سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ لامحدود معانی بہت ہی محدود معنی کی تنگنائے میں مقید ہو جاتے ہیں، دوسرے یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ شعر کا اصلی جوہر دب جائے اور ذیلی چیزیں زیادہ نمایاں ہو جائیں۔ صحافتی انداز کی تنقیدیں لکھنے والوں کی نظریں کسی شعری مجموعے کے ان اشعار پر پہلے پڑتی ہیں جن میں عصری اور وقتی حوالے واشگاف انداز میں نظر آ رہے ہوں یا تشبیہ و استعارہ یا اس طرح کی کوئی ظاہری خصوصیت فوراً ذہن میں آ جائے۔ ایسی تنقیدیں اکہری شاعری کے لئے ہی ٹھیک ہیں۔ حسن نعیم جیسے شاعروں پر بھی انھوں نے کچھ کم زیادتی نہیں کی ہے۔ ایسے تبصروں نے اس مجموعے کے اصل جوہر کو چھپانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔

میرے نزدیک حسن نعیم کی غزلوں میں جو موتی بکھرے پڑے ہیں وہ کچھ اس قسم کے ہیں:

کوئی تنہا نہیں دنیا میں بجز دردِ وفا	اس کے ہمدم ترے آنسو نہ مری کوہکنی
دل کو اب بھی ہے یہی وہم کہ مجھ سے چھپ کر	پیچھے پیچھے مرے وہ جانِ وفا چلتی تھی
قطرۂ مے سے دیا آج نہ طوفانِ طلب	مجھ پہ جو بیت گئی رات سُنا تو ہو گا
گیا تھا دشت سے اُٹھ کر سمندروں کی طرف	وہاں بھی تشنہ نصیبی وہاں بھی مرگِ سراب
دل میں نہ جانے کیا رہا مثلِ سرابِ جستجو	جوشِ طلب کے وقت بھی، ترکِ طلب کے بعد بھی
سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں یہ رات	نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریکِ خواب بنا
خواب کی راہ میں آئے نہ در و بام کبھی	اس مسافر نے اٹھایا نہیں آرام کبھی
روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب	میں چلا برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا
پاؤں سے لگ کے کھڑی ہے یہ غریب الوطنی	اس کو سمجھاؤ کہ ہم اپنے وطن آئے ہیں
آنچل میں نیند باندھ کے اے رات آ کبھی	یہ دن لگا ہے جان کو جنجال کی طرح

آبسے کتنے نئے لوگ مکان جاں میں
بام و در پر ہے مگر نام اسی کا لکھا

کچھ راز مکینوں کے ہیں کچھ راز مکاں کے
اک چھت کے سوا اور بھی کچھ بار ستوں ہے

وہی شباہت، وہی ادائیں مگر وہ لگتا ہے غیر جیسا
نعیم یادوں کی انجمن میں نہ جانے کس کو پکار لائے

حسن نعیم کے اس مجموعے کے ہر صفحے پر ایسے شعر مل جاتے ہیں۔ یہ وہ اشعار ہیں جو دائمی لطف رکھتے ہیں۔ ان کی کیفیت سدا بہار ہے۔ غزل کا یہ وہ آرٹ ہے جسے کوئی نئی ادبی تحریک یا نیا ادبی تجربہ مسترد نہیں کر سکتا۔ ان اشعار میں ایک "محسوس فکر" ہے اور غزل کو یہی چیز راس بھی آتی ہے۔ ——

تبصرہ

نام کتاب : آواز کا رنگ
شاعر : غیاث صدیقی
پبلیشر : مکتبۂ شعر و حکمت - حیدرآباد
قیمت : پانچ روپے
تاریخ اشاعت: مئی ۱۹۷۳ء

ترسٹھ نظموں اور اٹھائیس غزلوں کے علاوہ چند متفرق اشعار کا یہ شعری مجموعہ جناب وحید اختر کے تعارف کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ۶۳ نظموں میں بارہ نظمیں ترجمہ کی ہوئی ہیں۔ جو "مغرب کے نغمے" کے عنوان کے تحت ہیں۔
وحید اختر کے خیال کے مطابق :

"آواز کا رنگ ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے مطالعے کے لئے نہ تو ادب و تنقید کے بلند آہنگ اصول تراشنے کی ضرورت ہے اور نہ ہمالیائی امیدیں باندھ کر اس پہ چڑھائی کا ارادہ کرنا چاہیئے۔"

ہمارا ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بلند آہنگ تراشنے کی یہ کوئی جا نہیں ہے اور "چڑھائی کے ارادے" کو ہم جیسے عدم تشدد کو ماننے والے اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔

یہ شعری مجموعہ تکلفاً بھی قابل ذکر مجموعہ نہیں کہا جا سکتا۔ دل رکھنے کے لئے اسے اوسط درجے کی شاعری کہہ دیا جائے یہ الگ بات ہے مگر شاعری میں یہ درجہ بھی کم ہی شاعروں کو نصیب ہوتا ہے۔
غزلوں کے حصے میں چند غزلیں ایسی مل جاتی ہیں جو روا یت سے ہٹ کر ہیں۔ ـــــــــ کلام حیدری
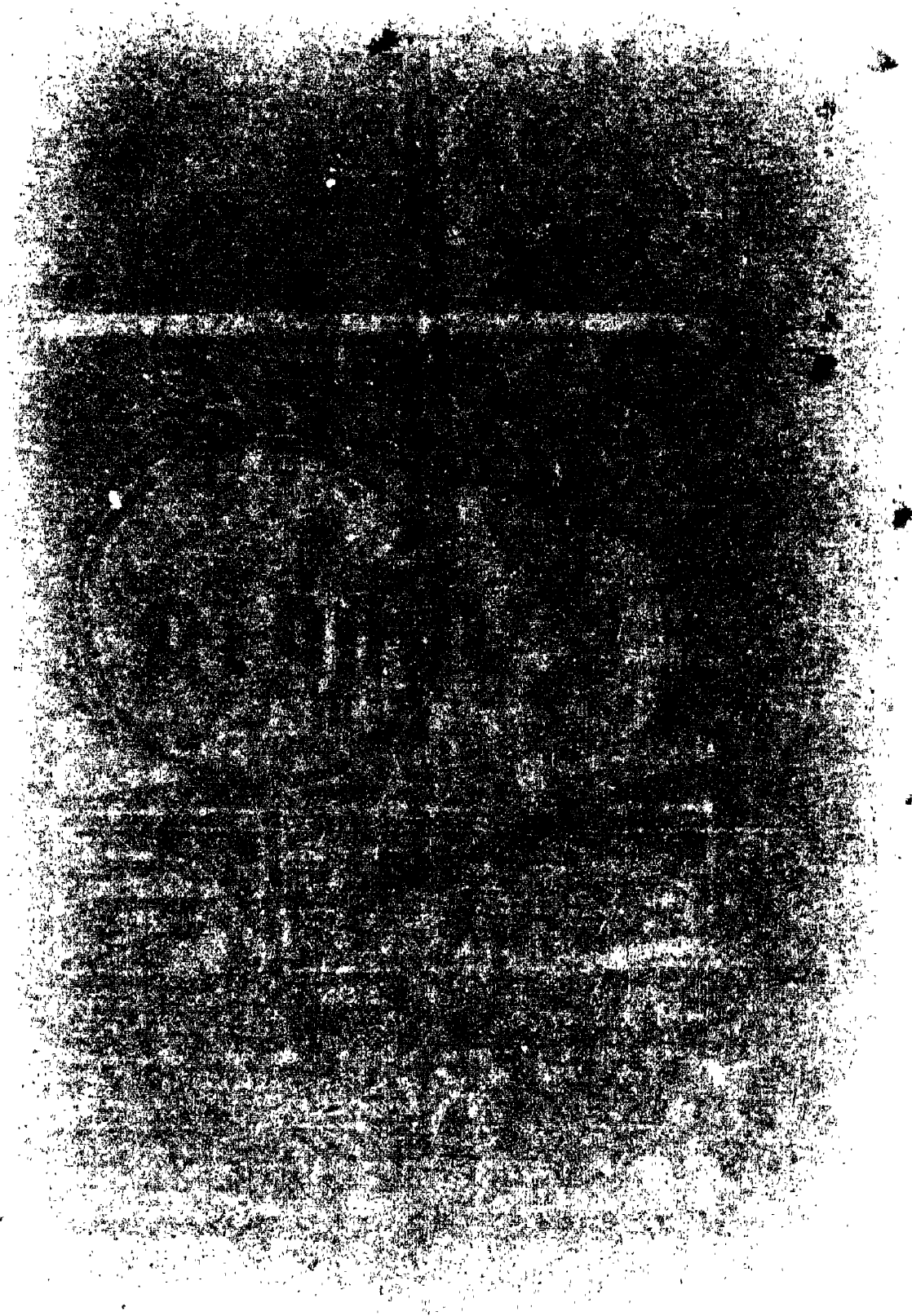
P.T. Regd. No. 153
PHONE NO. OFF. 662 RES. 53
Editor: KALAM HAIDRI
BAIRAGI, GAYA.

Bairagi, Gaya : 443

ماہنامہ
آہنگ

کلچرل اکادمی ، رینہ ہاؤس ، جگ جیون روڈ ، گیا

ستمبر ۱۹۷۴ء

شمارہ ۵۱

دفتر کا پتہ :
رینہ ہاؤس ۔ جگ جیون روڈ گیا

فون :
دفتر : ۶۶۲
رہائش : ۵۳

کتابت :
قمر نظامی

طباعت :
ہند لیتھو پریس میکلوڈ گنج گیا

شرح خریداری

سال کے لئے	۱۵ روپے
دو سال کے لئے	۲۸ روپے
تین سال کے لئے	۴۰ روپے

فی شمارہ

ایک روپیہ پچیس پیسے

مرتبین

کلام حیدری ، پرکاش فکری

محتویات

مزامیر

مضامین

افسانے

نظمیں

غزلیں

ھمزا مبر

خدا کا شکر ہے کہ ستمبر کا آہنگ تقریباً وقت پر شائع ہو رہا ہے۔ آہنگ سے اب مجھے اُمید ہو گئی ہے کہ ہر ماہ پابندی سے نکلا کرے گا۔

بہار کے حالات متزلزل ریاستی وزارت اور نام نہاد طلبا کی تحریک کی وجہ سے بے حد خراب ہیں۔ روزانہ کے معمولی کام نہیں ہو پاتے، گرانی اس طرح اوپر جا رہی ہے کہ غربت و افلاس کے مارے ہوئے نوّے فی صد لوگ کھانے اور کپڑے سے محروم ہو رہے ہیں۔ چھبیس سالہ غافل حکومت آج تک شمالی بہار کے سالانہ سیلاب پر عوام کا اربوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی عوام کو سیلاب کی تباہ کاری سے نجات نہیں دلا سکی ہے۔

ملیریا جو مفقود ہو گیا تھا پھر اپنی گرفت میں بہار کے کئی حصّوں کو لے رہا ہے اور اس کی واحد دوا کونین مہیا کرنا ہماری متزلزل حکومت کے بس سے باہر ہے۔

چیچک سے تقریباً نجات مل چکی تھی کہ خود گیا ضلع میں بیس ہزار لوگ اس مرض میں مبتلا ہو کر اپنی سرکار کو دعائیں دیتے ہوئے عدم کو سدھار گئے۔

——— مگر ہم مہان ہیں!

——— ہمیں برداشت کرنا چاہیے!

——— ہم آزمائش سے گھبرائیں نہیں!

——— ہم ٹیکس پر ٹیکس آرام سے دیتے رہیں!

غرض جو کچھ کریں ہم (عوام) کریں۔

ہمارے نمائندے بھاشن کریں اور ہر مرکزی منسٹر پر ہر ماہ ایک لاکھ روپئے خرچ ہوا کریں۔

جے ہند!

——— کلام حیدری

ندا فاضلی

غزل

جاگے ہوئے ملے ہیں، کبھی سو رہے ہیں ہم
موسم بدل رہے ہیں، بسر ہو رہے ہیں ہم

بیٹھے ہیں دوستوں میں ضروری ہیں قہقہے
سب کو ہنسا رہے ہیں مگر رو رہے ہیں ہم

آنکھیں کہیں نگاہ کہیں، دست و پا کہیں
کس سے کہیں کہ ڈھونڈو بہت کھو رہے ہیں ہم

ہر صبح پھینک جاتی ہے بستر پہ کوئی جسم
یہ کون مر رہا ہے کسے ڈھو رہے ہیں ہم

شاید کبھی اُجالوں کے اونچے درخت ہوں
صدیوں سے آنسوؤں کی چمک بو رہے ہیں ہم

غزل

ہر اک رستہ اندھیروں میں گھرا ہے
محبت اک ضروری حادثہ ہے

گرجتی آندھیاں ضائع ہوئی ہیں
زمیں پر ٹوٹ کر آنسو گرا ہے

نکل آئے کدھر منزل کی دھن میں
یہاں تو راستہ ہی راستہ ہے

دُعا کے ہاتھ پتھر ہو گئے ہیں
خدا ہر ذہن میں ٹوٹا پڑا ہے

تمہارا تجربہ شاید الگ ہو
مجھے تو علم نے بھٹکا دیا ہے

نظام صدیقی

جدید یوروپی ادب کے نئے زاویے

جدید اردو ادب کے ذہنی محرکات، خلاق اور فکری پس منظر کا عرفان اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک جدید مغربی تحریر و فکر کے بنیادی کردار و میلان کی بھی مروضی طور پر افہام و تفہیم کی سعی نہیں کی جاتی۔ اس رو سے انگریزی اور یوروپی "نیو رائٹنگ"[1] کا تجزیہ یا محاسبہ جدید اردو ادب کی روحِ فکر کی تنویر میں بھی بہت حد تک مفید مطلب ہوگا۔ لیکن اس امر کو بہر نوع مدنظر رکھنا لابدی ہے کہ اپنے مخصوص سیاق میں "نیو رائٹنگ" اور اردو کا جدید ادب ایسے تاریخی مطالبات ہیں جو ناگزیر تھے۔ انگریزی کی نیو رائٹنگ کے پس منظر میں مشینی اور جنگ پسند تہذیب کی کارفرمائی ہے۔ اردو کا جدید ادب علی الخصوص اقتصادی اور سماجی عدم مساوات اور ذات کے بحران کا بیانیہ ہے۔ دونوں میں بہت سارے اقدار مشترک ضرور ہیں۔ لیکن اُن کے تاریخی تناظر مختلف ہیں۔ ایک سے روحانی فیضان حاصل کرنے پر بھی دوسرے کی انفرادیت محفوظ رہ سکتی ہے اور رہی ہے۔ فنی تحریکات کے اثرات تو یوں بھی کم و بیش تمام مہذب ممالک میں پہونچتے ہی ہیں۔ جو ملک جتنا زیادہ جدید ہوتا ہے۔ وہاں کی تاریخ اتنی ہی متحرک اور نمایاں کردار کی حامل ہوتی ہے۔ ہندوستان اور اس میں بھی اُردو ادب کی تاریخ اوسطاً پچیس سال ضرور پیچھے رہی ہے۔ یہ مدت پہلے اس سے بھی زیادہ تھی۔ اور اب آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔ اس لئے جدید ادب کی جو رَو انگلستان میں ۱۹۳۰ء کے قریب شروع ہوئی تھی۔ وہ اگر اُردو میں ۱۹۵۵ء کے بعد نمو پذیر ہو تو کوئی بڑی حیرت کی بات نہیں۔ آفتاب تمام ممالک میں بیک وقت ہی طلوع نہیں ہوتا ہے۔ یہ جغرافیائی صورت حال ناقابل تغیر ہے۔

مغربی ممالک میں جدید ادب کا گہرا تعلق دو عالمی جنگوں سے ہے۔ پہلی جنگ عظیم نے یورپ کے ذہن اور روح کو شدید طور پر جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ جنگ سے پیدا مادی نقصانات کی تلافی تو تھوڑے زمانے کے بعد ہو جاتی ہے۔ لیکن روحانی زخم بہت گہرے ہوتے ہیں۔ جو مندمل ہونے کے بعد بھی درد و داغ تو چھوڑ ہی جاتے ہیں اور عوامی ذہن کو عموماً لیکن خصوصی طور پر فنکاروں کو بہت دنوں تک متاثر کرتے رہتے ہیں۔ اس نظریہ سے یورپ کے جدید ادب کا آغاز تقریباً ۱۹۳۰ء سے ہوتا ہے۔ جب پہلی عالمی جنگ کے مادی خسارے تو پورے کئے جا چکے تھے۔ لیکن انسانی عقیدہ اور ایمان کا انحطاط آہستہ آہستہ شروع ہو رہا تھا۔ اس جنگ سے پیدا سب سے بڑا خطرہ روحانی بے مائیگی، اخلاق باختگی، بدعقیدگی، حرماں نصیبی مرگ کوشی، اور بدترین بے حسی کا تھا جو متواتر نہایت مہیب شکل اختیار کر رہا تھا۔ اور ہر نوعیت کے اکھڑتے اور اُجڑتے خیموں کے بے پایاں درد کا پروردگار تھا جس کے باعث محرم اور

---

[1] یوروپی عالمی تحریک

برگزیدہ قدروں، خوابوں اور عقیدوں پر جاں کنی کی گرفت مضبوط تر ہوگئی تھی۔ مغربی ذہن کے اس شدید تصادم نے وہاں کے جدید ادب کو جنم دیا جو بیشتر گرتی ہوئی چھتوں، لڑکھڑاتے ہوئے سہاروں، ان گنت بھول بھلیوں کے خوفناک احساس گم کردہ راہی اور بے چارگی کا عطیہ ہے۔

آدرشوں اور نظریوں کی آویزش پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی رونما ہوئی جس میں کیتھولسزم، کیمونزم اور ہیومنزم جیسی ذہنی تحریکات باہم برسرپیکار تھیں۔ اس دور میں کیمونزم ایک مروجہ فیشن بن چکا تھا۔ جنگ کی ہلاکت خیزیوں نے انسان کی روحانیت کو یک لخت فنا کردیا تھا اور اقتصادی اور سماجی کیمونزم ہی انسانی فلاح و بہبود کا واحد ذریعۂ نجات معلوم ہوتا تھا۔ اس کی نجات دہندگی اور مشکل کشائی پر مارکس و مارکس کا ایمان تھا۔ کسی حد تک سبھی نئے ادیب و شاعر ابتداً کیمونسٹ ہونے پر فخر کناں تھے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کیمونزم کو اوپر عمداً فیشن ہی سے موسوم کیا گیا ہے۔ کیونکہ لوگوں نے بیشتر اس کو ایک شدید ردعمل کے طور پر قبول کیا تھا بہت کم افراد ایسے تھے جنھوں نے اس کے نظریات کو دیانت داری اور دقت نظری سے پرکھ کر اور اس سے پوری طرح ذہنی طور پر مطمئن ہو کر اس نئے نظام فکر کو اپنایا تھا۔ اس لئے کیمونزم اس زمانہ میں جدیدیت کا پیمانہ فرد بن گئی تھی۔ لیکن وہ یورپ کے عوامی ذہن میں بہت گہرے طور پر جڑ نہیں جما سکی تھی جیسا کہ ۱۹۴۰ کے قریب سابق کیمونسٹ کہے جانے والے ایک خاص جماعت کی روزافزوں تعداد سے معلوم ہوتا ہے۔ کیمونزم کی جانچ پڑتال کرنے وقت ان دانشوروں کو کیمونزم کے بنیادی فرقہ وارانہ کردار سے بڑی گہری ناامیدی کا شکار ہونا پڑا اور یورپ اور امریکہ کے اکثر مستند ادیبوں نے تو کیمونزم کو بے محابا ناکامیاب دیوتا (GOD THAT FAILED) سے موسوم کردیا۔ "گوڈ دیٹ فیلڈ" مجموعہ کے چھ مصنف۔ اسٹیفن اسپنڈر، آرتھر کوسلر، رچرڈ رائٹ، آندرے ژید، اگنیزیو سیلونے اور لوئی فشر اس دور کی ادا اس اور فریب شکستہ نسل کے ذہنی کش مکش کی نمائندگی کرتے ہیں جو ہر نوعیت کے نشہ آور خوابوں کے سرور، ذہنی خواجگی کے چن چن کر بنائے ہوئے مسکرات، یوٹوپیائی سبز باغ، آدرشی پناہ گاہ، خدا باپ یا قوم پرستی یا خوش اعتقادی کے خاندانی کی محفوظ سائبان سے قطعاً محروم ہے۔

آرتھر کوسلر کا تجربہ تلخ ترین تھا۔ شاید اسی لئے اس ضمن میں اُس نے سب سے زیادہ لکھا ہے۔ دو جلدوں میں شائع شدہ اُس کی سوانح عمری "ایرو ان دی بلیو" اور "ان دی ژبل رائٹنگ" اس انسحر کا خاراشگاف انکشاف ہے۔ ۱۹۳۱ء میں چھبیس۲۶ سال کی عمر میں کیمونسٹ بننے کی سنک کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ بڑے دلچسپ ڈھنگ سے لکھتا ہے کہ:

"سات سال تک اُس نے کیمونسٹ پارٹی کا نہایت تندہی سے کام کیا۔ ٹھیک اتنے ہی سال تک جتنے عرصہ میں لبان کی بھیڑیں چرا کر جیکب (یعقوب علیہ السلام) نے اس کی بیٹی ریشل (راحیل) کو حاصل کرنا چاہا تھا۔ جب یہ طویل مدت ختم ہوئی تو شب میں اُس کے تاریک کمرہ میں عروس کو لایا گیا۔ دوسرے دن یہ جان کر اُس کے جسم کا رواں رواں آنسوؤں میں نہا اُٹھا کہ اُس کی دولہن اُس کی روح کا بے قرار نغمہ داخل نہ ہوکر بدصورت لیاہ تھی جو اس کے جسم و جاں کے مدھر سنگیت کو مٹا لہولہان کرگئی تھی۔"

لے عہدنامہ عتیق، کتاب پیدائش سے مستعار اُردو ترجمہ (نظام صدیقی)

کمیونزم کی بابت بے پایاں مایوسی اور شدید بے اعتقادی کی اس سے زیادہ دل گداز اور روح فرسا تصویر کشی اور کیسے ہو سکتی تھی
مزید برآں اس ضمن میں اسٹیفن اسپنڈر کی " ورلڈ وِد ان دی ورلڈ " اور ہاورڈ فاسٹ کی " دی نیکیڈ گوڈ " (۱۹۵۸) خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں ۔

اپنی کتاب " نیو رائٹنگ اِن یورپ " میں یورپ کے جدید ادب کے فکری پس منظر کا تجزیہ کرتے ہوئے جان لیمن رقم طراز ہیں ــــــ

" ۱۹۳۰ اور اسی دہائی کے دوسرے برکش ادیبوں کے ٹھیک پہلے کچھ ایسے راندۂ درگاہ مصنفین اور شعرا منظر عام پر آئے جو خود باغی تھے اور ایک دوسرے سے کچھ اہم مسئلوں میں اختلاف رکھتے ہوئے بھی کچھ باتوں پر باہم متفق تھے ۔ "

اُس کا یہ بھی کہنا ہے کہ درحقیقت جدید ادب کے بنیادی عناصر کی تخم ریزی جیمس جوائس ، ورجنیا وُلف ، ایزرا پاؤنڈ اور ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ جیسے دوربیں اور عاقبت اندیش سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں ہی کم و بیش رو پذیر ہو گئی تھی (کچھ اسی طرح کی بات اردو کے جدید ادب کے سیاق میں کہی جا سکتی ہے ۔ جدیدیت کے قبل بھی قرۃ العین حیدر ، منٹو ، ممتاز مفتی ، حسن عسکری ، ن ۔ م راشد ، میراجی ، اور اختر الایمان اور کچھ دوسرے ترقی پسندوں کی سرکشی اپنے بنیادی مزاج میں کبھی دب نہیں سکی تھی ، وہ مختلف شکلوں اور حالات میں ظاہر ہوتی رہی تھی ۔ اس ضمن میں میرا مقالہ " ادب میں پورے آدمی کی تلاش (مطبوعہ آہنگ گیا قابل مطالعہ ہے) اس مبہم باغیانہ رویہ کو باقاعدہ منظم شکل البتہ جدید ادب کے زیر اثر نصیب ہوئی ۔

علاوہ بریں جدید ادب کی تعیین زمانی ۱۹۳۲ء سے باقاعدہ طور پر کی جا سکتی ہے ۔ جب نئے ادیبوں کا ایک شعری مجموعہ " نیو سگنیچر " (ہندی میں " نئے ہستاکچھر " اور اردو میں " نئے نام " شعری مجموعہ کے ناموں کے روحانی تناسخ کے پیچھے بھی کچھ اسی نوعیت کے تاثرات ، تعصبات اور معتقدات کارفرما ہیں) کے نام سے شائع ہوا ۔ یہ شعری مجموعہ ڈبلو ۔ ایچ ۔ آڈن ، جولین بیل ، سیسل ڈے لوئس ، رچرڈ ایبر ہرٹ ، ولیم ایمپسن ، جان لیمن ، ولیم پلومر ، اسٹیفن اسپنڈر اور اے ۔ ایچ ۔ آڈن ۔ جے ۔ ٹے سی مُنڈ کی گراں قدر منظومات پر مشتمل ہے ۔ اس کا دیباچہ مائیکل روبرٹس نے لکھا ہے ۔ ان شعرا کی ذہنی کیفیت کی ترجمانی جان لیمن کے ہی الفاظ میں کروں گا :ــ

" یہ سبھی پینتیس سال سے کم کے تھے ۔ ایسے نوجوان جو ۱۸ــ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں بہ لحاظ عمر حصہ لینے کے اہل نہیں تھے ۔ لیکن پھر بھی جن کا بچپن اور عنفوان شباب پہلی جنگ عظیم کے مہلک نتائج سے شدید طور پر متاثر ہوا تھا ۔ وہ سب کے سب انگریزی معاشرہ کے تقریباً ایک ہی طبقہ سے وابستہ تھے اور ان میں بیشتر آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر چکے تھے ۔ یہ بات دل چسپ ہونے کے ساتھ ہی یاد رکھنے کے قابل بھی ہے ۔ کیونکہ ان میں آڈن ، اسپنڈر اور سیسل ڈے

لہ مزید تفصیل کے لئے راقم الحروف کے آرٹیکل " جدید ادب کا پس منظر " اقدار کا مسئلہ " جدیدیت اور ناجدیدیت " مطبوعہ آہنگ (گیا) ملاحظہ فرمائیے ۔

لوئیس کی اہم ادبی تثلیث نہ صرف انقلابی تخلیقات کی بلکہ کمیونسٹ نظام فکر کی حامل شعری نگارشات کی بھی نمائندہ سمجھی جانے لگی۔ اگرچہ ان میں کوئی بھی پرولتاری خاندان سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا تھا۔"

اس اقتباس سے یہ منکشف ہوجاتا ہے کہ بیسویں صدی کے جنگ عظیم کے بعد سے شدتِ انتشار، احساسِ شکست، بے اعتقادی اور خوف اور محزونی کی فضا میں روایت زدہ تحریر و فکر سے غیر مطمئن ہوکر ایک نئی جہت کی تلاش میں کوشاں تھے۔ قدامت سے بے اطمینانی کی کیفیت سب میں مساوی طور پر کارفرما تھی۔ جدیدیت کی تلاش ہو۔ اس ضمن میں بھی سب باہم دگر متفق تھے۔ لیکن وہ جدیدیت کون سی ہو۔ یہ شاید اُن میں کوئی بھی ٹھیک ٹھیک نہیں جان سکا تھا۔ اس لئے کسی خاص پولیسی اور جماعت کے لئے ان کے دل میں کوئی خاص نرم گوشہ نہ تھا اور نہ خاص اصرار۔ کسی مناسب آدرش کے فقدان کے باعث ہی کمیونزم کی طرف ان کا جھکاؤ تھا اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن یہ جھکاؤ بہت پائدار ثابت نہ ہوا۔ اس وقت سے مختلف فکری مراحل طے کرکے فی زمانہ یوروپی جدید تحریر و فکر سیاسی سطح پر بھی وسیع انسانیت دوستی کو ادبی فلسفہ کے روپ میں تسلیم کرچکی ہے۔[۱]

"نیوسگنیچر" کی اشاعت کے ایک سال بعد ایک اور مجموعہ "نیوکنٹری" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں علی الخصوص نثری تخلیقات تھیں۔ ان دو مجموعوں نے انگریزی ادب میں مختلف نوعیت کے ردعمل پیدا کئے۔ اس سے جدید ادب کی بابت کئی زوردار مباحث چل پڑے۔ ادبی نظریہ کے ساتھ ان مجموعوں نے سیاسی آدرشوں کے بارے میں بھی کچھ نئے افکار پیش کئے۔ اس لئے ان کے متعلق مباحث بھی مختلف نوعیت کے تھے۔ کچھ تو موضوعی، کچھ اسلوبیاتی اور کچھ سیاسی نوعیت کے حامل تھے۔

یوروپی جدید ادب ایک طرف تو جذباتی شدت کا امین تھا اور دوسری طرف اس میں ذہنی بیداری بھی واقعی درحقیقت یہ عقلی زاویۂ نگاہ اس جدید ادب کا ایک مابہ الامتیاز وصف تھا۔ انسانی قدروں اور معیاروں کی بات کرتے وقت عقلی نقطۂ نظر کا نمو پذیر ہونا قدرتی امر تھا۔ فطری ہونے کے سبب اس عقلیت نے جدید ادب کے ادبی شعور اور آگہی کو بے جان اور خشک نہیں بننے دیا لیکن جنگ اور امن، عقیدہ اور ارتداد، انجمات اور انحراف، کیتھولزم اور کمیونزم جیسے موضوعات کی بابت چلنے والی تحریک کو اپنے بنیادی مزاج میں دانشورانہ کردار کا حامل ہونا ہی تھا۔

محولہ بالا مجموعوں کی اشاعت سے قبل اور بعد میں بھی انگریزی کی نئی شاعری کی تحریک کے روح رواں علی الخصوص آڈن، سیسل ڈے لوئس اور اسپنڈر تھے۔ ان کی شعری تخلیقات میں موضوعی جدت اور ہیئتی ندرت کے ساتھ عصری زندگی کے زیر و بم اور دھڑکتے ہوئے سیاق سے لئے گئے ایمجز (تصاویر) کی تنظیم بڑی چابکدستی سے ہوئی ہے۔ "نیوسگنیچر" کے دیباچہ نگار مائیکل روبرٹس کا تو واضح بیان تھا کہ ان شعرا کی نگارشات میں جو سب سے اہم بات تھی۔ وہ ایک نئی طرح کی نادرہ کار ایمیجری کا استعمال تھا مشینی دور کے یہ ایمجز شاعروں کے دماغ میں بہت شعوری طور پر نہیں آئے تھے۔ بلکہ ان کی کیفیت کافی فطری اور غیر ارادی تھی۔ سائنس، مارکسزم فلسفۂ تاریخ اور نفسیات جیسے موضوع اس دور کی شاعری کے نہایت موثر اور کارگر وسیلے بن گئے تھے۔

یوروپی اور انگریزی جدید تحریر و فکر کی نشو و نما اور پرداخت کا بہت کچھ سہرا جان لیمن کے سر باندھا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں

---

[۱] اس ضمن میں مزید مطالعہ کے لئے راقم الحروف کے مضامین "انگریزی تنقید کے نئے زاویے" "مغربی تنقید کے نئے میلانات" مطبوعہ آہنگ (گیا) بعدازاں پاکستان میں صحیفہ اور فنون میں شائع شدہ قابل توجہ ہیں۔

خود ان کا تخلیقی کام بہت اہم نہیں ہے۔ لیکن اپنی "نیو رائٹنگ"، "نیو رائٹنگ اینڈ ڈیلائٹ" اور "پنگ ون نیو رائٹنگ" کے ذریعہ انھوں نے جو شیرازہ بندی کی ہے۔ وہ شاعروں، ادیبوں اور ڈرامہ نگاروں کی غیر منظم کوششوں سے ممکن نہیں تھا۔ "پنگوئن نیو رائٹنگ" کے بند ہو جانے پر بھی "دی لنڈن میگزین" کے وسیلے سے وہ جدید ادب کی عالمی سطح پر نمائندگی کرتے رہے۔ ویسے اس سے قبل بھی جدید ادب کے میلانات کو انھوں نے بین الاقوامی سطح پر ہی دیکھا تھا۔ جان لیمن کی سوانح عمری "دی وہسپرنگ گیلری" یوروپی جدید ادب کے ارتقا کو اس کے حقیقی تناظر میں پیش کرتی ہے۔

ابتدا "نیو رائٹنگ" کی تنظیم جان لیمن اور کرسٹو ایشروڈ نے نہایت تندہی سے کی تھی۔ بعد ازاں رالف فوکس، اسٹیفن اسپنڈر، روزامنڈ، بری ٹکس لیمن اور ولیم پلومر وغیرہ دوسرے ادیبوں کا بھی تعاون حاصل کیا گیا۔ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جان لیمن نے کئی بار یورپ کا سفر کیا اور جدید ادب کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو منظم کیا۔ دوران سفر میں تمام صورت حال کا اپنی آنکھوں سے جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ نئے سیاسی حالات میں جس نوعیت کے ادب کی تخلیق شروع ہوئی ہے۔ اس کی اپنی کچھ خوبیاں ہیں اور اس کی ایک حقیقت پسندانہ اور انسانی اپیل ہے۔ یہیں سے نیو رائٹنگ کا منصوبہ اس کے مدیر کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے خود جان لیمن کے الفاظ میں "بالآخر میں نے ایک ایسے جریدہ کے اجرا کا تصور کیا تھا جو نہ صرف متوسط طبقہ بلکہ مزدور طبقہ کے ادیبوں کو متحد کرے اور ان میں بھی دوسری طرح کے ادیبوں کو بھی آگے آنے کے لئے حوصلہ افزائی کرے جو ایک دوسرے کے نمائندہ اور تکملہ بن سکیں۔

نیو رائٹنگ کے ادبی گروپ میں "نیو کنٹری" خاندان کے بہت سارے دوسرے اراکین بھی شامل تھے۔ انگلینڈ کے علاوہ دوسرے ممالک کے ادیبوں نے بھی اس تنظیم میں فراخ دلی سے تعاون کیا۔ ان قلمی معاونین میں کرسٹوفر ایشروڈ، ایڈورڈ اپ وارڈ، اسٹیفن اسپنڈر، ریکس وارنر، ولیم پلومر، سیسل ڈے لوئس، جارج آرویل، جیمس اسٹرن، دی۔ ایس۔ پریچٹ، رالف فاکس، جیمس ہنلی، داسٹن اور رالف بیٹس اہم تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے بھی شعرا اور ادبا تھے جن کی اب تک نگارشات شائع نہیں ہوئی تھیں۔ اس طرح کے قلم کاروں میں ٹام ہرنس، لیسلی ہوورڈ، جارج گیرٹ، ولی گولڈ مین، جی۔ ایف۔ گرین، ایچ۔ ٹی۔ ہوکنس، کیتھ برٹ واسلے رینڈال سونگر اور بی۔ ایل۔ کمبیز تھے۔ ہندوستان کے انگریزی ادیب ملک راج آنند، احمد علی اور راجا راؤ کی تخلیقات بھی نیو رائٹنگ میں شائع ہوئی تھیں۔ دوسرے غیر ملکی ادیبوں میں آندرے جیمین، زیاگی آنو، لوئی بلو، آنا سگھرس، ایگز یوسلونے، نکولا تی تخونوف، اور آندرے میلر وجدید ادب کی اس تحریک میں بڑے ہی سرگرم اور فعال تھے۔

جان لیمن نیو رائٹنگ کے لئے جس خاص متوسط اور مزدور طبقہ کے ادیبوں سے تعاون کا خواستگار تھا۔ وہ اس کو پورے طور پر ملا لیکن یوروپی جدید ادب میں اعلیٰ، متوسط اور نچلے سبھی طبقوں کا مساوی طور پر تعاون رہا ہے۔

شعری ادب میں قبولیت حاصل کر کے جدید رجحانات آہستہ آہستہ ادب کے دوسرے رُوپوں کو بھی متاثر کر رہے تھے۔ نئے ناول نگاروں میں کرسٹوفر ایشروڈ اور ایڈورڈ اسپورڈ کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ دونوں کی ناولوں میں سیاسی شعور کی بھرپور کارفرمائی تھی۔ فاشزم اور سامراجیت پر کاری ضرب ان کی نگارشات میں واضح طور سے نمایاں تھی۔ شاعر اسپنڈر نے بھی افسانوی ادب میں کچھ کام کیا ہے۔ ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "دی برننگ کیکٹس" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اور اس کے بعد ہی ان کا ایک ناول "بیک ورڈ سن" بھی آیا۔ لیکن یہ ناولیں بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کے سماجی شعور اور حقیقت پسندی کے علمبردار ایچ۔ جی ویلز، بنیٹ، گالزوردی اور ای۔ ایم۔ فارسٹر کے اثرات سے قطعاً آزاد نہیں ہیں جس کی

ابتدا انیسویں صدی کے اواخر میں ٹامس ہارڈی اور بٹلر کی نگارشات سے ہوئی تھی۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ مذکورہ ناول نگار شعور کی رو کے نفسیاتی مکتبِ فکر سے ذرا بھی متاثر نہیں تھے جبکہ پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک سب سے اہم دبستان "چشمۂ شعور" کارہا تھا۔ اس کے نمائندے مارسل پروست، ڈارو تھی رچارڈسن، جیمس جوائس اور ورجینیا وولف نے اپنے پیش رو ہنری جیمس اور جوزف کانریڈ کے برخلاف ناول کو خارجی حقائق سے ہٹا کر بالکل ہی فرد کی داخلی زندگی اور شعور اور لاشعور کی تنہائیوں میں مقید کر دیا تھا اسی دور میں کچھ ایسے دوسرے اہم میلانات بھی رونما ہوئے جن کے علمبردار ناول نگار ہم عصر زندگی اور ماحول کے مزاج داں بھی تھے اور جن کے اندر تخلیقی صلاحیت بھی بدرجہ اتم تھی۔ چنانچہ اس ضمن میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور آلڈس ہکسلے کے ناولوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جو نئے لکھنے والوں پر اثر انداز ہوئیں۔ انگلستان کے "آندرے ژید" اینگس ولسن کا ناول "ہیم لاک اینڈ آفٹر" اپنی نفسیاتی ژرف نگاہی کے باعث ایک طرف خاصہ جاذبِ توجہ بنا۔ دوسری طرف دورِ جدید کا سولفٹ جارج آرویل بھی کم توجہ کش نہیں تھا جو آلڈس ہکسلے سے متاثر تھا۔ دوسری جنگ عظیم تک انگریزی ناول کے متعلق معروضی طور پر کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن گذشتہ پندرہ بیس سالوں کی تخلیقات کے مطابق کچھ کہنا آسان نہیں ہے۔ جن میں مختلف میلانات کی زیریں لہریں رواں دواں ہیں۔ مثلاً دونوں عالمی جنگوں کے درمیان ہی مذہب کی طرف عام رجحان بڑھا۔ خود انگریزی میں گراہم گرین کے ناولوں میں اس غالب مذہبی رجحان کی بھرپور کارفرمائی ہوئی ہے۔ اسی اثنا میں ہی انگریزی تراجم کے ذریعہ کرکیگارد کی ادبی تصانیف کو انگلستان میں غیر معمولی مقبولیت نصیب ہوئی۔ اس کے ساتھ جرمن زبان کے عظیم شاعر وادیب رلکے کی دل کش نثر اور کافکا کے مخصوص فلسفیانہ ایماء نے ناول نگاروں کو اس حقیقت سے روشناس کیا جو روح کی مریضانہ کیفیت اور ذہنی عارضہ کا نتیجہ ہے لیکن جس میں ذاتی نجات اور روحانی مشکل کشائی کی پُرخلوص کوشش کارفرما ہے۔ کافکا سے پہلے فرد کی تنہائی کی گونج، مایوسی کی دیوانگی، اعصاب شکن قنوطیت اور احساسِ شکست کو اس قدر سنجیدگی، گہرائی اور ہوش مندی سے نہیں پیش کیا گیا تھا۔

۱۹۵۰ سے ۱۹۵۵ تک اگر نئے ناول نگاروں نے مختلف ممالک میں فوجی خدمات کی انجام دہی کے ضمن میں دستیاب تجربات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا تو ۱۹۵۶ سے ۱۹۶۶ تک کے دوران میں انھوں نے یورپ کی سماجی زندگی اور ترسیل وابلاغ کے نئے وسائل کے ساتھ ہم آہنگی حاصل کرنے کی بھی کوشش کی۔ جدید ناول نگاروں میں چند ایسے بھی فن کار ہیں جو تیسری دہائی کی مارکسزم کی سرد عقلیت اور فنی منصوبہ بندی کے منکر ہیں۔ وہ اپنی نگارشات میں اس امر کی طرف توجہ مرکوز کرتے ہیں کہ دنیا اب کافی وسیع ہے اور انسان نہ محض اپنی ذات کے گنبد کدہ میں اسیر ہے اور نہ کسی سیاسی فارمولا کا پابند۔ اس کی زندگی میں جو پیچیدگیاں ہیں۔ وہ روحِ عصر کا تقاضا ہیں۔ یہ ہوش مند فن کار اپنے فن میں آفاقی اور انسانی اقدار کی تلاش و توازن کو عارضی مسائل کے شور و شر پر فوقیت دیتے ہیں اور اپنی عظیم الشان ناولاتی روایت کے صالح اثرات کو قبول کرنے پر فخر کناں ہیں۔ اس ضمن میں الزبتھ بوون کا ناول "دی ہیٹ آف دی ڈے" آئرس مرڈوک کے دو ناول "انڈر دی نیٹ" اور "دی فلائٹ فرام دی انچانٹر" روزامنڈ لیہمان کا ناول "دی بلیڈ اینڈ دی سی آلنس" نائیجل بالچن کا "مائین اون ایگزیکیوشنر" اور انگریز شاعر فلپ لارکن کا لے ۷۲ا

لے اس موضوع پر مزید مطالعہ کے لئے میرا آرٹیکل "جیمس جوائس اور ولیز" مطبوعہ شب خون الہ آباد مفید مطلب ہو گا۔ جو بعد ازاں "فنون" پاکستان میں بھی مزید اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

قابل ذکر ہیں۔

فی زمانہ جدید فکر و نظر کے مانند جدید ناول پر بھی اشتراکیت کے برخلاف وجودیت کا اثر غالب ہے۔ وجودیت کے علم برداروں میں سارتر، کامیو اور گبریل مارشل کی عظمت مسلم ہے۔ وجودیت کے مسائل کے مختلف پہلو انگریزی ناول نگاروں کے یہاں بھی عام ہو گئے ہیں جس کی نمایاں شکل آئیڈیا لوجی سے بیزاری، ہر نوعیت کی منصوبہ بندی سے گریز، ذات کی تلاش، فرد کی نفسیات کی تحقیق، اس کی تنہائی، قنوطیت، احساس شکست، مایوسی، اعصاب زدگی، زندگی کی بے کیفی، اقدار کی اضافیت اور موت کے تصور سے شغف ہے۔ کنگ سلے ایمس، جان وین، جان آسبرن اور ایلن سلیٹو کی تخلیقات پر یہ تصورات مستولی ہیں۔

ناول کے مانند اہم کام ڈرامہ میں بھی ہوا۔ ڈرامہ نویسی، اسٹیج آرائی اور میک اپ میں ان لوگوں نے خصوصی طور پر توجہ مرکوز کی۔ انگریزی ڈرامہ جو ادھر شعری ڈرامہ کے ہی شکل میں زیادہ مروج تھا۔ ان نئے ادیبوں علی الخصوص شاعروں کے ہاتھ میں پڑ کر مزید بالیدہ ہوا۔ اسٹیج کے نقطۂ نظر سے دو تجربات ہوئے ایک محنت کش سوشلسٹوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی جو یونیٹی تھیٹر کی شکل میں نمودار ہوئی اور دوسری کوشش خود "ینو کنٹری" خاندان کے ادیبوں کی تھی۔ ان لوگوں نے نجی کلب کے انداز میں ایک گروپ تھیٹر کی تنظیم کی۔

ڈرامہ نویسی میں شاعروں نے ہی خصوصی طور پر پیش قدمی کی۔ ایشروڈ، آڈن اور اسپنڈر وغیرہم۔ آڈن نے اس جہت میں اہم کام کیا۔ "پیڈ آن بوتھ سائڈس" اور "دی ڈانس آف ڈیتھ" آڈن کی ڈرامائی تخلیقات تھیں۔ اس کے بعد آڈن اور ایشروڈ نے مل کر "دی ڈوگ بینیتھ دی اِسکن" "دی ایسنٹ آف سکس" لکھیں۔ یہ تمام ڈرامے گروپ تھیٹر کے ذریعہ پیش کئے گئے۔ اسٹیفن اسپنڈر کا مشہور ڈرامہ "ٹرائل آف جج" گروپ تھیٹر اور یونیٹی تھیٹر دونوں ہی کے ذریعہ پیش کیا گیا۔

فرانس میں صورت حال قطعاً انگلینڈ سے مختلف تھی۔ وہاں شاعری کے بجائے نثر میں تبدیلی کے آثار رونما ہوئے۔ یہ جدید نثر نگار بیشتر علی الخصوص "واندریدی" نامی ہفتہ وار سے کسی نہ کسی شکل میں وابستہ تھے۔ شام کو پیرس کے کسی کیفے میں مل کر بیٹھنا ان دانش وروں کی وقت گزاری کا ایک دل چسپ شغلہ تھا۔ جدید ادب کے فرانسیسی موئدین میں سب سے اہم آندرے شیمان تھے۔

جدید ادب کے دوسرے غیر ملکی معاونین میں گی او نے، اگنے زیو سلونے، آنا سیگھرس، بربرٹ برشیٹ[۵]، ارنسٹ ٹولر، لڈوگ رین، مائیکل شولوخوف، نکولائی تخونوف، ژاں پول سارتر اور آندرے مالرو کے نام خصوصی طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسی سیاق میں چند امریکی ادیبوں میں ای۔ای کمنگز، ولیم سرویاں، جان اسٹین بیک، ٹینسی ولیمس، آرتھر ملر، سال بیلو اور ارنسٹ ہمنگوے کے نام بھی اہم ہیں۔

ان تمام ادیبوں کے نظریات مختلف تھے۔ لیکن ایک بات سب میں مشترک تھی۔ اپنے ملک کے عوام سے انھیں گہری دلچسپی اور والہانہ وابستگی تھی۔ جان لیمن کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے۔ ان کی شدید آرزو یہ تھی کہ وہ ایک نئی انسان دوستی، ایک

---

[۵] ہندوستان میں برشیٹ کا بریخت تلفظ مروج ہے۔ سہولت کے لئے نشان دہی ناگزیر ہے۔

نئے جذبۂ اخوت اور مرد و زن کے نئے اقدارِ حیات کی بابت اپنے معتقدات کا نہایت ادبی خلوص سے اظہار کرسکیں۔ اس بیان کی توثیق اسپینش سول وار کے سیاق میں خصوصی طور پر ہوتی ہے۔ اس خانہ جنگی میں جمہوریت کی گردن کو بے محابا آمریت کے آہنی قدموں کے نیچے کچلے جانے کے جنون کے خلاف تمام دانش ور ادیبوں نے سخت احتجاج کیا۔ اس ضمن میں نظریاتی اور عملی دونوں ہی سطح پر دلی ہمدردی کا مظاہرہ کیا گیا۔ اسپین سے گہری جذباتی وابستگی رکھنے کے باعث ہمنگوے کا نام یوروپی جدید ادب میں خصوصی طور سے وابستہ ہے۔ اس کی تخلیقات میں اسپینی تہذیب کے عناصر جا بجا ملتے ہیں۔ اسپین کے جنگ کی عکاسی بھی اُس نے بڑی چابک دستی سے کی ہے۔ شعری سطح پر اسپنڈر کی مشہورِ عالم تخلیقات "اسپین" آج ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ اسپنڈر کے علاوہ "یوراٹنگ" خاندان کے دوسرے بہت سارے اراکین نے بھی اس اخلاقی مہم میں تعاون کیا۔ یہی نہیں اسپین کی جمہوری طاقتوں کو جنگ میں عملی تعاون دینے کے لئے جو انٹرنیشنل بریگیڈ بنا۔ اس میں کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ سے منتخب بہت سے نئے ادیبوں نے حصہ لیا۔ ان میں کئی تو میدان جنگ میں کام آئے۔ اسپین کے لئے عالمی سطح پر یہ دردمندی اور جاں سپاری اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ جدید تحریر و فکر، فعال ادیبوں اور شاعروں کی ہمہ جہت بیداری کا درخشاں مظہر ہے۔

عالمی سطح پر جدید ادب کے دیگر چند میلانات کی کارفرمائی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ جدید ادب نے سیاست کو بھی تخلیقی عمل کے ایک ناگزیر عنصر کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ لیکن سیاسی سطح پر مکمل طور سے بیدار رہتے ہوئے بھی وہ غیر دردمندانہ کردار کا حامل نہیں ہے۔ بلکہ وسیع ہمدردی اور دردمندی اس کا جزو لاینفک ہے۔ اسی لئے مختلف نظریات کے مؤید ادیبوں کی ادبی نہج یکساں رہی ہے۔ جدید ادب میں کمیونسٹ، غیر کمیونسٹ، کیتھولک، وجودیت پرست اور نظریاتی طور پر وسیع المشرب ادیب و شاعر سبھی شامل ہوسکے۔ کیونکہ مختلف سیاسی شعور سے بہرہ ور ہوتے ہوئے بھی ان کے بنیادی عقائد انسان دوستی کے حامل رہے ہیں۔

ایمسن کے الفاظ میں ——— LIFE IS NOT POLITICS BUT ETHICS

اسی لئے اکثر سیاسی مسائل کے انسانی پس منظر میں ہر طبقہ کے ادیبوں نے ایک متحدہ محاذ بنایا ہے۔

جدید یوروپی تحریر و فکر کے عالمی سیاق میں پانچویں دہائی میں ایک نئے ڈائی منشن کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ فکری اَبعاد اینگری ینگ مین (برافروختہ نسل) کے متعلق ہے۔ ان کا نمائندہ مجموعہ ڈکلریشن ۱۹۵۷ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ ان کا بے پایاں غم و غصہ علی الخصوص ہر نوعیت کے فرسودہ اور از کار رفتہ معیار و اقدار اور دیوہیکل خون آشام ادارہ بندی کے خلاف ہے۔ انگریزی میں اس کو ایک لفظ اسٹیبلشمنٹ سے موسوم کیا گیا ہے۔ "ڈیکلریشن کے دیباچہ نگار" ٹامس میشلر نے بتایا ہے کہ اینگری ینگ مین سے اُس نوعیت کے راندۂ درگاہ ادیبوں اور شاعروں کو موسوم کیا جاتا ہے جن کے دل میں اپنی عصری زندگی کی اُداسی، محرومی، خود اطمینانی، ذہنی کھوکھلے پن، احساسِ جرم، خوف تنہائی، کیفیت انتشار اور آدرشی دیوالیہ پن کی بابت ایک بلا کے تیکھے غم و غصہ کی کیفیت موجزن ہوتی ہے۔ علی الخصوص سربرآوردہ آدمیوں کا ریاکارانہ پوزا اور خود اطمینانی ان کی برافروختگی کا خاص سبب ہے۔ اس مجموعہ کے مضامین کے عنوان ان کے لکھنے والوں کی ذہنی کیفیت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ "دی اسمال پرسنل وائس" "ایلونگ دی ٹائٹ روپ" "گیٹ آوٹ اور اینڈ پُش" اور "اے سِنس آف کرائسس"، جیسے چونکانے کے ساتھ ہی فکر انگیزی پر مائل کرنے والے عنوان قارئین کے دماغ میں کسی بھیانک خطرہ کی طرف نشان دہی کرتے ہیں۔ اگر جان آسبرن کے ہی صرف معرکہ آرا مضمون "دے کال اِٹ کریکٹ" کا ہی صرف تجزیہ کیا جائے تو کچھ اہم نقاط واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ انگلینڈ کے نظامِ حکومت میں بادشاہ کی حیثیت کا قیام، سوئز کے مسئلہ کو لے کر مصر پر یلغار اور کرسمس آئی لینڈ میں

ایٹم بم کا تجربہ ـــــ حکومت اور ادیب کا رشتہ اور مصنوعی اعتدال اور مصلحت پرور غیر جانب داری کا مسئلہ ۔ ان بنیادی مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے جان آسبرن نے خارا شگاف تنقید کی ہے اور اس سے بھی زیادہ رائے عامہ کی کھال کھینچی ہے ۔ ان سب کی بنیاد میں اس نے فکری بزدلی، دماغی جمود، روحانی نابینائی اور دانش ورانہ دون ہمتی اور بدترین مصلحت پروری کو کارفرما پایا ہے ۔ کمٹ منٹ، کنسرن اور انگیج منٹ کے جدید دور میں ذہنی بزدلی سے زیادہ عارضی اور ناپائیدار اور کوئی قابل رحم حالت نہیں ہے ۔ اس ضمن میں ادیب وشاعر کی ذمہ داری اور بڑھ گئی ہے ۔ بل ہوپکنس کے مقالہ کا پہلا جملہ یہی ہے ۔ گزشتہ دہائی کا ادب کسی مخصوص سمت، مقصد اور طاقت کے فقدان کے سبب یاد رکھنے کے قابل ہے۔" اور اس کا یہ بیان اس جملہ پر ختم ہوتا ہے۔ " انھیں وجوہات کی بنا پر میرا عقیدہ ہے کہ ادب کو آئندہ مذہب، فلسفہ اور قیادت کی اساس بننا ہے ۔ اس عقیدہ کے سیاق میں ادیب کی غیر معمولی ذمہ داری کی اہمیت کو میں شدت سے محسوس کرتا ہوں ۔ اگر ہماری تہذیب کو زندہ رہنا ہے تو" نئے ادیب وشاعر کی یہ ذہنی نخوت نہیں بلکہ حقیقی صورت حال کا عرفان ہے ۔ ایک طرف بڑھتی ہوئی ذمہ داری کا شدید احساس ہے اور دوسری طرف ذہنی دیوالیہ پن ہے ۔ اینگری ینگ مین کی برافروختگی کا یہ پس منظر ہے ۔ اس نظریہ سے نئے ادیب کی برانگیختگی، آتش زیر پائی اور سرکشی بلاوجہ نہیں ہے ۔ پھر وہ چاہے انگلینڈ میں ہو یا ہندوستان میں یا امریکہ میں ۔ درحقیقت بڑے بھائیوں کی گندم نما جو فروشی، نظریاتی مصلحت پروری اور ریاکاری ہی برافروختہ نوجوانوں کے باغیانہ رویہ کی پروردگار ہے ۔ جمہوریت کے ناکام تجربات، فرسودہ اور از کار رفتہ اقدار سے جذباتی وابستگی، آدرشوں اور نظریوں کے ضمن میں ایک غیر فعال غیر جانب داری کا ڈھکوسلہ ہی نئے فن کار کے دل میں عقیدت کو فنا کر کے برافروختگی کو پیدا کرتا ہے جون آسبرن کا ڈرامہ "لک بیک ان اینگر" انگلستان کے اشرافیہ کے حواس پر ایٹم بم بن کر گرا تھا۔ ادھر امریکہ میں بیٹ جنریشن (نسل) کے علمبردار شہرہ آفاق شاعر گنس برگ کی " ہاؤل" نے بھی ہوش ربا تہلکہ مچایا ۔ بیٹ نسل نے سماجی انقلاب کا ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے ۔ انھوں نے سارے سماجی، مذہبی اور اخلاقی بندھن توڑ ڈالنے کی مہم شروع کی ہے ۔ یہ سیاسی آزادی سے زیادہ جنسی اور اخلاقی آزادی کے قائل ہیں ۔ گزشتہ چند سالوں میں اس راندۂ درگاہ جرگہ کے افراد موڈ اور راکر بھی کہلانے لگے ہیں ۔ ان کی عجوبۂ روزگار زندگی اور طرز معاشرت پر سیمون فنکنون کے دو حالیہ اشاعت پذیر ناول " لو " اور " ہارٹ نوز ڈانس اون ریزن " بھرپور روشنی ڈالتے ہیں ۔ اس کے علاوہ مختلف طرز فکر کے حامل نئے سربرآوردہ فنکار دوی نک روولاں، جیک کیرواک، ڈینیل زیلے، گرد وج دانا اولی بیچ، ژاں ژینے، مادام سراط، ایلکس لاگوما، لائف پانڈورو، ملادین اولیاچا، ہیری مولش، ہانس بیول اور دیت نام کے بینی اینڈرسن عصری یوروپی ادب کے نئے ابعاد کے مایۂ ناز ترجمان ہیں ۔ انگریزی کے مشہور ناقد پرائس جونس نے اپنی ایک ریڈیو ٹاک " اے روڈ ودلو ٹریننگ " میں نئی انگریزی اور امریکی صورت حال کا موازنہ کرتے ہوئے کہا ہے جو نہ صرف اردو بلکہ پورے عالمی ادب پر بہت حد تک منطبق ہوتا ہے :

" یہ واضح ہے کہ مائکل بیوٹر اور جیک کیرواک کے درمیان براہ راست تعلق نہیں ہے اور نہ جان آسبرن کے " لک بیک ان اینگر " اور سیلن ہومس کے " گو " میں ـــــ لیکن ساری دنیا کے نوجوان ایک بڑی تعداد میں تقریباً ایک ہی مرض کے شکار ہیں۔" ــــ

مصوّر سبزواری

غزلیں

چہرہ زوالِ وقت کا عرفان سا کوئی
تھا ڈوبتے جزیروں کی پہچان سا کوئی

اوروں کی قربتوں نے بھلا رکھا تھا اسے
بچھڑے جو لوگ تو بڑھا ہیجان سا کوئی

پل میں زماں مکاں کی طنابیں اکھڑ گئیں
آیا تھا آدھی رات میں طوفان سا کوئی

شاید بدن ہی منکرِ لذّت ہوا نہ تھا
در آیا خول توڑ کے شیطان سا کوئی

بلقیس کے سبا کی طرح شہر شہر رات
اُڑتا رہا تھا تختِ سلیمان سا کوئی

پھولوں کی وہ کمان کسی کام دیو کی
میں اس کا حیدِ ٹوٹتا ایمان سا کوئی

گریاں مصوّر اس میں سجاول کے گیت ہیں
خطہ نہیں ہے وادیٔ مہران سا کوئی

●●

اپنے بدن پہ ٹوٹ کے پڑنے کو رہ گیا
خود سے میں اس محاذ پہ لڑنے کو رہ گیا

چھو کر تو دیکھ ہانپتی شاخِ شجر کی ڈھال
پتّا سا اک ہواؤں سے لڑنے کو رہ گیا

میں خوشبوؤں کی لاش جسے پی گئی ہوا
تو میری پور پور جکڑنے کو رہ گیا

خوش ہوں کہ تو بھی رہروِ دشتِ فرار تھا
اب کوئی بھی نہ مجھ سے بچھڑنے کو رہ گیا

ان زلزلہ شکار چھتوں سائبانوں میں
اب کون سا ستون پکڑنے کو رہ گیا!

آباد مجھ میں سایۂ بدروح ہے کوئی
میں وہ مکان ہوں جو اُجڑنے کو رہ گیا

لنگر اٹھائے نیلے جہاز آئے اور گئے
وہ پانیوں میں عکس پکڑنے کو رہ گیا

●●

شاعری کے حصے میں بھی ترتیب کا وہی منصوبہ اختیار کیا گیا ہے جو افسانہ نگاری میں
چناں چہ اسی طرح شعرا کو چار ابواب میں تقسیم کر کے ان کی منتخب تخلیقات پیش کی گئی
ہیں۔ لیکن اس حصۂ کتاب کا نام ' نظم ' رکھا گیا ہے، حالاں کہ اس میں غزلیں بھی
شامل ہیں۔ شاید ایسا نثر کے مقابلے میں لفظ ' ورس ' کا ترجمہ کر کے کیا گیا ہے۔ مگر
اول تو اس سلسلے میں اُردو محاورے کو پیشِ نظر رکھ کر نظم و غزل کے درمیان الجھن سے
بچتے ہوئے ایک تسلیم شدہ لفظ ' شاعری ' کا استعمال بہتر ہوتا، دوسرے یہ کہ زیرِ نظر
کتاب میں نثر و نظم کی عمومی تقسیم ادب ملحوظ نہیں ہے، بلکہ افسانہ و شاعری کی خصوصی صنفیں
پیشِ نظر ہیں۔ لہٰذا اس حصے کے لئے ' نظم ' کا عنوان غیر ضروری، اور ناموزوں ہے۔
اس کی جگہ زیادہ مناسب لفظ ' شاعری ' ہے۔

اس حصے کے آغاز میں ' نئی شاعری ' کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے
قاضی سلیم کہتے ہیں:

> " جدید شاعر کے لئے ضمیر کی آزادی ہی سب سے پہلا اور آخری معیار
> ہے۔ اس کے فن کارانہ اظہار کے لئے مبہم اور بے جان تعمیمات کو
> رد کر کے وہ اپنی ذات کے مختص ردِ عمل کو شعری تجربے کی بنیاد بناتا ہے۔"

یہ وہی معیار ہے جو افسانہ نگاری کے سلسلے میں بشر نواز پیش کر چکے ہیں۔ اس میں نئی
شاعری کے اصول موضوعہ کے طور پر ' ضمیر کی آزادی ' اور ' مختص ردِ عمل ' کے جو نکتے
پیش کیے گئے ہیں ان سے درحقیقت کسی ایسی امتیازی خصوصیت کا سراغ نہیں ملتا جو
نئی شاعری کے لئے مخصوص ہو، اس لیے کہ یہ دونوں نکتے عموماً اور عملاً ہر تخلیقی کام
کرنے والے کے لئے ہر دور میں معیار کا کام کرتے رہے ہیں۔ کیا ضمیر کی آزادی اور مختص
ردِ عمل کے بغیر بھی کسی فنِ لطیف، با معنی اور قابلِ لحاظ فنِ لطیف، کی تخلیق کبھی کی گئی
ہے؟ خواہ نئے کہلانے والے شاعروں کی طرح کسی نے دعویٰ کیا ہو یا نہیں اور خواہ کسی
دَور اور معاشرے میں قوانین و ضوابط کی کتنی ہی پابندیاں ہوں، مگر حقیقی فن کاروں،
ادیبوں اور شاعروں نے برابر مظاہرِ حیات کے متعلق ضمیر کی آزادی کے ساتھ اپنے مختص
ردِ عمل ہی پیش کئے ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ بعض وقت یہ ردِ عمل استعارات و علامات
میں ملفوف کر کے، لطیف و دقیق انداز میں پیش کیا گیا ہے، لیکن شعر و فن کی یہ اشاریت
قدیم و جدید ہر دور کے لئے یکساں اور عام رہی ہے۔

بہرحال ' جدید شاعری کے پس منظر ' میں جن شاعروں کو درج کیا گیا ہے وہ
ہیں: ن۔ م۔ راشد، میرا جی، فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، مخدوم محی الدین،

اور اختر الایمان۔ ان میں فراق کے سوا دوسرے سبھی شعرا کی نظمیں دی گئی ہیں۔ جو زیادہ تر آزاد و معریٰ ہیں اور کچھ پابند۔ ان میں سب سے بنیادی تجربہ راشد کا ہے۔ ان کی طویل آزاد نظم "دل مرے صحرا نوردِ پیر دل" بلاشبہ کچھ فنی امکانات کی نشاندہی کرتی ہے اور اس کے فکری احساسات بھی قابل توجہ ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ راشد نے نظم کا پیمانہ اتنا وسیع کر دیا ہے کہ وہ ان کے قابو سے باہر ہو گیا ہے اور ارتکاز و تنظیم کے ضروری عناصر ہیئت فن میں پورے طور سے ابھر نہیں پائے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ارتقائے خیال بھی اچھی طرح واضح نہیں۔ ممکن ہے کہ سارا فتور شاعر کے ذہنی قصور کا ہو، غالباً راشد نے اپنے موضوع پر زیادہ غور و فکر نہیں کیا ہے۔ چنانچہ ان کے تصور میں جذبے کا وہ نکھار نہیں جو فنی سانچے کو موثر کر سکے۔ بہرحال، اس نظم کے اشارات و علامات خیال انگیز ہیں۔ اس کے برخلاف، میراجی کی تخلیقات کی تاریخی حیثیت جو بھی ہو، مگر تنقیدی نقطۂ نظر سے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں مسلم ہوتی۔ ایک تو میراجی کا ذہن بے حد الجھا ہوا ہے اور ان کو اپنے تجربات پر قدرت حاصل نہیں دوسرے یہ کہ یہ تجربات بجائے خود بہت ہی معمولی اور مبتذل قسم کے ہیں اور شاعر کے احساس نے اپنی بے چارگی کے سبب ان کے اندر کوئی فنی قدر و قیمت بھی پیدا نہیں کی ہے۔ محض حواس و اعصاب فن کاری کے لئے کافی نہیں۔ مخدوم بلاشبہ جدید شاعری کے ورثے کا ایک ضروری جز ہیں اور ان کی چند نظمیں یادگار ہیں، مثلاً زیر تبصرہ مجموعے میں شامل "چاند تاروں کا بن" اردو کی بہترین اور عظیم ترین نظموں میں ایک ہے اور اس میں کیا گیا آزاد نظم نگاری کا تجربہ اتنا شاندار ہے کہ اس کو دیکھ کر ہم کو ہیئت فن پر اعتبار آنے لگتا ہے اور اس کے مستقبل کے متعلق توقعات پیدا ہوتی ہیں۔ یہی بات فیض کی نظم "ملاقات" کے بارے میں کہی جائے گی۔ جو جدید شاعری اور اس میں اجتہادی تجربے کی ایک دستاویز اور مثالی نمونہ ہے۔ اس میں فکر و فن اور موضوع و اسلوب کا کامل امتزاج پایا جاتا ہے۔ مربوط ارتقائے خیال، اجزائے ہیئت کی ہم آہنگی، مصرعوں، شعروں اور بندوں کی پیوستگی، استعارات و علامات کی ندرت و معنویت اور تجربہ و روایت کے مکمل توازن نے اس نظم کو ایک عالمی شاہکار بنا دیا ہے۔ فیض کی تخلیقات کا موازنہ راشد کے تجربات کے ساتھ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید اردو شاعری نے طفولیت سے بلوغت تک کا سفر طے کر لیا ہے۔ اس انتخاب میں فیض کی ایک اور اہم ترین نظم "تنہائی" کی شمولیت بھی ہونی چاہئے تھی۔

فراق کی غزلیں بے شک جدید غزل کے احساس و اسلوب کا نمونۂ اولین ہیں اور ان میں ایک تازگی اور انفرادیت پائی جاتی ہے، لیکن فراق کے تغزل کے تمام اجزا معیاری نہیں ہیں، ان کی کتنی ہی باتیں اور ادائیں اکھڑی اکھڑی سی، کھردری اور بے ڈول ہیں۔ فراق کے فن میں بہت زیادہ ناہمواریاں اور الجھاوے ہیں۔ ان کے یہاں، تہذیبِ رسم عاشقی کی بھی سخت کمی ہے۔ وہ جذبات و تخیلات سے زیادہ اہمیت اعصاب و حسیات کو دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں سوز و گداز دونوں ہی کی قلت ہے لیکن بیک وقت نشاط و دردمندی کے عجیب امتزاج اور اظہار و بیان کے تیکھے پن اور مہک نے ان کی غزلوں میں ایک خاص رنگینی اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ فراق کی انفرادیت مسلم ہے، لیکن عظمت مشتبہ۔

اختر الایمان کی ایک پابند نظم "یادیں" اور دوسری معریٰ نظم "ایک لڑکا" دونوں ہی منفرد قسم کے متوازن تجربے ہیں اور ان سے شاعر کے ذہن و فن کی امتیازی خصوصیت کا اشارہ ملتا ہے، لیکن جلا اور جودت کے وہ عناصر آشکار نہیں ہوتے جن کے بغیر قدرِ اول کا فن تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت اختر الایمان کو پس منظر کے بجائے توازن کے باب میں رکھنا چاہئے تھا۔

توازن اور اجتہاد کے ابواب میں ایک ہی انداز کی اور ایک دوسرے سے ملتی جلتی تخلیقات پیش کرنے والے شعرا کی اتنی بھیڑ ہے کہ امتیاز وانتخاب کا تاکیدی نشان بہت دشوار ہے، اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ان ابواب کے تحت درج کیے گئے سبھی لوگ دراصل شاعر نہیں ہیں، بلکہ بہتیرے متشاعر ہیں اور محض اتفاقات نے ان کو خواہ مخواہ شاعروں کے زمرے میں کھڑا کر دیا ہے۔ بہرحال، توازن کے باب میں قابل ذکر شعرا یہ ہیں: خلیل الرحمٰن اعظمی، شاذ تمکنت، مظہر امام اور خورشید احمد جامی۔ ان میں آخرالذکر صرف غزل کے شاعر ہیں۔ جب کہ باقی تینوں نظم و غزل دونوں پر دست رس رکھتے ہیں اور ہر ایک کو آزاد نظم نگاری سے خاص شغف ہے۔ ان شعرا کی جو آزاد نظمیں شریک انتخاب ہیں ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی 'میں گو تم نہیں ہوں'۔ شاذ تمکنت کی 'نسیان کی عمارت شکستہ'، اور مظہر امام کی 'اکھڑتے خیموں کا درد' کامیاب اچھی اور امید افزا تخلیقات ہیں۔ پہلی اور دوسری نظموں کا موضوع ایک ذاتی تجربہ و احساس ہے، جب کہ تیسری نظم ایک آفاقی المیے کو پیش کرتی ہے۔

اجتہاد کے باب میں بالکل نئی شاعری کے بیشتر مشہور شعرا جمع کر دیئے گئے ہیں، گرچہ ان سب کی بہترین تخلیقات غالباً درج نہیں کی گئی ہیں۔ بہرحال، دو بنیادی خصوصیات ان سب کے درمیان مشترک ہیں۔ ایک یہ کہ ان لوگوں نے بالکل نئے، انوکھے اور اجنبی قسم کے احساسات کو، جیسے کہ وہ اعصابی طور پر ہیں، بغیر کسی تراش و خراش اور تربیت و تہذیب کے، پیش کر دیا ہے دوسرے یہ کہ یہ لوگ رموز و علائم اور استعارات و تلمیحات کا استعمال بڑی کثرت اور شدت کے ساتھ کرتے ہیں اور اشارے کنائے پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان باتوں کے سبب ان شعراء کے کلام میں طرفگی سے زیادہ عجوبگی اور معمگی کے مظاہر ملتے ہیں لیکن ان سب کے تخیل میں ایک باریکی اور احساس میں تیزی بھی پائی جاتی ہے، جس کے باعث ان کے کلام میں کچھ نادر تصویریں اور تازہ تشبیہیں ابھری ہوئی ہیں۔ ان لوگوں نے ایک اور لائق توجہ کام یہ کیا ہے کہ پیش پا افتادہ اور معمولی مناظر و مظاہر کو شعریت میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ مجموعی اور عمومی طور پر کہنا چاہیے کہ یہ نئے شعرا ہنوز اپنی راہوں کا تجسس کر رہے ہیں اور صرف تجربے کے مرحلے میں ہیں، جب کہ منزل مقصود پر پہنچ کر اپنی ایک روایت بنانا اور تاریخ ادب کا ایک جز بننا ابھی ان کے لئے باقی ہے۔ شاید ان شعراء کے متعلق کسی قطعی تنقیدی جائزے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ فی الواقع ان میں سے کسی نے ہنوز کوئی ایسا تخلیقی کارنامہ انجام نہیں دیا ہے جس کی قوت و صلاحیت کا تعین کیا جا سکے۔ بہرحال، عمل اجتہاد میں مشغول تصور کئے جانے والے جن شعراء سے کچھ نہ کچھ توقعات کا اظہار کیا جا سکتا ہے وہ غزل گوئی میں بانی اور بشیر بدر ہیں اور آزاد نظم نگاری میں عادل منصوری، عمیق حنفی، شفیق فاطمہ شعریٰ، باقر مہدی، بلراج کومل اور بشر نواز ہیں۔

اعتبار کا باب افسانے ہی کی طرح شاعری میں بھی ایک مدفاصل ہے۔ اس میں شامل کئے گئے شاعروں میں سے ایک قابل ذکر غزل گو پرکاش فکری کو بانی اور بدر کے ساتھ اجتہاد ہی کے تحت دے دینا چاہیے تھا۔

'نئے کلاسک' کے حصۂ شاعری میں چند نمایاں فروگذاشتیں یہ ہیں: علی سردار جعفری، نازش پرتاب گڈھی، فضا ابن فیضی، حرمت الاکرام، حسن نعیم، انیس امام، کرامت علی کرامت، ظہیر صدیقی۔

اِس حصے کی ایک بڑی فروگذاشت یہ بھی ہے کہ آزاد اور معری نظموں تک نظر انتخاب کو محدود کر کے اقبال کے بعد ابھرنے والے بہتیرے اہم جدید شعرا کے قیمتی تجربوں سے نئی نسل کے فن کاروں کو محروم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آج کی اردو شاعری کے پس منظر اُن کے علاوہ فیض، فراق اور مخدوم ہی کی صف کے دوسرے شعرا کو بھی درج کرنا ضروری ہے۔ مثلاً جوش، حفیظ، جمیل مظہری

یگانہ، جگر، احسان بن دانش، مجاز، جذبی، وجد، ندیم، روش صدیقی، پرویز شاہدی، مجروح، ساحر۔

(۳)

نئے افسانے اور نئی شاعری کے عمومی تصورات و تجربات پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہ نئے فن کار اپنے دور کے تازہ ترین موضوعات و احساسات کو گرفت میں لینا چاہتے ہیں اور ان کے اندر ایک صحت مند میلان یہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے ماقبل کی نام نہاد ترقی پسندی کے جمود کو توڑ کر اس کی پیدا کی ہوئی فرسودگی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ جس داخلیت اور ذاتی رد عمل کا حوالہ یہ نئے فن کار بار بار دیتے ہیں وہ دراصل اسی انفرادی تازگی کی ایک کوشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئے افسانہ نگاروں اور شاعروں نے دَورِ حاضر کے نت نئے واقعات و حادثات کو اپنا موضوعِ سخن بنایا، یہاں تک کہ ماضی قریب کی مصنوعی بندشوں سے آزادی حاصل کرنے کیلئے یہ فن کار ماضی بعید کی طرف بھی لوٹ کر گئے، گرچہ بیشتر یہ رجعت کسی سنجیدہ تفکر کے بجائے ایک تخیلی رومانیت پر مبنی ہے۔ بہرحال، اشتراکی اجتماعیت کے مقابلے میں جدید انفرادیت ایک عصری اہمیت رکھتی ہے اور گرچہ اس میں ایک انتہاپسندی ہے مگر دو انتہاپسندیوں کے تصادم سے توازن کے مواقع بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جدیدیت سے منسوب کیا جانے والا ادب بالآخر توازن کا یہی تاریخی رول ادا کرے۔ اس سلسلے میں نئے ادب کی وسعتِ تخیل خاص کر امید افزا ہے، جس نے انسانی تہذیب کو محض معیشت و سیاست تک محدود کرنے کے بجائے عمرانیات و اخلاقیات کی بنیادی اہمیت پر بھی زور دینے کی کوشش کی ہے، گرچہ بیشتر نئے فن کاروں کا ذہن واضح اور ہموار نہیں ہے۔

اس اعتبار سے "نئے کلاسک" کے مرتبین نے جدید ادب کے پس منظر کو ترقی پسندوں تک محدود کر کے نئے رجحانات کی ایک ناقص اور غلط تعبیر کی ہے۔ نئے افسانہ و شاعری کی روایات میں 'ترقی پسندوں' سے کم اہمیت 'قدامت پسندوں' کی نہیں، اور ماضی قریب میں بھی روایات کے یہ دونوں ہی عناصر موجود ہیں اور جن لوگوں کو قدامت پسند اور رجعت پسند قرار دے کر ترقی پسند اشتہار بازوں نے اپنے دورِ عروج میں فنا کرنے کی کوشش کی تھی آج ان کی اہمیت ایک نئے انداز سے ابھر آئی ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ نگاری میں آج اختر اورینوی کی اہمیت کرشن چندر سے کم نہیں۔ اسی طرح شاعری میں حفیظ جالندھری اور جمیل مظہری کو فیض اور مخدوم کے ساتھ ہی جگہ دینی چاہئے۔ جب تک نیا ادب اپنا پس منظر اس حقیقت پسندی کے ساتھ درست نہیں کرے گا، ایک منفی رد عمل سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکے گا۔

نئے افسانے میں شعور کی رَو اور نئی شاعری میں علامت نگاری کا جو غلبہ نظر آتا ہے اس پر آج کے فن کاروں کو سنجیدگی سے نظر ثانی کرنی چاہئے۔ تازہ کاری کا مطلب ہرزہ کاری نہیں ہوتا ہے۔ اگر شعور کی رو اس طرح چلتی ہے کہ کوئی قصہ نہیں ابھرتا بلکہ صرف واقعات و احساسات کی کچھ بکھری ہوئی جھلکیاں اکٹھا ہو جاتی ہیں تو یہ افسانہ نہیں ہوا، خواہ انشائیہ ہو جائے یا فلسفہ اور خواہ سند انگلستان سے لائی جائے یا فرانس سے۔ اسی طرح اگر علامتیں اس انداز سے ڈھیر کر دی جاتی ہیں کہ نظم کا کوئی ہیولا نہیں مرتب ہوتا تو یہ شاعری نہیں ہوئی۔ خواہ اس کو کوئی بھی اور نام دیا جائے اور اس کے لئے سند کہیں سے بھی لائی جائے۔ کسی بھی صنف میں، فن کے کچھ کرنے تقاضے، کچھ سخت آداب ہیں، فن محض جذبات و خیالات کلاً بال یا اُم کال نہیں ہے، یہ نام ہے تصورات و احساسات کو ایک سانچے میں ڈھالنے، ایک رنگ اور روپ دینے، ایک معنی خیز اور فکر انگیز تاثر پیدا کرنے کا۔

ایک فن پارے سے [illegible] اگر مسرت و بصیرت حاصل نہیں ہوتی تو وہ ناکام اور سراسر خام ہے۔

نظمِ آزاد پر ہمارے نئے شعراء بہت ہی مبالغے کے ساتھ زور دے رہے ہیں، لیکن جس کثرت کے ساتھ اس ہیئتِ شاعری کو استعمال کیا جا رہا ہے اتنی ہی محنت و صلاحیت اس کی ترقی پر صرف نہیں کی جا رہی ہے، یہاں تک کہ کتنے ہی نئے نام جو اس صنفِ ادب کے ساتھ منسوب ہوگئے ہیں درحقیقت انہوں نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ اپنے فن کی آب یاری کے لئے کچھ کیا ہی نہیں ہے یا پھر ان کے اندر کچھ کرنے کی قطعاً اہلیت نہیں ہے۔ ایک طرف 'نئے کلاسک' کے مرتبین پس منظر میں فیض کی 'ملاقات' اور مخدوم کی 'چاند تاروں کا بن' پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف ان نمونوں پر عمل کی گراوٹ جو نوازن کے باب سے شروع ہوتی ہے تو اجنبا د تک پہنچ کر اسفل السافلین میں چلی جاتی ہے اور اعتبار میں معاملہ صفر ہو جاتا ہے۔ یہ بڑی مایوس کن اور تشویش انگیز صورت حال ہے۔ کوئی نظم کتنی ہی آزاد ہو، اس کو ایک نظم تو ہونا ہی چاہئے، جس میں مصرعے اور بند ایک دوسرے سے پیوستہ ہو کر ارتقائے خیال کی ایک مربوط اور واضح شکل ترتیب دیں۔ اور احساسات نیز ان کی نشان دہی کرنے والی علامتیں کتنی ہی اچھوتی اور البیلی ہوں اور کتنے ہی گہرے تجربے کو پیش کرنے والی ہوں۔ بہر حال ہیئت نظم کے اندر ان کے معانی و مضمرات تو قابلِ فہم ہونے چاہئیں، اور اگر کوئی فن کار اتنی تنظیم کے ساتھ اپنی تجلیات کو ادا کرنے کا اہل نہ ہو تو پھر غزل میں قیمتی سے قیمتی تجربے کے ریزے بڑے خوب صورت اور موثر انداز میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ بہ شرطے کہ نظم و غزل کے درمیان تمیز کرنے اور غزل کی روایات کو برتنے کا سلیقہ ہو، ورنہ غزل میں نظم کے احساسات و تصورات کو جوں کا توں ٹھونس دینے کی کوشش بہت ہی بھونڈی ہوگی اور بھدی ہوگی۔ اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ ہمارے جدید شعراء بالعموم نظم و غزل کے درمیان فنی امتیاز نہیں کر پا رہے ہیں، دوسرے یہ کہ ان کا ذہنی انتشار شاید غزل ہی کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن نئے شاعروں نے بھی ذرا سنبھل کر غزلیں یا ان کے کچھ اشعار کہے ہیں ان میں انہوں نے جدت و ندرت کا ثبوت دیا ہے، گرچہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ بسا اوقات ہمارے نئے شعراء نے خواہ مخواہ صرف نیا پن پیدا کرنے کے لئے تغزل کو ملیامیٹ کر دیا ہے، ان کو سمجھنا چاہئے کہ ادب اور زندگی دونوں میں اعتبار تجدید کا ہوتا ہے، تجدد کا نہیں، نیا ہونا بڑی اچھی بات ہے مگر نیا بننا اتنی ہی بری بات ہے، اور فن میں تصنع صنعت کا دوسرا نام نہیں ہے، فن کاری کے لئے بہر حال خیالات کی اصلیت درکار ہے اور اس اصلیت کے اظہار کا موزوں ہونا بھی ضروری ہے۔

نئی شاعری کے معاملے میں بہر حال 'نئے کلاسک' نے 'نئے نام' وغیرہ کے مقابلے میں اتنی ترقی اور بہتری کا ثبوت ضرور دیا ہے کہ احمد ہمیش اور افتخار جالب جیسے مہمل گویوں کو شاعروں کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔ اس سے کم از کم یہ توقع ہوتی ہے کہ شاید اب نئی شاعری کے بردار فن و ادب پر پہلے سے زیادہ سنجیدگی اور بلوغت کے ساتھ سوچنے لگے ہیں۔ مستقبل کے لئے یہ ایک امید افزا اشارہ ہے۔ اردو شاعری کا ارتقا بہر حال دورِ حاضر کے فن کاروں ہی سے وابستہ ہے:

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ (اقبال)

یہ بات جتنی نئی شاعری کے متعلق [illegible] ہے اتنی ہی نئے افسانے کے متعلق ہے۔ لیکن نئے شاعروں اور افسانہ نگاروں دونوں ہی کو سوچنا چاہئے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ [illegible] افسانہ و شاعری نہ تو کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقات کے پائے کی یا اس سے

(بقیہ صـ ۶۴ پر)

غزل

علقمہ شبلی

ہیں یہ چہرے کہ نقابوں کی دکاں ان کو کہیں
شہر میں اب کسے ڈھونڈیں کہ ذرا مل بیٹھیں
مصلحت کا یہ تقاضا ہے کہ خاموش رہیں
دل یہ کہتا ہے کہ جو سچ ہے اسے عام کریں
کس لئے قتل ستاروں کا ہوا رات ڈھلے
آپ کو تاب ہو سننے کی تو ہم عرض کریں
صاحبِ لوح و قلم سب یہاں آتے ہیں نظر
کوئی ہم سا تو ملے جس سے کہ ہم بات کریں
آج بھی وقت کی سولی پہ ہیں لاشیں لٹکی
کاش قاتل ہی نہیں، آپ مسیحا نہ بنیں
"خیریت ہے" کا لگا بورڈ ہے باہر میں، مگر
ہم تو اندر سے ہیں ٹوٹے ہوئے، آ کر دیکھیں
دھوپ کھلنے کے لئے صبح بھی آئی چھت پر
آپ بھی شبلی رضائی سے نکل کر دیکھیں

غزل

جناب پرشاد راہی

غبارِ راہ گزر کا طلسم ٹوٹ گیا
یہ کیا ہوا کہ نظر کا طلسم ٹوٹ گیا
سیاہیوں کے سمندر میں شعلے بھڑکے
اگرچہ شام و سحر کا طلسم ٹوٹ گیا
سوا داد رہے گا مورخوں کے لئے
جو اس قدیم کھنڈر کا طلسم ٹوٹ گیا
اُبل پڑے گا لہو سنگ دل چٹانوں سے
جو اعتبارِ نظر کا طلسم ٹوٹ گیا
ملا جو اوجِ ترقی زمیں کے ذروں کو
فلک کے شمس و قمر کا طلسم ٹوٹ گیا
خیال و خواب کے پیکر جو بے نقاب ہوئے
حقیقتوں کے نگر کا طلسم ٹوٹ گیا
فسونِ عکسِ تخیل نہ پوچھئے راہی
غرورِ آئینہ گر کا طلسم ٹوٹ گیا

احمد یوسف

پطرس اور "مرحوم کی یاد میں"

پطرس ہمیں تہذیب کے دائرے میں رہ کر زیرلب مسکرانے کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ بلند قہقہوں کے قائل نہیں ہیں۔ اس طرح بحیثیت طنز نگار وہ رُلا دینے والی چٹکیوں کے حق میں بھی نہیں ہیں۔ ایک دھیما دھیما سا مزاح ، ایک ہلکی ہلکی طنز کی آنچ ان کے مضامین میں جا بجا سلگتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ محض چند لمحوں کا نشہ اور محض ایک عارضی سرور کی کیفیت نہیں ہوتی۔ پطرس کے مزاح دل میں ایک دیرپا کیف بن کر اُتر جاتے ہیں ، اور ان کے طنز کی ہلکی پھلکی چٹکیاں ہمیں دیر تک درد کی لذتوں میں مبتلا رکھتی ہیں۔

پطرس ٹھٹھول اور پھکڑ بازی کے قریب بھی نہیں آتے۔ ان کے نزدیک زور زور سے ہنسنا اور قلابازیاں کھانا عیب میں داخل ہے۔ وہ الفاظ کے بازیگر ہیں اور ان ہی کے ذریعے وہ ایک مضحکہ خیز سچویشن پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کی اچک پھاند والے بے مقصد جملے بازیوں سے مزاح نہیں پیدا کرتے۔ ایک معروضی حقیقت پسندی ان کے فن کا خاصہ ہے۔ ان کی تحریریں SUGGESTIVENESS ہے اور وہ عقلیت کا دامن نہیں چھوڑتیں۔

ان کے اسلوب میں دل کشی ہے۔ وہ تہ دار ترکیبوں اور الفاظ کی دو دھاری تلوار سے لیس ہو کر طنز و مزاح کے میدان میں اُترتے ہیں۔

مثلاً "مرحوم کی یاد میں" ہی کو لیجئے۔ مضمون یوں شروع ہوتا ہے۔

"ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی پرانی ہو گئی ہو تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ــــــ"

یہاں وہ ایک سماجی حقیقت کو بڑے دل کش پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ جب دوستوں کے تعلقات پرانے ہو جاتے ہیں اور گفتگو کے لئے مختلف النوع موضوعات کو وقت کی زبان چاٹ جاتی ہے، بولنے کو کچھ نہیں رہتا، سوچنے کو کچھ نہیں رہتا تو بڑے بے تکلف دوست بھی آمنے سامنے کرسیاں بچھائے بیٹھے رہتے ہیں اور ان کے درمیان خاموشی ایک قدر مشترک بن جاتی ہے اور وہ دونوں مل کر اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں ــــــ

"موٹر اس ادا سے گزر جائے .... تو اس دن گھر میں آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں، جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم

بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔"

یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ علم کیمیا ہمیں سونا بنانے کا عمل بھی سکھاتا ہے اور بم بنانے کا بھی۔ بم کے نسخے کی بات کر کے جہاں انہوں نے ایک روایتی انداز فکر سے گریز کیا ہے، وہاں ہمیں یہ بات بھی سمجھا دی ہے کہ ناپختہ ذہن بیشتر حالات میں تخریب کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

" مرزا صاحب میں ایک موٹر خریدنے لگا ہوں ——"

اس جگہ انہوں نے زمانہ حال استمراری PRESENT CONTINOVS TENSE کا استعمال کر کے ماجرے کو بے حد دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس میں ناداری کا احساس خود فریبی کی قبا اوڑھ کر ہمیں لطف و انبساط میں غرق کر دیتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو موٹر خریدنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا وہ اس TENSE کی وساطت سے اسے بتدریج خریدنے کی بات سوچتا ہے۔

" تو میاں خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ 'وغیرہ' کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا، لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرسکو گے۔"

یہاں روپے کے ساتھ 'وغیرہ' کا استعمال بے معنی ہے اور مرزا کا یہ کہنا کہ 'وغیرہ' کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا۔ یہ مطلب رکھتا ہے کہ 'بے معنی' شئے کا تو انتظام ہو جائے گا، لیکن اس مادی دنیا میں جو شئے سب سے زیادہ معنویت کی حامل ہے، یعنی 'روپے' ان کا انتظام کہاں سے ہوگا؟

" تب 'میں' نے بتایا کہ وہ اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ دے گا مثلاً سگریٹ کیس جس کی قیمت مرزا دس آنے لگاتے ہیں۔ یعنی ڈھائی تین ہزار کی مطلوبہ رقم میں دس آنے کا انتظام تو ہو ہی جائے گا۔"

یہ ساری گفتگو خاص سنجیدہ فضا میں اس منزل تک پہنچتی ہے۔ پطرس قاری کو ہنسانے اور لطف پہنچانے کے سلسلے میں کوئی شعوری کوشش نہیں کرتے۔ لیکن جملے کی ساخت اور انداز بیان بار بار گدگدیاں لگاتا ہے اور ایک عجیب سی مضحکہ خیز پوزیشن پیدا کر دیتا ہے:

" یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں؟ بہت سوچا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔"

یعنی یہ کہ دست و بازو کی محنت سے تو میں بھی کماتا ہوں لیکن عالم یہ ہے کہ میری قیمتی اشیاء میں سرفہرست میرا سگریٹ کیس ہے جس کی قیمت مرزا نے دس آنے لگائی تھی۔ پھر آخر یہ تین تین ہزار روپے کی کاریں کہاں سے آتی ہے۔ سامنے کا جواب تو یہی ہوگا کہ چوری سے۔

اس کے بعد مرزا 'میں' کو یہ مژدہ سناتے ہیں کہ ایک بائیسکل مفت میں مل سکتی ہے۔

" ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، اُبلتے فواروں کی موسیقی اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں، چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا۔"

پطرس اگر سیدھے سادے انداز میں صرف یہ کہہ دیتے کہ "میں بے حد خوش ہوا" —— یا "میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی" تو یہ جملے ایسی مکمل فضا اور ایسا بھرپور انداز بیان دینے سے قاصر رہتے۔ یہاں انہوں نے ایک ہی خیال کو کئی نمونوں سے گھیر کر دلچسپ بھی بنا لیا ہے اور ایک فضا کی تشکیل کر کے قاری کو بھی اس فضا میں شریک کر لیا ہے۔

اس انکشاف کے بعد کہ وہ سائیکل مرزا کی ہے 'میں' نے بے حد ممنونیت کا اظہار کیا اور پہلی بار اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ اپنی کم فہمی اور تنگ خیال کے باعث آج تک مرزا کو خود غرض اور عیار سمجھتا رہا تھا۔ درآنحالیکہ مرزا نے جس شرافت، بھلمناہٹ اور دوست پروری کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔
پھر غالباً اسی واسطے یہ فضا ہموار کرتے ہیں کہ جب قصہ آگے بڑھے گا تو قاری خود کھل کھلا کر ہنس پڑے گا اور کہے گا کہ "یہی تھے جناب آپ کے دوست"۔ وہ کسی قسم کی پیشین گوئی کو پسند نہیں کرتے، گویا قاری کو کہتے جاتے ہیں کہ آپ خود ہی دیکھیں گے اس طرح یہ مکالمہ بھی اس فضا بندی کی ایک کڑی ہے:

"مرزا کہنے لگے، کبھی اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارہ نہیں کرتے، حالانکہ خدا گواہ ہے احسان اس میں کوئی نہیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ خدا ہی گواہ تھا کہ اس میں احسان کوئی نہیں تھا بلکہ .... آپ خود ہی اس مقام تک پہنچیں گے۔

اس کے بعد مرزا کہتے ہیں:

"قیمت کا ذکر کر کے تم مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔"

پھر بائیسکل کی تعریف میں یہ ارشاد فرماتے ہیں:

"آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے آج کل کی بائیسکلیں تو ٹین کی بنی ہوتی ہیں۔"

ان جملوں میں جہاں ظرافت چھپے چھپے وار کرتی ہے۔ وہاں مرزا کا اپنا کردار بھی اُبھرتا ہے۔

"میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ومیت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں تم نہ مانو گے۔"

دوسری طرف 'میں' کی اقتصادی مجبوری اور مفلسی کے خدوخال بھی واضح طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

"لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا، تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔ وہ تو بے چارہ بالکل یہی کہتا تھا کہ تم مفت میں لے لو۔ لیکن میں کیسے لوں، آخر بائیسکل ہے ایک سواری ہے گھوڑوں اور ٹانگوں کے زمرے میں آتی ہے۔"

"بکس کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپئے ہیں۔ چھیالیس روپئے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں، پینتالیس یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے، پچاس تو ہو نہیں سکتے۔ اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس ہی کیوں نہ دئیے جائیں، جن رقموں کے آگے صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے چالیس روپئے دے دوں گا۔"

مالی دشواریوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی طرح 'میں' بار بار خود کو تسلیاں دیتا ہے۔ ایک کشمکش، حالات سے مفاہمت اور عدم مفاہمت کی جنگ، جس میں بالآخر مفاہمت اور موقع شناسی کو فتح ہوتی ہے، وہ ینگ چلتی رہتی ہے۔ یہ باتیں جو عام حالات میں بے حد سنجیدہ ہوتی ہیں، پطرس کے پاس پہنچ کر ایسی گولیاں بن جاتی ہیں جو اندر سے کڑوی کسیلی ہونے کے باوجود اوپر سے خاصی میٹھی ہوتی ہیں۔

مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا، لیکن ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کر لینا تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل

بھجوادینا۔"

اس کے بعد بائیسکل کے انتظار کا مرحلہ اور اس کے خواب (یعنی وہ خواب جو متوسط درجے کے محدود ذرائع رکھنے والے
[...]دن کا حق ہے) بے حد دلچسپ ہیں۔

"دو تین دن کے اندر اردگرد کے تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈرات کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔"

"بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کر دوں گا۔"

"ہوا خوری کے لئے ہر روز نہر تک جایا کروں گا۔"

—— اور یہ خواب اتنے سہانے ہیں کہ بائیسکل بالآخر ایک معشوق بن جاتی ہے۔

"بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ اڑ رہا ہو۔"

"ذرا جلدی جلدی چائے پی، غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ 'چل چنبیلی باغ میں' گاتا رہا۔"

[...]ین یہ خواب بڑے دقتی ہیں کیونکہ یہاں سے قصہ ایک دوسرا موڑ اختیار کر لیتا ہے۔ اس موڑ میں ہمیں مرزا کہیں نہیں دکھائی دیتے۔
[...]اس کہانی کے آخوی سرے پر پطرس گویا اپنے قارئین کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"حضرات یہ تھے میرے دوست مرزا صاحب۔"

اس موڑ پر پہنچ کر 'میں' کے خواب ٹوٹتے ہیں اور انھیں بڑی دکھ بھری راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس حصے کی شروعات [...]ل ہوتی ہے۔

"برآمدے میں آیا تو دیکھا کہ ایک عجیب و غریب مشین پڑی ہے، ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے، نوکر سے دریافت کیا "کیوں بے یہ کیا چیز ہے" نوکر بولا "حضور یہ بائیسکل ہے۔""

چنانچہ نوکر کے اس انکشاف کے بعد 'میں' اپنے دل کو سمجھاتا ہے۔ یہاں دل کو سمجھانے کی کیفیت بے حد دلچسپ ہے
[...]میں' کا بائیسکل کے قریب آنا۔ نوکر سے اُسے صاف کرنے اور تیل ڈالنے کی فرمائش اور پھر دل سے یہ گفتگو کرنا:

"بائیسکل ہے لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہل، رہٹ اور چرخہ، اس طرح کی ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔"

"پھر پہیے کو گھما کر سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا، لیکن اب سوراخ میں سلسلۂ آمدورفت بند تھا۔"

یہاں 'کسی زمانے میں' کا استعمال توجہ طلب ہے، یعنی وہ زمانہ ماضی بعید ہی کا کوئی زمانہ ہوگا، ماضی قریب کی [...]ات تو سوچی ہی نہیں جا سکتی ہے۔

'میں' نے کہا "اچھا او پر ہی ڈال یہ بھی مفید ہوتا ہے۔" یعنی دل پھر بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ یہ ایک از کار رفتہ شے ہے۔

"پہلا ہی پاؤں چلایا تو معلوم ہوا کہ جیسے کوئی مردہ ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہو۔"

یہ جملہ خاصا لطف دے جاتا ہے۔ اس دوسرے حصے میں وہ اس شکستہ حال بعد مردہ بدست زندہ بائیسکل کی اجمالی کیفیت

بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح وہ اپنا مردہ جسم اور مردہ خصائل لئے ہماری مجلس میں آکھڑی ہوتی ہے۔

اتراتی پر جب بائیسکل چل کھڑی ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں،

" بائی سکل خود بخود چلنے لگی، لیکن اس رفتار سے کہ جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے۔ "

پھر اس کی چال سے جو مختلف آوازیں پیدا ہوتی تھیں، ان کے متعلق لکھتے ہیں:

" ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔"

" چیں چاں چوں، کی قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پیچھے پہیے سے نکلتی تھیں۔"

" کھٹ، کھڑ، کھڑ، کھڑ کے قبیلے کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔"

" چر چرخ قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔"

اس کے بعد وہ بائیسکل کے مختلف اعضا، (مردہ اعضاء) کا تفصیلی حال بتاتے ہیں۔

" زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی، جب کبھی میں پیڈل پر زور ڈالتا تھا۔ زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہو جاتی تھی، جس سے وہ تن تن جاتی تھی اور چڑ چڑا کر بولنے لگتی تھی۔ اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ "

" پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا تھا، یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں بھی حرکت کرتا تھا، چنانچہ سڑک پر جو بھی نشان بن جاتا تھا، اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہو۔"

یہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ پہیہ لہراتا تھا اور اس قدر لہراتا تھا جیسے سانپ عام حالات میں نہیں بلکہ سُکر کے عالم میں لہراتے ہیں یعنی لہرانے کا انداز بے حد غیر معمولی تھا۔

" مڈگارڈ تھے تو سہی، لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ "

چنانچہ مڈگارڈ نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ اس میں انھیں ایک افادیت کا پہلو نظر آ گیا۔

" آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈ کی بدولت دھوپ سے بچے رہیں گے۔"

" اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ اوپر کو اُٹھ جاتا تھا اور میرا سر یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ "

تب ان مردہ اعضا کو زندہ کرنے میں جو قیامت کا شور اُٹھا اُسے وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

" تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔ "

یہاں وہ ' تمام ' کا استعمال کر کے اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ اس مردہ بائیسکل کا ایک ایک عضو بول رہا تھا، ایک نامانوس سی زبان میں جو یقینی کوئی ادق افریقی زبان ہو سکتی تھی۔ غالباً یہاں بائیسکل کی سیاہ رنگت کی مناسبت سے انہوں نے 'افریقہ' کا استعمال کیا ہے کہ افریقہ تا حال BLACK CONTINENT کہلاتا تھا۔

اس کے بعد وہ بائیسکل پر چڑھنے کا تجربہ بیان کرتے ہیں۔ کن کن مصائب سے گذرنا پڑا اور کون کون سے صدمے اُٹھائے۔

" پیڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جاتا تو سامنے تھا، لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔"

" بائیسکل کی گدی دفعتاً چھ انچ کے قریب بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں نیچے اوپر کر رہا تھا، تو میرے گھٹنے ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ "

بائیسکل کے شور کے متعلق لکھتے ہیں:

" بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں خاموشی چھا گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے باہر نکل آیا ہوں۔ "

شور ہنگامے کے اچانک بند ہو جانے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، یہ اس کا خوب صورت اظہار ہے:

" آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں درد سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ "

اتنی عمدہ تصویر کشی ہے کہ پورا منظر سامنے آجاتا ہے۔

یہ مصیبتیں تو تھیں ہی، اس پر شماتت ہمسایہ کے خیال سے پسینے آرہے تھے۔ لوگ تھے کہ انہیں ایک تفریح کا موقع ہاتھ آگیا تھا۔

" ایک لڑکے نے کہا۔ دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے۔ "

اس عالم میں وہ بائیسکل کو لے کر مستری کے یہاں پہنچتے ہیں۔ مستری دریافت کرتا ہے۔

" کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا۔ "

اور آخر میں اس نے باحسرت و یاس اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ:

" صدیاں گزر گئیں، لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔ "

مستری کی اس مایوس کن گفتگو کے بعد 'میں' کے اندر ایک سخت قسم کا احتجاج پیدا ہوتا ہے، اور وہ سوچتا ہے۔

" مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا، جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا، کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا اور اس کے بعد چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔ "

لیکن اس کے برخلاف 'میں' نے بائیسکل کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔

" دوکان دار نے کہا۔ کوئی اس کو لے کر کیا کرے گا۔ "

اب وہ دوکاندار اور 'میں' کے مابین جو مکالمہ ہوتا ہے اُسے آپ بھی سُنیں۔

" آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں۔ "

" میں نے کہا تو اور کیا، محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے میں گھر سے یہ بہانہ کر کے لایا تھا۔ "

" کہنے لگا۔ تین روپئے دوں گا۔ "

اس کے یہ کہنے پر 'میں' غصے سے کانپ اٹھتا ہے۔ لیکن اس حد کو پہنچ جانے پر بھی بائیسکل کا درد دل میں باقی رہتا ہے۔

" مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں، لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے، اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔ "

لیکن آخر کار جب بائیسکل ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے تو :۔

"میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں گویا بڑی مدت سے مجھے جس بات کا شوق تھا پورا ہو گیا۔"

ایسے مواقع ہر شخص کی زندگی میں کبھی نہ کبھی آ ہی جاتے ہیں، جب وہ تماشا بن کر، دوسروں کی دل بستگی کا سامان بن جاتا ہے

"دیکھو بیٹا یہ کس کی بائیسکل ہے اس کے دونوں پہیئے علٰحدہ ہوتے ہیں۔"

بائیسکل کو دریا بُرد کرنے کے بعد' میں ' مرزا کے یہاں پہنچتا ہے۔

"آپ ذرا باہر تشریف لایئے، آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کئے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں۔"

'وضو' کے استعمال سے غالباً پطرس طہارت نفسانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مرزا نے تو ایسا یقین پایا تھا کہ دن رات کے اُٹھنے بیٹھنے والے دوست کے ساتھ بھی فریب کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ اور قصہ یوں ختم ہوتا ہے کہ ۔

"گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف ۔ اے میں پڑھی تھی۔"

یعنی تھک ہار کر 'میں' بالآخر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ سونا بنانے کا نسخہ حاصل کر کے بغیر زر کے زندگی کی سواری اسی طرح بیچ چوراہے پر ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے ۔

پطرس کے یہاں قصہ زینہ بہ زینہ اوپر چڑھتا ہے، کہیں بھی چھلانگ لگا کر اوپر چڑھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ جزئیات نگاری اور گہرے مشاہدے کو فن کا اہم ترین جز و سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں فضا آفرینی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں ۔

شائستہ مزاج جو مہذب طبیعتوں کو راس آتا ہے، ان کا ایمان ہے ۔ وہ پھکڑ بازی اور پھبتی گوئی سے قطعی طور پر پرہیز کرتے ہیں ۔ ان کے جملے تہ دار ہوتے ہیں اور ان ہی مختلف تہوں سے وہ مزاح پیدا کرتے ہیں ۔

"بائیسکل والے سے یہ کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دیدے، جس سے تمام پرزے ختم ہو جائیں۔ بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں ۔"

چالیس روپے کی ایک خاندانی بائیسکل کے لئے یہ ہدایتیں دی جا رہی ہیں کہ "کوئی گھٹیا سا تیل نہ دیدے -" اور یہ کہ "بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں ۔"

دراصل نازک تو وہ احساسات تھے جو تین ہزار کی کار سے یک لخت گر کر چالیس روپے کی بائیسکل پر آشیانہ بنانے میں عافیت محسوس کر رہے تھے، اور اب انہیں ہر دم یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر یہ بھی ہاتھ سے جاتی رہی تو پھر تو کیمیا ہی میں پناہ ملے گی۔

پطرس کو دوسرے مزاح نگاروں سے ہم یوں مختلف سمجھتے ہیں کہ وہ رگ دپے میں دوڑنے کے قائل ہیں ۔ ■■

جوگندر پال کی افسانہ نگاری پر **وہاب اشرفی** کا مبسوط اور بھرپور مقالہ

آئندہ شمارہ میں ملاحظہ کریں ۔

غزل

پرکاش فکری

مضطرب کرتی لہک وہ اب کہاں ہے اب کہاں
بجھتے شعلوں میں لپک وہ اب کہاں ہے اب کہاں

آئینوں میں گھورئیے یا پانیوں میں جھانکئے
جھلملاتی سی چمک وہ اب کہاں ہے اب کہاں

جس کے دم سے تھا رگوں میں ایک نشہ موج زن
میٹھی میٹھی سی کسک وہ اب کہاں ہے اب کہاں

بے بصر خوابوں کی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں چار سو
رنگِ موسم میں دمک وہ اب کہاں ہے اب کہاں

دامنِ دل میں کبھی تھے مہرباں شاخوں کے پھول
اُن سے قربت کی مہک وہ اب کہاں ہے اب کہاں

کشتیٔ جاں جانتی ہے ان ہواؤں کا مزاج
اس کو طوفاں سے جھجک وہ اب کہاں ہے اب کہاں

ہم بھی فکریؔ عمر بھر جس کے تجسس میں رہے
اک گریزاں سی جھلک وہ اب کہاں ہے اب کہاں

یوگیش کمار

خوب صورت سینڈل

اکتوبر کے دنوں کی بات ہے، موسم تھوڑا بہت بدل رہا تھا۔ ہوا میں خنکی محسوس ہونے لگی تھی اور لوگ سردیوں کی آمد آمد میں گرم کپڑوں وغیرہ کی تیاری میں منہمک تھے۔ میرا اسکوٹر ایک تصادم کی زد میں آکر شکستہ ہو گیا تھا اور میں نے اسے اونے پونے داموں میں ایک کمیشن ایجنٹ کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔ اب مجبوراً مجھے بس پر آنا جانا پڑتا تھا۔ اسی سفر کے دوران میری ملاقات راجندر سے ہوئی تھی۔ وہ بہت دُبلا پتلا اور منحنی لڑکا تھا۔ بی اے کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور مقامی کالج میں پہنچنے کے لئے میری طرح بس میں سفر کرتا تھا۔ وہ اکثر ڈرائیور کی پشت والی سیٹ پر بیٹھا کرتا تھا۔ خاموش، منجمد کھویا ہوا مجھے اس کے ساتھ بیٹھنے میں سہولت محسوس ہوتی تھی کیوں کہ میں ذرا ڈیل ڈول والا ہوں راجندر شاید مجھے پسند نہیں کرتا تھا اور میں بھی اُسے قابل اعتبار نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ وہ بہت ہی لاغر و کمزور جسم کا مالک تھا اور میں اسے آدمیوں کے اُس زمرے میں شامل کرتا ہوتا جو بلا وجہ غلط سمجھوتے کرنے پر آمادہ ہو جاتے اور نازک حالات میں بہ آسانی ذہنی تناؤ کا نہ صرف شکار ہوتے ہیں بلکہ ٹوٹ کر بکھر بھی سکتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہماری واقفیت ایک قدرتی بات تھی کیونکہ ہم ایک ہی بس میں سفر کرتے تھے اور اکثر ایک ہی سیٹ پر بیٹھتے تھے۔ میں نے جب پہلی بار اُس سے نام پوچھا تھا تو اُس نے بہت انوکھا جواب دیا تھا "کسی لڑکی سے پوچھ لینا۔ وہ بتا دے گی۔"

اور میں چونک گیا تھا۔ کیونکہ راجندر کی شخصیت کے بارے میں میری یہ رائے تھی کہ لڑکیوں کا اس کی طرف مائل ہونا غیر قدرتی نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہے۔ مگر میں نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ از راہِ مذاق کہہ دیا۔

"کون سی لڑکی سے پوچھوں۔"

"ایک ہے۔ پربت نگر میں آتی جاتی ہے۔ یہیں سے بس پکڑتی ہے مگر روزانہ نہیں ملتی۔ بیس بائیس سال کی عمر ہے۔ شکل و صورت سے کافی سنجیدہ لگتی ہے۔ ہاتھ میں زنانہ کا سیاہ چمڑے کا بیگ پکڑے رہتی ہے۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتی ہے۔ دوپٹہ بالوں کے کلپ اُلجھا رہتا ہے اور جب بھی میری طرف دیکھتی ہے اُداس نظروں سے۔ پتہ نہیں کون ہے۔ ج نہیں پہنتی۔"

"جوتے نہیں پہنتی۔"

میں نے راجندر کی ڈائیلاگ کو دُہرایا۔ اس کی طویل بات سن کر میں پریشان اور اس کے آخری اعلان پر تو مجھے تھوڑی بہت تشویش بھی ہونے لگی تھی۔ راجندر سے کہنا چاہتا تھا کہ اس کا دماغ خراب ہے۔

"ہاں نہیں پہنتی"

راجندر اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ اور کہا "میں نہیں جانتا
وہ جوتے پہننا کیوں ناپسند کرتی ہے۔ اور نہ میں نے وجہ
یافت کرنے کی کوشش کی ہے۔"

میں مایوس ہو گیا تھا لیکن راجندر کی دل جوئی کے لئے
یا "ایک آدھ لڑکی سے واقفیت ہونا اچھی بات ہے گفتگو
چسپ رہتی ہے۔"

"لیکن وہ مجھ سے گفتگو نہیں کرتی۔" راجندر بولا۔

"گفتگو نہیں کرتی۔" میں اور زیادہ حیران ہوا "کیوں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ بس آتی ہے، پاس بیٹھ جاتی ہے اور
جاتی ہے۔"

"کس وقت آتی ہے۔"

"شام کے ساڑھے پانچ بجے جب دفتر میں چھٹی ہوتی ہے۔"

"تم اُسے پہچانتے ہو؟"

"ہاں" راجندر بولا اور تفصیل کے ساتھ اُس کا
بیان کرنے لگا۔

راجندر کی گفتگو سے میں اس قدر متاثر ہوا تھا کہ میں نے
چند آوارہ طبیعت دوستوں کی معرفت راجندر کی معشوقہ کی
ش کرنا شروع کر دی اور یہ جاننے کی کہ آیا وہ اس لڑکی کو
جانتے ہیں۔ مگر انہوں نے ایک رائے فیصلہ دیا کہ اس حلیہ کی
لی پربت نگر آتی ہے نہ جاتی ہے۔ لیکن راجندر اپنی بات پر
رہا تھا۔ اُس نے بتایا۔

"ٹھیک شام کے ساڑھے پانچ بجے وہ کہیں سے نمودار
تی ہے اور بس کا انتظار کرتی وہ ہمیشہ بجلی کے پول کے پاس کھڑی
تی ہے اور اس کی نگاہوں کا مرکز صرف میں ہوتا ہوں۔"

میں راجندر کی خود پرستی اور خود اعتقادی پر محظوظ ہوئے
نہیں رہ سکا اور اس پر مذاق حالت کو پُر لطف بنانے کی
طر اُسے کریدنے لگا۔

"کام کیا کرتی ہے؟"

"جادوگرنی ہے" راجندر بولا

"جادوگرنی ہے" میں نے ایک بار راجندر کو دُہرایا

"یہ کیا تُک ہوئی۔"

راجندر کو میرا یہ فقرہ پسند نہیں آیا تھا۔ بولا

"تم پہلے آدمی نہیں جو میری بات پر یقین نہیں لائے۔ اگر
تم چاہو تو تمہیں ایک قصہ سناتا ہوں جس سے تمہیں اطمینان
ہو جائے گا۔"

"سناؤ۔"

"ایک دن کا ذکر ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بہت
زیادہ ٹھنڈی تو نہیں مگر اتنا گرم بھی نہ تھی۔"

میں نے محسوس کیا کہ راجندر گفتگو کرتے وقت بال کی کھال
اُتارتا ہے اُس کی جزئیات نگاری کی عادت، کی مثالیں مجھے
بار بار ملیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔

اُس نے ملگجی رنگ کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ یہ مکمل طور پر
ملگجی تو نہ تھا۔ تھوڑا دھندلا، مٹیالا اور تھوڑا ہریالا۔ خیر
جو بھی رنگ ہو۔ وہ دوپٹہ ہوا میں جھول جھول کر ابر باراں کی
شکل اختیار کر رہا تھا۔ اس کی شلوار کے پائنچے بھی ہوا سے
بھاری تھے۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی قمیص کو دیکھ کر شبہ ہوتا تھا
کہ جیسے کسی نے اس کے جسم میں سائیکل کے پمپ سے ہوا ابھر رکھی ہو
اور وہ کسی سرکس میں بچوں کے سامنے جوکر کا تماشا کرنے جا رہی
ہو۔ اس کے دھندلے گم ہوتے ہونٹ ہل ہل کر ہوا میں چھوٹے
بڑے دائرے بنا رہے تھے۔ شاید وہ گفتگو کر رہی تھی مگر الفاظ
سنائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ نہ صرف میری طرف دیکھ رہی
تھی بلکہ بڑھتی رہی تھی۔ لیکن یکایک گرد و غبار کا ایک بگولہ
آیا۔ آس پاس کی اشیاء ہوا میں اُڑنے لگیں اور چند لمحات
کے لئے مجھے دھول سے بچنے کے لئے آنکھیں موندنی پڑیں
اور جس وقت آندھی کا ریلا گزر گیا تو میں نے اس کی طرف دیکھا

مگر وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ شاید غبار میں اڑ گئی تھی۔"
"غبار میں اڑ گئی؟" میں راجندر کی بے ہودہ دلیل پر
جھنجھلائے بغیر نہ رہ سکا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"
"جادوگرنی ہے" راجندر نے جواب دیا۔
اور میں قطعی بوکھلا گیا۔ مگر راجندر نے میری بوکھلاہٹ
کی ذرا پرواہ نہیں کی اور اپنی ہانکتا چلا گیا۔
"ایک دن اس سے بھی عجیب بات ہوئی تھی۔"
"اس سے بھی عجیب" میں نے طنزاً کہا۔
"ہاں۔ سنو گے تو یقین نہیں آئے گا۔ میں بس میں بیٹھا
تھا۔ کھڑکی سے سر نکال کر باہر دیکھ رہا تھا کہ وہ دکھائی دے
گئی۔ وہ بس کی طرف بھاگی آ رہی تھی۔ وہ بھی وہی بس پکڑنا
چاہتی تھی۔ اس کے پیر زمین پر تھے بھی اور نہیں بھی۔ اس کے
پر بھی نہیں لگتا تھا کہ مجھے لگا کہ ہوا میں تیرتی چلی آ رہی ہے اور
جس وقت اس نے ہاتھ اٹھا کر ڈرائیور کو بس روکنے کا اشارہ
کیا تھا تو ایسا لگا کہ جیسے وہ آسمانی فرشتوں کو زمین پر اترنے کا
حکم دے رہی ہو۔ مگر ڈرائیور نے مطلق توجہ نہیں دی اور
بس کو اسٹارٹ کر دیا۔ رفتار بھی تیز ہو گئی تھی۔ میں مغموم ہو گیا
مگر جب میں نے رخ موڑ کر دیکھا تو اسے اپنی سیٹ پر بیٹھی
دیکھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ تھی اور میں خوشی سے چیخ اٹھا
مگر وہ بدستور خلا میں گھورے جا رہی تھی۔ اس نے ریشمی لباس
زیب تن کیا ہوا تھا۔ آسمانی، تھوڑا گلابی، کچھ بسنتی جیسے طوطے
کے پر ہوتے ہیں۔ اس کا دوپٹہ اڑ کر میرے کاندھے پر آ پڑا
تھا۔ اور میری گال سے مس ہو کر ایک دل پسند مہک پیدا کر رہا
تھا۔ جب اس نے پہلو بدلا تو وہ میرے نزدیک چلی آئی۔ میں
نے اس کے سانسوں کی گرمی محسوس کی۔ اس کے جسم کا لمس میرے
ذہن میں ہلچل پیدا کرنے لگا تھا۔ ڈر اور خوشی کے ملے جلے جذبات
مجھ پر غلبہ پا چکے تھے۔ اتنے میں کنڈکٹر آ گیا اور ٹکٹ کا مطالبہ
کرنے لگا۔ مگر وہ لڑکی چپ چاپ بیٹھی رہی تھی اور میں نے
مردانگی دکھائی۔"
"کیا مردانگی دکھائی؟" میں نے طنزاً پوچھا۔
"میں نے اس کا ٹکٹ بھی لے لیا۔ وہ کنڈکٹر ہنسنے لگا
تھا۔ وہ کنڈکٹر بہت بدتمیز تھا۔"
"کیوں؟" میں نے پوچھا
"پوچھنے لگا کہ میں نے دو ٹکٹیں کیوں خریدی ہیں۔
میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے حسد کر رہا تھا۔
اتنی خوب صورت لڑکی کو ساتھ دیکھ کر بھلا کون نہیں جلتا
اگر تم ہوتے تو تم بھی جلتے۔"
مجھے راجندر کی کہانی خاصی فلمی محسوس ہوئی تھی۔ لیکن میں نے
اسے ٹوکا نہیں تھا۔
"دیکھنے میں تو تم کافی بھولے لگتے ہو مگر ہو چھپے رستم۔"
"شکل سے کیا پتہ چلتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔
میں چپ ہو رہا۔

یونیورسٹی میں انٹر کالج ڈرامیٹک کمپیٹیشن شروع ہو گیا
تھا اور تقریباً تمام مقامی کالجوں کی ٹولیاں اس میں حصہ
لے رہی تھیں۔ اس موقع پر راجندر بھی موجود تھا اور وہ کسی
دوسرے کالج کی ایک لڑکی سے واقفیت بڑھانے کی خاطر
بات چیت کر رہا تھا مگر اس لڑکی نے راجندر کی باتوں
پر کوئی توجہ نہیں دی اور منہ بنا کر چلی گئی تھی۔ بات آئی گئی
مگر اس وقت وہاں اس لڑکی کے کالج کے چند طلبا بھی موجود
تھے اور انھوں نے راجندر کے رویے کی نہ صرف مذمت کی بلکہ
ان میں ایک لڑکے نے راجندر کا کالر بھی نوچ لیا تھا۔ اور اس
کی کتابیں چھین کر گملوں کے پیچھے پھینک دی تھیں۔ شاید
وہ راجندر کی مار پیٹ بھی کرتے۔ مگر میں نے دیکھ لیا اس ٹولی
کے چند لڑکوں سے میں واقف تھا۔ اس لئے میں نے بیچ میں پڑ کر

معاملہ رفع دفع کروادیا۔ اور راجندر کو لے کر بس اسٹینڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر راجندر میری اس مداخلت پر بہت سیخ پا ہوا اور بولا۔

"تم کیوں آئے تھے۔ میری بات تھی۔ میں نپٹ لیتا۔"

میں راجندر کے ردعمل سے مایوس ہوا۔ اس سے داد طلب کرنے کی بجائے اس کی ڈانٹ سن رہا تھا۔ صلح صفائی کی خاطر بولا۔

"جھگڑا لڑائی کوئی اچھی چیز نہیں۔"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن وہ لڑکی کیا سمجھے گی" راجندر نے روٹھ کر کہا۔

"کیا تم اسے جانتے تھے؟"

"اور نہیں تو کیا۔ یوں ہی بات کر رہی تھی۔ تم نے دیکھا نہیں تھا۔" راجندر کے لہجہ میں ایک ضدی بچے کی جھلک ملتی تھی۔

"مگر وہ لڑکے تو کچھ اور ہی کہہ ...."

"ان کی بات پر اعتبار ہے۔ برا نہیں۔" راجندر نے چڑ کر کہا۔

میں نے راجندر کی ہٹ دھرمی کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے چپ ہو رہا لیکن راجندر چپ نہیں ہوا۔ بولا۔

"میں سب سمجھتا ہوں کہ تم کیوں آئے تھے۔"

"کیوں آیا تھا۔" میں نے اکڑ کر پوچھا۔

"تم مجھ پر احسان جتانے چلے تھے تاکہ میں تمہارا اس لڑکی سے تعارف کروا دوں۔"

راجندر سراسر احمقانہ بات کہہ رہا تھا۔ میں نے تنگ آکر کہہ دیا۔

"اچھا بابا۔ آئندہ جھگڑا ہوا تو دور سے دیکھتا رہوں گا"

میں دوسری طرف چل دیا۔

ابھی چند گز کی دوری پر گیا ہوں گا کہ پیچھے سے آواز آئی راجندر کہہ رہا تھا۔

"احسان کیا ہے تو انعام بھی لیتے جاؤ۔"

"کیسا انعام" میں نے سوچا راجندر سچ مچ عجیب لڑکا ہے۔

"میرے گھر چلو۔ میں تمہیں سنگترے کا رس پلاؤں گا۔"

راجندر کے کمرے میں پہنچ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی صاف ستھرے عجائب گھر میں پہنچ گیا ہوں۔ بڑے دروازے کے عین اوپر ایک جنگلی بھینسے کا سر لگایا ہوا تھا میں نے پوچھا کہ یہ کہاں سے لیا تو اس نے بے رخی سے جواب دیا۔

"نہیں کیا، کہیں سے بھی ملا ہو۔"

کتابوں کو نہ صرف قرینے سے سجایا تھا بلکہ ہر کتاب پہ نائلن کا کور بھی چڑھا رکھا تھا۔ ترتیب وار نمبر دئے تھے۔ ان میں بیشتر کتب جنسی مضامین پر تھی مثلاً ملکہ وکٹوریہ کے عاشق، ڈان جان کی محبتیں، میز پر جو کتاب کھلی پڑی تھی اس کا عنوان تھا "قصہ ایک جہاز راں کا" وغیرہ وغیرہ۔ بستر پہ بے داغ چادر بچھی ہوئی تھی۔ دونوں تکیے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے اور ان پر سفید دُھلے ہوئے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ ہر ایک چیز صاف ستھری تھی۔ پڑھائی کی میز کے عین اوپر دیوار پر "صوفیہ لارین" کا آدھا ننگا پوسٹر چپکا ہوا تھا جس کی چھاتیاں ٹیبل لیمپ کی روشنی میں جانے پہچانے آتش فشاں پہاڑ کے دہانوں کی طرح لگ رہی تھیں میز پہ ایک لڑکی کا فوٹو بھی رکھا ہوا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہی راجندر کی معشوقہ ہے کیونکہ اس کی شکل راجندر کے بناشہ ہوئے چہرے سے ملتی جلتی تھی۔ جو نہ [illegible]

بھی کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ مگر راجندر نے نفرت سے جواب دیا
"تمہیں کیا مطلب کوئی بھی ہو۔" فوٹو گراف تازہ پھول
کی مالا سے لپٹا ہوا تھا جس سے بھینی بھینی خوشبو مہک رہی
تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ راجندر ہر روز اس پر نئے پھول چڑھاتا
تھا۔ ساتھ میں ایک زنانہ سینڈلوں کا جوڑا رکھا تھا۔ فوٹو
پھول اور سینڈلوں کے انوکھے مرقع کو میز پر دیکھ کر مجھے
حیرت ہوئی تھی میں نے پوچھ لیا۔

"پڑھائی کی میز پر زنانہ جوتے کس لئے رکھے ہیں۔"

مگر راجندر کا جواب بدستور تھا۔

"تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔"

اُس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو اشارہ کیا اور ساتھ یہ
بھی بتا دیا کہ میں اسے گندہ نہ کروں۔ صفائی خدا کا
دوسرا نام ہے۔ اسی قسم کی ایک تختی اس نے دیوار پر بھی لگا
رکھی تھی جس پر لکھا تھا 'CLEANINESS IS NEXT TO GOD' میں بہت آرام سے ہو کر بیٹھا تھا۔ اس نے وعدے
کے مطابق سنگترے کا رس بھی لاکر پیش کیا۔ اور جس وقت میں
گلاس پکڑنے لگا تو میرا ہاتھ ہل گیا اور گلاس میں بھرا رس
اُچھل کر فرش پر آگرا۔ دو چار چھینٹے کرسی کے گدے پر بھی
گرے تھے۔ راجندر میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگا
اور کہا۔

"تم بہت غلیظ آدمی ہو۔"

مجھے غصہ تو ضرور آیا مگر اس وقت میں مہمان تھا،
اس لئے خاموش رہا۔ راجندر جاکر دالان سے ایک جھاڑن
اُٹھا لایا۔ جس سے وہ فرش کی صفائی کرنے لگا۔ فرش پونچھتا
اس کا جسم سمٹ کر اس قدر مختصر ہوگیا تھا کہ ایک لمحہ کے لئے
مجھے محسوس ہوا کہ جیسے وہ آٹھ دس سال کی لڑکی ہو جس کو
ابھی جوان ہونا تھا۔

راجندر کے گھر سے چلنے سے پہلے اُس کے ماتا پتا سے
بھی ملاقات ہوئی۔ وہ دونوں ساٹھ کے لگ بھگ تھے
راجندر کے والد کو دکھائی بھی مشکل سے دیتا تھا۔ اس کی
ماں بھی سخت لاغر و کمزور تھی۔ وہ سخت مضمحل مریل اور اداس
عورت لگتی تھی۔ مجھے وہاں پاکر وہ دونوں بہت خوش ہوئے
راجندر کی ماں نے کہا۔

"تم راجو کے دوست ہو۔ بہت اچھی بات ہے۔ اس
کا کوئی دوست نہیں۔"

"ہاں بیٹا۔" اُس کے باپ نے بھی سر ہلا دیا۔ "کبھی کبھا
ملنے آجایا کرو۔ راجو ہماری اکلوتی اولاد ہے۔"

اس کی ماں نے کہا۔

"اِس لئے تو ہم راجو کی شادی جلد کر دینا چاہتے تھے۔
تاکہ گھر میں رونق ہو۔ مگر .... راجو کی قسمت اچھی نہیں۔"

ماں کی بات سن کر راجندر کو بہت غصہ آیا اور جھنجھلا کر
بولا "منہ بند رکھا کرو۔" اور مڑ کر وہ میز پر پڑی تصویر کے
پھول درست کرنے لگا۔

امتحان نزدیک آرہے تھے۔ پڑھائی کا دباؤ بھی بڑھ
گیا تھا۔ اس لئے راجندر سے ملاقات کا موقع نہیں ملا تھا۔ راجندر
بھی نہیں ملتا تھا۔ شاید امتحان کی وجہ سے وہ بھی خوب محنت
کر رہا تھا۔ لیکن ایک دن یونیورسٹی کینٹین میں ٹکر ہوگئی معمول
کے برعکس اس کا چہرہ اس وقت کھلا ہوا تھا۔ اور اپنی عادت
کے خلاف وہ کافی تیز قدم اُٹھا اُٹھا کر چل رہا تھا۔ کرسی پر
بیٹھنے سے پہلے ہی وہ میرا مسکراہٹوں سے استقبال کرنے لگا۔
اور چھوٹتے ہی بولا:

"یار! ایک بہت اچھی بات ہوگئی ہے۔"

مجھے بات کا اندازہ ہوگیا تھا۔ لیکن راجندر کے پُرامید
موڈ کو دیکھتے ہوئے میں نے خود بیان کرنا مناسب نہیں
سمجھا اور چپ رہا اور اس کی گفتگو کے لئے میدان صاف کر دیا

"اُس لڑکی کے محلے کا پتہ چل گیا ہے۔"

"اور مکان کا۔" میں نے سوال کیا۔

"ابھی نہیں۔ لیکن چند دنوں تک پوری اطلاع میسر ہو جائے گی۔"

"کیسے پتہ چلایا۔"

"بس ایک خیال آگیا۔" راجندر شروع ہو گیا "کہ اس لڑکی کا پیچھا کرنا چاہیئے۔ یعنی اِس کے ٹھکانے کا سراغ لگایا جائے۔ رہتی کہاں ہے۔"

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ راجندر ایک بات کو مختلف انداز میں دہرا دہرا کر کہتا ہے۔ یہ اُس کی ایک اور مخصوص عادت تھی۔

"میں نہیں جانتا کہ میں نے اِس لڑکی کا پیچھا کرنے کی کیوں سوچی۔ اِس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوگی جو مجھے معلوم نہیں تھی لیکن وجہ ہے ضرور۔ شاید اس لڑکی کی پُراسرار شخصیت میری مردانگی کو للکار رہی تھی۔ یا پھر میں یک مشت یک طرفہ کارروائیوں سے تنگ آچکا تھا۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں اس کے گھر کا پتہ ضرور چلاؤں گا۔"

"تو تم نے تفتیش کی۔" میں راجندر کی اُلٹی سیدھی باتوں سے پریشان ہو گیا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ وہ ایک دم سارا قصہ سنا دے۔

"ہاں" وہ کہنے لگا۔ "میں بس میں جا کر بیٹھ گیا۔ اور وہ آئی حسبِ معمول میری سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے جی کڑا کر کے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ بہ غور جائزہ لینے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ لڑکی گوشت پوست کی بنی ہوئی نہیں تھی۔"

"یہ کیا الم غلم بکے جا رہے ہو"۔ میں نے اُسے ٹوکا۔

"چپ رہو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ٹھیک کہہ رہا ہوں تم نے پکاسو کا وہ شاہکار تخلیق دیکھ رکھی ہے جس میں اُس نے نقشہ کشی کے اوزاروں سے ایک مرد نہ عورت کی چوکور تصویر بنائی تھی۔ اس لڑکی کے چہرے پر بھی اس طرح کے موڑ توڑ ہیں۔ اُلٹے سیدھے خطوط جن کو ترتیب دیتے دیتے آدمی خود گم ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ لڑکی چاندی کے پتلے چمک دار تاروں کی بنی ہو۔ وہ میرے پاس بیٹھی تھی اور میرے ذہن میں وحشت اُبھر رہی تھی۔ مجھے اس کے سانسوں کی گرمی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے جسم کا لمس محسوس ہوا...... بس ولزلی روڈ پر خراٹے بھرتی جا رہی تھی سڑک کی دونوں جانب جامن کے درخت قطار در قطار ایستادہ تھے۔ اور ان کی پشت میں زمردی گھاس کے وسیع میدان پھیلے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پتوں کے جھنڈ میں داخل ہو کر ہلکا ہلکا ارتعاش پیدا کر رہے تھے سورج شام کے آسمان پر رنگ برنگی تصویریں کھینچ رہا تھا۔ اِس شاندار منظر کی دلکشی نے مجھ پر وجد کی کیفیت طاری کر دی اور میں کھو گیا۔"

راجندر کے منظر کشی کی تعریف کئے بغیر میں نہیں رہ سکا لیکن میرے ذہن میں یہ خیال بھی گذرا کہ وہ یا تو بہت زیادہ فلمیں دیکھتا ہے یا پھر رومانی ناولوں کا دلدادہ ہے۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پھر ..... ایک بہت بُرا واقعہ ہوا۔ میرے جانے بغیر بس ٹرمنیس پر پہنچ چکی تھی اور میں نے پلٹ کر دیکھا مگر وہ سیٹ پر موجود نہیں تھی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ مگر ایک بات اچھی ہوئی۔"

"وہ کیا" میں نے دریافت کیا۔

"اس کے محلے کا پتہ چل گیا۔"

مجھے راجندر کی گفتگو میں حماقت دکھائی دی تھی وہ معمولی معمولی بات اِس ڈرامائی انداز میں پیش کر رہا تھا کہ میری دلچسپی خود بخود کم ہوتی جا رہی تھی۔ میں وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس سے رخصت لئے بغیر کلاس روم کی طرف چل دیا

لیکن چلتے وقت مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ راجندر میرے اس سلوک سے ناخوش تھا۔ وہ شاید مجھے روک کر اپنے اس معاشقے کے بارے میں کچھ اور تفصیل بتانا چاہتا تھا۔ لیکن میں رکا نہیں۔

امتحان شروع ہونے سے قبل کالج میں چھٹیاں ہوگئی تھیں میں نے لائبریری جانا بھی ترک کر دیا تھا کیوں کہ میں چند دنوں تک ملیریا میں مبتلا رہا تھا اور جس وقت میں چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تو امتحان کی تیاری کے سلسلے میں ایک دوست کے یہاں چلا گیا۔ میرے دوست کا گھر شہر سے باہر ایروڈروم کے پرے واقع تھا۔ یہ کالونی نئی نئی آباد ہوئی تھی۔ آس پاس گھنا جنگل تھا۔ جہاں لومڑی وغیرہ کے علاوہ دوسرے جنگلی جانور بھی پائے جاتے تھے۔ کبھی کبھار بھیڑیئے کا بھی خطرہ ہو جایا کرتا تھا ایروڈروم کے کوارٹرز کے ارد گرد پتھر کی فصیل کھڑی کر دی گئی تھی۔ اور شام ڈھلتے ہی بڑا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ فصیل کے باہر آس پاس چند تاریخی کھنڈرات بھی تھے مگر ان کی حالت اس قدر خستہ ہو چکی تھی کہ شاذ و نادر ہی کوئی سیاح ادھر آتا تھا۔ اس سے پرے چینی کے برتنوں کی ایک فیکٹری تھی لیکن وہاں فیکٹری کا اسٹاف نہیں رہا کرتا تھا چوکیدار کے سوا۔ اور پھر جہاں تک بینائی کام کرتی اونچا کھا بڑ بیت سے اٹا ہوا ویران علاقہ دکھائی دیتا۔ رات کو یہاں گیدڑوں کے غول کے غول شور مچایا کرتے۔ جن کی آوازیں گھپ اندھیری رات میں زیادہ بھیانک لگا کرتی۔ ہم شام کو سیر کو نکلتے تو فقط فصیل کے آس پاس گھوم کر واپس لوٹ آتے تھے۔

شاید دوپہر کا وقت تھا میں اپنے دوست کے ساتھ ایروڈروم کی کینٹین سے چائے پی کر نکلا تھا کہ ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ راجندر تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے ابھی ابھی وہ بس سے اترا ہو۔ اور یا تو وہ کسی کی انتظار کر رہا تھا یا پھر کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چاروں طرف طواف کر رہی تھیں میں نے پاس جا کر کہا۔

" راجندر تم ...... "

اور یہ کہہ کر اس کا اپنے دوست سے تعارف کرایا۔ لیکن راجندر نے میرے دوست کی طرف کوئی زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے نہایت بے دلی سے ہاتھ ملایا۔ لگتا تھا کہ جیسے اس کا ذہن اس وقت کسی اور مسئلہ سے دوچار تھا اور عارضی طور پر اس نے باہری دنیا سے کنارہ کشی کر لی تھی۔

میرا دوسرا سوال تھا۔

" ادھر کیسے ؟ "

" وہ یہیں تو رہتی ہے۔" راجندر نے جواب دیا۔

میرا دوست اس 'وہ' پر متعجب ہوا لیکن میری سمجھ میں سب بات آ چکی تھی۔

میں نے اختصار سے اپنے دوست کو راجندر کی پریم کہانی سنا دی۔ اور جس کو سن کر نہ صرف میرا دوست بلکہ راجندر خود بھی بہت محظوظ ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے اپنے عشق کا ذکر سن کر راجندر کی شخصیت میں کوئی خالی جگہ پر ہوتی تھی۔ ہم راجندر کو گھر لے آئے اور اسے وہاں رکنے کی دعوت دی جو راجندر نے بغیر تردد کے قبول کر لی۔ شام کو ہم چھت پر پڑھائی کی خاطر چلے آئے۔ مگر راجندر کو پڑھائی میں قطعاً دلچسپی نہ تھی اور نہ وہ امتحان کے بارے میں فکر مند تھا۔ وہ منڈیر کے پاس کھڑا ہو کر فصیل کے اس پار ویران علاقے کو دیکھنے لگا اور دریافت کیا " ادھر کیا ہے ؟ "

میرے دوست نے بتایا کہ وہاں کھنڈرات کے علاوہ ایک کارخانہ بھی ہے لیکن وہاں کوئی نہیں رہتا اور زیادہ تر زمین جنگلی جانوروں کے قبضہ میں ہے۔ راجندر بڑے انہماک سے اس کی بات سنتا رہا اور پھر میری طرف رخ کر کے بولا۔

" میرا خیال ہے وہ اس طرف رہتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ چھت سے نیچے چلا گیا تھا۔ میرا دوست کچھ نہیں کہا تھا اور جب وقت راجندر رات کے ۹ بجے کے بعد واپس لوٹا تو اسے اس کا اتنی دیر

غیر حاضر رہنا بہت کھٹکتا۔ وہ اِس غیر حاضری کی وجہ بھی
جاننا چاہتا تھا۔ راجندر کہنے لگا۔

" تم کہہ رہے تھے کہ وہ علاقہ بیابان ہے مگر وہاں تو کافی
آبادی ہے۔ "

میرا دوست حیران ہوگیا۔ وہ اِس علاقہ کے گرد و نواح
سے اچھی طرح واقف تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ اکا دکا جھونپڑیوں
کے سوا اس طرف کوئی نہیں آبادی تھی۔ مگر راجندر اُسے غلط بتلا
رہا تھا۔ میرے دوست نے یہ سوچ کر کہ عنقریب ہی مزدوروں
وغیرہ نے اپنے گھر بنالئے ہوں گے۔ راجندر کا کہنا مان لیا۔ مگر
یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

" کیا تم اُسی علاقے میں گھومتے رہے ہو؟ "

راجندر نے سر ہلا دیا۔

" مگر وہ تو کافی خطرناک جگہ ہے۔ اِس وقت تو بھیڑیئے
کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ "

میرے دوست کی اطلاعات نے راجندر پر کچھ اثر
نہیں کیا۔ وہ مطمئن ہوکر بولا۔

" مجھے ایک شخص کا پتہ چلانا تھا۔ "

میرا دوست چپ ہوگیا، مگر میں نے کریدنا شروع
کردیا۔

" مل گئی کیا؟ "

" ہاں "

یہ ایک احمقانہ بات تھی۔ اس غیر آباد علاقے میں راجندر
کی معشوقہ کا پایا جانا دنیا کا ساتواں عجوبہ تھا اور میں اس کے
جھوٹ کا قلع قمع کرنے پر تل گیا۔ اس مہم میں میں نے اپنے
دوست کو بھی شامل کرلیا۔ اور راجندر سے بضد ہوکر مطالبہ
کیا کہ وہ اپنی کھوج کے تمام حالات ہمیں سنائے۔ عادت کے
مطابق راجندر شروع ہوگیا۔ وہ کہنے لگا۔

" جس وقت میں فصیل کے باہر نکلا تو سات بج چکے تھے
سورج غروب ہوچکا تھا اور در و دیوار شام کے ڈھلتے
سایوں کی سیاہی میں ڈوب چکے تھے ...... "

میرا دوست راجندر کے شاعرانہ اندازِ بیان پر بوکھلا
اُٹھا۔ مگر میں نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کردیا۔

" میں فیکٹری سے بھی ایک آدھ میل آگے نکل گیا تھا
جہاں مجھے ایک پتھر کی بنی ہوئی حویلی دکھائی دی۔ جس میں داخل
ہونے کے لئے صرف ایک ہی بلند دروازہ ہے۔ دو چار گیدڑ
منڈلا رہے تھے اور مجھے عجیب قسم کا شور و غوغا سنائی دیا۔
میں اِس حویلی کے پاس پہنچ گیا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا
مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ آخر کار میں نے خود ہی دروازہ
کو ہولے سے دھکیل دیا۔ اور وہ کھل گیا۔ مگر اس کے کھلتے ایک
ایسی چیخ نکلی جیسے ہزیلی پہاڑیوں کی خاموشی میں کوئی گولی داغ
دے۔ میں اندر داخل ہوگیا۔ کانٹے دار جھاڑیوں کی ایک
قطار دکھائی دی۔ ان جھاڑیوں کے بیچوں بیچ ایک ٹیڑھی میڑھی
پگڈنڈی جاتی دکھائی دی۔ میں اس پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ اس
کے خاتمے پر مجھے دو چار پرانی وضع کے خستہ مکان نظر آئے
کونے والے مکان کی کھڑکی کھلی تھی۔ یہاں مدھم سے لالٹین جل
رہی تھی اور روشنی کی دھندلی لکیریں آس پاس کے ماحول پر
بے سود قابو پانے کی کوشش کررہی تھیں۔ مکان کے باہر کچا
دالان تھا۔ جہاں ایک دُبلا پتلا منحنی سا لڑکا زمین پر آڑی
ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ رات کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔
جھاڑیوں سے طرح طرح کے کیڑے مکوڑے اپنی بولیاں بول
رہے تھے۔ آسمان پر بادل تو تھے مگر اندھیرے کی وجہ سے
دیکھنا مشکل تھا۔ کبھی کبھار گھر دیر سے لوٹنے والے پرندے کے
پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ "

" چلتے چلتے میں اس دالان میں آگیا جہاں وہ لڑکا
لکیریں کھینچ رہا تھا۔ مگر اب وہ وہاں موجود نہ تھا۔ میں نے
مڑ کر دیکھا تو وہ کچھ دیر پہلے بیٹھا تھا۔ ہنڈیر کی مٹی پھسل کر

ڈھے چکی تھی۔ کہیں کہیں گڑھے بھی پڑے ہوئے تھے۔ اُس نے اُس جگہ پہ ایک لڑکی کی تصویر بنا رکھی تھی۔ لیکن شاید جلدی میں یا ڈر کے مارے وہ اس کے پیر بنانا بھول گیا تھا۔ اس تصویر سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ کسی فرشتے کی بیٹی ہو۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" میرے دوست نے احتجاج کیا مگر میں نے اپنے دوست کی پریشانی کی طرف توجہ نہیں دی کیونکہ اب تک میں راجندر کے کردار سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا اور یہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کسی کے کہنے پر بھی اپنی کہانی سنائے بغیر رُکے گا نہیں۔ راجندر کہہ رہا تھا۔

میں اور آگے بڑھ گیا۔ مکانوں پر وحشت برس رہی تھی۔ یکایک کسی آدمی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ سسکیاں بھی لے رہا تھا اور کبھی کبھار سسکیاں تو ٹوٹی ہوئی چیخوں میں بدل جاتی تھیں۔ میں نے بلند آواز میں پوچھا "کون ہے۔" مگر میری آواز گاڑھے دار جھاڑیوں سے ٹکرا کر واپس لوٹ آئی البتہ سسکیاں بند ہو گئی تھیں۔ میرے سامنے ایک بند دروازہ تھا۔ میں نے باہر سے کنڈی کھول دی اور دروازے پر دھکا دے دیا۔ سامنے ایک جھلنگا چارپائی نظر آئی اور اس چارپائی پر بیٹھے ایک بڈھا اور بوڑھی عورت رو رہے تھے۔ ان کی شکلیں مجھے پسند نہیں آئیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے اپنے ماں باپ یاد آ گئے تھے۔ میں نے اُن کے رونے کی وجہ پوچھی تو بڑھیا بولی "میرا بیٹا مصیبت میں ہے۔" انھوں نے اشاروں سے یہ بھی بتلایا کہ وہ اس قید سے باہر جانا چاہتے تھے۔ میں اس وقت دروازے کے بالکل درمیان کھڑا تھا۔ وہ میرے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے شاید مجھے چھوا بھی تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ مجھے میرے جسم پر ٹھنڈا یخ پانی میں انڈیل دیا گیا ہو۔ وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کدھر غائب ہو گئے ہیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ بھی اس نوجوان کی طرح تیز رفتار پروں والے گھوڑے کی طرح ہوا میں سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔ دور سے ایک آواز آ رہی تھی، "واپس لوٹ آؤ، دروازے بند ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔" مگر میں آواز پر توجہ دئے بغیر آگے چلا گیا، چلتے چلتے ایک اور کھڑکی نظر آئی جس کی سلاخوں کے پیچھے ایک شمع جل رہی تھی۔ میرا دماغ شل ہو گیا۔ میرے پاؤں ٹھٹھک گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شمع کی روشنی میں وہی لڑکی بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے۔ وہ وہاں رہتی ہے۔"

راجندر کے بیان سے اندازہ ہونے لگا کہ وہ باقی ماندہ داستان بھی جاری رکھے گا مگر وہ یکایک خاموش ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تو کیا تم اُس کے پاس گئے۔ اُس سے بات چیت ہوئی؟"

اور راجندر آگ بگولہ ہو گیا۔ غصّے میں بولا۔

"تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔ یہ میرا نجی معاملہ ہے۔"

اور ہم دونوں سہم گئے۔ راجندر جل بھن رہا تھا اور میرے دوست کو یقین ہو چلا تھا کہ راجندر کا دماغ خراب ہے۔ اس لئے بحث میں اُلجھنا حماقت ہوگی۔

اگلی صبح راجندر نے یکایک گھر لوٹنے کا اعلان کر دیا۔ میرے دوست کو یہ خبر سن کر تسکین ہوئی۔ وہ راجندر کے طور طریقوں سے مکمل طور پر اکتا گیا تھا۔ اُس کی بہکی بہکی باتیں اُسے خاک سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اور ایک آدھ دفعہ وہ مجھ سے یہ شکایت بھی کر چکا تھا کہ راجندر کی موجودگی میں امتحان کی تیاری نہیں ہو سکتی ہے بہتر ہوگا کہ اُسے یہاں سے رفو چکر کیا جائے۔ اور اب وہ خود ہی جا رہا تھا۔

وہ دن ہم کافی رات گئے تک پڑھتے رہے۔ امتحان کے فکر نے ہمارے ذہن سے تمام فضول باتیں نکال کر رکھ دی تھیں اور ہم پوری تندہی و ایمان داری سے محنت کرتے رہے۔ ایک ڈیڑھ بجے کے قریب جب ہم تھک ہار کر سونے کی تیاری کر رہے تھے تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا دوست حیران تھا کہ

اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے۔ بتی جلا کر وہ نیچے گیا اور دروازہ
کھول دیا۔ باہر محلے کا چوکیدار کھڑا تھا اور اس نے اپنے کندھے
پر راجندر کو اٹھایا ہوا تھا جو بظاہر نیند میں سویا ہوا لگتا تھا
میرے دوست نے آواز دے کر مجھے بھی نیچے بلا لیا اور ہم معاملے کی
تفصیل سننے لگے۔ چوکیدار بتلا رہا تھا کہ یہ صاحب کارخانے
کے پرے کھنڈروں کے پاس پتھروں پر پڑے ہوئے تھے۔ چوکیدار
اپنے گاؤں سے لوٹ رہا تھا کہ اچانک راجندر پر نظر جا پڑی۔
چوکیدار نے یہ بھی کہا کہ اس وقت راجندر کے ماتھے سے تھوڑا
بہت خون بہ رہا تھا، لیکن اب خون رک چکا ہے۔ چوکیدار کا
اندازہ تھا کہ راجندر کسی اونچی چٹان سے پھسل کر نیچے گرا ہوگا
اور پتھروں سے ٹکرا کر بے ہوش ہو گیا ہوگا۔ پیشانی کے زخم کی
بھی یہی وجہ ہو سکتی ہے۔

راجندر کا منحنی جسم اب بھی چوکیدار کے کندھے پر
لٹکا ہوا تھا اور ہم دونوں پریشان تھے۔ میرا دوست کہنے لگا
"لیکن یہ تو کہہ کر گیا تھا کہ وہ اپنے گھر جا رہا ہے۔"

میں نے اپنے دوست کو ٹوک دیا۔ یہ وقت ایسی باتوں
میں برباد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے چوکیدار کو دو روپے بطور
انعام دیے اور اس سے کہا کہ وہ بھاگ کر ایروڈروم سے ایک
ٹیکسی لے آئے۔ جس وقت ٹیکسی آئی تو ہم راجندر کو اس میں ڈال
کر اس کے گھر چھوڑ آئے۔ راجندر کی یہ حالت دیکھ کر اس کے ماں
باپ بہت گھبرائے۔ مگر راجندر بے ہوش تھا۔ اور ہم لوٹ آئے۔

شام کو فرصت ملی تو میں اپنے دوست کے ہمراہ راجندر
کا حال پوچھنے کے لئے اس کے گھر پھر پہنچے۔ کمرے میں اس وقت
اس کے ماں باپ کے علاوہ ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ راجندر کو
انجکشن دیا جا رہا تھا۔ راجندر ہوش میں تو تھا مگر اس وقت
وہ ہذیان کی حالت میں تھا۔ اور بے معنی و مہمل باتیں کیے جا رہا
تھا۔ اس کا والد سخت پریشان تھا اور ڈاکٹر انہیں تسلی دے
رہا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے ٹیکہ لگا دیا ہے
ایک آدھ گھنٹے میں اسے نیند آ جائے گی۔ آپ اس کے آرام
میں مخل نہ ہوں۔"

ڈاکٹر نے راجندر کے ماتھے کا زخم بھی دھو دیا تھا اور
اس پر تازہ پٹی باندھ دی تھی۔

راجندر کی ماں رو کر کہہ رہی تھی۔

"میرے بیٹے کی قسمت خراب ہے۔"

میں نے ڈاکٹر کی تشخیص جاننی چاہی، اس نے کہا۔

"کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ نروس بریک ڈاؤن لگتا
ہے۔" اور پھر وہ کچھ ٹرانکولائزر جیسی دوائیں دے کر چلا گیا۔

راجندر اب بھی ہذیانی حالت میں بول رہا تھا۔ اس نے
میز پر پڑی لڑکی کی تصویر اٹھالی تھی اور کہہ رہا تھا۔

"پریاں فرشتے ہوتی ہیں، ان کے پر نہیں ہوتے۔"

وہ کافی دیر تک بڑبڑاتا رہا شاید خواب آور دواؤں نے
اس پر اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سوئے ہوئے
راجندر کے ہاتھوں سے اس لڑکی کی تصویر کو لے لیا اور اس کا بغور
جائزہ لینے لگا۔ اس کی شکل ہو بہو راجندر کے بتلائے ہوئے
معشوق کے حلیہ سے ملتی جلتی تھی اور ایک بار پھر میرے ذہن
میں یہ وہم پیدا ہوا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کے پیچھے راجندر مارا
مارا پھرتا ہے۔ میں نے اپنا شک دور کرنے کی خاطر راجندر کی
والدہ سے پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے۔ مگر وہ سخت صدمے میں
تھیں اور ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھیں۔

"میرے بیٹے کی قسمت خراب ہے۔"

میری بات کا جواب راجندر کے والد نے دیا سو وہ کہہ
رہے تھے۔

"بیٹا یہ وہی لڑکی ہے جس سے راجندر کا رشتہ ٹھہرا تھا۔
ہم بہت خوش ہوئے تھے۔ راجندر ہماری اکلوتی اولاد ہے
ہم سوچتے تھے کہ بہو کے آجانے سے گھر میں رونق ہو جائے گی۔

(بقیہ صفحہ ۵۵ پر)

آہنگِ غزل

پریدار برنی

ایک بٹیلے پھول کی خاطر، کچھ شمشیریں جمع کرو
دل رانجھا ہے، اس کے لئے پنجاب کی ہیریں جمع کرو
چاہتا ہوں میں جشن منانا مرنے سے پہلے یارو
میری سب بکھری آوازیں اور تحریریں جمع کرو
ممکن ہے بن جائے مقدر مجھ سے کسی نجومی کا
ایک کنوارے ہاتھ کی نازک نرم لکیریں جمع کرو
آج نئے انداز سے ہوگا رقصِ جنوں کا ہنگامہ
سارے طوق اکٹھے کرلو، سب زنجیریں جمع کرو
کس کے قلم کو ڈھونڈھ رہی ہے وقت کی سب سے اہم کتاب
میری پوری اور ادھوری سب تحریریں جمع کرو
کرنا ہے تخلیق نیا اک سورج دل کی دھرتی پر
دنیا والو! ذرّے ذرّے کی تنویریں جمع کرو
پڑھ لیں گی ہر راز بدن کا، عُریانی کی آنکھیں خود
شرمیلے ڈوروں میں کاجل کی تحریریں جمع کرو
تشنہ لب تعبیر کریں گے، ایک لہو کا مئے خانہ
ٹوٹے پھوٹے سب خوابوں کی سب تعبیر جمع کرو
پریدار تمہارے جام سے شاید پھر سقراط جنم لے گا
زہر بھرے ساغر میں ماضی کی تصویریں جمع کرو

اندھیرے میں چلتے ہوئے

شانتا سنہا

ہم دیر تک اندھیرے میں چلتے رہے ۔ میرا ہاتھ اس کی انگلیوں کی گرفت میں تھا جو بھیگی بھیگی اور گرم تھی جسے آپ کھلی چھت پر ٹہلتے ہوئے محسوس کرسکتے ہیں۔ ان میں کسی گرم جذبات کا وجود نہیں تھا، ہوا میں خنکی تھی ادھوری سی خنکی جو ہمارے گرد سمٹ آئی تھی ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور تنہا۔

وہ کچھ دنوں کے لئے ہندوستان آیا تھا اور اگلے دن اسے واپس جانا تھا۔

تمام شہر گویا آئینہ میں سمٹ آیا تھا۔ شہر جواب اس کا ہے۔ ٹمٹمائی روشنیوں اور برفانی طوفانوں کا شہر۔ درختوں کے جھنڈ، خزاں کا دور، میدانوں میں کھیلتے بچے اور خاموش مکانوں کے سائے۔

یادوں کی اپنی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ چمپا کی طرح جہاں سانپ کنڈلی مارے بیٹھا رہتا ہے۔ مقامات، لوگ اور ان سے منسوب کہانیاں دھوپ اور خوشبو کے مجرے کنول سے بھرے تالاب اور سنیچر کی شاموں کو اُجلے فٹ پاتھوں پر چاند اور سورج پر انداز سے اور تصویروں کے باغات، مسکراتی ہوئی عورت، اداس عورت، خوب صورت مرد، خوشی سے جھومتے ہوئے مرد، تاریخ کا سنگیت جسے جب چاہیں سن لیں۔ یہ سب کچھ میرے پاس ہے۔ ہے اور نہیں بھی ہے۔ وہ جہاں بھی ہیں خوش ہیں۔ علٰحدہ رہ کر بھی خوش رہنا ایک بڑی بات ہے وہ میرے لئے ہیں اور میں ان کے لئے ہوں۔ یہ ایک سوال ہے گو کہ بہت پرانا ہے۔ لیکن ہر بار نیا لگتا ہے کبھی کبھی ہم اس میں کھو جاتے ہیں۔ جیسے ہم جنگل میں آ گئے ہوں سڑک سے دور۔ سڑک جو قسمت کی جانب لے جاتی ہے۔ سڑک جہاں ایک سرخ نشان ہے جو سنگ مرمر پر کھدا ہوا ہے وہ کہتا ہے قسمت پر توکل و یقین ایک عام آدمی رکھ سکتا ہے میں نہیں۔ اندھیرے اور چاندنی درختوں سے ڈھکی سڑک پر کسی نظم افسانے یا حادثے کی تلاش خود کو لٹتے دینا۔ یہ ہی قسمت ہے کیا؟ کہانی جو پانی کی لکیر ہے اور اسی لکیر کے پاس کہیں ہمارا گھر ہے۔ گھر جو افسانوی ہے اور ہم دونوں کا ہے۔ اس میں دروازہ نہیں ہے۔ جہاں جس کا جی چاہے گھس آئے رہنے لگے اور ایک دن پھر اسے چھوڑ دے۔ اسے اگلے دن جانا ہے اور ہم ابھی ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ مکمل تاریکی چھائی ہوئی ہے اور میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اگر شام ایسی ہو تو کیا کرنا چاہئے۔ بہت کچھ جادوئی ہو جس کو ہم اپنے رہائش کے کمرے میں سجا سکیں۔ یا پھر آج کے کینوس پر ہمیشہ کے لئے سمو دیں۔

میں نے اپنے کاندھے پر ہلکا سا دباؤ محسوس کیا۔

"کچھ ہوگی؟"

"کیا ؟"

کچھ بھی ۔ چائے ۔ کافی !

یہاں اس وقت بھی کافی بھیڑ رہتی ہے اور مجھے بھیڑ اچھی نہیں لگتی ۔ اس کیفے ٹیریا کے پاس پہنچنے کے بعد اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔

تاریکی میں اس طرح چلنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا مجھے تکان سی لگنے لگی تھی ۔ شہر میں اب بھی ویسا ہی ہے گندگی بے ترتیبی ، گھٹن ۔ میں نے پل بھر کے لئے اُسے دیکھا اور پھر دھند میں ڈوبتے شہر کو جو اب اس کا نہیں تھا جو کہ اب اس کے لئے بیگانہ سا تھا ۔ جو اب ہم دونوں کا بھی نہیں صرف میرا شہر تھا۔

"ہم کچھ اور گھنٹے اسی طرح رہ سکتے ہیں ۔" اس نے کہا

"اس طرح چلتے ہوئے ۔" میں نے کہنا چاہا۔

جب میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہے اور ہم کچھ محسوس نہیں کر پا رہے ہیں اور ہمارے اس پاس اور نیچے تاریکی ہے یا اس طرح ساتھ چلتے ہوئے ؟ جب سڑک چل رہی ہے اور ہم وہیں کونے پر چپ چاپ کھڑے ہیں جہاں روشنی ناکام ہو رہی ہے اور وہ نہیں ہیں جو بہت پہلے ہمارے ساتھ تھے اور اب چلے گئے ہیں ۔ ہمیں چھوڑ کر

میں نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھا ۔ وہ ایک مکمل پروگرام کا خواہش مند تھا ۔ ابد او ر ازل کا جس کو ہم کئی بار دہرا چکے تھے اور جانے سے پہلے وہ ایک بار اسے دہرانا چاہتا تھا ۔ کھلی سڑک پر ۔ گھر کے سائے سے دور ۔

سڑک پر بھیڑ بڑھ رہی تھی ۔ اس سے بچنے کے لئے اُس نے مجھے پارک میں چلنے کا اشارہ کیا ۔ میرے پاس اس کے ساتھ چلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا ۔ اندھیرے میں کچھ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا ۔ میرے قدموں کے نیچے زمین اونچی نیچی تھی اور بیلنس بنائے رکھنے کے لئے مجھے اس کا سہارا لینا پڑ رہا تھا ۔

تمہاری چیزیں اب بھی وہاں ہیں ۔ تصویریں ، کتابیں ریکارڈس ہیں انھیں لا سکتا تھا لیکن میں نے سوچا شاید تم کسی دن آؤ ۔ کسی بھی دن گرمیوں میں ۔ وہ وہاں ہیں اور میرا انتظار کر رہے ہیں اور جنھیں کوئی دوسرا استعمال کر رہا ہے جن کو میں نے دیکھا بھی نہیں ہے ۔

تم انھیں واپس مانگنا چاہتی ہو ؟

میں نے ہاتھ کے اشارے سے انکار کر دیا۔

کبھی کبھی ہم ان کی وجہ سے بھی واپس جانے کے بارے میں سوچتے ہیں جیسے ان چیزوں نے ہمارا جانا یقینی کر رکھا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہم کبھی نہیں جائیں گے ۔ وہ جگہ رہائش اپنے لئے اور اپنی چیزوں کے لئے کتنی عجیب بات ہے ـــــ

کیا تمہیں روپے چاہئیں ؟ یہاں سے کچھ لے جانے کے لئے ۔

نہیں میرے پاس ہیں ۔ میرے پاس سفری چیک ہیں ۔ جانے کو جی ہی نہیں چاہتا ۔

اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا " سچ ' مجھے اکتاہٹ ہوتی ہے ۔

ماں کو خط بھیجا کرو ۔ وہ پریشان رہتی ہیں خاص طور پر پاپا کی موت کے بعد اور بھی تم سب بھول جاتے ہو ۔ میں نے ہنسنے کی کوشش کی ۔

تم جانتی ہو کہ میں خط نہیں لکھ پاتا اور پھر فرق بھی کیا پڑتا ہے ۔ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا ۔ پڑتا ہے کوئی فرق ؟ میں وہی ہوں جو پہلے تھا اور ہمیشہ رہوں گا ۔

ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوا کا شور تھا جیسے کہ عام طور پر ہمارے ہاں موسم کی ابتدا میں ہوتا ہے ۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا اور ہوا بھری تاریکی میں ہم چپ چاپ کھڑے تھے ۔

تم جانتے ہو پاپا کی موت کیسے ہوئی ؟ میں نے بہت

آہستہ سے کہا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ موت اس طرح بھی ہو جاتی ہے۔ خاموش، تنہا میری آنکھیں دور اندھیرے میں پھیلنے لگی تھیں۔

انہیں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ایسی کوئی بھی بات نہیں ہوئی تھی جو انھیں عدم کی طرف لے جاتی۔ بعد میں سب آئے۔ تب تک وہ بہت دور جا چکے تھے۔ ان کے ہاتھ میں وہی جلی ہوئی سگریٹ تھی اور وہسکی کا گلاس میز پر۔ دوسرے ہاتھ میں قلم لکھنے کی غرض سے۔ وہ کراس ورڈ دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر انہیں شراب نوشی کے لئے منع کر چکا تھا۔ لیکن اس دن پرشی انکل آنے والے تھے۔ انہوں نے وہسکی ان کے لئے ہی منگوائی تھی۔ ان کا گلاس اب بھی ان کی الماری میں رکھا ہوا ہے اور مجھے لگتا تھا پاپا کہیں گئے نہیں۔ وہ یہاں اس گھر کے اندر ہی ہیں۔ کراس ورڈ حل کر رہے ہیں۔ پھر ایک نہ ایک دن گلاس خالی ہو جائے گا پتہ تک۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا بعد میں سب اسی طرح چلنے لگتا ہے پہلے کی طرح۔ یہ کتنا بڑا سکھ ہے۔ اس چلتے رہنے کے ساتھ جڑ جانا، جڑتے جانا۔ میں تنہائی محسوس کرنے لگی تھی۔ ایک عجب سی اداسی ہ... گرد گھر آئی تھی جیسے ہم موت کے منہ سے نکل کر آئے ہیں۔ وہ خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ نہیں کہ رہا تھا۔

ہمیں چلنا چاہئے۔ میں نے اداس آواز میں کہا۔

ابھی ہم کچھ دیر اور بیٹھ سکتے ہیں۔

لوگ وہاں انتظار کر رہے ہوں گے۔

لوگ۔ تم ہمیشہ لوگوں کے بارے میں سوچتی ہو۔

اس کا لہجہ شکایتی تھا۔ میں تمہارے لئے ہی آیا تھا۔

میرے لئے میرے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی ان کے لئے کیوں نہیں۔ جو آج تمہاری واپسی کے انتظار میں جی رہی ہے جو آج بھی تمہارے ہونے والے بچے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ جنہیں تمہاری وہاں کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہے۔

پاپا کے لئے کیوں نہیں جو تمہارے خط کے انتظار میں ایک دن چپ چاپ دنیا سے چلے گئے۔

کیوں نہیں ان سب کے لئے جو آج بھی اس گھر میں تمہارے کمرے میں پلنگ کے نیچے اور میز کی دراز میں تمہاری راہ بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔

سیبن اور گینڈی کی تصویروں کے لئے کیوں نہیں؟

پیٹ سیگر کے گیتوں کے لئے کیوں نہیں؟

اور پھر

لال پھولوں والی بوگن بیلیا۔؟ ان کے لئے کیوں نہیں؟

مقام، کردار۔ حادثہ۔ تجربہ۔ موم کا ایک پتلا ہے جو وقت کے چمک دار شیشے میں پگھل جاتا ہے۔ ایک کے بعد ایک اور کبھی ایک ساتھ۔ رہ جاتے ہیں ہم۔ ایک پر اسنے درخت کی طرح باقی سب کچھ چلا جاتا ہے۔

تمہیں یقین نہیں آتا کہ میں تمہارے لئے آیا تھا؟

ہر آدمی اپنے آنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ چن لیتا ہے۔ جیسے دھاگے الگ لوگوں کے لئے علیحدہ ڈھنگ استعمال کرتا ہے۔

تم اب بھی ناراض ہو؟ میرے یہاں آنے کے بعد بھی اس کی آواز بھرا گئی۔

یہ تمہیں کیسے لگا؟

میں جانتا ہوں۔

یہاں سے جانے کے بعد سب بے معنی ہو جائے گا۔ جیسے بغیر دروازے کا کمرہ۔ اندھیرے کا سنگیت۔ جیسے بجلی کوند کر چھپ جائے جیسے کھلی سڑک پر کوئی بھیڑ میں کھو جائے گزشتہ ستمبر کی طرح۔ اس سے بھی پچھلے ستمبر کی طرح میرے الفاظ دور سناٹے میں پھیل گئے اپنی اپنی جگہ ڈھونڈتے ہوئے۔

تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو۔ جتنا ہر آدمی عورت کو جاننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اندھیری گلیوں میں گھومنے کا سکھ۔ سکھ جو جتنا پرانا ہوتا ہے۔ موت کے دروازے تک لے جاتا ہے سکھ جو بلی کی طرح کسی تنہا کونے میں گھات لگائے بیٹھا رہتا ہے .... حملہ کرنے کے لئے۔

وہاں ابھی دن ہوگا۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ سفید اور چمکتا ہوا۔

وہ وہاں لابی میں اپنا میل باکس کھول رہی ہوگی جو تمہارا ابھی ہے۔ تمہارا ایک خط اس کے نام ...... اور تم ابھی کہاں ہو۔ اندھیرے میں چپ چاپ میرے ساتھ چلتے ہوئے اور میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہے اور ہم کچھ محسوس نہیں کر پا رہے ہیں .... اور پھر وہ تمہارا خط پڑھے گی اور ہنسے گی۔ وہ جسے تمہارے اس گھر کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم .....

تم کچھ سوچ رہی ہو! اس نے مجھے چھوتے ہوئے کہا۔

اب چلنا چاہئے۔

ہم کچھ دیر اور اس طرح بیٹھ سکتے ہیں اس نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔

اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور ہم بنچ پر الگ الگ بیٹھ گئے تھے اندھیرے کی طرف رخ کئے ایک بڑے سے لمحے میں قید جو ہمیں کہیں بہت دور لے جا کر چھوڑ دیتا ہے جہاں پانی کی ایک لکیر ہے۔

اب تمہیں چھونے سے مجھے ڈر لگتا ہے۔

ڈر؟

ہاں جب میں آیا ہوں میں نے یہ محسوس کیا ہے۔

کیا یہ ہمارے لئے ضروری ہے؟

تم سمجھتی ہو میں اسی کے لئے آیا تھا۔

اس کا لہجہ سخت ہوگیا۔ سنو اس کے لئے مجھے یہاں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ شدت جذبات سے کانپ رہا تھا۔ اور نہ مجھے کوئی احساس جرم ہے۔ جیسا تم سوچتی ہو۔ اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے سیدھا سا سوال کیا۔ یا اب میں تمہیں کیا دے سکتی ہوں۔ اس سے بھی زیادہ کچھ اور ہے ہمارے لئے یہ سورج آج بھی موجود ہے۔ جھولتے پل کی طرح۔ اس کنارے سے اس کنارے تک۔

میں خود نہیں جانتا کہ میں اسے کتنا پیار کرتا ہوں۔ اس کا لہجہ یکایک غم گین ہوگیا۔ جیسے وہ خود سے بات کر رہا ہو

سڑک پر بھیڑ بڑھ گئی تھی۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے شہر بیتا سا دکھتا تھا آواز اور روشنی کے گھیرے سے باہر ہم اپنی آخری شام یہاں گزارنے کے لئے آئے تھے جیسے یہ ہمارے رشتے کے لئے ایک ضروری چیز ہو۔

میں بہت تھک گئی تھی جیسے سردیوں کی تھکان مجھ پر حاوی ہوگئی ہو۔ کہنے کے لئے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا کیونکہ ہر لمحہ ایسا لگتا کہ ابھی کچھ باقی ہے۔ خاموش مکانوں کے حاشئے میں چھپا ہوا جو ہمیں یکایک چونکا دے گا۔ کسی بھی لمحہ میں۔

تم میرے بارے میں ابھی وہی سوچتی ہو۔ ایک غلط ڈھنگ کا آدمی؟ اس کے منہ سے یہ لفظ بڑے عجیب لگ رہے تھے۔ میں نے ایک لمحہ کے لئے اسے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

تم وہاں سکھی ہو' میں یہاں۔ اپنے آپ میں سکھی رہنا ایک بڑی بات ہے پہلے لگتا تھا کہ ہر آدمی سکھ کا ایک وسیلہ ہے اور اب لگتا ہے کہ میں غلط تھی۔

سکھ تم کسے کہتی ہو۔ وہ جو تمہارے پاس ہے، وہ جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ جو حال میں ہے یا ماضی کی ایک داستان ہے۔

نہیں وہ جو ہر آدمی کو ایک دوسرے جیسا بنا دیتا ہے ایک دوسرے سے مختلف۔ پھر بھی ایک جیسا۔ میں نے دور اندھیرے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

کبھی کبھی ہم پرانے لگاؤ کو سنے کر (بقیہ ص ۵۵ پر)

حامدی کاشمیری

غزل

تھی تو بس اتنی تھی روداد سفر پہلے بھی
کالی کھائی میں گرا راہگزر پہلے بھی

وہ ہوا اب کے چلی نام و نشاں بھی نہ رہا
ہم نے دیکھے تھے اُجڑتے ہوئے گھر پہلے بھی

منجمد آنکھوں میں لہرائے کئی رنگ اب کے
اس سیہ خانے سے گزری تھی سحر پہلے بھی

جس طرف دیکھو ہے دیوار سلاخوں کی کھڑی
گھیر لیتے تھے مجھے کالے شجر پہلے بھی

آنکھ کھلنے پہ بھی ہیں خوابوں کے گڈمڈ سائے
دیر تک رہتا تھا خوابوں کا اثر پہلے بھی

کچھ نہیں ہے صرف بہتا ہوا سناٹا ہے
دھند کے پار بھٹکتی تھی نظر پہلے بھی

جعفر عسکری

غزل

زخموں کے لالہ زار کھلے ہیں فضاؤں میں
خوشبو بسی ہوئی ہے لہو کی ہواؤں میں

گردن اسیرِ طوقِ غمِ روزگار ہے
لپٹی ہے ایک درد کی زنجیر پاؤں میں

ٹوٹی فصیلِ شب تو ہوا صبح کا نزول
ڈوبا تمام شہرِ خموشاں صداؤں میں

دیر و حرم کے بعد سرِ بزم تیرگی
اکثر سیاہ کار ملے پارساؤں میں

ہستی کے ریگزار میں پیاسے پھرے عبث
بیٹھے ہیں تھک کے لوگ سرابوں کی چھاؤں میں

جعفر خیال و خواب کے حلقے سے اب نکل
کارِ عبث ہے سوچتے رہنا خلاؤں میں

قاضی نور الاسلام

پرانا افسانہ نمبر ایک

لوگوں کو اب بھی یقین نہیں آتا حالانکہ مقامی اور بیرونی ڈاکٹر اور حکماء
متفق ہیں کہ مجھے کوئی مہلک مرض نہیں ہے، چار ہزار روپیہ ماہانہ کرایہ آتا ہے۔ فیکٹری
منافع پر چل رہی ہے۔ میری مصروفیات بھی سب پہلے ہی جیسی ہیں، لوگوں کو حیرت
ہے کہ میرا اکڑیل جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ کیوں بن کر رہ گیا ہے۔ کس کو بتاؤں چھپکلی
دو ننھے بچے میری جان لے کر چھوڑیں گے۔

اس کو سب سے پہلے میں نے دہلی کے سفر میں اپنے کمپارٹمنٹ میں دیکھا تھا
اور پھر چار سال تک میری ازدواجی زندگی میں جنت کا سکون رہا۔ لیکن اس کا حیرت
انگیز چھلاوہ پن کبھی کبھی میرے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو جاتا کہ وہ انسان
یا کوئی برقی مشین۔ لیکن میں نے اس کو وہم قرار دے کر کوئی اہمیت نہ دی اور اس
شوہر پرستی خدمت گزاری کے سامنے ہر چیز کو فراموش کرتا رہا حالانکہ اکثر
تھا نرگس کی حد سے بڑھی ہوئی ضدیں کہیں میرا گھر اجاڑ کر نہ رکھ دیں!

نرگس کا چھوٹا بھائی کشبوکن ڈاہیں نہ معلوم کون سا بزنس کرتا ہے کہ
دو بار صرف بہن سے ملنے آتا ہے ......! وہ مردانہ حسن و وجاہت کا شاہکار
زبانیں فرانٹے سے لکھتا اور بولتا ہے، اتنی سی عمر میں دنیا بھر کا سفر کر چکا ہے

میری جنت میں گیہوں کی بالیاں دھیرے دھیرے جوان ہونے لگیں اور
بنتِ حوا کی باتیں مجھے کھلنے لگیں۔ حالانکہ اس کی سیر و تفریح سے میری آسائشوں
کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ہر چیز وقت پر تیار ملتی، فیشن کے مطابق نئے کپڑے وا
میں آجاتے، روزمرہ کے امور کی انجام دہی کے لئے کبھی کہنے کی نوبت ہی نہ آ
کام از خود ہو جاتے! لیکن میری تشویش! اکثر رات میں آنکھ کھل گئی تو اس
خالی پایا، شروع شروع سوچا ہو سکتا ہے کسی کام کے لئے اٹھی ہو۔ لیکن یہ
برابر جاری رہا، کئی بار ایسا ہوا اس کو بستر پر نہ پاکر میں نے گھر کا کونا کونا چھا
اور جب کمرے میں واپس آیا تو دیکھا وہ اپنے پلنگ پر بے خبر سو رہی ہے
وحشت بڑھتی گئی! اکثر دن کو ایسا لگا کہ وہ کمرے میں نہیں ہے لیکن جب بہ
تو موجود۔ مجھے اس کی دل ربا اداؤں سے ڈر لگنے لگا۔ لیکن میں اپنے کو سمجھا
کہ یہ سب دھوکا ہے۔ میرے ہی ذہن کا فساد ہے!

وہ نومبر کی ایک شام تھی۔ میں فیکٹری سے ابھی ابھی آیا تھا اور صو
پاؤں پھیلائے آرام سے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ڈرائنگ روم سے ہمارے
کا وہ حصہ صاف نظر آتا تھا جہاں نرگس کا پلنگ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا وہ

سمیٹے بیٹھی ہوئی ہے۔ میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا، پھر چائے پینے میں مصروف ہو جاتا۔ چائے پی کر میں نے کتاب "MYSTICISM IN INDIA" جسے ادھوری پڑھی ہوئی چھوڑ کر فیکٹری چلا گیا تھا، دوبارہ پڑھنا شروع کی، وہ چلائی کیا پڑھ رہے ہو؟ تم نے اتنا پڑھا ہی نہیں کہ اسے سمجھ سکو، میں نے کہا "تمہیں کیا معلوم کہ کیا پڑھ رہا ہوں"؟ وہ بڑبڑائی، میں اسرارِ کائنات کی حامل ہوں! .... جلدی ڈاکٹر سہگل کو فون کرو۔ مجھے درد محسوس ہو رہا ہے، میں گھبرا گیا۔ اور پوچھا کہاں درد ہو رہا ہے؟ پُر وقار لہجے میں رُک رُک کر اس نے کہا "تمہاری قبر میں"!

میں فون کی طرف لپکا لیکن رسیور ٹوٹا پڑا تھا لمحہ بھر کے لئے میں رُکا پھر بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور آریہ نگر پہنچ کر ڈاکٹر سہگل کو لے کر گھر آیا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دو پھول سی بچیاں ایک اس کے داہنے طرف اور ایک بائیں طرف لیٹی تھیں دونوں مسکرا رہی تھیں جیسے انھیں میرا ہی انتظار تھا۔ مجھے عجیب خوف سا لگا اور میں نے منھ پھیر لیا، پائنتی اسٹول پر ایک نرس بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ مجھے آریہ نگر جانے آتے زیادہ سے زیادہ پچیس منٹ لگے ہوں گے۔ بقول لیڈی ڈاکٹر سہگل ان بچیوں کو دنیا میں سانس لیتے ہوئے ہفتوں ہو چکے ہیں۔ BAD IMPRESSION کے ساتھ وہ لوٹ گئیں۔... میں بار بار گھڑی دیکھتا اور سوچتا، میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ نہیں بالکل جاگ رہا تھا، میری سمجھ میں کچھ نہ آیا .... اپنے کمرے میں چلا گیا خلاف توقع نیند آ گئی۔ رات دو بجے آنکھ کھلی۔ دل مضبوط کر کے نرگس کے کمرے میں دبے پاؤں گیا .... بستر خالی تھا .... سہم کر میں پھر اپنے کمرے کی طرف پلٹا یہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی

کہ وہ دونوں بچیوں کو لئے میرے بستر پر سو رہی ہے اور نرس صوفے پر لیٹی ہے، میں دوڑ کر نرگس کے کمرے میں آیا اور یہ دیکھ کر سناٹے میں آ گیا کہ شبو اس نرس کے ساتھ محو اختلاط ہے۔

صبح آٹھ بجے میری آنکھ کھلی تو میں برآمدے کی ایک کرسی پر پڑا ہوا تھا، شبو اور نرگس کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی، میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سوچا خواب دیکھ رہا تھا، ابھی تک خواب میں ہوں، گزشتہ شب ولادت ہوئی وہ بھی توام اور پھر چلنا پھرنا ایسی گفتگو کرنا .... یقیناً میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

شبو نے میرے بائیں پیر کے انگوٹھے کو دبایا اور کہا جناب کو بچیاں مبارک ہوں۔ میں آنکھیں پھاڑے ساکت پڑا سوچتا رہا۔ خواب اتنا گاڑھا ہے کہ جاگتے پر بھی نظر آ رہا ہے۔ اس کی مسلسل مبارک بادیوں پر میں نے چونک کر کہا "تم کب آئے؟" اس پر دونوں بہن بھائی کھلکھلا کر ہنس پڑے، نرگس نے کہا "آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کل آپ خود ہی شبو کو لینے، ایرپورٹ گئے تھے"۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، تھوڑی دیر بعد میں بولا "ہاں بھوا گیا تھا معاف کرنا بیٹو شبو، تم کو بھی بھانجیاں مبارک ہوں۔ وہ کچھ جواب دیئے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے میں نے اسے گالی دے دی ہو۔ میں اسی ادھیڑ بن میں بیٹھا بیٹھا پھر سو گیا اور خواب دیکھا۔

"حدِ نظر تک نیلا سمندر ہے۔ میں پیاس سے بے قرار اس پر دوڑ رہا ہوں جیسے پانی میں پکی سڑک ہو، اچانک ایک فلک بوس عمارت کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے خود بخود کھل گئے میں اندر چلا گیا، ایک لمبا گلیارا ہے فرش پر سُرخ رنگ کا قالین بچھا ہے۔ قالین پر بڑے بڑے اُبھرے ہوئے سفید پھول بنے ہیں، دو رویہ کمروں کے دروازوں پر

تنسیل کے پردے پڑے ہیں، مہندی کی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی ہے اور آتش دان روشن، معلوم ہوتا ہے کہ یہ آباد ہیں، میرے پاؤں ہلکے ہونے لگے۔ لرزہ طاری ہو گیا اور میں آگے ہی بڑھتا گیا، گلیارے کے سرے پر ایک دیسی کمرہ ہے۔ دروازے پر BIRD CLOCK ٹنگی ہوئی ہے۔ جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا۔ سیاہ رنگ کی ایک چڑیا نکلی اور کرخت آواز میں کوکو کوکو چار بار بولی۔ سناٹے میں آواز گونج گئی میں دہل گیا۔ دو قدم پیچھے ہٹا۔ پھر جھپٹ کر خود بخود کمرے میں گھس پڑا۔ وہاں ایک آہنی سلاخ میرے سینے کے آر پار ہے۔ میں آتش دان پر لٹک رہا ہوں، بائیں طرف ایک خوب صورت نیم برہنہ لڑکی جس کے ہونٹوں پر ہلکا گلابی رنگ اور چمکی لگی ہوئی ہے، ہلکی موسیقی ہو رہی ہے، دائیں طرف ایک بڑی مسہری پر نرگس اور شبو برہنہ پڑے ہانپ رہے ہیں۔ وہ لڑکی بالکل برہنہ ہو کر میری طرف بڑھی پھر پلٹی اور ایک چمکتی ہوئی چھری اٹھا کر قریب آئی اور میرے سینے کا گوشت کاٹا، اس پر نمک چھڑکا اور سنہری نقشین پلیٹ میں رکھ کر دونوں کے پاس مسہری پر رکھ دیا۔ شبو کچھ اس طرح کہہ رہا تھا۔ "چار سال بعد اب تم آزاد ہو چکی ہو شرط اور امتحان دونوں پورے ہو گئے، ایک اشرف المخلوق کی روح پگھلا کر بوند بوند کر کے تم پی چکی ہو۔ اس کا کالبد خالی ہو چکا ہے وہ مرے گا نہ اس سے زیادہ زندہ رہے گا۔"

اچانک کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ میں اچھل پڑا بائیں طرف جو خوب صورت لڑکی کھڑی تھی اس کی جگہ سوکھی ہڈیوں کا سفید ڈھانچہ ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہا ہے۔

نرگس نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں نے گھگھیا کر تکیہ منہ پر رکھ لیا۔ اس نے تکیہ چھین لیا، میری آواز حلق میں ہی پھنس گئی۔ میں نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں وہ میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "کیا آپ کی طبیعت خراب ہے؟ بارہ بج چکے ہیں، کھانا، فیکٹری، بچوں کی نہ میری فکر، میں نے جسم جنم کی طاقت اکٹھا کی اور آنکھ کھولی وہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اکثر زچگی کے بعد عورت کا حسن نکھر جاتا ہے بکھرے ہوئے بال، الماسی آنکھیں، گلابی گال، یاقوتی ہونٹ طباشیر جیسے شہابی دانت .... ایک ساعت کے لئے سب کچھ بھول کر بے خوف اس کو کھینچ لیا، اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے کہا ابھی کل ہی تو تمہیں جڑواں بچیاں ہوئی ہیں آرام کیوں نہیں کرتیں، وہ مسکرائی پھر میرے بازوؤں میں ڈھیلی ہو کر فکر انگیز لہجے میں کہنے لگی۔ اٹھیے اور نہائیے آپ کو ڈاکٹر کو دکھاؤں گی، بچیوں کو پیدا ہوئے سوا مہینہ ہو چکا ہے اور آپ کے لئے ابھی کل اپنے مدار پر رکا ہوا ہے۔ میں جمائی لیتا ہوا اٹھا۔ جیسے میرے ذہن پر کوئی گرانی ہی نہیں، باتھ روم سے واپس آیا کھانے کی میز بھری ہوئی تھی۔ محسوس ہوا بہت بھوک لگی ہے۔ میں نے جلدی جلدی کھانا شروع کر دیا۔

اتنے میں شبو آیا اور ہلو کہتا ہوا سامنے بیٹھ گیا اسے دیکھتے ہی پہلے تو مجھ پر کپکپی طاری ہوئی پھر بے خوفی کے ساتھ غصہ آنا شروع ہوا، میں نے ترش لہجے میں پوچھا تم کب آئے؟ وہ ہنسنے لگا ارے سوا مہینے سے روز ہم دونوں صبح و شام ساتھ کھانا کھا رہے ہیں، آپ یہ کیا پوچھ رہے ہیں کہ میں کب آیا!

میں سوچنے لگا یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا یہ سب بھی خواب دیکھ رہا ہوں؟

نرگس نے کہا "کل کی فلائٹ سے میں شبو کے ساتھ اونٹاریو جا رہی ہوں بہت جلد واپس آجاؤں گی، سیٹیں بک کرالی ہیں۔"

میں نے ڈپٹ کر کہا ہرگز نہیں، میں شبو کو ایک سکنڈ بھی دیکھنا نہیں چاہتا اسے گولی مار دوں گا یہ حرامزادہ تمہارا بھائی نہیں عاشق ہے، اس سے کہو ابھی اسی وقت میرے گھر سے نکل جائے۔ [بقیہ صفحہ ۹۴ پر]

غزلیں

رشید نثار

زخموں کا ایک ڈھیر تھا سوچوں کے جال میں
لاوا بسا ہوا تھا میرے بال بال میں

دھڑکن کا رقص ٹوٹتے لمحوں کے ساتھ ہے
سارا بدن ہے وقت کے بارہی آبال میں

صحرا نہیں ہوں، شہر کی موجِ سراب ہوں
اک عصرِ بے وجود ہوں میلی سی کھال میں

میرا ہی رنگ روپ تھا جانے وہ کون تھا
دیکھا تھا ایک شخص کو قحط الرجال میں

جنگل کی آگ میرے لہو میں سما گئی
ایندھن بنا ہوا ہوں کسی کے خیال میں

گہرے سمندروں میں کٹھن راستے بھی تھے
لیکن اَنا کا اسم تھا میرے جمال میں

اک برگِ سبز تھا میری آنکھوں کی روشنی
اک زرد سا غبار تھا سورج کے تھال میں

یہ حادثہ نثار ہر اک موڑ پر ہوا
میں خود سے آملا ہوں کسی کے وصال میں

--

صحرا کی رات میرے لئے بے مثال تھی
جو ذات بھی سفر میں ملی لازوال تھی

اُدھڑے ہوئے لباس میں کس کو خبر ہوئی
مٹھی میں ایک نوٹ تھا یا اپنی کھال تھی

آنکھیں بجھیں تو لمس کی لہریں پلٹ گئیں
بے رنگ سی صدا بھی مرے حسبِ حال تھی

ہر انگ بجھ کے ٹوٹ چکا تھا وجود کا
بے خواب ہر مکان پہ چشمِ سوال تھا

پچھلی کا پیٹ زخم کو مرہم سے کم نہ تھا
دریا کی ریت جسم کا پردہ تھی شال تھی

چونکے ہر ایک رات میرا ہمسفر نثار
سو جاؤں چین سے یہ مری کب مجال تھی

--

غزل

شمیم قاسمی

"میں آج کیا ہوں؟" ترے سامنے بتا مجھکو
یہ اور بات ہے میں بدگمان تھا پہلے

جو تم کو دیکھا تو پھر اس کو بھول بیٹھا ہوں
تمہارے ہونے کا اس پر گمان تھا پہلے

جسے میں برف کا تودا بنائے پھرتا ہوں
وہ شخص بھی میاں جلتی چٹان تھا پہلے

یہ سچ ہے آج تو میرا مکان مالک ہے
ترے پڑوس میں اپنا مکان تھا پہلے

اسی کو قاسمی شیریں زبان کہتے ہیں
جو شخص سب کے لئے بدزبان تھا پہلے

--

غزل

اسعد بدایونی

عجیب سانحہ کل رات مجھ پہ گزرا تھا
میں اپنے آپ سے ہی ڈر کے بھاگ نکلا تھا

سبھی کا ذہن تھا الجھا ہوا تفکر میں
ہوا نہ حل جو کسی سے سوال ایسا تھا

تمہاری بستی میں جب کوئی پرخلوص نہ تھا
میں ایک بار تمہارے بھی در پہ آیا تھا

میں اس کو لکھنے کی خواہش میں زندہ تھا اب تک
نظر نظر جو فسانہ جو ایک بکھرا تھا

وہ دور جبکہ نئے لفظ کی تلاش میں ہیں
تخیلات کے دریا میں تیرا کرتا تھا

ہزاروں لوگ گئے پتھروں کی وادی میں
مگر ہر ایک کے ہاتھوں میں ایک تیشہ تھا

میں اس کو ڈھونڈ رہا ہوں خوشی کے ساگر میں
مگر وہ شخص تو دریائے غم میں ڈوبا تھا

نہیں کہیں بھی ملا پھر کبھی نہ اے اسعد
ضرور وہ کسی دیوار ہی کا سایہ تھا

--

غزل

رونق گیاوی

شوخ آنکھوں کی حیا، فکر کی وسعت ٹھہرے
ہم سے جاگتے احساس کی لذت ٹھہرے

خواب ٹوٹے گا تو تعبیر سمٹ جائے گی
ہم کو معلوم ہے اس دور کی قسمت ٹھہرے

روشنی آج مرے شہر میں تقسیم ہوئی
چاہتا ہوں میں اندھیرا بھی امانت ٹھہرے

نیلگوں آسماں دریا کو تکا کرتا ہے
چاہتا ہے کہ تہِ آب ہی دولت ٹھہرے

بند آنکھیں بھی یہاں شور مچا دیتی ہیں
اور ہم آج بھی سنجیدہ علامت ٹھہرے

آج پھر میری انا جنگ کرے گی مجھ سے
جانے کب تک یہ شکستہ سی عمارت ٹھہرے

سر احساس کا سیلاب ہے آیا رونق
کب تلک دیکھئے اب آگ کی شہرت ٹھہرے

--

۔ش کنیّا

۔۔ اندھے سمندر میں ڈوب جانے کے بعد
۔نے اِس غبار آلود چاندنی کا پیرہن نوچ پھینکا تھا
۔ر نکل پڑی تھیں ایک بھرے شہر میں اپنا برہنہ جسم لئے ہوئے
۔ؤں نے دیکھ لیا تھا
۔ہارے ہاتھوں میں دو لہراتے ہوئے سانپ تھے
۔تانوں پر لٹک رہے تھے بچھوؤں کے ان گنت ڈنک
۔نوں کے بیچ ایک خون کی ندی بہ رہی تھی
۔ن تم مسلسل رقص کر رہی تھیں، ایک ایسا وحشیانہ رقص
۔ہ دیکھ کر جاگ اٹھی تھی نامردوں کی ایک سفاک فوج
۔لپٹ جانا چاہتی تھی زمرد کے اس تنے ہوئے درخت سے
۔ دیکھ رہا تھا اس دھند کی اوٹ سے نکل کر جب بھی دیکھ رہا تھا
۔ہاری آنکھیں دھیرے دھیرے پتھراتی جا رہی تھیں
۔یلیوں پر اُگ آئے تھے سرکنڈوں کے سنسناتے ہوئے جنگل
۔ن میں کچھ بھی نہیں کر سکا تھا اس وقت، صرف کچھ بھی نہیں
۔ہ یاد ہے اُس غبار آلود چاندنی کا سرسراتا ہوا پیرہن
۔۔ جھڑتے ہوئے چہرے پر وِش کنیّا کی لپک لینے والی خواہش
۔رکے پتھرائے ہوئے کونے میں شیولنگ کا عریاں رقص
۔ہ یاد ہے کہ ایک اندھے سمندر میں ڈوب جانے کے بعد
۔نے اس غبار آلود چاندنی کا پیرہن نوچ پھینکا تھا

— —

ندیم گویائی

نامرد آسمان

ایک گنجان بھیڑ کی کٹکٹاتی خاموشی میں
آخر وہ چہرہ بھی کہیں کھو گیا
جسے میں نے اپنے جسم پر ایک لجلجی جونک کی طرح چپکا لیا تھا
اور چاٹتا رہا تھا ایک نمکین سمندر اپنی لٹکتی زبان سے
اب نہ وہ سمندر ہے نہ سیلاب کی بہتی ہوئی سنسناہٹ
ایک ہانپتا ہوا جسم میرے سامنے سانس لے رہا ہے
جسے میں ایک چٹان کی درز سے جھانک رہا ہوں بھیڑیے کی طرح
نہ جانے کتنے برس بیت گئے ان جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے
لیکن جب بھی ایک چٹان سے ہاتھ بڑھا کر اسے چھونا چاہا
دو لٹکتی ہوئی بوڑھی چھاتیاں میرے ہاتھ میں آ گئی ہیں۔
آنکھوں میں تن گئے ہیں چپچپاتی مکڑیوں کے جالے
دیواریں سانپ کی طرح رینگنے لگی ہیں میرے چاروں طرف
اب کہاں جا چھپے مجھ پر سایہ کرنے والے آسمان
مجھے نہیں چاہئے یہ دھڑکتا ہوا ساکت جسم
اور کانوں پر منڈلاتی ہوئی بھوری جان آنکھیں
اب میں اس شہر کو ایک گرجتے پہاڑ پر سنا دینا چاہتا ہوں
اور ناگ پھنی کے اس جنگل سے دور بہت دور
ایک لپلپاتے خلا میں کھو جانا چاہتا ہوں

— —

بابو

کلام حیدری

صبح سات بجے کا گھر سے نکلا میں ابھی ابھی گھر لوٹا ہوں۔ تھک کر چور ہو چکا ہوں مگر ذہن پر جو بوجھ تھا وہ اُتر سا گیا ہے لیکن جو بوجھ اب ذہن پر محسوس کر رہا ہوں وہ مجھے اُس بوجھ سے زیادہ بھاری معلوم پڑ رہا ہے۔

یہ میری حماقت بھی ہو سکتی ہے

میں نے گھڑی دیکھی، گیارہ بج چکے ہیں۔ میں نے نوکر کو آواز دی تو میری بیوی بھی جاگ پڑی ہے، میں نہا دھو کر اب کھانے کی میز پر بیٹھ چکا ہوں۔

میری بیوی مجھ سے دن بھر غائب رہنے کے بعد اتنی دیر سے گھر پہونچنے کا احوال پوچھ رہی ہے۔ میں نے اصلی بات چھپا کر اُسے اپنی مصروفیتوں کا قصّہ سنا کر ختم کیا اور کھانا کھانے لگا۔

بستر پر کئی کروٹیں لے چکا ہوں، بے حد تھک چکا ہوں مگر نیند نہیں آرہی ہے وہ ٹھکانے لگ گیا ہے۔ وہ جس جرم میں جیل گیا ہے وہ اسے پھر اس سرزمین پر قدم نہیں رکھنے دے گا۔ فارنیر ایکٹ میں گرفتار کرانے کے بعد میرے ذہن کا وہ بوجھ اُتر چکا ہے جو اس کی ملاقات نے اچانک میرے سر پر رکھ دیا تھا۔

بیس سال سے اس شہر میں عزت و نیک نامی کی زندگی گذارنے کے بعد یوں اچانک ایسے زلزلے سے دو چار ہو جاؤں گا، میں نے سوچا بھی نہ تھا

یہ خوب صورت مکان، یہ لان، اچھی بیوی، تین بیٹے، ایک بیٹی، شہر کی سب سے بڑی کپڑے کی آڑھت۔

خوش حال اور مطمئن زندگی کے بیس سال گذارنے کے بعد اچانک یہ زلزلہ۔

میری کنپٹیوں پر کچھ بڑھاپے کی سفیدیاں نمایاں ہونی شروع ہو گئی ہیں میں اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھا کہ کوئی میری ہموار اور سیدھی زندگی کے راستے میں ہچکولے پیدا کرنے کے لئے آجائے۔

میں نے اپنے دس سال پرانے ڈرائیور کو بھی نکال دیا ہے۔ کیونکہ۔۔۔۔ کیونکہ۔۔۔۔

میں ایک ضروری کام سے دوسرے شہر جا رہا تھا تو ڈرائیور نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا کہ اُسے ایک ہفتہ کی چھٹی چاہئے اس لئے کہ اس کا بھائی بیس سال کے بعد اچانک آرہا ہے

"کہاں سے آرہا ہے" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی نہیں معلوم۔ ویسے تار کلکتہ سے آیا ہے۔" ڈرائیور نے بتایا۔

"تو یہ بیس سال بعد اچانک تمہارا بھائی کون تھا جو اب تمہارے پاس آرہا ہے؟"

سر! میں تو کچھ جانتا نہیں، میں دس بارہ سال کا تھا جب یہ

...ہ میں رہتے تھے۔ مجھے ان کی شادی یاد ہے اُس کے بعد کچھ
...ں معلوم وہ کہاں گئے اور اب کہاں سے آرہے ہیں۔"
میں اپنے ٹور سے لوٹا تو ڈرائیور چھٹی پر چلا گیا۔
اُس دن ناشتہ کر چکا تھا اور برآمدے میں اخبار
...رہا تھا کہ پورٹیکو میں ڈرائیور ایک اجنبی کے ساتھ آتا دکھائی

ڈرائیور نے مجھے سلام کیا، پھر اُس اجنبی نے بھی۔
" سر! یہی میرے بھائی ہیں۔ یٰسین! "
میں نے محسوس کیا ڈرائیور کا بھائی مجھے غور سے دیکھ
رہا ہے۔
اچانک جیسے مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں دیکھے ہوئے
...ے کو دیکھ رہا ہوں۔
مگر چند لمحوں میں ہی اتنے چہرے میری آنکھوں میں
...کہ سب کے سب گڈ مڈ ہو گئے۔
اور تب اس بھیڑ بھاڑ میں آہستہ آہستہ ایک چہرہ اُبھرنے

لیکن......
لیکن......
میں نے کرسی پر پہلو بدلا اور اس چہرے کو جو اب بے حد
...نے طور پر میرے سامنے آگیا تھا اپنی نظروں سے دور کرنے
... اپنی یاد داشت کو جھٹلانے کی کوشش کرنے لگا۔
یٰسین!
یہ وہ نہیں ہے۔
"میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے بابو ۔۔۔ "
میں نے نظریں اُٹھا کر اوپر دیکھا ۔۔۔ وہ یٰسین تھا
یٰسین تھا! میں چاہے اس حقیقت کو پسند کروں یا
...ں مگر وہ چہرہ میرے سامنے تھا، ماہ و سال کے اثرات
...گر چہرہ وہی تھا۔

میں نے دل میں سوچا۔ تم نے پہچان لیا تو کیا میں نے
نہیں پہچانا۔ تمہیں پہچان کر میں کہیں اپنے آپ کو نہ کھو دوں
کیونکہ......

مجھے اُس بڑے شہر کے آخری کنارے پر کھولا باڑی
میں رہتے ہوئے دو ماہ سے اوپر ہو چکے ہیں۔
میں کوئی سیاح نہیں ہوں، میں کوئی شوقین امیر بھی
نہیں ہوں جو تجربے کے شوق میں کھولا باڑی میں رہنے لگا
ہے، پھر وہاں سے چلا جائے گا۔ اور کھولا باڑی کی زندگی
پر دو چار آرٹیکل لکھ کر ہزاروں کمائے گا۔
مجھے تو یہاں میرے وہ ظالم حالات لے آئے ہیں جن میں
گھر گیا ہوں۔ ورنہ میں مزے سے کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا
اور مستقبل کے سنہرے خواب دیکھا کرتا تھا، میرے پاس ہر ماہ
ایک مقررہ رقم گھر سے آجاتی تھی اور میں مزے سے ہوسٹل کی اوسط
زندگی گذار رہا تھا۔ بی۔ اے کر چکا تھا اور اب اطمینان
سے ایم۔ اے کر کے بہتر زندگی کے خوابوں کے نشے میں
زندگی گذار رہا تھا کہ اچانک۔
اس میں کوئی ڈرامائیت نہیں ہے کہ اچانک میرا باپ
مرگیا۔ کیونکہ جس طرح اچانک میرا باپ مرگیا اُس طرح بہت
سے لوگ مرجایا کرتے ہیں اور جس طرح میں کھولا باڑی کی زندگی
بسر کرنے پر مجبور رہا اُس طرح بہت سے لوگ مجبوراً کھولا
باڑی میں پوری زندگی کاٹ دیتے ہیں۔
میرا باپ تو خیر ایک اچھا خاصہ سرکاری ملازم تھا کہ
جب وہ مرگیا تو ایک مخصوص عرصہ تک میری ماں کو پنشن
ملتی رہے گی۔
پنشن اور تنخواہ میں فرق ہوتا ہے اسی لئے میں ہوسٹل
سے اس کھولا باڑی میں آگیا۔

سنہرے خوابوں کی بجائے اب مجھے اپنے دو بھائیوں کی تعلیم اُن کے مستقبل کی فکر لاحق ہوگئی۔ ایک بہن کی شادی کا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔

زندگی مجھے کہاں لے آئی تھی ؟

زندگی مجھے کہاں لے جائے گی ؟

صبح سات بجے اُٹھ کر میں کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا ہوں تو میرے بلاک والے پانی کے نل پر حسب معمول بھیڑ جمع ہے۔ بالٹیوں اور گھڑوں کا انبار لگا ہوا ہے، کون پانی پہلے بھرے گا ؟ جھگڑے ہو رہے ہیں، پھر میں اپنی لنگی اور تولیہ لے کر باہر نکل جاتا ہوں اور نل کے پاس پہونچتا ہوں تو ان جھگڑتے ہوئے کیڑے مکوڑوں کو پتہ نہیں کیا ہوجاتا ہے کہ سب کے سب کنارے ہٹ جاتے ہیں ۔

بابو نہائے گا ۔ بابو نہائے گا ۔

بابو کا لقب ان میں سے کس نے مجھے دیا تھا، میں نہیں جانتا مگر مجھے اس جگہ بابو کہا جاتا تھا اور اس احترام کا تجربہ مجھے روزانہ اس وقت ہوتا تھا جب میں نہانے کے لئے اس نل پر آتا تھا۔

اس احترام کے جواب میں اس کے سوا مجھے کچھ نہیں سوجھتا کہ جلدی جلدی نہا کر ہٹ جاؤں ۔

میرے ہٹتے ہی وہاں پھر وہی گالم گلوچ اور لڑائی جھگڑے شروع ہوجاتے ۔

میں ایک مخصوص معمولات کا پابند تھا اس لئے ساتھیوں میں سنجیدہ سمجھا جاتا تھا اور طرار قسم کے ساتھی اکثر غبی بھی کہہ دیا کرتے تھے ۔

باپ کی موت نے میرے اوپر سنجیدگی کی ایک اور تہہ بٹھادی تھی اس لئے دنیا کی تمام ترغیبات سے کنارہ کشی زندگی گذارنے کے لئے یہ کھولا باڑی بڑی مناسب جگہ تھی ۔

شروع شروع میں مجھے لگا تھا کہ میں ان نیچ لوگوں میں زیادہ دن نہیں رہ سکوں گا، مگر ان لوگوں نے جو میرا احترام کیا تھا اُس سے میں کم از کم اتنا مطمئن ضرور رہا تھا کہ میرے کام میں کسی طرح کا خلل نہیں پہونچے گا ۔

اس احترام کی قیمت مجھے ایک اور طرح چکانی پڑتی، اس آبادی کے اکثر لوگ میرے پاس منی آرڈر لکھوانے، اپنے خطوط لکھوانے اور پڑھوانے آجاتے تھے۔ اکا دکا سے شروع ہوکر اب یہ حال ہوگیا تھا کہ مجھے روزانہ کئی کئی خطوط لکھنے اور پڑھنے پڑجاتے۔ وقت بے وقت سے تنگ آکر میں نے اب صرف ایک دن مقرر کردیا تھا۔ جب میں یہ کام کرتا تھا یعنی اتوار کے دن ۔ بس، اور اتوار کو میرے دروازے میں یہ سب اس طرح لائن میں لگ کر بیٹھتے کہ جیسے راشن کی دکان میں نمبر لگائے ہوئے ہوں ۔

میں باری باری خط پڑھتا، اُن کے جواب لکھتا۔ اور یہ کام دو گھنٹے سے کم میں کبھی ختم نہ ہوتا ۔

وہ اتوار کی رات تھی جب کسی نے میری کوٹھری کا دروازہ پیٹنا شروع کیا ۔

میں گہری نیند سے اُٹھا اور بوکھلاہٹ میں بلا سوچے سمجھے دروازہ کھول دیا۔

وہ تیر کی طرح اندر آگیا ۔

" بابو ۔ " اتنا کہہ کر وہ دروازے کی طرف مڑا اور اس نے اندر سے کنڈی چڑھادی اور ہاتھ کی ایک چھوٹی سی اٹیچی کو میرے پلنگ کے نیچے ڈال دیا ۔

" مجھے یہاں پر گولی لگ گئی ہے ۔" اس نے اپنا شانہ کھول کر دکھایا۔ جس پر کس کر ایک گمچھا بندھا ہوا تھا۔

" گولی ۔۔ ؟ ارے ! لیکن ۔۔ کیسے ہوا ۔ "

میں بے حد نروس ہوا ۔

" بابو گھبرائیے نہیں ، بس ایک دو چھرا ہی لگا ہے۔ میں یہاں پکڑ لیا جا سکتا ہوں ۔ "

"بات کیا ہے ـــ ؟"

"جلدی میں کیا بتاؤں ۔ میری اٹیچی اپنے پاس رکھیں گے میں کل آکر لے جاؤں گا ۔ ؟" اور میرے کچھ سوچنے سمجھنے سے قبل وہ میری کوٹھری سے نکل گیا ۔

کچھ دیر تو میں اپنی چارپائی پر بیٹھا رہا پھر لیٹ گیا ۔ نیند غائب تھی ۔ !

اِن لوگوں کا کیا ٹھکانہ ؟ پتہ کیا کہیں ڈاکہ ڈالا ہو ۔ کہیں جھگڑا کر بیٹھا ہو ، کہیں ، ـــ میں بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ ایک تالہ بنانے والی فیکٹری میں کاریگر ہے اور میرے اس بلاک میں اپنی نئی بیاہتا بیوی کے ساتھ رہتا ہے ۔

چارپائی کے نیچے اٹیچی ہے ۔

اس خیال کو میں ذہن سے جھٹک کر سوجانا چاہتا تھا ، مگر نیند اور میرے بیچ میں لیپن اور .....

پھر جانے کیا ہوا اور کب ہوا کہ میری آنکھ لگ گئی ۔ بے خبر سو گیا ، اٹھا تو سرہانے پڑی ہوئی گھڑی میں ساڑھے سات بج رہے تھے ۔

مجھے خیال آیا چارپائی کے نیچے ـــــ

باہر نکل کر ادھر اُدھر دیکھا تو سامنے لیپن کی کوٹھری کھلی ہوئی تھی اور وہ اور اس کی بیوی دونوں کے پُراسرار فرار پر عورت مرد سب ہی باتیں کر رہے تھے ۔

میں نے اٹیچی چارپائی کے نیچے سے نکالی اور اسے کھولا ۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔

سو کے نوٹوں سے وہ اٹیچی بھری پڑی تھی ۔ دو لاکھ ۔ تین لاکھ ـــــــ

میں نہایت خاموشی سے کھولا باڑی چھوڑ کر اپنے شہر روانہ ہو گیا ۔

— —

بقیہ : خوب صورت سینڈل

راجندر بھی بہت خوش تھا ۔"

" میرے بیٹے کی قسمت خراب ہے ۔" راجندر کی والدہ پھر چلائی ۔

" مگر نہ جانے کیا بات ہو گئی ۔" راجندر کے والد نے بات جاری رکھی ۔ " کسی رشتہ دار نے خبر اُڑا دی کہ لڑکے کی صحت ٹھیک نہیں اور سمندھیوں کا دل بدل گیا ۔ راجندر اس لڑکی کے لئے خاص سینڈل لایا تھا اور جب یہ تحفہ دینے ان کے ہاں پہنچا تو سمندھی نے سیدھے مُنہ بات نہیں کی اور اس لڑکی نے بھی تحفہ لینے سے انکار کر دیا تھا...... اور رشتہ ٹوٹ گیا ۔"

راجندر ایک دفعہ پھر غشی میں بول رہا تھا ـ

" پریاں فرشتے ہوتی ہیں ۔ ان کے پیر نہیں ہوتے ۔"

اور میری نظر میز پر پڑے سینڈل کے جوڑے میں جاکر اُلجھ گئیں ۔

— —

بقیہ : اندھیرے میں چلتے ہوئے

بہت آگے تک بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ پھر یہ لگا تار اچانک بیچ میں ٹوٹ جاتا ہے اور ہم اسے لے کر گھسٹتے رہتے ہیں سوکھے پتوں کی طرح ۔

ہم پھر اندھیرے میں چلنے لگے تھے ۔ ساتھ ساتھ اور تنہا ۔ بڑھتی ہوئی بھیڑ ۔ شور و غل اور آوازوں کے گھیرے سے الگ ۔ جہاں ہم تھوڑی دیر پہلے اس تسلسل کا تجزیہ کر رہے تھے جو اب ہمارے بیچ نہیں تھا ۔ جو اب دو الگ الگ گھروں میں شیشے کے اندر پل رہا تھا ۔ انکیوبیٹر میں پلتے ہوئے بچے کی طرح ----

— —

شمارہ ۴/۵۱

تین مختصر نظمیں

رؤف صادق

ممیز

اَن گنت لوگ
لے کر ٹکٹ چار آنے کا
دیکھنے جاتے ہیں ممیز کو
میوزیم کی طرف
جبکہ
زندگی کے تابوت میں محفوظ ہیں
فٹ پاتھ پر بسنے والی
زندہ لاشیں!
— —

منگل سُوتر

نابینا کمرے میں رات بھر
پہنتی ہے
بہت سارے منگل سوتر
اور صبح ہوتے ہی
وہ عورت
وِدوا ہو جاتی ہے!
— —

بے چینی

وہ لڑکی
خوب سنورتی ہے
شام سے رات ہونے تک
تو جھلّاہٹ سے
نوچنے لگتی ہے جُوڑے کے پھول!
— —

مدھ چندر

عابدہ احمد

جوش ہوش کیسے سمیٹے
درپن فصیل سے ٹکرا گیا
خاموش بے صبر لمحے ایک دوسرے کا لقمہ بنے
کلپنا بے سدھ
انجانی ڈگر ـــــــ، ـــــــــ،
دھرتی کا منجمد لاوا اُبلا
شیتل پون کی آنچ لپکی
بے نور آنکھیں چھپائے
اماوس کی رات !!!

نورجل

صلاح الدین پرویز

ادھر ایک مکان سے وہ نکلی
میرے دل میں آ گئی نورجل
تو حریف، حرمیں پلا گیا
تو سفید، گھاس کھلا گیا

یہ ڈراپ ٹاپ ہے
شانتی
اسے ماردو گے نا
قہقہہ
تو وہ نورجل جو پیار یون پہ لدی ہوئی
کسی گھر میں چھپتی چھپائی تھی
کبھی سات بہنوں کی سائیں تھی
وہ پیالی ٹوٹ کے گر گئی
وہ پیاری دل سے نکل گئی

احمد اعجاز

اُترے ہوئے پیراہن

اُداس اور گردنیں جھکائے اندھیرے کمرے کی نم زمیں پر
غلاظتوں کے یہ ڈھیر سارے لپٹ کے باہم سنا رہے ہیں
مظلموں کی وہ داستانیں جو اُن پہ گزریں
(جو اُن کا حق تھا)
یہاں ہیں وہ بھی جو مالکوں کی تنی ہوئی گردنوں کو اپنے
تئیں چھپایا بانشینوں سے وقار بخشا کئے تھے
وہ بھی جو نازک اندام مالکاؤں کے دودھیا نرم اور چکنے
خطوط اور دائروں کی تختی بھری رعونت تھے
اور وہ بھی جو کتنے نابالغوں کو دیتے رہے بلوغت
جو دو دن سے دریدہ پیراہنوں کو پہنتے رہے غلاظت
وہ سب ہی ہاں وہ سبھی غلاظت کے ڈھیر بن کر
اندھیرے کمرے کی نم زمیں پر اداس اور گردنیں جھکائے
لپٹ کے باہم سنا رہے ہیں عروج کی اپنے داستانیں
سُنو! کہ ہم سب ان ہی اتارے ہوئے پیراہن کی صورت
اندھیرے کمرے کی نم زمیں پر غلاظتوں سے بھرے میں اک دن پڑے ملیں گے

●●

تمہارے ہی عطیات ہیں سب

خدا را نہ چھوؤ
اُدھڑتا ہوا جسم
اُبھرے ہوئے نرم زخموں سے بہتی غلاظت
پچے گوشت
جلتی ہوئی کھال
عریاں پگھلتی ہوئی ہڈیاں
اور رِستے ہوئے سُرخ نیلے سیہ سبز پیلے لہو کی لکیریں
تمہارے ہی عطیات ہیں سب
بہت درد ہوتا ہے ان میں

●●

ایلیا اھرن برگ
سعادت شمیم

سلگتے لمحوں کا منظر

دنیا میں بہت سارے خوب صورت شہر ہیں مگر پیرس ان سب سے خوب صورت ہے جہاں عورتیں دل کھول کر قہقہہ لگاتی ہیں۔ لوگ "چسٹ نٹ" کے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر سُرخ شراب پیتے ہیں۔ اور کھلے شاہراہوں کے صاف اور چمکتے راستوں پر بے شمار روشنیاں جگمگاتی ہیں۔

پتھروں کا کام کرنے والے لوئی راڈکس (LOUIS RAUDAX) پیرس میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۸۱۸ء کے جولائی کے دن اسے یاد تھے۔ تب اس کی عمر صرف سات سال تھی۔ اور وہ بھوکا تھا۔ لیکن اس کے والد ژاں راڈکس کے پاس روٹی نہیں تھی۔ اسی کے پاس صرف ایک بندوق تھی اور بندوق کھائی نہیں جا سکتی۔ لوئی کو موسم گرما کی وہ صبح یاد ہے جب اس کا باپ بندوق صاف کر رہا تھا اور اس کی ماں رو رہی تھی۔ پھر لوئی اپنے باپ کے پیچھے بھاگا تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ اپنی صاف کی ہوئی بندوق سے روٹیاں بیچنے والے کو مار ڈالے گا اور اس کی دُکان سے سب سے بڑی روٹی لے گا۔ لوئی سے بھی بڑی۔ لیکن اس کا باپ اپنے جیسے ہی اُداس لوگوں سے جا کر ملا تھا۔ ان کے پاس بھی بندوقیں تھیں۔ وہ سب مل کر گانے لگے تھے اور پھر انہوں نے اونچی آواز میں کہا تھا۔ روٹی!

لوئی بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ان نغموں کو سن کر انھیں روٹیاں اور کھانے کی دوسری چیزیں ملیں گی۔ لیکن روٹیاں ملنے کے بجائے اس نے اونچی آوازیں اور گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں سنی تھیں۔ ایک شخص نے زور سے کہا تھا۔ روٹی! اور دوسرے ہی لمحے آہ کی آواز آئی اور وہ شخص گر پڑا تھا۔ اور تب لوئی کے باپ اور دوسرے لوگوں نے بنچ اور میز اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں سڑک کے بیچ جمع کر کے مورچہ بنا لیا تھا اور اس کی اوٹ میں سڑک پر لیٹ گئے تھے۔ لوئی کو لگا تھا کہ وہ لوگ کوئی کھیل کھیلنے لگے ہیں۔ لیکن وہ گولیاں چلا رہے تھے اور سامنے سے اُن پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد شاندار وردیاں پہنے سپاہی وہاں آئے تھے اور اس کے باپ کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ لوئی نے اپنے باپ کے پیچھے جانا چاہا تھا لیکن جا نہیں سکا تھا۔ سڑکوں پر عورتیں ہنس رہی تھیں۔ لوگ "چسٹ نٹ" درختوں کے سائے میں بیٹھ کر سُرخ شراب پی رہے تھے، اور ہزاروں لوگ شاہراہوں پر جمع ہو رہے تھے ——

سپاہی لوئی کے باپ کو لے کر اس شاہراہ کے سامنے سے گزرے تھے، تو کیفے میں بیٹھی ہوئی ایک عورت بہت خوش ہو کر ہنسی تھی اور اس نے ایک سپاہی سے کہا تھا۔ اسے اور کتنی دور لے کر جاؤ گے؟ یہیں کیوں نہیں ختم کر دیتے؟

اس پر سپاہی نے بندوق اٹھا کر لوئی کے باپ کا نشانہ لیا اور دوسرے ہی لمحے لوئی کا باپ

سیچ گر پڑا تھا۔ لوئی بھاگ کر اس کے پیروں سے لپٹ گیا تھا کچھ دیر تک ہلنے کے بعد ساکت ہو گیا تھا۔

تب کیفے میں بیٹھی ہوئی عورت نے کہا تھا۔ "اس چھوکرے کا بھی کام تمام کردو۔" لیکن پاس ہی بیٹھے ایک مرد نے کہا تھا۔
"تب کام کون کرے گا؟"

اس طرح لوئی کی جان بچ گئی تھی۔

لوئی بڑا ہوتا گیا تھا اور اپنے باپ کی طرح پتھروں کا کام کرنے لگا تھا۔ وہ مکان بناتا تھا۔ خوب صورت پیرس اور بھی زیادہ خوب صورت بننا چاہتا تھا اور لوئی مکان پر مکان بنائے جا رہا تھا۔ اس نے تھیئٹر بنائے، دکانیں بنائیں، کیفے اور بینک بنائے اور گھر بنائے جن میں کہ عورتیں سردی کے موسم میں آرام سے رہا کرتی تھیں اور دل کھول کر قہقہے لگایا کرتی تھیں۔ اس نے بڑے بڑے پتھروں کو کاٹ تراش کر ایسے خوب صورت مکان بنائے کہ دنیا کا سب سے خوب صورت شہر پیرس اور بھی خوب صورت نظر آنے لگا۔

لوئی دن کے وقت نئے بن رہے مکانوں کی اونچی مچانوں پر کھڑا ہو کر کام کرتا اور رات کے وقت مزدوروں کی بستی میں اپنی چھوٹی سی بدبودار، گندی کوٹھری میں تھکا ہارا پڑ سو جاتا۔ اس کمرے میں چوہے، پسینے اور سستے تمباکو کی بدبو آتی تھی۔ ایسی ہی کئی قسم کی بدبوئیں گلی میں سے بھی آ رہی تھیں، جہاں لوئی کا کمرہ تھا
لوئی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بہت سے کیفے بنائے جو بعد میں بہت مشہور ہوئے۔ لیکن اپنے باپ کی موت کے بعد وہ ایک بار بھی ان کیفوں میں نہیں گیا۔ نہ ہی اس نے دس سرخ شرابیں پی۔ وہ دن بھر کام کرنے کے بعد تھکا ہارا اپنی بستی کے ایک گھٹیا سے ہوٹل میں جاتا اور سستی شراب کا ایک گلاس پی کر اپنی کوٹھری میں جا کر لیٹ جاتا۔

کبھی ایسے بھی مواقع آتے جب لوئی کی جیب میں پیسے نہ ہوتے، کہیں کام بھی نہ ملتا تب نہ سستی شراب ملتی اور نہ روٹی ملتی۔ لوئی اپنے جیب میں سے بچا کھچا تمباکو نکالتا، یا سڑک پر پڑے سگریٹ کے ٹکڑے کو اٹھا کر اس میں سے تمباکو نکالتا اور اپنی مٹی کی پائپ میں بھر کر، اداس اداس سڑک پر ٹہلتا۔ اس نے اپنے باپ کی طرح نہ تو کبھی گیت گائے، نہ روٹی کا نعرہ لگایا کیونکہ اس کے پاس بندوق نہیں تھی اور نہ روٹی کے لئے ضد کرنے والا بیٹا تھا۔

اس نے وہ سب کچھ کیا تاکہ پیرس کی عورتیں دل کھول کر قہقہہ لگا سکیں لیکن ان کی ہنسی سن کر وہ سہم جاتا کیونکہ جب کہ وہ اپنے مرتے ہوئے باپ کے پیروں سے چپٹا ہوا تھا تو کیفے میں بیٹھی ہوئی ایک عورت ہنسی تھی۔ دراصل بیس سال کی عمر تک لوئی نے کسی جوان عورت کو نزدیک سے دیکھا تک نہیں تھا۔ لیکن ۲۵ سال کا ہو جانے پر اس کی زندگی میں جولیٹ نام کی ایک لڑکی وارد ہوئی جو فرش کو صاف کرنے کا کام کیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ پائپ سلگانے کے لئے ماچس مانگنے کے لئے اس کے کمرے میں گیا۔ اور اگلے دن صبح وہاں سے لوٹا اور اس کے اگلے دن جولیٹ اپنے دو پھٹے کوٹ، ایک پیالہ اور ایک فرش صاف کرنے والا برش لے کر بیوی کی شکل میں اس کے پاس آ گئی۔ ایک سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔
اس طرح لوئی کی زندگی میں عورت آئی۔ لیکن وہ بہت سی عورتوں کی طرح جن پر پیرس کو ناز ہے جولیٹ کبھی کھل کر ہنسی نہیں تھی۔ حالانکہ لوئی اسے بہت پیار کرتا تھا۔ جیسا کہ بڑے بڑے پتھر اٹھانے اور خوب صورت عمارتیں بنانے والا کوئی مزدور کر سکتا ہے۔ وہ شاید اس لئے نہیں ہنسی تھی کیونکہ وہ اس علاقے میں رہتی تھی جہاں کھل کر ہنسنے کی آواز تب تک سنائی دی تھی جب ایک بار سپاہی "میری" نام کی ایک دھوبن کو پکڑ کر پاگل خانے لے جا رہے تھے۔ جولیٹ شاید اس لئے بھی نہیں ہنسی تھی کیونکہ اس کے پاس دو ہی پھٹے کوٹ تھے اور لوئی اسے کبھی نیا لباس خریدنے کے لئے پیسے نہیں دے پایا تھا۔

۱۸۶۹ء کے موسم بہار میں جب لوئی ۲۰ سال کا تھا اور

اس کا بیٹا پال دو سال کا تھا تو جولیٹ اپنے شوہر کو چھوڑ کر ایک قصاب کے فلیٹ میں رہنے چلی گئی تھی جو گھوڑوں کا گوشت بیچا کرتا تھا۔ وہ پال کو اپنے ساتھ لے کر نہیں گئی تھی کیونکہ قصاب کو بچے اچھے نہیں لگتے تھے۔

جولیٹ کے جانے کے بعد لوئی اپنے بیٹے کی پرورش کرنے لگا۔ وہ اُسے بڑے بے ڈھنگے طریقے سے اپنے ہاتھوں میں اُٹھا کر اُچھالتا۔ وہ پتھر تو اُٹھا سکتا تھا مگر بچے کو اُٹھاتے وقت بڑے عجیب حرکات کیا کرتا تھا۔ کبھی وہ اپنے منہ میں پائپ دبائے، اداس کے عالم میں سڑک پر چلتے وقت جولیٹ کے بارے میں سوچا کرتا اور اُسے لگتا کہ اُس نے جو قدم اُٹھایا تھا وہ ٹھیک ہی تھا کیونکہ قصاب کے گھر میں وہ خوشی کی زندگی بسر کر سکتی تھی، نئے کپڑے خرید سکتی تھی اور کھل کر ہنس سکتی تھی۔

لوئی مکان بناتا رہا اور اپنے بیٹے کی پرورش کرتا رہا۔ پھر اچانک جنگ چھڑ گئی اور پرشا کی فوجوں نے پیرس کو گھیر لیا۔ اب مکان بنانے کی کسی کو فکر نہیں تھی ادھورے مکان اسی حالت میں چھوڑ دیے گئے۔ پرشا کی توپوں نے خوب صورت پیرس کی بہت سی عمارتیں منہدم کر دیں جو کہ لوئی اور اس کے ساتھیوں نے بنائے تھے۔ اب لوئی کے پاس کوئی کام نہیں تھا اور اس کا تین سال کا بیٹا پال بھوکا تھا۔ آخر لوئی کو بندوق دی گئی۔ اُس نے بندوق لے لی مگر کوئی نغمہ نہیں گایا نہ ہی روٹی کا نعرہ لگایا۔ ہزاروں راج مزدور، بڑھئی اور لوہاروں کے شامل ہو وہ پیرس کی حفاظت کرنے لگا جو کہ سبھی شہروں سے خوب صورت شہر ہے۔ تب مادام مونود نام کی ایک غریب اور رحم دل عورت اس کے لڑکے کی پرورش کرنے لگی۔ لوئی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ننگے پیر برف پر چلتا ہوا گولے اُٹھا اُٹھا کر توپوں کے پاس لاتا رہا جو کہ دشمن کی فوج پر گولہ باری کر رہی تھی۔ وہ کئی دنوں تک بھوکے پیٹ رہا کیونکہ پیرس میں قحط پڑا تھا۔ اس کے پیر گل چکے تھے۔ اس کے ساتھی دشمن کے گولیوں کا نشانہ بنتے گئے لیکن لوئی اپنی جگہ پر جما رہا۔ اور توپ کے گولے ڈھوتا رہا کیونکہ وہ پیرس کی حفاظت کر رہا تھا۔ بھوک اور ٹھنڈک کے باوجود بعض علاقوں میں روشنیاں جگمگاتی رہیں۔ لوگ بالگ سرخ شرابیں پیتے رہے اور عورتوں کے قہقہے گونجتے رہے۔

لوئی جانتا تھا کہ فرانس کا بادشاہ چلا گیا تھا اور ملک جمہوریت قائم ہو گئی تھی۔ گولے ڈھوتے ہوئے اس کے پاس سوچنے کے لئے وقت نہیں تھا کہ جمہوریت کیا ہوتی ہے لیکن پیرس سے آنے والے اس کے ساتھی بتا رہے تھے کہ وہاں کے ہوٹل اور کیفے پہلے ہی کی طرح بھرے ہوئے تھے اور لوگ شرابیں پیتے تھے اور عورتیں جی کھول کر قہقہہ لگاتی تھیں۔

ان کی غصے سے بھری باتیں سن کر لوئی کو محسوس ہوا کہ جیسے پیرس میں کچھ بھی نہیں بدلا ہے اور جمہوریت اس علاقے میں نہیں آئی ہے جہاں اس کا کمرہ ہے۔

آخر کار جب دشمنوں کو مار بھگایا گیا اور لوئی لوٹ کر گھر آیا تو پال پہلے ہی کی طرح روٹی مانگنے لگا۔ لوئی پھر منہ میں پائپ دبائے، اُداس اداس سڑکوں پر گھومنے لگا۔ اب کوئی مکان نہیں بناتا تھا۔ پال روٹی مانگتا رہا اور لوئی اپنی بندوق صاف کرنی شروع کر دی۔ پھر ایک دن یہ سرکاری اعلان جاری ہوا کہ سبھی لوگ اپنی بندوقیں واپس کر دیں۔ اس طبقہ کے لوگوں کو جولائی ۱۸۴۸ء کے دن اچھی طرح یاد تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی مزدور کے پاس کوئی ہتھیار رہے۔

لوئی اپنی بندوق لوٹانا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اس کے ساتھی اپنی بندوقیں واپس کرنا چاہتے تھے لہٰذا وہ سڑکوں پر جا کر گولیاں چلانے لگے۔ اگلے دن لوئی نے سڑکوں پر بہت سی بگھیاں اور گاڑیاں دیکھیں جن میں وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن کو وہ امیر علاقے کے کیفوں میں دیکھا کرتا تھا۔ وہ اپنا سامان لے جا رہے تھے۔ پھر اُسی روز شام کو لوئی نے خالی کیفے دیکھے جہاں نہ لوگ شرابیں پی رہے تھے نہ عورتیں جی کھول کر قہقہہ لگا رہی تھیں

والے بھی مزدوروں کے خوف سے خوب صورت پیرس کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

لوئی نے سوچا جمہوریت بگھیوں اور گاڑیوں میں بیٹھ کر پیرس کو چھوڑ گئی ہے۔ اس نے اس کے متعلق اپنے ساتھیوں سے باتیں کیں تو انھوں نے کہا کہ "اب پیرس میں کمیون قائم ہوگیا ہے اور لوئی نے سوچا کہ پیرس کا کمیون اس علاقے کے کہیں آس پاس رہتا ہے جہاں کہ وہ خود رہتا تھا۔

لیکن پیرس چھوڑ کر جانے والے لوگ اپنے اس سب سے خوب صورت شہر کو بھولے نہیں۔ وہ اسے راج مزدور، بڑھئی اور لوہاروں کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس طرح ایک بار پھر گولے چلنے لگے، مکان گرنے لگے۔ لیکن اس مرتبہ وہ پرشا کی فوجوں کی بجائے پیرس کے ان لوگوں کی جانب سے چل رہے تھے جو بگھیوں میں بیٹھ کر سرخ شراب پیا کرتے تھے تب لوئی کو لگا کہ اسے پھر پہلے ہی کی طرح لڑنا پڑے گا۔ اس مرتبہ مادام موفود اس کے بیٹے کو اپنے پاس رکھنے کے لئے راضی نہ ہوئی کیونکہ وہ رحم دل عورت تو تھی مگر کیتھولک مذہب کو ماننے والی بھی تھی۔ وہ اُن لوگوں کے خلاف تھی جنھوں نے پیرس کے بشپ کو مار ڈالا تھا اور لوئی اُن لوگوں میں شامل تھا۔ اس طرح لوئی نے اپنے بیٹے کو کاندھے پر بٹھایا اور منہ میں پائپ دبائے مورچے کی جانب چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر وہ گولے اُٹھا اُٹھا کر توپ کے پاس لانے لگا۔ پال نزدیک ہی پڑے خالی کارتوسوں سے کھیلنے لگا۔ رات ہوئی تو پال کو ایک سپاہی کے یہاں سلایا گیا جو سینٹ ونسنٹ کے قلعے پر پہرہ دے رہا تھا۔ سپاہی نے پال کو مٹی کا بنا ایک نیا پائپ دیا۔ جو اس کے باپ کے پائپ کی شکل کا تھا۔ ساتھ میں اُسے صابن کا ایک ٹکڑا دیا۔ پال جب گولہ باری کی آواز سنتا ہوا اکتا گیا تو پانی میں صابن گھول کر اور اُس میں پائپ ڈال کر بلبلے اُڑانے لگا۔ وہ کئی رنگوں کے بلبلے تھے، نیلے، گلابی اور سنگی بلبلے اُڑاتے وقت پال کو روٹی کا خیال نکل گیا۔

لڑائی ہوتی رہی کمیون کے حمایتی لوگوں کے پاس توپیں بھی کم تھیں اور گولے بھی کم تھے جو دھیرے دھیرے ختم ہونے کو آرہے تھے۔ دوسری جانب پیرس چھوڑ کر بھاگ گئے والوں کی طاقت بڑھتی جارہی تھی۔ فرانس کے سیدھے سادے کسان اُن کی فوج میں بھرتی ہو رہے تھے اور پرشا والوں سے انھیں نئے ہتھیار مل رہے تھے جو کہ کچھ دن پہلے ان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ آخر کار ان کی طاقت اتنی بڑھی کہ انھوں نے پیرس کو چاروں جانب سے گھیر لیا اور پھر دھیرے دھیرے اُن کا گھیرا تنگ ہونے لگا کمیون والوں کی طاقت کم ہوتی گئی کیونکہ ان کا جو بھی آدمی مرتا اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی دوسرا آدمی نہیں آسکتا تھا۔ لوئی کا ساتھی توپچی مرگیا تو لوئی گولے ڈھونے کے ساتھ توپ بھی چلانے لگا تب اس کے ساتھ دو ہی آدمی تھے جو اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے اس دوران بادشاہوں کے پرانے محلوں میں خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ سرخ شراب کی پیاس بڑھتی گئی۔ فرانسیسی فوجی افسر پرشا کی فوجی افسروں کے ساتھ بیٹھ کر خوشی اور مسرت کی باتیں کرتے رہے اُن شاندار باغوں میں جنھیں ۲۰ ہزار مزدوروں نے دن رات محنت کر کے لگایا تھا۔ فتح کی خوشی منانے کے لئے جھنڈیاں لگائی گئیں بغاوت کرنے والوں کا اب کوئی ڈر نہیں رہا تھا۔ پھر بھی سینٹ ونسنٹ کا قلعہ ابھی تک کمیون والوں کے قبضے میں تھا۔

اگلے دن فرانسیسی فوج کے لیفٹیننٹ فرانسوا دی ایموینین نے اپنی فوجی دستے کو سینٹ ونسنٹ کے قلعہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ قلعے میں بیٹھے ہوئے لوئی اور اس کے دو ساتھیوں نے اُن پر گولہ باری کی۔ لیفٹیننٹ نے دیکھا کہ قلعے پر قبضہ کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ تو اُس نے سفید جھنڈا لہرانے کے لئے کہا لوئی نے صلح کا سفید جھنڈا دیکھا تو گولہ باری بند کر دی۔ اس نے سوچا کہ فرانسیسی فوج پیرس کو تباہ ہونے سے بچانے کے لئے کمیون والوں سے صلح کرنا چاہ رہی ہے۔ اس طرح وہ اپنے دو

ساتھیوں کے ساتھ اطمینان کرکے فوجیوں کے انتظار میں پائپ پینے لگا۔ اُس کا بیٹا پال بھی ان کی نقل میں اپنا پائپ مُنہ میں ڈال کر پینے کا دکھاوا کرنے لگا۔ آخر کار جب فوجی قلعے کے پاس پہنچے تو اچانک گولیاں چلیں اور لوئی اور اس کے ساتھی مارے گئے۔ لیفٹیننٹ نے پال کو مرنے نہیں دیا کیونکہ وہ اسے اپنے فتح کی نشانی کے طور پر لے کر جانا چاہتا تھا اور دکھانا چاہتا تھا کہ کیمون میں اتنے چھوٹے بچے بھی لڑتے ہیں۔

پال کو قیدی بنا کر پیرس لے جایا گیا وہ مئی کا مہینہ تھا جو کہ سب سے اچھا مہینہ سمجھا جاتا ہے۔ چیسٹ نٹ کے درختوں پر بہار آئی ہوئی تھی۔ اور ان کے نیچے کیفوں میں سنگ مرمر کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ سرخ شراب پی رہے تھے اور عورتیں کھل کر قہقہہ لگا رہی تھیں۔

جب دوسرے قیدیوں کے ساتھ چار سال کے پال کو وہاں سے لے جایا جا رہا تھا تو کیفوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے ان پر تھوکا اور جو کچھ ہاتھ میں آیا ان پر دے مارا۔ پال اور دوسرے قیدیوں کو "لکسم برگ" باغ میں محل کے سامنے لے جا کر کھڑا کیا گیا۔ پال بڑے فخر کے ساتھ وہاں کھڑا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہاں گھاس پر بیٹھ گیا اور اپنے پائپ کی جانب دیکھتا ہوا، صابن کے پانی کے بلبلوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ نیلے گلابی اور آسمانی رنگوں کے وہ بلبلے کتنے خوبصورت تھے۔ پال لمبا راستہ طے کر کے آیا تھا اور بہت تھکا ہوا تھا تو وہ بلبلوں کے متعلق زیادہ دیر تک نہ سوچ سکا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔

جب وہ سو رہا تھا لیفٹیننٹ فرانسوا دی ایمونین اپنی محبوبہ گیبرئیل کے ساتھ وہاں آیا۔ اس نے ایک فوجی کو بلا کر سبلٹ ونسنٹ کے قلعے کے چھوٹے قیدی کے متعلق پوچھا۔ بتائے جانے پر وہ اس کے پاس گیا۔ اُس وقت فوجی قیدیوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے لئے وہاں سے لے جا رہے تھے فرانسوا دی ایمونین پال کے پاس پہنچا تو وہ سو رہا تھا۔ اس نے پیر کے ٹھوکر سے اُسے جگایا۔ پال اُٹھا تو گھبرا کر رونے لگا۔ پھر فوراً چپ ہو گیا، اور اپنے باپ کی طرح منہ میں پائپ دبا کر اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "کون ہو تم؟" گیبرئیل نے پوچھا۔ "میں کیمون والا ہوں"۔ پال نے فخر سے کہا۔ گیبرئیل کو اس سے ڈر لگا اور اُس نے اپنے عاشق سے کہا "کیمون والوں کے بچے بھی بڑے خطرناک ہیں۔ ان سب کا صفایا کر دینا چاہئے۔" فرانسوا نے کہا "تمہارے سامنے ہی صفایا ہو جائے گا۔" تب گیبرئیل نے کہا، "ذرا ٹھہرو۔" اسے یاد آیا کہ ایک میلے میں اس نے لوگوں کو بندوق سے پائپوں کا نشانہ لگاتے دیکھا۔ جو کسی چیز سے لٹکے ہوئے گھوم رہے تھے۔ تب اس کے دل میں بھی نشانہ لگانے کی خواہش پیدا ہوئی اور اس نے اپنے عاشق سے کہا "میں اس چھوٹے سے قاتل کے منہ میں پکڑے ہوئے پائپ کا نشانہ لگا کر دیکھنا چاہتی ہوں۔ آخر ایک فوجی افسر کی محبوبہ کو بندوق چلانا آنا چاہئے۔" "بے شک" فرانسوا نے خوش ہو کر کہا۔ وہ اس کی ہر بات ماننے کو تیار تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اُس نے اُسے ۴۰ ہزار فرانک کا موتیوں کا ہار خرید کر دیا تھا۔ نشانہ لگانے والی بات تو بہت معمولی سی تھی۔ اس لئے اُس نے ایک فوجی کی بندوق لے کر گیبرئیل کو دے دی۔

گیبرئیل نے پال کے منہ میں پکڑے ہوئے پائپ کا نشانہ لگایا اور گولی چلا دی اس لئے کہ اگر گولی پائپ کے بجائے پال کو لگتی تو قصور وار گیبرئیل نہیں قرار دی جاتی کیونکہ وہ جنگی قیدی تھا اور بہر حال اس کی سزا سزائے موت تھی۔ گولی چلتے ہی فرانسوا نے گیبرئیل کو خوش ہو کر داد دی اور کہا۔ "واہ، جواب نہیں ہے! کیا نشانہ لگایا ہے!"

یہ سن کر گیبرئیل خوش نہیں ہوئی۔ پال کو مرتے ہوئے دیکھ کر اس کی سانسیں تیز ہو گئی تھیں اور اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ وہاں سے جلد از جلد ہٹ جانا چاہتی تھی۔ پال کچھ دیر تک تڑپنے کے بعد خاموش ہو گیا۔

کچھ عرصے بعد برسلس میں پیرلاتر نام کے ایک بوڑھے

(بقیہ صفحہ ۶۳ پر)

بقیہ: نئے کلاسک

قریب تر چیزیں پیش کر رہے ہیں؟ کیا ہمارے ادب کے 'نئے کلاسک' بس پس منظر ہی تک محدود ہو کر رہیں گے، چند مستثنیات کو چھوڑ کر؟

اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ زیرِ تبصرہ مجموعۂ ادب کے لئے 'نئے کلاسک' کا عنوان صحیح نہیں ہے، یہ ایک قبل از وقت اور بلا دلیل دعویٰ ہے۔ اس 'نئے کلاسک' کی تحویل میں ہو نہ پس منظر کے سوا عمومی طور پر کچھ نہیں۔ مرتبین کو غور کرنا چاہئے 'کلاسک' کا جو تصور معروف و مسلّم ہے اور غالباً ان کے ذہن میں بھی ہوگا، کیا ان کے ابواب توازن، اجتہاد اور اعتبار کی تخلیقات اس تصور کے معیار پر پوری اُترتی ہیں؟ کیا یہ تخلیقات اس قابل ہیں کہ ان کے ذریعے تعلیم گاہوں میں نئی نسلوں کو ادب سے روشناس کرایا جائے اور ان کے ذوق و شعور کی تربیت ہو؟ کیا اُردو ادب میں زبان و بیان کے معیاری نمونے وہی ہیں جو 'نئے کلاسک' کے یہ ابواب پیش کرتے ہیں؟ اس معاملے میں 'نئے نام' کے مرتبین نے کم از کم اس حد تک بہتر تنقیدی نظر کا ثبوت دیا تھا کہ انہوں نے اپنی کوشش کے عنوان میں کوئی مبالغہ آمیز بلکہ گمراہ کن دعویٰ نہیں کیا۔

اب یہ دوسری بات ہے کہ آج خود اردو کے اساتذہ کا ذوق و کردار اتنا پست ہو گیا ہے کہ وہ کالج کی درسیات میں سراسر غیر معیاری چیزوں کا انتخاب کر کے اُردو زبان و ادب کے ساتھ غدّاری اور نمک حرامی کر رہے ہیں۔ آج ہر ہر علاقے میں جو یونی ورسٹیوں کی کثرت ہو گئی ہے تو ہر جگہ اُردو کے اربابِ اختیار اور ان کے چمچے زبان و ادب کے معیار و روایت کو بالکل پسِ پشت ڈال کر قواعد و محاورات تک کی غلطیوں سے بھری ہوئی اپنی اور اپنے دوستوں کی تحریروں کو، جو کسی معیاری رسالے میں قابلِ اشاعت بھی قرار نہیں پا سکتی ہیں، بی اے تک کی درسیات میں داخل کر رہے ہیں۔ ——

بقیہ: پُرانا افسانہ نمبر ایک

اس کے کان کی لویں سُرخ ہو گئیں وہ کھڑا ہو گیا۔ نرگس بپھر گئی یہ کیا فضول بکے جا رہے ہو تم۔ اب تو میں جاؤں گی ضرور جاؤں گی۔ پھر اتنا ذلیل الزام لگایا ہے تمہاری زندگی اجیرن کر دوں گی سِسکا سِسکا کر ماروں گی کمینے کہیں کے۔"

میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا اور کہا جاؤ ان حرام زادیوں کو بھی لیتی جاؤ۔ اب کبھی ادھر کا رُخ نہ کرنا۔ وہ لڑکیوں کی طرف جھپٹی۔ بیدردی سے دونوں کو اُٹھا لیا اور خشم ناک نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ان چھپکلیوں کو اپنی جان کے ساتھ چپٹائے رکھو۔" اس نے دونوں کو میرے منہ پر پھینک دیا! وہ چھپکلیاں بن کر میرے دائیں اور بائیں کندھے پر چپک گئیں ... اور پھر وہاں نرگس تھی نہ خوشبو! میں پوری قوت سے گلا پھاڑ کر چلایا، بچاؤ!

کمرے میں ایک دم سے ہزار آفتابوں کی روشنی پھیل گئی اور پھر فوراً ہی گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ——

بقیہ: سلگتے لمحوں کا سفر

شخص سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ جس نے کیمون میں حصہ لیا تھا اُن دنوں کی یاد کے طور پر اُس نے مجھے ایک پائپ دکھایا جو کہ پال کے پاس ہوا کرتا تھا۔ اس کے مرنے پر اُس نے موقع پا کر اس کا پائپ اُٹھا لیا تھا۔ اس کے سبھی دوست جو کہ قیدی تھے مارے گئے تھے۔ خوش قسمتی سے وہ بچ گیا تھا۔ اُن دنوں کی کہانی سنانے کے بعد آخر اُس نے وہ پائپ مجھے دے دیا تھا۔ پائپ کو دیکھ کر جہاں میرے دل میں بے شمار نرم و نازک احساسات پیدا ہوتے ہیں وہیں بے حد نفرت کا جذبہ بھی اُبھرتا ہے۔ اور آج اسی کی یاد میں مَیں نے یہ کہانی لکھی ہے۔ ——

R.N: Regd. No 4253/64
P.T. Regd. No. 155
PHONE NO. OFF 662 RES 53

THE Aahang Urdu Monthly
Editor: KALAM HAIDRI
BAIRAGI, GAYA.

Hind Litoh Press Gy.

ادب

کلچرل اکادمی، رینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا

اکتوبر ۱۹۷۴ء

شمارہ ۵۲

دفتر کا پتہ:

رینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ۔ گیا

فون:

رہائش: ۵۳

دفتر: ۴۳۲

کتابت:

قمر نظامی

طباعت:

ہند لیتھو پریس بکلوڈ گنج۔ گیا

شرح خریداری

سال کے لئے	۱۵ روپے
دو سال کے لئے	۲۸ روپے
تین سال کے لئے	۴۰ روپے

فی شمارہ

ایک روپیہ پچیس پیسے

مرتبین

کلام حیدری   پرکاش فکری

محتویات

مزامیر

مضامین

افسانے

ڈراما

نظمیں

غزلیں

حرفِ اوّل

آہنگ ہندوپاک کے درمیان خط وکتابت، فون، ٹیلی گرام وغیرہ کی سہولتوں کی تجدید کا خیر مقدم کرتا ہے اور اُمید کرتا ہے کہ اسی طرح دیگر رابطے بھی آہستہ آہستہ ہی سہی مگر پھر سے شروع ہو جائیں گے اور مستحکم ہوتے چلے جائیں گے۔

دونوں ممالک میں اتنی ساری باتیں مشترک ہیں کہ رابطے کا نہ ہونا دونوں کی بدنصیبی کے سوا اور کچھ نہیں کہلا سکتا۔ آج دنیا میں جو چیز امن کی گارنٹی بن سکتی ہے وہ نہ کسی امیر ملک کی پشت پناہیاں ہیں نہ جوہری طاقتوں کا حصول اور اضافہ۔

تہذیبی رشتے ہی پائیدار اور قابلِ اعتماد امن قائم کر سکتے ہیں۔ دنیا کے بہت سارے ممالک میں ایسے رشتے قائم کرنے پڑیں گے مگر ہندوپاک کے درمیان اتنی تہذیبی روایتیں مشترک ہیں اور تہذیبی رشتے اتنے گہرے ہیں کہ اگر آمد و رفت، رسل و رسائل پر پابندیاں نہ ہوں تو ہم پچیس سال کے اندر محسوس کرنے لگیں گے ہم دو نہیں ہیں۔ یہی احساس دونوں ملکوں کے درمیان قابلِ اعتماد امن کی ضمانت بن سکتا ہے۔

آہنگ پاکستان کے تمام ادیبوں اور دانش وروں کو اس موقع پر مبارک باد دیتا ہے کہ ہم ہی ہیں جو تہذیبی رشتے کے تقدس کو سمجھ سکتے ہیں۔

آہنگ پاکستان کے نامور ادیبوں، شاعروں کو دعوتِ نگارش دیتا ہے۔ آہنگ کے صفحات اُن کے لئے ویسے ہی وا ہیں جیسے دلوں کے دروازے اُن کے لئے کھلے ہیں۔

——— کلام حیدری

احمد ندیم قاسمی

○

یہ کیا، کہ لمحۂ موجود کا ادب نہ کریں
اگر یہ شب ہے تو کیوں لوگ نوکرشب کریں

نہ جانے کفر ہے یہ، یا جنونِ استغنا،
ترے فقیر خدا سے بھی کچھ طلب نہ کریں

ترے کمالِ بلاغت سے مجھ کو شکوہ ہے
جو گفتگو تری آنکھیں کریں وہ لب کریں

یہ التجا ہے۔ مرے حال پر مرے احباب
ترس جو کھانے چلے ہیں تو یہ غضب نہ کریں

کہیں وقار سرِ بازار بک نہ جائے ندیم
کہ اب تو لوگ محبت بھی بے سبب نہ کریں

وزیر آغا

اُردُو کے چند انوکھے افسانے

ارسطو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ رُوح تین واضح سطحوں پر اپنا اظہار کرتی ہے۔ پہلی سطح نباتات کی ہے۔ جہاں "محسوس کرنے" کا عمل ہی اس کا نمایاں ترین ثبوت ہے دوسری حشرات الارض کی ہے جہاں "محسوس کرنے" کے علاوہ "حرکت کرنے" کا عمل ایک اضافی وصف کے طور پر موجود ہے۔ تیسری سطح انسان کی ہے۔ جہاں "محسوس کرنے اور حرکت کرنے" کے علاوہ "سوچ بچار" کا عمل بھی موجود ہے۔ خود انسانی معاشرہ میں بھی یہ تینوں ابعاد بآسانی مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً بعض افراد صرف "احساس" کی سطح پر زندہ ہوتے ہیں۔ وہ محسوس تو کرتے ہیں لیکن حرکت کرنے کے عمل کی طرف کچھ زیادہ مائل نہیں ہوتے۔ بعض حرکت تو کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو خوب حرکت کرتے ہیں لیکن انھیں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کس سمت میں حرکت فرما رہے ہیں۔ بعض حسّاس اور فعّال ہونے کے علاوہ سوچ بچار کے بھی عادی ہوتے ہیں مگر انسانی معاشرے میں رہتے ہوئے اکثر افراد ایک آدھ سطح پر ہی عمرِ عزیز کا معتدبہ حصّہ گزار دیتے ہیں اور ان متعدد ابعاد سے ناآشنا رہتے ہیں جنھیں بھرپور زندگی گزارنے کے لئے ناگزیر قرار دینا چاہئے۔ مثلاً جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کی غرض سے جو اسلوبِ زیست اختیار کیا جاتا ہے اور جو دن بھر کام کرنے اور رات کو گھوڑے بیچ کر سونے کے عمل پر منتج ہوتا ہے یا بقائے نسل پر سب سے زیادہ توجہ صرف کرتا ہے۔ محض زندگی کی حیوانی سطح ہی کا غمّاز ہے۔ چنانچہ وہ مسلک جو محض اس خاص اسلوبِ حیات کے گرد گھومتا ہے، قدرتی طور پر یک طرفہ، محدود اور اکہرا قرار پاتا ہے، وجہ یہ کہ زندگی محض جسمانی سطح پر زندہ رہنے کا نام نہیں۔ اس کی ایک سطح فطرت سے ہم آہنگ ہونے کی بھی ہے۔ جس سے بیشتر افراد ناآشنا رہتے ہیں۔ آخر کتنے لوگ ہیں جو بازار کے تماشے سے نظریں ہٹا کر آسمان پر اُڑتے ہوئے بادلوں کو دیکھنے میں لطف محسوس کرتے ہوں؟ زندگی کی ایک اور سطح جمالیاتی حظ کی تحصیل پر منتج ہوتی ہے مگر اس سے واقف ہونے والوں کی تعداد بھی خاصی محدود ہے۔ اسی طرح روحانی مدارج سے متعارف ہونے کی خواہش کتنے فی صد لوگوں کو ہے؟

ہم میں سے بیشتر کی زندگیاں فطرت، محبت، فنونِ لطیفہ، روحانی اقدار، سیر و سیاحت اور مطالعۂ کتب کے بغیر ہی بسر ہو جاتی ہیں اور یہ ایک المیہ نہیں تو اور کیا ہے؟

ان تمہیدی سطور کے لئے میں معذرت خواہ ہوں، لیکن ان کے بغیر میں شاید اپنا مدعا پوری طرح بیان نہ کر سکتا۔ مجھے دراصل یہ کہنا ہے کہ جس طرح ایک عام سا شخص محض ایک سطح پر زندگی گزار دیتا ہے بالکل اسی طرح ایک عام سا افسانہ نگار زندگی کے محض ایک آدھ پہلو تک ہی خود کو محدود رکھتا ہے اور اس کی لاتعداد دوسری سطحوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے افسانے محض ایک ہی ڈگر پر چلتے اور ہماری فلم کی طرح ایک ڈرامائی مثلث کو مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں۔ تاہم بعض افسانہ نگاروں کے ہاں کچھ ایسے انوکھے افسانے بھی مل جاتے ہیں جو زندگی کے عام پہلوؤں کی عکاسی کے بجائے اس کے بعض نامانوس ابعاد کو اجاگر کرتے ہیں، اور اسی لئے انوکھے اور منفرد بھی ہیں۔ زیرِ نظر مضمون کا مقصد چند ایسے ہی انوکھے افسانوں کی نشان دہی ہے۔

اُردو میں کہانی کی عام روش سے انحراف کی ایک اہم مثال سعادت حسن منٹو کا افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ہے۔ اس افسانے کا انوکھاپن اس بات میں ہے کہ یہاں کسی باشعور انسانی کردار کے بجائے (جیسا کہ عام افسانوں میں ہوتا ہے) ایک پاگل کو کہانی کا موضوع بنایا گیا ہے۔ انسان کا امتیازی وصف اس کی فراست اور سوجھ بوجھ ہے لیکن جب یہ سوجھ بوجھ کسی وجہ سے زائل ہو جائے تو فرد نہ تو انسانی سطح پر ٹھہر سکتا ہے اور نہ حیوانی سطح ہی پر اُتر پاتا ہے۔ وجہ یہ کہ حیوانی سطح بھی تو آخر ایک حیوانی سوجھ بوجھ سے عبارت ہے جس سے ایک پاگل تمام طور سے محروم رہتا ہے۔ پاگل آدمی دراصل ایک ایسے نئے جہان کا باسی ہے جس کے کچھ اپنے اصول اور آداب ہیں۔ ایسے اصول اور آداب جو ایک باشعور انسان کی نظروں میں قطعاً بے معنی ہیں اور اسی لئے وہ انھیں پاگل پن کا نام دیتا ہے۔ قباحت یہ ہے کہ سوجھ بوجھ کا معاملہ بھی جمہوری طرزِ عمل ہی کے تابع ہے یعنی جس امر کے بارے میں زیادہ لوگ متفق ہوں وہ عین فطری ہے اور جس میں محض ایک آدھ شخص مبتلا ہو وہ خلافِ فطرت اور اسی لئے قابلِ گرفت ہے۔ پاگل سوچ بچار کے نارمل انداز سے انحراف کا مرتکب ہوتا ہے اور اس لئے عام لوگوں کی نگاہوں میں قابلِ گرفت قرار پاتا ہے۔ مگر منٹو نے اپنے اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ جو عام لوگوں کی نظروں میں پاگل ہے خود اس کی نظروں میں انبوہ کا طرزِ عمل ایک خاص واقعہ (SITUATION) کی نسبت سے عقل و دانش کی صریحاً خلاف ورزی قرار پا سکتا ہے۔ یہ صورتِ واقعہ اُن فسادات سے متعلق ہے۔ جو ۱۹۴۷ء میں شدت اختیار کر گئے اور جنھیں ایک اجتماعی پاگل پن کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پاگل پن کا شعور عام لوگوں کے بجائے ایک پاگل کو ہوا۔ ایک ایسا پاگل جو شعور اور لاشعور کے عین درمیان ایک ایسی ذہنی اور جذباتی کیفیت میں مبتلا تھا جہاں سے وہ شعور اور لاشعور (تہذیب اور جبلت) دونوں کی یک رنگ کارکردگی پر ایک نظر ڈال سکتا تھا۔ چنانچہ جب اس نے نظر ڈالی اور اسے اپنے چاروں طرف ایک اجتماعی پاگل پن کا سیلاب سا دکھائی دیا تو اس نے دو ملکوں کے درمیانی خطۂ زمین یعنی (NO MAN'S LAND) ہی کو محفوظ ترین مقام سمجھا اور اس سے باہر آنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ افسانہ ہر اعتبار سے منفرد اور انوکھا ہے۔ اور اُردو کے چند خاص افسانوں میں شمار ہو سکتا ہے۔

دوسری انوکھی کہانی، رحمان مذنب کا افسانہ "بیگم جان" ہے جس طرح "ٹوبہ ٹیک سنگھ" انسان کی امتیازی خصوصیت (یعنی عقل و شعور) سے انحراف کی ایک مثال ہے۔

اسی طرح "پتلی جان" انسانی جسم کی جنسی تقسیم سے ماورا ہے
انسانی سماج ایک ایسی گاڑی ہے جس کے دو پہیے کی کہانی ہے
ایک ایسا پہیہ جس کی گاڑی کو تو قطعاً ضرورت نہ تھی لیکن جو
کسی نہ کسی طرح گاڑی کے ساتھ چمٹ گیا ہے۔ رحمان مذنب
نے اس غیر فطری کردار کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور ان کی
یہ کہانی "تیسری جنس" کو منظرِ عام پر لانے کی ایک انوکھی کاوش ہے۔

اُردو کے افسانوی ادب میں "پتلی جان" وہ پہلی
کہانی ہے جس میں ایک ہیجڑے کی داستانِ حیات کو قلم بند
کیا گیا ہے۔ کہانی کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف نے
اُس جیتے جاگتے ماحول کو بھی پیش کر دیا ہے جس میں اس
وضع کا کردار اُبھرتا اور پروان چڑھتا ہے۔ اس ماحول کے
بعض نارمل کرداروں بالخصوص حاجی کے کردار کو اُجاگر
کرنے میں بھی افسانہ نگار نے گہری بصیرت کا ثبوت دیا ہے
تاہم اس کا مرکزی کردار پتلی جان ہے جو اپنے خاص ماحول
کی پیداوار ہی نہیں، اس کی بقا کا ضامن بھی ہے۔ لیکن
پتلی جان کوئی بہروپیا نہیں جو ایک خاص مقصد کی تکمیل
کے لئے اپنا حلیہ تبدیل کرتا ہے۔ بلکہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کی
طرح وہ بھی زندگی کے تیسرے بُعد (DIMENTION) کا
باسی ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ شعور اور غیر شعور کے درمیان معلق
ہو کر رہ گیا تھا۔ پتلی جان نسوانیت اور مردانہ پن کے
عین درمیان ایک ایسے مقام پر رُک گیا ہے جو انسانی سماج
کی عورت اور مرد میں تقسیم کی نفی کرتا ہے۔ رحمان مذنب نے
اس نفسیاتی NO MAN'S LAND کی عکاسی کر کے اُردو کو
ایک انوکھا افسانہ عطا کر دیا ہے۔

تیسری کہانی غلام الثقلین نقوی کا افسانہ "وہ" ہے
اس کے افسانے کے کردار سلیم اور نغمی ہیں اور پس منظر وہ
خطۂ زمین جہاں نورجہاں اور جہانگیر کے مقبرے ہیں۔ عام
افسانوں کا طریق یہ ہے کہ وہ یا تو حقیقت کی زندگی سے متعلق
ہوتے ہیں اور گوشت پوست کے کرداروں کے گرد گھومتے ہیں
یا تجریدیت سے مملو ہوتے ہیں اور اپنے گرد خوابوں کی ایک
فضا سی بُن لیتے ہیں لیکن کم افسانے ایسے ہیں جو خواب اور
حقیقت کے درمیان کی سرزمین سے متعلق ہوں۔ ایک ایسی
سرزمین جس میں داخل ہوتے ہی تمام کردار مکانی طور پر
ہی نہیں زمانی طور پر بھی زندگی کے اُس دیار میں چلے جائیں
جو کبھی باسی یا مُردہ نہیں ہوتا۔ "وہ" ایک ایسا ہی افسانہ
ہے جس میں سلیم اور نغمی جو بیسویں صدی کے کردار ہیں، جہانگیر
اور نورجہاں کے مقبروں کی سیر کرتے ہوئے معاً آج سے کئی سو
برس پہلے کی فضا میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس طور کہ سلیم، شہزادہ
سلیم کے روپ میں اور نغمی، انارکلی کے سراپا میں ڈھل جاتی
ہے۔ یوں وہ انوکھا بُعد اُبھر آتا ہے، جو زمان و مکان کی
تقسیم سے ماورا ہے اور نسل کے اجتماعی ذہن میں سدا موجود
رہتا ہے۔ ناول میں اس کا بہترین تجربہ قرۃ العین حیدر
کے ناول "آگ کا دریا" میں ملتا ہے۔ اور افسانے میں
غلام الثقلین نقوی کے "وہ" میں۔

"وہ" ایک ایسی کہانی ہے۔ جس میں نغمی اور سلیم زندگی
کی ایک نئی سطح کو لمحہ بھر کے لئے چھونے میں کامیاب ہوتے ہیں
بالکل جیسے کوئی صوفی ایک لمحۂ خود فراموشی میں اُس حقیقت کی
جھلک پا لے جو تقسیم اور تفریق سے ماورا ہے اور ایک عظیم
وحدت کے طور پر موجود ہے۔ "وہ" میں اس ازلی و ابدی
لمحے کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

"نغمی!" سلیم نے حیران ہو کر کہا "تم اُس وقت
کہاں تھیں؟"

"ظہابلی میرا رقص دیکھ رہے تھے اور میں ایک تُرک غمزہ
زن کے خیال میں غرق تھی اور وقت کے دھارے تھم گئے تھے
کیونکہ وہ میرے مقابل بیٹھا ہوا تھا اور ہندوستان کی تاریخ
اس لمحے کو فنا کی نیند سُلانے کے لئے پَر تول رہی تھی۔"

"نغمی !!"

"میں مہرالنساء نہیں، میں نورجہاں نہیں، میں انارکلی ہوں۔ میں وقت کے تخت پر نہیں بیٹھتی۔ میں تو ایک لمحے کو جنم دیتی ہوں اور خود وقت کی دیواروں میں چن دی جاتی ہوں۔" نغمی کی آواز درد میں ڈوب گئی۔

"میں نے اس لمحے کو بھی کھو دیا۔ اب میری تصویر کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔"

یہ آخری الفاظ سلیم کے ہیں جس نے اُس لمحے کو محض چھو کر چھوڑ دیا جو زندگی کی ایک انوکھی سطح کی حسین ترین علامت تھا اور جس کو گرفت میں نہ لے سکنے کے باعث وہ اپنی تصویر کو مکمل کرنے سے قاصر رہا۔ لیکن افسانہ نگار کا کمال دیکھیے کہ اس نے کس چابک دستی سے اس لمحے کا عرفان حاصل کیا اور پھر اسے قارئین کے وسیع تر طبقے کے سامنے پیش کر دیا۔ یقیناً غلام الثقلین نقوی کا یہ افسانہ اُردو کے انوکھے افسانوں کی فہرست میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ چوتھا افسانہ انتظار حسین کا "آخری آدمی" ہے۔ توبہ ٹیک سنگھ شعور اور لاشعور کے درمیان اور "وہ" "میں اور تم" یا حقیقت یا خواب کے درمیان معلق تھا لیکن "آخری آدمی" حیوان اور انسان کے درمیان کی NO MAN'S LAND کے کرب میں مبتلا ہے۔ انسان ایک تجربہ ہے جو ہر طرح کے تضاد یا آویزش سے ماورا ہے اور حیوان بھی اُس ذہنی یا جذباتی تضاد سے محفوظ رہتا ہے جو آدمی کا نوشتۂ تقدیر ہے۔ مگر آدمی اُس اعراف کا باسی ہے جو جنت اور جہنم کے عین درمیان واقع ہے۔ اور جو نفسیاتی سطح پر خیر اور شر کی آویزش کے لئے ایک میدان عمل ہے۔ انتظار حسین نے "آخری آدمی" میں اسی کیفیت کو علاماتی انداز میں بیان کرنے کی ایک انوکھی کاوش کی ہے۔ بستی کے تمام لوگ آناً فاناً "آدمیت" کی سطح سے اُتر کر "حیوانیت" کے درجے میں چلے گئے تھے اور ان کے لئے کوئی نفسیاتی مسئلہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وجہ یہ کہ وہ اب جبلت کے محفوظ چھتنار کے نیچے آ گئے تھے۔ ساری معلیت تو الیاسف کے لئے تھی جو ابھی انسان اور حیوان کے درمیان کہیں معلق تھا۔ اس کے ایک طرف بستی تھی، دوسری طرف جنگل اور وہ ان دونوں کے درمیان حیران و ششدر کھڑا تھا۔

"الیاسف نے پہلی بستی (کیونکہ بستی اسے جنگل سے زیادہ وحشت بھری نظر آتی تھی)
کو جانے کو خیال کیا مگر خود ہی اس خیال سے
خائف ہو گیا اور الیاسف کو بستی کے خالی
اور اونچے گھروں سے خفقان ہونے لگا تھا
اور جنگل کے اونچے درخت رہ رہ کر اُسے
اپنی طرف کھینچتے تھے۔"

افسانے کے متن میں بھی ایک ایسا مقام واضح طور پر اُبھرا ہے جہاں الیاسف کو اعضاء کے سمٹنے (جو بندر بننے کی ایک علامت تھی) اور کھلنے (جو انسان بننے کی علامت تھی) سے بیک وقت خوف محسوس ہوا۔ اسے یاد آیا کہ جب الیاسف خوف سے اپنے اندر سمٹا تھا تو بندر بن گیا تھا تب اس نے اندر کے خوف پر غلبہ پایا اور اُس کے سمٹتے ہوئے اعضاء کھلنے اور پھیلنے لگے مگر اب اس کے لئے یہ مصیبت پیدا ہوئی کہ کہیں اس کے سارے اعضاء پھیل کر بکھر نہ جائیں۔ الیاسف دراصل آدمی کو انسان اور حیوان، دونوں کو دستبرد سے محفوظ رکھنے کا خواہاں ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ آدمیت خیر و شر کی آویزش سے عبارت ہے اور پلڑے کے کسی ایک طرف جھک جانے سے قائم نہیں رہ سکتی۔ بے شک آخر آخر میں خود الیاسف بھی اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹیک دیتا ہے اور پنجوں کے بل چلنے لگتا ہے۔ لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں کیونکہ الیاسف کے قبل بستی کے باقی لوگ بھی اس تحت الثریٰ میں اُتر چکے تھے۔ افسانے کا انوکھا پن اس بات میں ہے کہ اس میں

المیاسف کے اس کرب کو بیان کیا گیا ہے جو اُسے "بستی" اور "جنگل" کے درمیان لحظہ بھر رُکنے سے حاصل ہوتا ہے اور جو آدمی کا نوشتۂ تقدیر ہی نہیں اس کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔ افسانہ ہر اعتبار سے منفرد اور انوکھا ہے۔ اور اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جانے کے قابل!

اب تک جن افسانوں کا ذکر ہوا وہ زندگی کے اُس مرحلے سے متعلق ہیں جسے اصطلاحاً "ستوگن" کا دَور کہا گیا ہے۔ اب کچھ ایسی کہانیاں لیجئے جو "رجوگن" کے دَور کی عکاس ہیں۔ مثلاً سید رفیق حسین کا افسانہ "بیرو" جس میں ایک بھی انسانی کردار موجود نہیں مگر جس کے حیوانی کردار مثلاً بیرو جو ایک جنگلی نیل گائے ہے، نازک اندام نیل گائیں، شیر اور سفید ریچھ۔ یہ سب اپنے اپنے اعمال میں انسانی کرداروں ہی کی طرح اُبھرتے ہیں جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زندگی مزاجاً UNITARY ہونے کے باعث تقسیم اور تفریق سے ماورا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ زندگی کو حیاتیاتی ہمہ اوست کے زاویے سے بھی جاننے کی کوشش ہونی چاہیئے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ بیرو جو ایک پالتو نیل گائے ہے اپنے آبائی جنگل کو واپس جانا چاہتا ہے۔ مگر چونکہ وہ جنگل سے اب مانوس نہیں رہا۔ لہٰذا وہ پہلے تو اس میں داخل ہوتے ہوئے ہچکچاتا ہے تاہم جب وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کے گلے کا گھنٹا اس کے اور جنگل کی مخلوق کے درمیان ایک دیوار سی بن کر حائل ہو جاتا ہے۔ بیرو کی منزل وہ نیل گائیں ہیں جو اسے دُور سے اشارے تو کرتی ہیں لیکن جو محض گھنٹے کی آواز کے باعث اس سے خوف زدہ ہیں۔ باقی کہانی بیرو کی جستجو، تعاقب، محبت اور نفرت کی کہانی ہے اور افسانہ نگار نے اس کے بیان میں اپنے تجربے اور مشاہدے سے پورا کام لیا ہے۔ آخر میں جب بیرو شیر اور ریچھ کو ایک ہی ٹکر سے ایک ہزار فٹ نیچے چٹانوں پر گرا دیتا ہے اور اس تصادم میں اس کے گلے سے گھنٹا اتر جاتا ہے تو گریزپا نیل گائیں بلا جھجک اس کے پاس آجاتی ہیں۔ یہ افسانہ اس اعتبار سے منفرد اور انوکھا نہیں کہ یہ اردو میں جانوروں کے بارے میں لکھی گئی ایک خوب صورت کہانی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس میں سید رفیق حسین نے قاری کو زندگی کی ایک نامانوس لیکن انوکھی سطح سے آشنا کرنے میں پوری کامیابی حاصل کی ہے۔

اس سلسلے کی اگلی خوب صورت کہانی میرزا ادیب کا افسانہ "دلِ ناتواں" ہے۔ رفیق حسین کا بیرو جانوروں کی کہانی تھی لیکن "دلِ ناتواں" اُردو کے ان چند افسانوں میں سے ایک ہے جو پودوں کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ میرزا ادیب کے اس افسانے میں صرف تین کردار ہیں۔ ایک ننھا پودا جو اندھیرے غار کے اندر پیدا ہوا ہے۔ ایک شعاع جو چند گریزاں لمحات کے لئے اس غار میں آتی ہے اور ایک ایسا پودا جو غار کے باہر اُگا ہوا ہے۔ ان تینوں کرداروں میں سے صرف شعاع اپنی جگہ سے حرکت کرتی ہے۔ باقی کردار زمین کے ساتھ بُری طرح چمٹے رہتے ہیں تاہم افسانہ نگار نے ان کرداروں میں احساس اور شعور کی وہی روشنی محسوس کی ہے جسے آدمی صرف اپنی میراث سمجھتا ہے اور یوں گویا اعلان کیا ہے کہ زندگی جہاں کہیں بھی ہے اس کا پیٹرن ایک سا ہے۔ مثلاً نباتاتی سطح کے یہ کردار آدمی ہی کی طرح محبت بغض اور ندامت کے مختلف مراحل سے گزرتے ہیں اور قاری کو اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ وہ اپنی جنس کے افکار و اعمال میں اس درجہ مستغرق ہے کہ اُسے زندگی کے کسی اور روپ کے مطالعہ کی فرصت ہی نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ ترکیب مطمحِ نظر کی تنگ دامانی! سوچی ہوئی ایغو! کئی وجوہ پیش کی جا سکتی ہیں۔

بیرو، جانوروں کی کہانی تھی اور "دلِ ناتواں" پودوں کی لیکن ممتاز مفتی کا افسانہ "اندھیرا" اُن

بے جان روغنی پتلوں کی کہانی ہے جو مردانہ ٹوپیوں کی ایک دُکان میں کھڑے تھے۔ افسانہ نگار کے زرخیز تخیل نے ان پتلوں سے زندہ کرداروں کا کام لیا ہے اور ان کے اعمال ، حرکات ، اور تخیلات کی مدد سے زندگی کو سمجھنے کی ایک نادر کوشش کی ہے۔

" اندھیرا " کی کہانی بالکل سادہ ہے۔ مردانہ ٹوپیوں کی دکان میں بہت سے روغنی پتلے، سروں پر ٹوپیاں اٹھائے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے بےحس وحرکت کھڑے ہیں۔ جب دن کو دکان جاگتی ہے تو یہ سو رہے ہوتے ہیں لیکن آدھی رات کو جب سنّاٹا چھا جاتا ہے تو یہ بیدار ہو کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ان روغنی پتلوں میں سے بیشتر زندگی سے مطمئن ہیں اور سوچ بچار کی تکلیف تک گوارا نہیں کرتے۔ آدمیوں کے اُس بہت بڑے طبقے کی طرح جو حیاتیاتی سطح پر زندگی گزار دیتا ہے لیکن یہ سوچنے کی کوشش نہیں کرتا کہ اس کی تگ ودو کا حاصل کیا ہے۔ نیز زندگی اور کائنات کا کوئی مقصد ہے بھی یا نہیں ؟ تاہم ان پتلوں میں سے سولا ہیٹ والا پتلا اپنے ماحول سے مطمئن نہیں۔ پہلے آدمی کی طرح اس کے دل میں تجسس کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور وہ خود سے پوچھنے لگتا ہے کہ وہ کون ہے ؟ اس طرح کیوں کھڑا ہے ؟ اور اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے ؟ پھر ایک دن یہ باغی اپنے انجماد اور بےبسی کو جسمانی سطح پر بھی توڑ ڈالتا ہے اور دکان کے اندر آزادانہ چلنے پھرنے لگتا ہے لیکن حرکت جو نارمل حالات میں برکت کا موجب ہے۔ اس روغنی پتلے کے لئے جان لیوا ثابت ہوتی ہے اور وہ فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے (اگلے روز اُسے اُٹھا کر چھت کے ایک اندھیرے کونے میں پھینک دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ دیوی کے ایک مجسمے کو دے دی جاتی ہے پھر جب رات آتی ہے اور روغنی پتلے اپنے مرحوم رہبر کے نقشِ قدم پر چلنے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں تو ان کی نظریں دیوی کے خوب صورت مجسّمے کی طرف اُٹھ جاتی ہے اور اور وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ان کا تجسس ، بغاوت اور عزم - سب کچھ راکھ ہو جاتا ہے۔ اور وہ دیوی کے حسن کی مالا جپنے لگتے ہیں۔

ممتاز مفتی کے اس افسانے کا انوکھا پہلو صرف یہی نہیں کہ یہ بے جان اشیا کی کہانی ہے اور اس کی مدد سے افسانہ نگار نے زندگی کے اُفق کو بہت دور تک پھیلا دیا ہے بلکہ یہ بھی کہ اس میں ممتاز مفتی نے علامتی انداز اختیار کر کے انسانی وجود کی ماہیت اور اس کے طریق کار پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ایک نیم فلسفیانہ رویئے کے باعث انتظار حسین کا " آخری آدمی " اور ممتاز مفتی کا " اندھیرا " (جو دراصل " آدمی " کی کہانی ہے) ایک ہی زمرے میں شامل ہیں اور افسانے کی عام روش سے بالکل ہٹ کر لکھے گئے ہیں۔

اُردو میں اسی قبیل کے چند اور انوکھے افسانے ہیں مثلاً مولوی محمد ظفر کا افسانہ " پکھن " جو [illegible] کے بارے میں ہے۔ اور میرزا ادیب کا افسانہ " [illegible] " جو ذروں کی کہانی ہے۔ پھر سید قاسم محمود کا ایک خوب صورت افسانہ جوتوں کے بارے میں ہے۔ اس طرح سید رفیق حسین نے جانوروں کے بارے میں کچھ اور اچھی کہانیاں بھی لکھی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ایک ہی مضمون میں ان سب کا تذکرہ ممکن نہیں۔

حسن نعیم

○

قریۂ جاں میں کھو گئی بوئے وفا، یقیں کرو
صحنِ چمن میں لُٹ گئی موجِ صبا، یقیں کرو

وادیٔ غم کے سلسلے کوہِ انا سے جا ملے
خواب کی ایک بُوند ہے ابرِ ادا، یقیں کرو

مجھ سے خفا ہیں بے ہنر، اہلِ ہنر خوش ہیں
حُسنِ نوا کی مل چکی مجھ کو سزا، یقیں کرو

تم بھی اُٹھاؤ نازِ درد، میرے جہاں میں آ بسو!
خدمتِ وصل بھی نہیں غم کا صلہ، یقیں کرو

دِلّی کی یاد مٹ سکی، دل سے نہ ایک پل حسن
رشک بجاں تھی غرب کی آب و ہوا، یقیں کرو

فضا ابن فیضی

○

یہ دمکتا ہوا آہنگ، نکھرتی آواز
میں ترے دور کی ہوں ایک ابھرتی آواز
دیکھتا دیدۂ بینا یہ تماشا ہی ذرا
گرد بن کر مرے چہرے پہ بکھرتی آواز
دل کو خوں کیجئے، دیباچہ غزل کا لکھئے
شعلہ ہوئی وہ پھول کترتی آواز
نئے لہجوں کو کوئی آئینہ خانہ نہ ملا
کھردری سطحوں پہ کیا رہ کے سنورتی آواز
صاف کانوں سے سنی میں نے دمِ فکرِ سخن
چاندنی رات کے زینے سے اترتی آواز
زندگی کی ہے بشارت اسی مٹی کی کھنک
عرش و افلاک خموشی، مری دھرتی آواز
طنز بن جاتی ہے شاعر کی نوا میں ڈھل کر
سر جھکائے بھرے شہروں سے گزرتی آواز
لے اڑی لفظ بنا کر اسے مفہوم کی پیاس
کیا سلگتے ہوئے ہونٹوں پہ ٹھہرتی آواز
اے فضا کیسے تو نغموں کا مسیحا ہوتا
روح پیکر میں جو لفظوں کے نہ بھرتی آواز

○

فقط ہمیں کو نہ سمجھو کہ معتبر ہیں ابھی!
بہت سے لوگ سرابوں کے ہم سفر ہیں ابھی
لہو کی شمع ہوں، جلتا رہوں گا صدیوں تک
مضائقہ نہیں راتیں جو بے سحر ہیں ابھی
نہ دیکھو ان کی جبینوں پہ گرد ہے کتنی
غنیمت ایسے نگہدار و خود نگر ہیں ابھی
شکستہ روح، بجھے ذہن، سوختہ احساس
دمکتے چہروں کے پیچھے بھی کچھ کھنڈر ہیں ابھی،
انھیں بھی ڈر ہے نہ کٹ جائیں بے ستوں کی طرح
مرے رفیق جیسے تیشۂ ہنر ہیں ابھی
کہوں یہ کیسے مرے آگے اپنی مٹھی کھول
بصیرتوں کے صدف میں کئی گہر ہیں ابھی
کہیں اتار کے پھینک آئیں ہم انھیں لوگو
ہمارے جسم جو پیراہنِ شرر ہیں ابھی
یہ زنگ جوہرِ دانش کھاٹ جائے گا
مری لغت میں کچھ الفاظ معتبر ہیں ابھی
ذرا یہ دھوپ ڈھلے تو حواس میں آئیں
سلگتی سوچ میں ڈوبے ہوئے شجر ہیں ابھی
جلاؤ آتشِ جاں، یہ جمود تو ٹوٹے
کہ یخ زدہ سے رفیقانِ دیدہ ور ہیں ابھی
شعور کوئی نئی راہ ڈھونڈ ہی لے گا
کہ تجربوں کے قدم، شمعِ رہ گزر ہیں ابھی
فضا یقیں ہے مجھے، ان کو جھیل جاؤں گا
وہ حادثے جو پسِ دانش و نظر ہیں ابھی

ڈاکٹر وہاب اشرفی

جوگندر پال کی افسانہ نگاری

جوگندر پال اپنی افسانہ نگاری کے سلسلے میں ایک سوال پوز کرتے ہیں۔ "میں کیوں لکھتا ہوں؟" ــــــ اور پھر جواب دیتے ہیں کہ:

"زندگی کے شعور و ادراک کا اظہار ایک فطری عمل ہے، اگر میں لکھ کر یہ اظہار نہ کروں گا تو اپنی فطرت کے مطابق کوئی اور ذریعۂ اظہار کر لوں گا .... ہر باشعور انسان فن کار ہے جو کسی نہ کسی طرح اپنے شعور کے فنکارانہ اظہار کے لئے بے چین رہتا ہے .....

..... افسانہ نگار کا یہ بھی کمال ہے اپنے سفر کے دوران کسی خوابیدہ گھٹا ٹوپ اور دشوار گذار جنگل سے سیٹیاں بجاتا ہوا گذر جائے اور اس کے پیچھے پیچھے اوروں کے آنے کے لئے ایک شاہراہ بنتی جائے اُس کا یہ ایک اہم کانٹری بیوشن ہے کہ اُس کی بے باکی فکر کی بدولت متمدن زندگی کے نقشے کا کینوس اور پھیل جاتا ہے اور سچائیوں کی مزید سچائی واہوتی نظر آنے لگتی ہے اور انسانی نسل اپنے علم و فکر سے بور نہیں ہوتی ..... " (پس لفظ، مطبوعہ رسائی)

اپنی افسانہ نگاری کے باب میں جوگندر پال کی یہ وضاحت بے حد اہم ہے اور ان کے فکر و فن کی تفہیم میں بے حد معاون بھی، اس سلسلے میں ان کا ایک اور کلیدی بیان قابلِ توجہ ہے:

"میرے ان گنت ذاتی نظریات ہیں ..... تاہم میرا ادبی نظریہ ایک بھی نہیں، ادبی نظریوں سے ادیب تعصبات کا شکار ہو جاتا ہے، کسی زندہ افسانے میں نظریے افسانہ نگار کے نہیں اس کے کرداروں کے ہوتے ہیں .... " (پس لفظ)

اس پس منظر میں جوگندر پال کی افسانہ نگاری کی روش کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے

میں نے محسوس کیا ہے کہ جوگندر پال اپنے افسانوں کے موضوعات کے لئے زندگی کے مسائل کی طرف براہ راست رجوع کرتے ہیں اور ان پر اپنے کرداروں کی زبان سے خاصے علمی تبصرے کرواتے ہیں ۔ یہی علمی تبصرے زندگی کا آئینہ بھی بنتے ہیں اور افسانے کے تار و پود بھی۔ یہ بذات خود مشکل کام ہے، اور افسانے کے نازک مزاج کو ذہن میں رکھئے تو یہ مشکل کام اور بھی مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن جوگندر پال کا کمال یہ ہے کہ وہ اس پل صراط پر اکثر صحیح و سالم گذر جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اصحاب جو افسانے کو ابھی تک زندگی کی محض ایک قاش سمجھتے آئے ہیں اور جنھیں ہر لمحہ اس میں اچانک پن اور ایک واضح نقطۂ عروج کی تلاش رہتی ہے اُنھیں جوگندر پال کے افسانے سخت عذاب معلوم ہوں گے ۔ اور ان کی فضا خاصی جبری ۔

جوگندر پال کے افسانوں میں زندگی کے مسائل تو ہیں ہی لیکن ان کے کسی ایک افسانے میں زندگی کا کوئی ایک ہی مسئلہ نہیں ہوتا، ایک ہی افسانے میں متعدد مسائل ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے ہیں، پال ان میں کسی ایک پر یا ایک سے زیادہ پر اچٹتی نظر ڈالتے ہیں، کسی پر تفصیلی، کہیں محض اشارے، ایسے میں ان کے اکثر افسانے پر پل پیچیز بن جاتے ہیں، فکر کے بکھرے موتی ذہین اور حساس قاری کا ہر موڑ پر امتحان لیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن اس امتحان میں ایسے قاری کے فکری افق کی توسیع ہوتی جاتی ہے، اس طرح پال اپنے افسانوں سے محض اپنے پڑھنے والوں کو خوش نہیں کرتے بلکہ اپنی بصیرت کا ان کی بصیرت سے معائنہ پر مجبور کرتے ہیں، میں نے یہاں 'معائنہ' کا لفظ جان بوجھ کر لکھا ہے، ظاہر ہے کہ پال کے تمام فکری امور سبھوں کے لئے قابل قبول تو ہو نہیں سکتے، نہ ہی سب کے سب جذب کی بڑ قرار پائیں گے، ایسے میں ان کا حساس اور ذہین قاری ان کے افسانے کے مطالعے کے دوران اپنی فکری قوت کو متحرک ضرور پاتا ہے ۔

جوگندر پال کے افسانوں کا یہ تیور انہیں ایک فکری ساخت دے دیتا ہے، یہ ساخت اتنی انفرادی ہے کہ اس کا ڈانڈا کسی دوسرے افسانہ نگار سے نہیں ملتا اور ان کی انفرادیت نئے لکھنے والوں میں مسلم ہو جاتی ہے، افسانے کی علمی و فکری ساخت سے ذہن قرۃ العین حیدر کی طرف مڑ جاتا ہے لیکن دونوں کے فکری محوراتنے متضاد اور متخالف ہیں کہ انھیں ایک جگہ رکھنا انتہائی انمل بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے، ان کے اندر جو قدر مشترک ہے وہ بس یہ کہ دونوں ہی کے افسانوں کی اساس فکر پر ہے لیکن گہرائی اور گیرائی کی سطحیں الگ الگ ہیں ۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے افکار و آرا ہیں جن سے جوگندر پال نے اپنے افسانوں کی تزئین کی ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کے جواب میں پال کے مختلف النوع افسانے ذہن کے نہاں خانے سے جھانکنے لگتے ہیں اور جو جواب ابھرتا ہے وہ یہ HERE IS GODS PLENTY

مثال کے طور پر 'بازیافت' کے یہ اقتباسات ملاحظہ کیجئے :

(۱) "میرے ایم۔ اے انگلش کی ڈگری علی گڑھ کی ہے، پرائیوٹ حاصل کردہ، یعنی منغفل اور مقفل نہ ہو تو میری لیکچرار کی ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی ......"

(۲) "...... بھوک کا مسئلہ ہندوستان میں تعجب کا باعث نہیں ......"

(۳) "...... سب تصویریں خیالی ہوتی ہیں ......"

(۴) "آلوؤں میں نصف فی صد نشہ ہوتا ہے، رم میں پچیس فی صد اور طاقت سو فیصد، طاقت دروغ

اپنے سونی صدنشے میں چوبیس گھنٹے دُھت رہتے ہیں اور یہ لوگ ان کے روبرو تعظیم سے اپنی آنکھیں اوپر نہیں اُٹھاتے مگر ہم سے کوئی بھی اپنی نحیف صلاحیتوں کی ذراسی اسٹومیلیشن کے لئے ایک چوتھائی نشے کے اسباب بھی کرنا چاہتا ہے تو اس کی خوراک اس کی بے ضرر ذاتی پسند پر بداخلاقی کا لیبل چپاں کیا جاتا ہے ۔ اگر بداخلاق ہوکر خوش اخلاق ہونے کو جی چاہے ...... "

(۵) "...... میرا خیال ہے کہ وہ (ڈاکٹر عظیم) ہمیشہ اپنے ساتھ رہتا ہے اور اس طرح اس کی تنہائی لمبی لمبی معلوم ہوتی ہے ..... "

(۶) "...... جنگل، ہم کنوارے اور اکیلے لوگوں کو جن رشتوں کی کھوج ہوتی ہے وہ ہمارے آس پاس ہونے کے بجائے دراصل ہماری ہڈیوں کے اندر ہوتے ہیں، میری ہڈیوں میں میرے ماں باپ ایک دوسرے سے بغل گیر ہیں، نہ صرف وہ، بلکہ سب انگنت جوڑے، وہ سب ماں باپ جن سے ہوتے ہوتے رشتوں کی یہ ڈور میرے ماں باپ تک پہنچی .... "

(۷) "..... ہماری قوم ہر روز اپنا آپ کھو کر ہر روز ایک نیا اپنا آپ امریکہ اور یوروپ سے اُدھار لیتی ہے اس طرح کے جملے 'بازیافت' ہی سے چنتا جاؤں تو ان کی تعداد خاصی کثیر ہو جائے گی' یہی پرپل پیچز ہیں' یہی افکار کے موتی ہیں ۔ ان کا تعلق 'بازیافت' کے بنیادی عشقیہ قصے سے نہیں ہے، لیکن انھیں نکال دیجئے تو لکھنو کی خالہ اور ان کی خوب صورت بیٹی خالدہ اور اس سے لوگوں کا عشق کا افسانہ تیسرے درجہ کا سطحی، سستا افسانہ بن جائے گا اور بازیافت کا جواز ہی باقی نہیں رہے گا۔ اور اپنے آپ کو اور دوسروں کو ریاکاری اور جنسی لیک کے پس منظر میں دیکھنا محال ہوگا۔ اور وہ بے باک کنفیشن اور اپنی ذات کی کڑی تنقید جو اس افسانے کو چند بہترین افسانوں میں شمار کرنے پر مجبور کرتی ہے معدوم ہو جائے گی ۔

جوگندر پال کے ایک علامتی افسانے 'بوڑھا جزیرہ' میں کہنہ عمری کے باب میں یہ جملے ملتے ہیں :

" کہنہ عمری کا شکار وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو کہنہ یادوں کے جراثیم سے محفوظ نہ رکھ سکے ۔ یہ موذی جراثیم آدمی کے حال کو چاٹ جاتے ہیں اور اس کے دل و دماغ میں قطار در قطار رینگ رینگ کر، جا بجا سوراخ کر کرکے گھٹاٹوپ نہاں خانوں میں جا نکلتے ہیں، آدمی بے چارہ اپنی آنکھیں بند کئے اُن نہاں خانوں میں پڑا رہتا ہے اور اس تاریک کائنات کا عادی ہو ہوکر باہر کی روشنی اُسے اذیت کن معلوم ہونے لگتی ہے یہی کہنہ عمری ہے، میرے بوڑھے اس لئے کہنہ عمر نہیں کہ ان کے ذہنوں سے اپنی گذشتہ عمریں محو ہیں، وہ یوں کہ وہ زمانہ، حال کا با ہر قدم ہی نہیں دھرتے جو لمحہ اب اس وقت ہے بس وہی ہے، اس کے آگے کچھ ہے ہی نہیں اور مستقبل عدم وجود ہو تو ماضی از خود اوجھل ہو جاتا ہے ...... "

عام قاری کے لئے "بوڑھا جزیرہ" سے لطف لینے کی ایک سبیل مارونی اور شوشو کی بوڑھی عجیب و غریب اور مضحکہ خیز یا دوسری سطح پر عین فطری محبت ہے لیکن اس افسانے کا انڈر کرنٹ فلسفۂ وجودیت کے عناصر ہیں ۔ اسے سارتر کے EXISTENCE PRECEEDS ESSENCE کی بازگشت کہئے ('جو ہے سو ہے') یا زندگی کے معاملات کو وجودی افکار کے آئینہ میں سمجھنے کی کوشش' دراصل یہ عنصر پال کے صرف ایک افسانہ 'بوڑھا جزیرہ' ہی میں نہیں ملتا بلکہ ان کے افسانوں

عمومی مزاج بھی یہی ہے، لمحاتی زندگی کے تمام تر شاخسانے پال کے افسانوں کا خمیر ہیں، ان کے احساس تنہائی کا جواز بھی یہی ہے، بیگانگی کے تصور کی عقبی زمین بھی یہی، تشکیک اور بے یقینی کے کرب کی وجہ بھی یہی، اور مشینی میکانکی زندگی کی الجھن کا باعث بھی یہی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ جوگندر پال نظریاتی طور پر POSITIVISTIC PHILOSOPHY پر ایقان رکھتے ہوئے وجودیت کے رجحان تک آتے ہیں۔ POSITIVISTIC PHILOSOPHY پر جوگندر پال ایقان رکھتے ہوں یا نہیں لیکن وہ عناصر بہرحال ان کے افسانوں میں موجود ہیں، ان کے یہاں بھی نجات کی راہ تلاش کرنے کی الجھن نظر آتی ہے، اپنے افسانوں میں پال COMTE کی طرح ذہنی تشدد سے خائف نظر آتے ہیں، پرانے اقدار و معیار کی شکست و ریخت انھیں بھی ہکا بکا بنائے رکھتی ہے، اور وہ بھی سائنس اور عقیدے میں ایک طرح کا تال میل چاہتے ہیں لیکن ایسے تال میل میں کوئی میری محیر العقول یا فرضی دلائل کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ذہن کی بالادستی کے خلاف پال کے افسانے "تیسرا شخص" کا ایک اقتباس دیدنی ہے، پروفیسر ددت سے اس کی شادی شدہ محبوبہ مانی ہم کلام ہے:

"جانتے ہو ڈارلنگ، میری تمہاری شادی کیوں نہ ہو پائی؟ اس لئے کہ میں تمہارے پاس بیٹھی ہوتی لیکن مجھے دیکھنے کے لئے تم اپنے ذہن میں دیکھنے لگتے، میں بیٹھ بیٹھ کر تنگ آجاتی کہ عجیب عاشق سے پالا پڑا ہے، عشق مجھ سے کرتا ہے پر توجہ میرے تصور کی طرف رہتا ہے۔ تم نے میرا ایک تصور بنا رکھا تھا، اپنی مرضی کا تصور، اور اپنی اس پسند کو میری ذات پہ محمول کر لیا تھا، دراصل تم اپنی ذات سے، اپنے تخیل سے، اپنے آپ سے پیار کرتے تھے، مجھ سے نہیں۔"

مینٹل انارکی کے خلاف مانی کا یہ احتجاج بے معنی نہیں، خصوصاً اس پس منظر میں جب تخیل پسندی کتابوں کو اپنی حقیقی اولاد کا بدل ماننے پر مجبور کر دے اور گوشت پوست کے رازہائے سربستہ سے واقفیت کی نفی کر ڈالے، پروفیسر ددت کی تخیل پسندی دیکھئے اور پال کے فکری محور کا اندازہ لگائے:

"مانی مجھے عجیب سا خیال آرہا ہے، تم ہی میری ساری کاغذی اولاد کی ماں ہو اور میں اس کا باپ، جیسے شوہر اور بیوی کے رشتے سے بچے پیدا ہوتے ہیں ویسے افلاطونی رشتے کتابوں کی پیدائش کے باعث ہیں اگر تم مجھے خالی الذہن کر کے چلی گئیں مانی، تو میں اس فکری اختلاط سے محروم ہو جاؤں گا۔"

لیکن ایسی مینٹل انارکی کے خلاف مانی کی زبان سے پال کی تنقید یہ ہے:

"ایکا ایکی مانی بے اختیار ہنسی۔

تمہاری ہر کتاب اسٹل بے بی ہے مائی ڈیر ددت..... آئی ایم سوری ددت! لیکن میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ زندہ بچے ذہنی ملاقاتوں سے نہیں پیدا ہوتے۔"

POSITIVISTIC رویہ جوگندر پال کے متعدد افسانوں میں ملتا ہے۔ لیکن یہ کہنا بھی زیادتی ہوگی کہ پوزیٹیوسٹک لوجسٹک ٹیلسٹ رویہ ہی جوگندر پال کے افسانوں کے نمایاں ترین محور ہیں، دراصل پال کسی مکتبہ خیال سے حتمی طور پر وابستہ ہونا نہیں چاہتے، کسی ایک فلسفے کی بھاری زنجیر اپنے پاؤں میں ڈالنا نہیں پسند کرتے، یہی وجہ ہے کہ کچھ بنیادی رجحانات کے باوجود وہ بڑے آزاد رو ہیں اور سچ پوچھئے تو ان کے فکری احاطے میں ناخن پر لگا ہوا رنگ بھی ہے اور دل میں گم ہو جانے

والی ایک ہستی تھی، پھر وہ وسیع و عریض دنیا کے سفر پر نکلتے ہیں تو کرپشن، ہائی پوکریسی، ریاکاری، چور بازاری۔ غرض دنیا بھر کی آلائشوں پر تیکھی نگاہ ڈالتے ہیں اور انہیں EXPOSE کرتے ہیں۔

ان کا افسانہ 'رسائی' ان امور کی موثر، فن کارانہ اور جیتی جاگتی تصویر ہے، جس میں کسی کا پیشہ جیوتش اور پسندیدہ فلسفہ ہے جس کے لئے یہ پیشہ کوئی ہتھکنڈہ نہیں بلکہ باقاعدہ روحانی سائنس بن جاتا ہے جو اپنی توکل اور مشہور رقاصہ مس جیوا گاندھی کا عاشق بھی ہے، جس کے لئے جیوا اس کے کرۂ ارض کا دوسرا نام بن جاتی ہے، جسے اس کا احساس ہے کہ عورت کا خوف اور خوشی اس کی سالم زندگی اس کے چہرے پر رقم ہوتی ہے، جو یہ سوچتا ہے کہ جیوا اس کے لئے ایک پرابلم ہے کہ وہ اپنے چہرے سے خارج ہو کر ذہن میں گھسی رہتی ہے، جو اس کے لئے اس کی پہلی محبوبہ اوما کا بدل ہی نہیں بنتی بلکہ ہر طرح اوما کے خد و خال بن جاتی ہے، جو آخری نتیجے میں ایک بہت بڑا اسمگلر ہے اور جس کی محبوبہ جیوا اوما کا روحانی اور جسمانی روپ ہے کوئی اور نہیں اسے گرفتار کرنے کی ایک ایجنسی ہے، ایک سی آئی ڈی ہے۔ اگر 'رسائی' میں محض اتنی ہی باتیں ہوتیں تو کوئی قابلِ لحاظ چیز نہ تھی۔ دراصل اسی افسانے کی IRONY قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے اور ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا غلاظت کا ڈھیر معلوم ہوتی ہے، ایسے مواقع پر جوگندر پال کا ہلکا طنز خاص مزا دے جاتا ہے اور فضا کی عمومی لطافت میں اضافہ کر دیتا ہے۔

جوگندر پال آئرنیکل سچوئشنس پیدا کرنے میں فنکارانہ کمال رکھتے ہیں، ان کے متذکرہ افسانوں کے علاوہ "آمد و رفت" (آمد آمد) 'وحدت' 'باہر کے بھیتر' 'جنگل' (ہم جنس) وغیرہ سامنے کی [illegible] مثالیں، کہیں کہیں افسانوی تاثر کو شدید بنانے کے لئے قول محال یا پیراڈوکس کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ ایسے عوامل سے ان کا وہ نقطۂ نظر جو کسی افسانے میں وہ بیان کرنا چاہتے ہیں واضح ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال کے لئے ان کا طویل افسانہ 'کچھوا' (پال اسے ناولٹ لکھتے ہیں) مطالعہ کیا جا سکتا ہے اکھڑے ہوئے لوگ اور ان کی نسلوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں، جو ملک اپنا ہے وہ اپنی اولاد کے لئے اپنا نہیں ہے، جس جگہ سے کسی کو پیار ہے وہ جگہ اجنبی نہیں پیار کو خجالت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ 'کچھوا' میں آپ بیتی کے جو عناصر شامل ہیں ان سے افسانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور اس پس منظر میں اس میں جذبے کی غیر معمولی شدت اور احساس کی تیز آنچ کی وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے

جوگندر پال کو کہانی کہنے کا ڈھنگ آتا ہے، وہ اپنی معمولی اور غیر معمولی باتوں کو ایک وقار سے برتنے کے عادی ہیں اس طرح ان کے جملے اُبلتے ہوئے سے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ عام طور سے 'فال بیک' کی تیکنک اپناتے ہیں اس طرح مستقبل یا حال کے معاملات ماضی کی یادوں سے اُبھرتے جاتے ہیں۔

جوگندر پال کی ساری فکری [illegible] ان کے افسانے میں مبدل ہو گئی ہے۔ اس لئے کومل نازک دھیما دھیما اور شیریں انداز بیان ان کے افسانوں کے خصائص نہیں۔ ان کے کردار ثقافتی، تمدنی، معاشرتی، معاشی اور فلسفیانہ امور پر اپنی واضح رائے رکھتے ہیں اور ان کے اظہار کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں، لہٰذا اظہار آرا کا انداز ہر جگہ پایا جاتا ہے، وہ اس کا التزام نہیں کرتے کہ کرداروں کی سطحیں متعین کریں اور پھر ان کے مطابق وہ ان سے گفتگو کروائیں، دراصل ان کے تمام افسانوں میں ایک ہی کردار ہے اور وہ ہے آج کا بہت ذی علم ٹوٹا ہوا، شکی، چالاک، عیار، تنہا آدمی جو اپنی نظر پوری کائنات پر بھی رکھنا چاہتا ہے اور اپنی ذات پر سے ہٹانا بھی نہیں چاہتا۔ لہٰذا گفتگو کا انداز ایک ہے اور یہ بہرحال شیریں اور نازک نہیں بلکہ تند و تیز ہے، اور طنز آمیز ہے۔

ان امور کی واضح تفہیم کے لئے جوگندر پال کا افسانہ "کتھا ایک سیل کی" بے حد معاون ہے، اس افسانے کا علامتی ہے لیکن تخیل علامتی نہیں، اس میں زندگی کے روز وشب کی کہانی افسانہ بنی ہے، ہماری جنسی خواہشیں، انتہا محبت امکانات، رقابت کی بنیادی خلش، خیر وشر کا ابدی نزاع، مجبوری و معذوری، آزادانہ زندہ رہنے کی خواہش، اپنی خواہش کی بے معنویت، نئی روشنی اور نئے خیالات کی رجائیت اور اس ضمن میں بھی تکنیک کے مسائل۔ غرض ایک پورے ناول کا مواد (اس افسانے میں ملتا ہے اور پھر بھی یہ افسانہ ہی ہے)، میں نے پہلے ہی عرض کردیا ہے کہ افسانے کی تعریف کے سلسلے میں وہ خیال کہ اس میں زندگی کا کوئی عکس ہی پیش ہوسکتا ہے کم از کم جوگندر پال کے افسانوں میں لایعنی ٹھہرتا ہے، بہرحال اس افسانے کو اردو کے چند بے حد معیاری افسانوں میں جگہ ملنی چاہئے۔ اس لئے بھی کہ ایک طرف تو اس کا رشتہ تیرھویں صدی عیسوی کی تمثیلی رومان "دی آؤل اینڈ دی نائیٹ اینگل" سے ملتا ہے تو دوسری طرف ہماری اپنی روایت میں منطق الطیر اور انوار سہیلی روایت کے احساس اور انفرادیت صلاحیت کی واضح چھاپ جوگندر پال کے افسانوں کے خصائص ہیں۔ جوگندر پال کے یہاں بہرحال دنجابت، ذات برادری کی بات بھی تواتر سے آتی رہی ہے۔ وہ ایسے غیرانسانی تصورات پر طنز کرتے جاتے ہیں لیکن ایسے طنز میں بھی اپنے انداز کو کھل کھیلنے کی اجازت نہیں دیتے:

"— تمہارا ہی بچہ ہے یا کم از کم اپنی ہی ذات میں کسی کا ہے، کسی کوے کی اولاد تو نہیں —" اس نے اپنی آواز ذرا آہستہ کرلی کہ آس پاس کوئی اس کے بول کی بھنک نہ پالے، پہلے ہی سب کو شکایت تھی کہ اس بڑھیا کو اپنی اونچی ذات پر بڑا مان ہے۔

"بس جی چپ رہو تم۔ بچے کی نیا ڈبو کر دم لوگی، پھر وہی موئے آدم کا کانا سا محاورہ! — ہمیں نیا ویا سے کیا لینا ہے؟ ہمارے پر سلامت رہیں۔" —

(کتھا ایک سیل کی)

"چڑے نے اپنی چڑیا سے کہا۔" کوے کی ذات کتنی بدتمیز ہوتی ہے! خواہ مخواہ شور مچا کر ہمیں پریشان کر رہے ہیں۔ جاہل! آوارہ! —"

"چھوڑو، ہمیں کیا؟ لڑائی بھی ان ہی سے کرنا چاہئے جو شریف اور مہذب ہوں....."

لیکن کوے کی کائیں کائیں کی جو فضا مرتب کی گئی ہے وہ بہت تیکنیکی ہے، ایک ناگ ان کے گھونسلے میں گھس آیا اور انڈوں کو تباہ و برباد کرچکا ہے، لیکن شریف اور مہذب افراد کو کمینوں اور رذیلوں کے مصائب اور آلام سے کیا بحث مسائل سے ان کا کیا علاقہ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے خیالات کی وضاحت کے لئے جوگندر پال تضاد کی تیکنیک کو ہیں بالکل اس طرح جس طرح ایلیٹ اپنی نظم "ویسٹ لینڈ" میں اپنے خیالات کا ڈھانچہ متوازی و متضاد ڈھانچے پر رکھ کر انہیں زیادہ پُراثر اور بامعنی بنادیتا ہے:

"ہاں، اُسے اپنے شوہر کے مقابلے میں ہمارے سیل کا کا پر زیادہ وشواش ہے —"

"ہاں کیونکہ وہ جب بھی یہاں آتی ہے، کاکا بیبی اس کا منتظر ہوتا ہے، گردوں اور کووں کا کیا بھروسہ" گِدوں اور کووں کے کردار کی سطحیت کے متوازی سیل کی پُروقار، اٹل، اور محکم شخصیت اور بھی واضح ہوجاتی ہے، ...

پیدوفانی کے تمام تر افسانے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں ۔ اسے افسانوی تاثر کہیے جو کسی افسانے کی سب سے بڑی غایت ہو سکتی ہے ، اور یہ غایت اگر حاصل ہو جائے تو فن بھی کامیاب ہے اور فنکار بھی ۔ ایسے تاثر کے تلاش کی ایک خوب صورت مثال جوگندر پال کے افسانے " چہار درویش " میں بھی ملتی ہے ۔ ہم کون ہیں ؟ ہم کیا ہیں ؟ ہم کہاں سے آئے ہیں ؟ ہم کیوں ہیں ؟ ہیں یا نہیں ؟ زندہ ہیں یا مُردہ ؟ زندگی کیا ہے ؟ موت کیا ہے ؟ وقت کیا ہے ؟ بلندی کیا ہے ؟ پستی کیا ہے ؟ ہماری منزل کیا ہے ؟ ہمیں کہاں پہنچنا ہے ؟ — اس افسانے کے تو ام میں یہ سارے امور یا مسائل داخل ہیں ۔ اگر سموئیل بکیٹ کا ڈراما " ویٹنگ فور گودو " ذہن میں ہو تو اس افسانے کی ساخت سمجھ میں آجاتی ہے ، گودو کون ہے ؟ کیا ہے ؟ کہاں ہے ؟ کس لئے ہے ؟ اس کا انتظار کیوں ہے ؟ اور نتیجہ یہ ہے کہ نہ کوئی آتا ہے نہ جاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ " چہار درویش " میں نہ کوئی اسٹرا گون ہے اور نہ یلادیمر ، لیکن اسٹراگون اور یلادیمر (گوگو اور دیدی) کی گفتگو کی فضا ضرور ہے ۔ اور ان کی گفتگو کا حاصل زندگی کی بے معنویت ہے ، اور اسی بے معنویت سے متعلق تاثر کی تلاش جوگندر پال کو بھی ہے ، اس افسانے کی " ہاں " میں " لیکن " کا پہلو موجود ہوتا ہے ، یعنی وہی تشکیک " ویٹنگ فور گودو " میں بھی ہے ۔ اور " چہار درویش " میں بھی ۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدید افسانے کے لئے رنگ و آہنگ کی مثال میں اس افسانے کو ایک نمایاں جگہ ملنی چاہئے ۔ آج ہماری زندگی تشکیک سے عبارت ہے ، کچھ بھی واضح نہیں ، ہر چیز مبہم ، ہر شے مشکوک ، ایسی صورت میں فن کار کی سوچ اور فکر کا بھی کیا حاصل ؟ " چہار درویش " کی ابتدا یوں ہوتی ہے :

" دماغ پر زور ڈال کر یاد کرو دوستو ، ہم یہاں آئے کیسے نہیں ، دماغ پر زور مت ڈالو ، ورنہ ٹوٹ جاؤ گے ۔ "

اور اختتام کی سطریں ہیں :

" اور ہم کہیں سے بھی نہیں آئے
اور ہمیں کہیں نہیں جانا ہے
ہاں ، کسی اور ہی کو جانا ہے
ہاں کوئی اور ہی آیا تھا "

اور اسی افسانے میں کہیں پر ہے :

" سوچو ، خوب سوچو
دماغ پر زور مت ڈالو ، ورنہ ——————
نہیں نہیں اس وقت تک سوچتے جاؤ جب تک ٹوٹ نہ جاؤ ۔
ہاں ، ٹوٹ کر ہم اپنے آپ وہاں جا پہنچیں جہاں ہمیں پہنچنا ہے
کہاں ؟
نامعلوم کہاں ، پر سوچتے رہو ، ٹوٹ جانے کے خوف سے سوچنا بند نہ کرو "

واقعی سوچنے کا حاصل کیا ہے ؟ یہی زندگی کی بے معنویت ، اقدار کا ٹوٹنا بکھرنا ، شدتِ احساس کرب ، احساس تنہائی ، زندگی کے بارے میں بالکل وہی تصورات جو کامیو کے مقالے " متھ آف سی سیفس " میں ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جوگندر پال ایسے تمام

مسائل کا حل چاہتے ہیں لیکن ان کا حل ہے کہاں؟ ایک طرف ہماری اتھاہ بھوک ہے، پیٹ کی بھوک اور جنسی بھوک اور دوسری طرف پھر ی تقاضے ہیں کچھ روحانی بھوک ہے، انسان ان دونوں کے درمیان معلق ہے، آخری نتیجے میں وہ محض اپنی نفسانی خواہشوں کا غلام ہے، وہ کسی کا دوست نہیں، وہ کہیں مخلص نہیں، وہ بے چہرگی کا شکار ہے، فریب کار ہے، اس کی ظاہری چمک دمک، اس کی پر فریب باطنی شخصیت کو چھپائے ہوئے ہے، ملمع کو کھرچ دیجئے اُس کی اصلیت آپ ہی بے نقاب ہو جائے گی، ایسا احساس جوگندر پال کے کئی افسانوں میں ملتا ہے، لیکن اس کا کامیاب اظہار ان کے افسانے "باہر کے بھیتر" میں ہوا ہے۔ "کتا" انسان کے طور اور کردار کی حقیقی تفسیر و تشریح کا ذریعہ بنا ہے، ایک اقتباس دیکھئے،

> "کتے کا پنجہ غلاظت کے ڈھیر میں لگاتار چل رہا ہے اور اس کی ناک بھول بھول کر اسے یقین دلا رہی ہے کہ اس ڈھیر میں کام و دہن کی ساری لذتیں میسر آجائیں گی اور اس کے منہ میں دریاؤں پانی بھر آیا ہے اور اپنے منہ میں' منہ میں تیرتے ہوئے وہ اپنے سارے دکھ درد بھول گیا ہے ... انسان کی ذات اپنی گندگی کو ہمیشہ بوجھل کیوں رکھنا چاہتی ہے؟ ۔ کہ اپنی گندگی سے بے خبر رہے! ..... یہ لوگ بار بار نہاتے ہیں اور اپنی کھال کو صاف کر کر کے چھیل چھیل کے اپنی پہچان کی ساری علامتیں کھو دیتے ہیں ..... انسان کے لباس کو پھاڑ دیا جائے گا تو اندر سے برآمد ہوتا ہے ـــ خالی پن! .... اپنے لباس کے اندر وہ آپ کہاں ہے؟ اپنے ذہن میں؟

انسان کے بارے میں جدید حسیت کی کیفیت دیکھئے۔

واضح ہوا کہ جوگندر پال کے افسانے خالص فکری ہیں اس اور ان کا مطالعہ اسی بنیاد پر ممکن ہے۔ یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ افسانے میں فکری عوامل کی کارکردگی کہاں تک مناسب ہے؟ کیا افسانے کا وہ ہلکا ہلکا انداز جو اس صنف کا کبھی مقدر رہا تھا مجروح نہیں ہوتا؟ پھر افسانے کے اچانک پن کا کیا ہوگا جو کبھی افسانے کے لئے ضروری سمجھا گیا تھا۔؟

میری رائے میں فنی لحاظ سے افسانے کے واضح خط و خال کچھ بھی نہیں، نہ اس کے لئے سپاٹ سیدھی سادی کہانی کی ضرورت ہے اور نہ ہی باضابطہ ماجرا کی۔ افسانے میں عضویاتی تکمیل کی تلاش بھی از کار رفتہ امر ہے۔ ورنہ جدید افسانوں کا تجزیہ محال ہوگا۔ جوگندر پال کے افسانوں میں کہانی پن کی تلاش بے معنی ہوگی، ان کے افسانوں کے منتشر اجزا دراصل خیالات کی دھوپ چھاؤں میں متحد ہوتے ہیں، ان کا اتحاد معنوی ہے، ظاہر ہے کہ ایسی معنوی تکمیل کے لئے روایتی اسلوب بیان شاید موضوع نہیں، یہی وجہ ہے کہ جوگندر پال کا افسانوی ماحول سطحی نظر میں افسانوی نہیں معلوم ہوتا۔ مجھے احساس ہے کہ وہ حضرات جو افسانے کو کومل، نازک، سیدھا سپاٹ فن سمجھتے آئے ہیں اُنھیں جوگندر پال کو پڑھ کر سخت مایوسی ہوگی لیکن جنھیں فلسفے کے ارتقائی سفر کی خبر ہوگی اور اس کے اعلیٰ منصب کا احساس ہوگا وہ بار بار اس کی طرف رجوع کریں گے۔

غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری پر وہاب اشرفی کا مبسوط اور بھرپور مقالہ آئندہ شمارہ میں ملاحظہ کریں۔

شاہین

آنکھوں میں پھول برف کے جب رنگ لائیں گے
تجھ کو بساطِ رقص پہ ہم لے ہی آئیں گے

پت جھڑ میں اتنے رنگ کھلے شاخ شاخ پر
آئی نہ جو بہار اسے بھول جائیں گے

کچھ یوں اُلٹ رہی ہے ہوا ابر کے ورق
تحریر کے نقوش بھی اب رہ نہ پائیں گے

ہے اور کس میں اتنی سکت ضبطِ حال کی
الزام آئیں گے تو مرے نام آئیں گے

تو بھی نوازشوں کے تسلسل کو توڑ دے
سوچوں کو اپنی ہم بھی سلیقہ سکھائیں گے

جلتی رہیں گی سارے کٹے کھیت میں جڑیں
ہم چاند کو دھوئیں ۔۔ کہاں دیکھ پائیں گے

شاہین اس سے قبل کہ ساحل تک آئے موج
ہم خود ہی اپنے نقشِ کفِ پا مٹائیں گے

تم تو وطن میں رہ کے بھی کہلائے اجنبی
اس اجنبی دیار میں کیوں آئے اجنبی

دریائے تند و تیز سے کشتی نکال کر
ساحل پہ اپنے عکس میں کھو جائے اجنبی

کیسا ہے تیرے سفر کی عطا اس سوال پر
کہنا بھی چاہے کچھ تو نہ کہہ پائے اجنبی

کھینچا ہے دھوپ نے خطِ تثلیث اس طرح
جسموں میں جذب ہو کے بھی ہیں سائے اجنبی

آندھی وہ تھی زمیں کے رشتے بھی کٹ گئے
اُکھڑی ہوئی جڑوں سے لپٹ جائے اجنبی

بارش ہوا کا زور گھنے جنگلوں کی شام
شاہین اپنی سانس بھی بن جائے اجنبی

...ی بلگرامی

...ایک ہلکی سی جنبش سے ٹوٹ سکتا ہوں
...ص کے ہاتھ لگاؤ میں آبگینہ ہوں

...اپنا دشتِ تمنّا ہرا بھرا کر لو
...آج ابر کی مانند آب دیدہ ہوں

...پہ تھا تو پہاڑوں کا ضعف تھا مجھ میں
...میں آیا تو میں روئی روئی جیسا ہوں

...پہ حسن کا چاہو تو جائزہ لے لو
...رے سامنے آئینہ بن کے ٹھہرا ہوں

...لگے ہیں تقاضے اب ان کی نرم لبوں کے
...آج پھول نہیں زخم زخم چنتا ہوں

...تے تا بہ افق پیچ بن گئے منظر
...ی جو لوٹے ذرّوں پہ پاؤں رکھا ہوں

...ن کے داغ چھپائے ذکی نہیں چھپتے
...اس ڈھونڈتا پیرہن دریدہ ہوں

عشرت ظفر

جز موسمِ سکوت ہے کیا پیش و پس یہاں
کب تھی صدائے جنبشِ برگِ نفس یہاں

اُڑ جا، کہ سب ہی کہنہ طلسموں میں قید ہیں
سمجھے گا کون رازِ شکستِ قفس یہاں

سیلِ ہوائے تند کبھی اس طرف بھی آ
اک شعلہ سو رہا ہے تہِ خار و خس یہاں

دل کی زمیں کو اس نے نہ جانے دیا تھا کیا
نکلے ہیں کتنے سنگِ سیہ اس برس یہاں

عشرت ہواؤں نے اسے پتھر بنا دیا
جس آئینے میں قید تھا عکسِ ہوس یہاں

احترام اسلام

سلگتے ریگزار میں کھلے گلاب دیکھتے رہو
تمہیں جو خواب ہی پسند ہیں تو خواب دیکھتے رہو

فریب خوردہ حسرتوں کو کامیاب دیکھتے رہو
یہ زندگی سراب ہی تو ہے سراب دیکھتے رہو

اُمیدِ مہرِ سحر کا تم کو اس قدر تو ہو نشہ
کہ دامنِ شبِ سیہ میں آفتاب دیکھتے رہو

جھلس رہے ہیں جسم و جاں مگر تسلیٔ حیات کو
تمام شعلہ پیکروں کو آب آب دیکھتے رہو

ملے گا کیسے کب کہاں یہ احترام زندگی کا
ہے ان سبھی سوالوں کا بس اک جواب دیکھتے رہو

مظفؔر وارثی

○

کس قدر محتاط جینے کا چلن ہم کو ملا
داغ جیسی روح، چادر سا بدن ہم کو ملا

نصب ہوتے ہیں سرہانے آئے دن کتبے نئے
خواہشوں کی قبر، خوابوں کا کفن ہم کو ملا

تیز جھونکوں کی ردا خوشبو کو پہنائی گئی
جو برہنہ کر گیا وہ پیرہن ہم کو ملا

روشنی کے پھول بام و در کے ہونٹوں پر کھلے
اور گل ہو کر چراغِ انجمن ہم کو ملا

خیر مقدم کو ہمارے، منتظر ہیں وسعتیں
گھر بگولہ سا، بیاباں سا وطن ہم کو ملا

دھوپ کا خیمہ لگائیں، خاک سے سیراب ہوں
بے حسوں کے درمیاں جینے کا فن ہم کو ملا

ہم مظفرؔ، سوچ کے سیاح ہیں، شاعر نہیں
کائناتِ ذہن کا آوارہ پن ہم کو ملا

فہمیدہ ریاض

سجّاد ظہیر سے دو مُلاقاتیں

ان کے بال سفید جھک تھے۔ وہ بہت خوش شکل آدمی تھے اور کم گو۔ گذشتہ برس میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لندن آئے ہوئے تھے۔ جب میں ان کے پاس پہنچی تو وہ کھانا کھا رہے تھے۔

فہمیدہ ریاض ــــــ اچھا ــــــ آپ پاکستانی ہیں۔

"جی ہاں میں پاکستانی شاعرہ ہوں۔" میں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا پھر میں جوش میں آگئی۔ آخر میں اُن سے کچھ سوال پوچھنے اتنی دور سے چل کر آئی تھی۔

"میں آپ سے آپ کی پارٹی یعنی C.P.I. کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں آخر حکومتِ ہند سے اس پارٹی کا کس قسم کا گٹھ جوڑ ہے۔؟"

"کیا آپ کمیونسٹ ہیں؟" انھوں نے نظریں جھکائے ہوئے پوچھا۔

اتنے ڈائرکٹ سوال سے میں ذرا گھبرا گئی۔ بالآخر میرا ارادہ وطن واپس جانے کا بھی تھا اور وہ بھی بہت جلد۔ لہٰذا اس سوال کو میں نے گول کر دیا۔ ایک اصل النسل پاکستانی نوجوان کے نمایندے کی حیثیت سے میں نے کہا۔

"میں...... ؟ میں تو محض مارکسزم کی ایک طالب علم ہوں۔" کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس طرح ہمارے سارے جوشیلے لیفٹسٹ کام کرنے کی ذمہ داری سے صاف بچ سکتے ہیں۔

"اچھا۔ آپ کھانا تو کھائیے۔" وہ مُسکرائے۔

میں اُن کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گئی۔

"یہ سانبھر لیجئے۔ ہماری بیٹی نجمہ نے بہت اچھا پکایا ہے۔"

سانبھر بہت مزے کا تھا۔ سجاد ظہیر مجھ سے بزرگوں کا سا برتاؤ کر رہے تھے۔ لیکن میں تو حملے کے موڈ میں تھی۔

"ہم آپ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے اُنھیں کھانا کھانے کے بعد اطلاع دی خلاف توقع وہ اس بات پر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے:

جہاں تک ہم پر حملے کی بات ہے، وہ تو نئی نہیں۔ گذشتہ تیس[۳۰]، چالیس[۴۰] برس سے

یہ حملہ جاری ہے۔ لیکن آپ لوگوں سے تو ہماری امیدیں وابستہ ہیں۔"

اب وہ پھر خطرناک باتیں کرنے لگے تھے۔ بھلا کس قسم کی اُمیدیں تھیں اُن کو ہم سے۔ کہیں وہ یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ سیاسی فلسفے کے بجائے ایسے طالب علم پارٹی وغیرہ بنائیں اور آدھی عمر انڈرگراؤنڈ میں۔ چھپتے چھپاتے اور قید خانے کی کوٹھریوں میں بسر کریں۔ لہٰذا میں نے بات کا رُخ فوراً بدلا۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ اندرا گاندھی کی بورژوا حکومت سے سمجھوتہ کر کے آپ نے مارکسزم لینن ازم کے اصولوں سے غداری کی ہے۔"

وہ بہار کا خوشگوار دن تھا۔ اب بھی مجھے یاد ہے، چاروں طرف جھلملاتی ہوئی دھوپ پھیلی تھی۔ سجاد ظہیر اپنی بیٹی نجمہ اور داماد علی باقر صاحب کے گھر ٹھہرے تھے۔ اس وقت ہم ان کے گول کمرے میں بیٹھے یہ باتیں کر رہے تھے۔ باہر اُن کے چھوٹے سے باغیچے میں ڈھیروں گلاب کھل رہے تھے۔

"ہمیں آپ کی نیت پر شک ہے۔ آپ لبرل ہیں۔" میں نے اُن سے کہا۔

سجاد ظہیر تھوڑی دیر تک مجھے دیکھتے رہے۔ پھر دفعتاً انھوں نے اشتیاق سے پوچھا:

"مجھے کچھ اُس طرف کی باتیں بتاؤ گی۔؟"

اب وہ پھر "اُس طرف کی باتیں" پوچھ رہے تھے پوائنٹ یہ نہیں تھا۔ میں نے اُن سے عجلت میں کہا۔

"پوائنٹ یہ نہیں ہے۔" پھر مجھے ایک بات اور یاد آگئی۔ میں نے کہا۔

"اُس طرف تو یہ خیال ہے کہ آپ ایجنٹ ہیں۔"

"کس کے ایجنٹ؟" انھوں نے ضبط سے پوچھا۔

میں نے محسوس کیا کہ سجاد ظہیر کی نظر میں ہماری طرف کے لیفٹسٹ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ نہ تو آواز بلند کرتے تھے نہ ابھی تک انھوں نے میز پر مکا مارا تھا۔

"سامراج کے ایجنٹ۔" میں نے ذرا اطمینان سے کہا مشکل یہ تھی کہ اس آدمی نے کام بہت کیا تھا۔

سجاد ظہیر نے سامنے میز پر رکھی ہوئی کتاب اٹھائی۔ "پگھلا نیلم"۔ اور پڑھنے لگے:۔

"— وہ ہماری بچی۔ ہمارے پاس سوتی تھی، اُس کی ماں، کہیں چلی گئی تھی۔ اُسے میرے پاس لٹا کر۔
وہ میرے پاس سو رہی تھی
تروتازہ — لمبی لمبی سانسیں لیتی ہوئی
اور مجھے ایسا لگتا تھا۔
جیسے زندگی اپنی ساری خوشیاں میرے سرہانے رکھ کر بھول گئی ہو۔"

یہ اکتوبر ۱۹۷۳ء کی بات ہے۔

جس دن ہم لوگ سجاد ظہیر صاحب سے دوسری بار ملے، اس کے پانچ دن بعد اُن کی موت کی خبر ملی۔ اس ملاقات میں ہمارے ساتھ کچھ اور بھی لڑکے لڑکیاں تھیں۔ سجاد ظہیر اس بار اچانک بہت بوڑھے اور تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہم لوگ دیر سے اُن کا انتظار کر رہے تھے جیسے ہی وہ ہمیں ملے۔ ہم نے "حملہ" شروع کر دیا۔

"کیا کنٹری بیوشن ہے آپ کا۔ ترقی پسند ادب۔ یہ کس چڑیا کا نام ہے۔؟" میرے ایک ساتھی نے چپکے سے مجھ سے پوچھا۔ اس بیچارے کو اردو پڑھنی نہیں آتی تھی۔

"ادب!! —" میرے ساتھ کی دوسری لڑکی۔ جو اسکول آف اکنامکس میں پڑھ رہی تھی۔ صوفے پر دراز ہو گئی۔ "بورژوا ادب۔ ہم ادب کو انقلاب کے لئے بالکل بیکار سمجھتے ہیں۔"

"آپ کیا کرتے ہیں۔؟ اخبار نکالتے ہیں۔ اُردو کا اخبار"
ایک نوجوان انقلابی نے بہ مشکل ہنسی ضبط کی۔
"۔ ایک ہی بات ۔ ایک ہی بات ۔"
"نکسل باڑی ۔ نکسل باڑی ۔"
سب نے نعرہ لگایا۔
"لیکن وہ تو ہندوستان میں ہے ۔ !" سجاد ظہیر پہلی بار مسکرائے
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ ؟" ہم میں سے ایک نے کہا
"ایک بار نکسلایٹ حکومت ہند کا تختہ اُلٹ دے پھر دیکھئے۔"
"پھر کیا ہوگا ؟" ۔ انھوں نے شرارت سے پوچھا۔
ہم لوگوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔
پھر کسی نے کہا:
"پھر پاکستان میں اپنے آپ انقلاب آجائے گا۔"
یہ سُن کر ہم اپنے ساتھی کی دور اندیشی پر بے حد خوش ہوئے۔ لیکن یہ موقع ہرگز ایسا نہ تھا کہ ہم کھلم کھلا داد و تحسین کا نذرانہ پیش کرتے ۔ اس قسم کی باتیں خطرناک بھی ہو سکتی تھیں ہم خدانخواستہ کوئی اینٹی اسٹیٹ ایلی مینٹس تھوڑی تھے ۔ خود ہمارے ساتھی کو ہماری ہچکچاہٹ کا احساس ہوا ۔ اُس نے تسلی دینے والے لہجے میں کہا ۔
"انقلاب آجائے گا ۔ کچھ سمجھے آپ لوگ ۔ ہر چیز میں انقلاب آجائے گا ۔ زمین داروں میں انقلاب آجائے گا ۔ سرمایہ داروں میں انقلاب آجائے گا ۔ بیوروکریسی میں انقلاب آجائے گا ۔ فوج میں اور حکومت میں انقلاب آجائے گا ۔ اور پھر ـــ پھر ہم سب ہنسی خوشی رہنے لگیں گے ۔ اس بات سے ہرگز کسی کو نقصان پہنچنے کا یا خوش ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔"
اس سے ہماری بے حد ڈھارس بندھی ۔ سب نے نعرہ لگایا۔
"انقلاب زندہ باد ۔ ہندوستان کی بورژوا حکومت مُردہ باد ۔ ہندو سامراج مُردہ باد ۔"

ہم میں سے ایک نے گانا شروع کیا۔
"آج ہندیاں جنگ دی گل کیتی انکھ ہوئی حیران حیرانیاں دی
مہاراج ایہہ کھیڈ تلوار دی اے ۔ جنگ کھیڈ نئیں ہوندی ننانیاں دی"
سجاد ظہیر اپنی عینک کے شیشے صاف کرتے رہے ۔ پھر انھوں نے اپنا بوڑھا چہرہ اُٹھایا۔
"تقسیم کے بعد ہماری پارٹی نے فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان ابھی آزاد نہیں ہوا ہے اور ملک مسلح انقلاب کے لئے تیار ہے یہی ہماری غلطی تھی ۔ یہ سچ ہے کہ ہم سے غلطیاں ہوئی ہیں۔"
"کیا آپ شیعہ ہیں ؟" ہمارے ایک ساتھی نے ابرو اٹھاکر پوچھا ۔
سجاد ظہیر تھوڑی دیر تک حیرت زدہ رہے ۔ پھر کھلکھلاکر ہنس پڑے ۔ اب ان کے چہرے سے اُداسی کا بادل چھٹ گیا تھا وہ خوش طبعی سے دیر تک ہنستے رہے ۔ پھر کہنے لگے ۔
"تو پھر کیجئے آپ لوگ کچھ کام ۔ !"
"کام ! ۔ آپ کام کو کہتے ہیں ۔" ہمارے ایک ساتھی نے پتلی سی گردن گھماکر کہا ۔ بمشکل ڈائی ٹنگ کرنے کے بعد وہ اس قابل ہوا تھا کہ اٹلین سوٹ میں بچ سکے ۔ اب وہ بے حد دُبلا اور سرکنڈے کی مانند تھا ۔ وہ صوفے سے لہراتا ہوا اٹھا اور اس نے اپنا پتلا سا مُکہ فضا میں لہرایا۔
"نکسل باڑی کے خون سے لتھڑی ہوئی کہانی ـــ آہ ـ"
پھر وہ دھم سے صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔
اس کے بعد سجاد ظہیر سے مزید باتیں فضول تھیں ۔ لہٰذا ہم نے اُن سے کہا: "آپ سامراجی ایجنٹ ہیں ۔"
"ایسا خیال کیوں ہوتا ہے آپ کو ؟" سجاد ظہیر نے تھکی ہوئی آواز میں کہا ۔ "آپ کی ناکامی سے دیکھ لیجئے ۔ ہندوستان میں ابھی تک انقلاب نہیں آیا ۔ آیا کہیں انقلاب ؟" ہم نے کہا ـــ
پھر ہم سب نعرے لگاتے ہوئے اس بوڑھے سامراجی ایجنٹ کو چھوڑ کر باہر نکل آئے ۔

ـــــ ـــــ ـــــ

ماجد الباقری

○

جب چمکتی دھوپ میں سوچوں کے پَر جلنے لگے
غول امیدوں کے سطحِ آب پر چلنے لگے

رُت بدلنے کی خبر سے فاصلے کم ہو گئے
کاغذوں کے پیڑ گھر میں پھولنے پھلنے لگے

صرف تقریروں سے بھر کر پیٹ اخبارات کا
سُرخیوں کو سونگھ کر مضمون کچھ پلنے لگے

خون جسموں سے نکل کر بوتلوں میں آ گیا
کانچ کی بھٹی میں شیشے کے بدن ڈھلنے لگے

بے مسافر گاڑیوں سے جب نکلتے تھے ٹکٹ
کچھ مسافر بھی سفر میں بے ٹکٹ چلنے لگے

کون سی رُت میں ملیں گے اب معانی کے ثمر
لفظ کے پودے بھری برسات میں گلنے لگے

بھیڑ اتنی ہے کہ ماجد مل نہیں سکتا سراغ
کس طرف جانا تھا ہم کو کس طرف چلنے لگے

الطاف فاطمہ

اگیا بیتال

گوگو کے کاؤنٹر کے ساتھ بے حد اونچے اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اور گرم گرم کافی کے خوشبودار گھونٹ لیتے ہوئے حلیم کو کچھ عجیب سا احساس ہونے لگا۔ جیسے اس کے بلے اور بیحد چوڑے شانوں والے کزن کو اس وقت کسی کا بے چینی سے انتظار ہے اور وہ جو اس کو اس وقت یوں گھیر کر بیٹھا ہوا اپنی جیب سے کافی پلوا رہا ہے تو اس لئے نہیں کہ اس کو اس کی ذات سے دلچسپی ہے اور وہ اس کی مدارات کرنا چاہتا ہے بلکہ اس کو کسی کا شدت سے انتظار ہے اور وہ یہاں بیٹھ کر تنہا وقت گذاری کے خیال سے خوف زدہ ہے۔

تب اچانک ہی حلیم کو اپنے کزن اور اس کی پلائی ہوئی کافی سے کراہت سی آنے لگی اور وہ سوچنے لگا عجیب کمینہ ہے یہ رضی بھی جو اتنے چکر ڈال کر مجھے یہاں لایا ہے اور گھیر کر بیٹھا ہوا ہے۔ سیدھی طرح کہہ دیتا کہ مجھے کسی کا انتظار کرنا ہے اور تمہاری کمپنی درکار ہے اس انکشاف کے ساتھ ہی اس کا دل بوجھل ہونے لگا تھا۔

رضی کے اندر جتنی سمائی اور گنجائش تھی اس کے اندر شاید اتنی ہی کمی تھی۔ چنانچہ اب وہ رضی پر یہ واضح کردینے کے لئے بے چین تھا کہ میں نے تمہارا مقصد تاڑ لیا ہے اور یہ کہ میں خوب جانتا ہوں کہ تم مجھے کیوں پکڑے بیٹھے ہو۔

"اب بھی وہ تمہارا ملاقاتی کب آئے گا۔ یار اب تو گیارہ بجنے والے ہیں۔" حلیم نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔

رضی کا چہرہ ایک دم فق ہوگیا، اس کے کانوں کی لویں سرخ ہوگئیں۔ پھر بھی اس نے بڑے حوصلے سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "میرا ملاقاتی آچکا ہے اور وہ یہ رہا۔"

"میں ہرگز تمہارا وہ ملاقاتی نہیں ہوں۔" حلیم کا پارہ اچھا خاصا اوپر چڑھ چکا تھا

"یار گرم نہ ہو۔ ایک کون (CONE) کھالے تو ٹھنڈا پڑجائے گا۔"

قبل اس کے کہ حلیم اس کو یہ لکچر دے کہ گرم چیز کے بعد ٹھنڈی چیز کھانے سے دانتوں میں ٹیس پڑجاتی ہے، رضی نے بوائے کو اشارے سے بلایا "اے لڑکا! دو کون۔"

اس نے دو انگلیاں اس کے سامنے نچائیں۔

لڑکا اس کی دو انگلیوں کو دیکھ کر دانت نکال کر ہنسا اور تھالی ہاتھ میں اٹھائے جھاڑن کندھے پر ڈالے مشین کے پاس جا کھڑا ہوا، لیکن حلیم نے محسوس کیا جیسے وہ کون بنوانے سے زیادہ سڑک پر آتے جاتے راہ گیروں کو بہ غور دیکھنے میں مصروف ہے۔

اچانک کسی کو دیکھ کر وہ آگے بڑھا، پیک کراس تک گیا اور پھر بھاگ کر واپس مشین پر آ کھڑا ہوا۔ کون تیار ہو چکے تھے۔ ان کو کاغذی نیپکن میں لپیٹے ہوئے وہ آیا اور کون ان کے ہاتھوں میں تھما دیئے۔ پھر ایک لحظے کو وہ رُکا۔ اس نے دو انگلیاں اوپر اٹھا کر کہا۔ "صاب جی دو کون۔"

رضی نے اپنے حساب وں آنکھ کے بڑے خفیف اشارے سے اُسے باہر جانے کے کہا تھا مگر حلیم نے وہ بھی تاڑ لیا تھا۔

رضی اپنا کون ہاتھ میں لئے لئے باہر نکل گیا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ رضی لڑکے کی آنکھ کے اشارے پر چلتا ہوا جین اینڈ الرٹن کی دکان کی طرف چلا گیا ہے۔ حلیم بھی اپنا کون اُٹھا کر باہر نکل آیا اور ٹہلتا ہوا اس طرف چلا گیا۔ وہ رضی کو بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کی حرکات وسکنات کا مطلب نکال رہا ہے۔

رضی کھمبے کی آڑ میں کھڑا ہوا کسی سے زیرلب باتیں کر رہا تھا کہ حلیم نے ٹارچ نکال کر اس شخص پر روشنی ڈالی جو بالکل ہی اندھیرے میں کھڑا تھا۔ ایک بہت ہی معمولی قد اور منحنی سے جثے والا اوسط درجے کا شخص رضی سے ہم کلام تھا۔ بھلا رضی کا اور اس کا کیا جوڑ ہے۔ حلیم دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ رضی اس کو دیکھ کر اس کی طرف آ گیا۔

"یار یہ کیا حرکت تھی۔ مجھے کاؤنٹر کے حوالے کر کے تم نکل آئے۔"

"بات سنو!" رضی نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر اور پرس نکال کر اس نے دس دس روپے کے دو نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

"بل چکا دو۔"

"تم کہاں چلے؟"

"میں ذرا جا رہا ہوں ______ اچھا کل ملاقات ہو گی"

"مگر یہ بیس روپے تو زیادہ ہوں گے۔"

کل حساب ہو جائے گا۔"

رضی ذرا آگے بڑھ کر اس شخص کے ساتھ ہو لیا جس نے اس کو اپنے اسکوٹر پر بٹھا لیا تھا، اسکوٹر اسٹارٹ ہوا، ا ہوا ہو گیا۔

حلیم جز بز کھڑا بل دے رہا تھا کہ وہی لڑکا آیا۔ ا حلیم کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی دی اور کہا "صاب رضی صا کی گاڑی گھر چھوڑنا ہے۔"

مگر یہ چابی اس لڑکے کے ہاتھ میں کب آئی۔ سار راستے وہ سوچتا رہا۔

گاڑی رضی کے گیراج میں کھڑی کر کے وہ باہر نکلا تو ٹیکسی رکشا نظر ہی نہ آیا۔ پھر اسے پیدل ہی مارچ کرنا پڑ تو چاہ رہا تھا۔ گاڑی گھر لے جائے مگر اس وقت وہ حد زیادہ بیزار ہو رہا تھا۔ گھر پہونچتے پہونچتے ایک بج گیا امی جی برآمدے کے تخت پر رضائی اوڑھے کتھا چاٹ رہی تھیں۔

"آپ اب تک جاگ رہی ہیں۔!"

"ہاں تم ایک ایک بجے تک گھومتے رہو، پھر ب اب تک جاگ رہی ہیں!" امی جی بھری بیٹھی تھیں پڑیں۔ "بھلا اتنے غضب کی سردی میں کہاں گھو

"وہ رضی ....."

"ہزار مرتبہ بتایا ہے کہ رضی کا تمہارا کیا جوڑ ہے وہ بڑے آدمی ہیں۔"

امی جی کا غصہ ٹھنڈا کرنے وہ ان ہی کے پاس بیٹھ گیا۔
"امی جی آج رضی نے عجیب حرکت کی۔"
"کیا؟" امی جی کو رضی کی کسی حرکت سے بھی دلچسپی نہ تھی اور وہ اس کی کوئی حرکت سننے کے موڈ میں نہ تھیں، لیکن جب وہ ساری بات بتا چکا تو ایک دم ہی ان کی دلچسپی عود کر آئی۔ "اچھا تو وہ سور اب رضی کو گانٹھ رہا ہے!"
"آپ جانتی ہیں اُسے؟" حلیم ہونق رہ گیا۔
"اے لو وہ نجم الدین کا سالا ہے۔"
مگر حلیم نجم الدین سے بھی واقف نہ تھا۔ رشتے ناطے اس کو آتے ہی نہ تھے۔
تو یہ پہلی مرتبہ تھی۔ وہ حلیم کے نوٹس میں آیا اور حلیم نے اس کو دیکھا۔ پھر تو وہ اس کو دیکھتا ہی چلا گیا۔ پھر اس دن جب ظفر نے اُسے بتایا کہ بلی آنکھوں والا وہ شخص اس سے خوف زدہ ہے تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ حیرت سے زیادہ اُسے صدمہ ہوا تھا۔ اور بات بھی ٹھیک ہے کہ آپ کسی کو اپنے ذہن میں فن کار کا درجہ دیتے رہیں اور اسی نظر اور دلچسپی سے اس کو اپنے عمل میں مصروف دیکھ کر وہی حظ محسوس کریں جو کسی فنکار کو اس کے تخلیقی عمل میں مصروف دیکھ کر ہوتا ہے۔ اور پھر ایک دم ہی آپ پر یہ انکشاف ہو کہ وہ تو آپ سے ڈرتا ہے اور آپ کو اپنی ذات کے لئے خطرہ محسوس کرتا ہے تو آپ کو کیسا لگے۔
بلکہ اسے تو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ اس نے اس کو فن کار جیسی مبہم اور مشکوک اصطلاح اور نام سے یاد کیا۔ بات یہ ہے کہ فن کاروں کی بھی تو اس کی نظر میں دو قسمیں تھیں یعنی وہ جو بڑی آسانی سے ہر کسی کے ہاتھ بک جاتے ہیں، جن کا عمل اور تخلیق مصلحت کا شکار اور جنس بازار بن کر رہ جاتی ہے، جو اپنے کمال سے PROSTITUTIION کرواتے ہیں، دوسروں کے خیالات اور فکر کو بڑی خوش اسلوبی سے اسمگل کرتے ہیں اور جن کا پندار ان کو زمین پر پاؤں دھرنے نہیں دیتا۔ فن کار کی دوسری قسم کی تعریف حلیم کے ذہن میں بہت مختصر تھی اور وہ یہ کہ وہ بے نیاز ہوتا ہے تو چنانچہ اس نے اس کو دوسری قسم کے فن کاروں کے زمرے میں شمار کیا ہوا تھا۔
وہ اس معمولی نظر انداز کئے جانے والے پھرتیلے شخص کا یوں احترام کرتا تھا کہ وہ اپنے فن اور پیشے کا احترام کرتا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کرتا تھا اس کا فن ہی بن چکا تھا۔ اور اس کے تقدس کو برقرار رکھتا تھا۔ اس جیسا کام کرنے والے بے نیاز ہو ہی نہیں سکتے لیکن اس نے اس کو فن بنا کر اپنے اندر بے نیازی پیدا کرلی تھی یا یوں کہئے کہ اس کی بے نیازی نے اس کام کو فن بنا دیا تھا۔
وہ ایک ایسی سوسائٹی کا کارساز تھا جو ایک رات میں سرمایہ دار، ارسٹوکریٹ اور بورژوا بننے کی آرزو مند ہوتی ہے، اور جو سب کچھ بننے سے پہلے امریکی اور اطالوی طرز پر بنے ایرکنڈیشنڈ بنگلوں میں رہنا ہی اپنی ترقی کی پہلی منزل سمجھتی ہے۔ کار لے لیتی ہے تو پھر کہنا شروع کر دیتی ہے کہ وہ بھی کوئی گھر ہے کہ جہاں فرج نہ ہو، ٹی۔ وی نہ ہو، واشنگ مشین نہ ہو اور پھر بغیر کوکنگ رینج کے بھی کوئی بھلا آدمی کھانا پکا سکتا ہے۔ اتنی بہت سی ضرورتوں کے حصول کے لئے لازماً اس جیسے ہی خاموش، چابک دست، باوفا مددگار کی ضرورت ہے تو چنانچہ وہ ایسے ہی انسانوں کی ضرورت بن چکا تھا۔
لیکن اس کی اس چھوٹی سی صفت کے خاطر تو اس نے فن کار کا درجہ نہیں دیا ہوا تھا۔ یہ تو اس کی چابک دستی اور اپنے کام میں سنجیدہ انہماک اور اپنی نجی زندگی میں بے نیازی کا مدبر تھا جس نے اسے اس کی نظر میں بڑا فن کار بنا دیا تھا، جس کی ہر سوچ اور ہر تعلق اپنے عمل اور تخلیق سے ہی ہوتا ہے۔
ایک دن جب وہ ظفر اور رضی کی ہمراہی میں ٹی ہاؤس

سے نکل رہا تھا تو اُسے اچانک ہی محسوس ہونے لگا تھا کہ رضی ان دونوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ وہ بار بار اپنے دائیں بائیں اور سامنے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ شخص دہلی ہاؤس کے قریب ان کی طرف پشت کئے اپنے اسکوٹر کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

رضی نے دو ایک مرتبہ کھنکار کر گلا صاف کیا، اپنے دائیں بائیں حلیم اور ظفر کو دیکھا اور پھر ایک دم ہی رکھائی سے ان سے اجازت لے کر ٹہلتا ہوا اس طرف کو چل دیا۔ وہ ظاہر یہ کر رہا تھا کہ وہ نیلے گنبد کی طرف جائے گا۔

ظفر نے حلیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "یار یہ رضی کا دماغ خراب ہے۔ کیا گھیر گھار کر ہمیں لا کر یہاں بٹھایا۔ پھر ہمارے ہی ساتھ آگے جانے کا پروگرام تھا۔ اور اب یوں ABRUPTLY ہم سے الگ ہو گیا۔"

"تمہارا خیال غلط ہے۔ رضی کا پروگرام ہمارے ساتھ یہیں تک کا تھا۔"

"مگر وہ تو یہی کہہ کر ......"

حلیم نے بات کاٹ دی۔ "دیکھو یہاں کے بعد اس کا پروگرام وہ تھا۔"

"کیا؟"

"اِدھر آجاؤ پان والے کی دکان پر۔"

دونوں ہٹ کر پان والے کی دکان کی طرف ہو گئے تب حلیم نے اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو رضی کا پروگرام وہ رہا۔" بلی آنکھوں والا آدمی رضی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر رضی اس کے اسکوٹر پر پیچھے بیٹھ گیا اور دونوں ہوا ہو گئے۔

"مجھے تم اس واسطے رضی ہمیں یہاں اپنی گاڑی میں لانے کے بجائے ٹیکسی میں لایا تھا۔"

ظفر ایک دم کسی خیال میں کھو گیا تھا۔ "یار حلیم تم نے دیکھا ہے اس شخص کو کبھی پہلے؟"

"ہاں ہاں ــ کیوں نہیں۔"

"یہ وہی ہے نا بلی آنکھوں والا شخص۔"

"بالکل۔ کیوں کیا بات ہے؟" حلیم نے پان کا اپنے اور ظفر کے درمیان تقسیم کرتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ کچھ پُراسرار سا آدمی نہیں ہے۔؟"

"چنگا بھلا تو آدمی ہے۔ ایک ناک، دو کان، دو ... تمہارا کیا خیال ہے کچھ جن وِن کی قسم سے ہے۔؟"

"ارے نہیں، میں نے یہ دیکھا ہے اس کا تعارف جس سے بھی ہوتا ہے وہ بھی پُراسرار ہو جاتا ہے۔"

"تم نے اس کو کتنے لوگوں سے ملتے دیکھا ہے؟"

"میں نے! ارے میں نے اس کو بہت لوگوں سے متعلق ہے۔ پہلی مرتبہ میں نے اسے جب دیکھا تھا جب خالو جی تم یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنے خالو جی تم جانو بڑے اچھے آدمی ہیں۔ تگ و دو، جدوجہد اور حالات بدلنے کے قائل، خوب سے خوب تر کی جستجو کے خوگر۔ وہ جب پہلے پہل ہمارے ہاں آئے تھے تو ان کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرنے کا تھا۔ چنگے بھلے آدمی تھے کہ ان کے کسی عزیز نے ان کا تعارف اس سے کروا دیا۔ پھر یہ ان سے ملنے وقتاً فوقتاً آنے لگا اور خالو جی ایک دم پُراسرار ہوتے چلے گئے۔"

"پھر اب خالو جی کیا کر رہے ہیں ان دنوں؟"

"خالو جی؟ یہ تو کچھ پتہ نہیں چلتا ہے۔ سنا ہے زمینیں خریدی ہیں۔ بڑی شان سے رہتے ہیں۔ کار ہے، بنگلہ اور بنگلے کے کل لوازمات......"

حلیم نے ظفر کی بات کاٹ دی۔ "یار ابو جان کہتے ہیں یہ کار، بنگلہ اور اس کے جملہ لوازمات ہمارے معاشرے کے جسم کے ناسور ہیں، اور اس کے سارے وجود کو گلائے دیتے ہیں میں سوچتا ہوں ابا جان یہ سب OUT OF FRUSTRATION کہتے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"ہوں۔اوں۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا حلیمؔ میں تو یہ
نا ہوں کہ خالو جی ان دنوں ایبٹ آباد میں گھر بنا رہے
ردشور سے۔ اور وہ اب ہاشما کو خاطر میں نہیں لاتے
سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس سے بھی کٹ گئے ہیں۔"

"ایک بات تو بتاؤ ظفر!"

"کیا؟"

"یہ بلی آنکھوں والا ذی شان کا بھی تو واقف ہوا
تھا۔"

"واقف! میں کہتا ہوں گاڑھی چھنتی تھی۔"

"خیر یہ تو ظاہر ہے کہ اگر یہ کسی کا واقف ہوتا ہے تو
خفیہ اور گاڑھی ہی چھنتی ہے اس کی۔"

"ہاں اور پھر ذی شان ایک دم پُراسرار ہوتا چلا گیا۔"

"اور جوں جوں پُراسرار ہو گیا اسی قدر اونچا ہوتا گیا۔"
ہنسا۔

"ہاں اور معلوم ہے اب آتا ہے پٹھا تو کوٹھی میں ٹھہرتا
اپنے کو تو پہچانتا ہی نہیں۔"

"پہچانتا تو وہ اس کو بھی نہیں ہے۔"

"یار یہ عجیب شخص ہے۔" حلیم کہنے لگا۔ "کبھی کبھی مجھے یوں
ہے کہ یہ PARASITE ہے۔ ایک ٹھٹھرا ہوا درخت
کی جڑ میں سے ایک بیل سر اٹھاتی ہے، اپنی وائرس کو دھیرے
سے اس کے وجود میں تیراتی ہے۔ اپنی خوراک حاصل کرتی
ر پھر نہ جانے کہاں کی کہاں جاتی ہے اور یہ اپنی جگہ پر
کا توں کھڑا رہتا ہے۔"

ظفر کہنے لگا۔ ایک مرتبہ میں ذیشان کے ساتھ اس
ر گیا تھا۔"

"واقعی! کیسے؟"

"ہاں۔ بس اتفاق ہو گیا تھا۔ یہ شخص مجھے دیکھ کر
نا جز بز ہوا۔ یار میں تو حیران رہ گیا۔ اندرونِ شہر میں گلی مد

گلی ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ یہ اس میں گذشتہ بیس سال سے
رہ رہا ہے، مجھے تو تعجب یہ ہے کہ یہ اپنی LIVING
CONDITION سے FED UP بھی نہیں ہوتا۔"

"اس کو تبدیلی سے سخت قسم کی نفرت معلوم ہوتی ہے۔"
حلیم پھر ہنس پڑا۔ "سنا ہے برسوں سے ایک دفتر میں جونیئر
کلرک لگا ہوا ہے۔ یہی پرانا سڑا ہوا اسکوٹر چلا رہا ہے۔
ایک ماں ہے۔ تین چار بہنیں ہیں، ایک بھائی ہے۔ اس کی
زندگی کی چھوٹی سی کشتی میں ضرورت سے زیادہ مسافر سوار ہیں
نہ کوئی چڑھتا ہے اور نہ اُترتا ہے۔"

"اس نے تو شادی بھی نہیں کی ہوئی ہے شاید۔" ظفر نے
پان والے سے دو مزید پانوں کی فرمائش کی۔

"توبہ کرو۔ جو اتنی جان جوکھم کے کام کرے گا اس کو
شادی بیاہ سے کیا سروکار ہے۔"

"اس کو فائدہ کیا مل رہا ہے اتنے خطرناک کام کر کے
یہ تعجب ہے۔؟

ایک بات سنو۔ یہ ہم اتنی دیر سے اسی کے متعلق باتیں
کیوں کئے جا رہے ہیں۔ کہیں یہ ہمارے اعصاب پر تو سوار نہیں
ہو رہا ہے۔؟"

"یار حلیم! تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو جاتے ہو؟"
نہیں یہ بات نہیں ظفر، یہ عجیب آدمی ہے۔ کہتے ہیں
مجذوب لوگ اگر کسی پر نظر ڈال دیتے ہیں تو وہ اپنے آپے میں
نہیں رہتا۔ میں یہ دیکھتا ہوں اس کی بھی نظر جس پر پڑ جاتی
ہے، وہ اسی عالم میں چلا جاتا ہے۔ تم دیکھتے نہیں ہو یہ شخص
جس کسی پر نظر ڈالتا ہے۔"

"چھوڑو۔" ظفر نے بات کاٹی۔ "یہ اسی پر نظر ڈالتا ہے
جو اس کی توجہ کا طالب ہوتا ہے۔"

"چلو چلتے ہیں۔ ہم فضول وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"حلیم میری مانو، یہ بھی شہر کے ایک ہزار ایک آدمیوں میں

ایک ہے۔ تم فضول ہی اس کو IMPORTANCE دے رہے ہو۔"
دونوں آگے بڑھ گئے۔ شاہراہ پر آ کر دونوں کے راستے
مختلف ہو گئے، اور وہ اپنی اپنی طرف چلے گئے۔

"نہیں معلوم اس وقت رضی کو لے کر وہ کس بورڈر پر
گیا ہو گا۔ مگر رضی کو ہوا کیا ہے۔ اس کو کس بات کی کمی ہے
جو اس کے ساتھ یوں خوار ہوتا پھرتا ہے۔ بس اسٹینڈ کی طرف
بڑھتے ہوئے وہ یہی سوچتا رہا۔ اتنی جان جوکھوں کا خطرناک
کام! آخر رضی کیوں اپنے آپ INVOLVE کئے ہوئے ہے
اس بچھو سے آدمی سے۔

کوئی اس کے دل میں چپکے چپکے سرگوشی کر رہا تھا بچھو
وہ نہیں ہے بلکہ رضی ہے جو خود سے کچھ کرنے کی صلاحیت
نہیں رکھتا اور اس کا سہارا پکڑتا ہے۔

"ایک بس آکر رکی تو وہ چونکا مگر یہ بائیس نمبر بس تھی۔
مگر پھر وہی سوال اٹھتا ہے کہ یہ رضی کو کیا ہوا ہے۔ اس کا
اور اس شخص کا کوئی جوڑ بھی ہو! خیر بلّی آنکھوں والے اور
رضی کے تعلق کا معمہ بس اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر اپنی بس کے طویل
انتظار کا GOOD PAST TIME بن سکتا ہے۔ اس
نے یہ سوچا ہی تھا کہ اس کی بس آ گئی۔

گھر پہونچا تو امی جان نے آج پھر اس کی ٹانگ لی۔
"کچھ پتہ ہے دس بج رہے ہیں صاحبزادے۔ میں کہتی ہوں یہ
رضی کی صحبت ___ بھئی ___"

"نہیں امی! میں رضی کے ساتھ تو نہیں تھا۔"

"تو پھر کہاں تھے؟" وہ جھلائیں۔

"رضی کا معمہ حل کر رہا تھا۔"

"تم کو کیا جھک ہو گئی ہے۔ فضول باتوں میں دماغ کھپانے
کی۔"

"نہیں میں تو یہ حیران ہوتا ہوں کہ بھلا رضی کو کیسا
مصیبت پڑ گئی ہے۔"

"کا ہے کی مصیبت؟" وہ ابھی تک اس کے دیر میں
آنے سے بیزار تھیں۔

"آپ اس بلّی آنکھوں والے کو جانتی ہیں؟"

"اے کون بلّی آنکھوں والا؟ وہی نجم الدین کا سالا؟"

"ہاں۔ ہاں۔"

"کیوں جانتی کیوں نہیں۔ اے ایسا ویسا جانتی ہوں۔
ناظم نام ہے اس کا۔"

"کیا کام کرتا ہے یہ؟"

"اے بھئی تم کو کیا کرید لگ گئی ہے۔ تم ان چکروں میں
نہ پڑ جانا۔"

"نہیں میں تو پوچھتا ہوں کہ رضی ___"

"پھر وہی رضی! میں کہتی ہوں انسان کی ہوس کا بھی
کوئی ٹھکانہ ہے۔ انسان کو جتنا ملتا ہے اس کی ہوس بڑھتی ہے۔"

اچھا رضی کو تو ہوس ہے مگر اس کو کیا ہے۔ یہ جو اتنے
خطرے مول لیتا ہے کس لئے؟ ___ امی جان! کہتے
ہیں بارہ برس بعد تو گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں، لیکن
اس کے دن تو پھرنے میں نہیں آتے۔"

"کبھی پھریں گے۔ یہ ایسا ویسا نہیں۔ یہ بڑا چلتا ہوا
ہے۔ تم کو کیا معلوم یہ تو سب کا گرو ہے۔ ایک دم ہی پلٹا
کھائے گا۔"

حلیم کو اس خیال پر ہنسی آنے لگی کہ ایک دم ہی امی جان
کی ساری ناراضگی کا رخ پھیر دیا اس کی بات شروع کر کے۔
تب وہ اٹھ کر اپنے پلنگ پر جا لیٹا۔

اس کے حالات کیا بدلیں گے اور کیا پلٹا کھائیں گے
اس کے خیالات کا سلسلہ جڑ گیا۔ جانے کیا بات تھی اس کے
ذہن میں کرید سی لگ گئی تھی اس کے بارے میں۔ حالات تو
اُس کے بدلتے ہیں جس کے اندر کوئی آرزو، کوئی تمنا، کوئی
حسرت تعمیر ہو۔ اور پھر جب حالات بدلتا سوتی صد خود اس کے

ملائی کی بات ہو۔ لیکن مجھے تو یہ لگتا ہے کہ جب روز ازل اور
مندی کا راشن تقسیم کیا جا رہا تھا تو یہ اس وقت بھی اپنے
شغلے کے ایسے جوڑ توڑ میں منہمک تھا کہ اپنا حصہ ہی لینا بھول
۔ بات یہ ہے کہ یہ اس کا شغلہ ہے پیشہ نہیں ہے۔ نیند کے
کوں میں اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹنے لگا۔ اس کی
ہ لگ گئی۔

پھر ایک دن اس نے رضی کو گھیر ہی لیا۔ ایک بات
رضی۔"

"کیا؟"

"یہ جو تمہارا ناظم ہے نا۔"

"ہاں کیوں؟" رضی اپنی نشست پر بےکل سا ہو کر
بدلنے لگا۔

"کیا بات ہے یہ کبھی گرفتار نہیں ہوتا۔"

رضی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اتنا غیر متوقع سوال
بھی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ "کیوں تم کو اس کی گرفتاری کا خیال
آگیا؟"

"رضی تم سمجھتے ہو تم اکیلے ہی ناظم سے فائدہ اٹھاتے
ہو۔ میں نے بھی اس کے ساتھ کچھ دن کام کیا ہے۔" حلیم نے
ت اتنا روکھا منہ بنا کر کہی تھی کہ رضی کو یقین آگیا۔

"پھر ـــ پھر ـــ تم نے چھوڑ کیوں دیا؟"

"یار ڈر لگتا ہے۔ کسی دن دھر لئے جائیں گے۔"

کمال ہے۔ اس کے ساتھ کام کرنے کا یہی تو فائدہ ہے
دمی پھنس نہیں سکتا۔ اس کی ٹکنیک تو اتنی ستھری ہے کہ
اپنے آپ کو یقین نہیں آتا کہ ہم کوئی ایسا ویسا کام کر رہے
ـــ" رضی ایک لمحہ کو رکا۔ اس نے بڑے غور سے حلیم کی
ہوں میں دیکھا۔ حلیم نے بھی بالکل اسی انداز میں آنکھیں
کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ رضی کچھ مطمئن سا ہو گیا۔
تم ایک بار پھر TRY کر کے دیکھو۔ ایسا لگتا ہے تمہاری

اس کی HEART TO HEART بات ہی نہیں ہوئی۔ اس کا
کمال تو یہ ہے کہ وہ تمہارے دل سے اس خوف کو دھو دیتا ہے
کہ تم کوئی غلط کام کر رہے ہو۔ سب سے پہلے تو وہ آپ کو
اس خوف اور احساس جرم سے نجات دلا دیتا ہے۔ جو بھاری
پتھر بن کر ذہن کو کچلتا ہے۔ پھر تم ہلکے پھلکے دل سے ایک بار
اس کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھ لو گے تو وہ تم کو اپنی تکنیک
کی تربیت دے گا۔"

"اچھا، باقاعدہ ٹریننگ ہوتی ہے اس کی؟ مجھ سے
تو وہ کچھ بیزار سی معلوم ہوتا تھا۔ حلیم نے مردہ سی آواز میں کہا۔
لیکن رضی کو ان سب طریقوں سے گھیرنے کی ضرورت
نہ تھی۔ رضی اب کھل چکا تھا۔ چنانچہ وہ بولتا رہا۔ اس کی
تکنیک اتنی پیچیدہ اور REFINED ہے کہ اس کے لئے صبر
آزما ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ اور پھر وہ اپنے کام کا زبردست
مزاق رکھتا ہے۔ رضی ایک جذب کے عالم میں ساری تکنیک
اور اس کے طریق کار بیان کرتا چلا گیا۔

وہ رضی کو باتیں کرتا چھوڑ کر ریستوراں سے باہر نکل
آیا تھا۔ اس نے شفاف نیلے آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر
کی طرف دیکھا۔ واہ اللہ میاں تم نے بھی غضب کیا ہے۔
ہر انسان کے اندر ایک فن کار چھپا دیا ہے۔

اور اس دن سے وہ ایک فن کار کی طرح اس کا احترام
کرنے لگا تھا۔ بغیر اس کے قریب آئے اور بغیر اس سے کوئی
فائدہ اٹھائے وہ اس کی مہارت، چابک دستی اور اس
سب سے بڑھ کر زندگی سے بے نیاز رویئے کا احترام کرتا تھا۔

پھر ایک دن رضی اس کو ملا۔ اس نے اس کو بتایا کہ وہ
طہران جا رہا ہے اور وہاں سے وہ CONTINENT جائے گا۔
اس کا ارادہ ہالینڈ میں ریستوراں کھولنے کا ہے۔

تو چنانچہ روانگی کے دن وہ ہار پھول کے ساتھ اس کو
رخصت کرنے ہوائی اڈے گیا تھا۔ اس کی آنکھیں رضی کے

دوستوں اور رشتہ داروں کے درمیان پورے وقت بلی آنکھوں والے ناظم کو دیکھتی رہی تھیں۔ آخر اس نے رضی سے سوال کر ہی ڈالا۔ "وہ تمہارا ناظم نہیں آیا۔"

"وہ ایسی فورمیلٹیز کا قائل نہیں ہے۔ وہ تو کسی کے ساتھ اس وقت تک رہتا ہے۔ جب تک کسی کو اس کی ضرورت رہتی ہے۔"

"اس وقت وہ کہاں ہوگا۔" حلیم نے یوں ہی بے دھیانی میں سوال کر لیا۔

"ہوگا کہیں اپنے کسی نئے چیلے کے ساتھ کہیں کسی پیچدار گلی در گلی چھپتے میں کسی گھنے کھیت میں کھڑی کسی فصل کی آڑ میں آیا پھر سرحد کے اس طرف۔"

اچانک مسافروں کو ہدایات دی جانے لگیں۔ "کراچی جانے والا طیارہ پرواز کے لئے تیار اور مسافروں کا منتظر ہے۔" رضی جلد جلد سب سے رخصت ہو کر چیکنگ کے لئے روانہ ہو گیا۔

حلیم کا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ وہ رضی کے طیارے کی پرواز کا انتظار کئے بغیر ہوائی اڈے سے باہر نکل آیا تھا۔ اپنی تمام پراسراریت کے باوجود وہ تمہارا اچھا ساتھی تھا۔ حلیم! تمہارے پریشان لمحوں کو اپنی خوش باش کیفی سے مسکراہٹوں سے بدل دینے والا ساتھی۔ وہ تم سے بہت دور اور بہت آگے نکل گیا ہے۔ اور تم اب بھی وہیں کھڑے ہو۔ حلیم بہت ملول ہو رہا تھا۔ اب تم تہران جاؤ گے رضی۔ وہاں سے پرشین گلف کے موتی لے کر ہالینڈ جاؤ گے۔ وہاں تم ریستوراں بناؤ گے ایک خوب صورت سی کاٹج بناؤ گے۔ اور تمہارے باغ میں لالے کے پھول مسکرائیں گے۔ لالہ: جس کے قلب میں افیون سوئی ہوتی ہے۔ ہالینڈ۔ لالے کا باغ اور لالے کے قلب میں سوئی ہوئی افیون۔ اور تمہاری زندگی میں یہ پیچ در پیچ گلیاں کبھی نہیں آئیں گی۔ تم چرس کی اس بدبو سے بہت دور اور محفوظ ہو جاؤ گے۔ جس نے بلی آنکھوں والے ناظم کی زندگی کو اپنے محیط میں لے رکھا ہے۔ حلیم یہ سب کچھ سوچتا رہا اس نے رکشہ کا رُخ گھر کی بجائے گوگو کی طرف پھروا دیا۔

رات آگے بڑھ رہی تھی اور گوگو کی گہما گہمی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ارد نی اور افریقی طالب علموں کے جھگھٹے گوگو کے قریب منڈلا رہے تھے۔ تب اس لڑکے نے جو دو انگلیاں اٹھا کر رضی کو اطلاع دیا کرتا تھا۔ "صاب دو کون" اس کو یوں نظر انداز کر دیا تھا جیسے وہ کام کا آدمی ہی نہ ہو۔

وہ اندر چلا گیا۔ کاؤنٹر کے ساتھ اسٹول پر ظفر بیٹھا کافی کی چسکیاں لے رہا تھا اس کو دیکھ کر بولا۔ "چھوڑ آئے رضی کو؟"

"ہاں" حلیم افسردہ تھا۔

"تم تو بہت دکھی ہو رہے ہو یار اس کی جدائی سے۔ تمہارے اور اس کے درمیان تو بہت سے اصولی اور نظریاتی اختلاف تھے۔"

"مگر اصولی اور نظریاتی اختلاف بھی تو دل کی رونقوں کا باعث ہوتے ہیں۔ اور جو وہ بھی ختم ہو جائیں تو دل میں کتنا سناٹا ہو جائے۔"

حلیم نے کافی کا آرڈر دیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر رکھ کر تھوڑا سا آگے جھک گیا۔ "یار ظفر میں چاہتا ہوں اپنی سائیکو انالیسس کرواؤں۔"

"یا وحشت!" ظفر نے مسخری سی صورت بنا کر اس کی طرف دیکھا۔ تم بھی کیا کوئی بڑے سرمایہ دار یا اہل اقتدار ہو چلے ہو جو تم کو اس قسم کی حاجت پیش آرہی ہے پھر اس نے حلیم کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ یار MENTAL BREAK DOWN تو BIG POTS کا ہوا کرتا ہے جن کو V.I.PS اور ELITE OF SOCIETY کہا کرتے ہیں۔ ہم جیسے بیکاروں کو اس شریف مرض سے کیا نسبت۔ مینٹل بریک ڈاؤن تو اب رضی کا ہوا کرے گا۔"

حلیم رضی کا نام سن کر چونک پڑا۔ یہی تو بات ہے ظفر۔

میں اس بلی آنکھوں والے ناظم کے بارے اتنا کیوں سوچتا ہوں۔ بے وجہ کسی شخص کے لئے اپنی سوچوں کا اتنا حصہ وقف کردینا صحت مندی کی علامت تو نہیں۔"

"تو آؤ حلیم میں تمہارا تجزیہ کردوں۔ ابھی ابھی۔ یوں فٹافٹ۔ بولو کیا فیس دوگے؟" پھر وہ ہنسا "فیس! تم کیا دوگے۔ تمہاری جیب بھی میری طرح کافی کے ایک مگ سے زیادہ کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتی۔ چلو تم بھی کیا یاد کروگے۔ مشورہ تجزیہ سب فی سبیل اللہ یا قرض حسنہ۔"

"ہاں تو کیا تجزیہ ہے تمہارا؟" حلیم نے بے صبری سے اس کی طرف دیکھا۔

ظفر نے سگریٹ سلگا لیا۔ اپنے مگ میں کافی ڈال لی اور بغیر دودھ اور چینی ہی کے اس کا تلخ گھونٹ لے کر بولا۔ حلیم تم کو یاد ہے ہم دونوں کے سال سے بے کار اور تلاش روزگار میں مصروف ہیں؟"

"یہ تیسرا سال ہے ظفر۔"

"اور پھر بھی کہیں سے امید کی کرن؟ ہر طرف اندھیرا ہے مایوسی ہے اور اندھیرے میں ٹٹولنے والوں کی قسمت کا لکھا دھکے ہے میرے اور تمہارے پاس کوئی بڑھیا اور ڈبل سی سفارش؟"

"مگر ہماری ڈگریاں اور ڈویژنیں؟"

"کھڈے میں ڈالو ان ڈگریوں اور ڈویژنوں کو۔ تم انھیں کیا سمجھ رہے ہو۔ سب فراڈ ہے۔ کیا تمہارا اب بھی ایمان باقی ہے، اپنی ڈگری اور ڈویژن پر؟"

حلیم نے دیکھا ظفر کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں۔

خدا کی قسم ان ڈگریوں سے تو بلی آنکھوں والا ناظم اچھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم غیر شعوری طور پر اس کے متعلق سوچتے رہتے ہو۔ اور میں بھی۔"

حلیم افسردگی سے ظفر کی بھیگی آنکھوں کی طرف دیکھتا رہا

"حلیم یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ تم کو اندھیری رات میں ایک روشنی نظر آئے اور تم اس کی طرف بڑھنے کے بجائے۔ اس کو بغور دیکھتے ہی رہو۔"

"اور جو وہ روشنی "اگیا بیتال" ہو؟"

"اگیا بیتال؟ وہ کیا ہوتا ہے حلیم؟"

امی جان اور نانی اماں کہتی ہیں کہ ویران راستوں اور گھنے جنگلوں میں اندھیری رات کے مسافروں کو دور فاصلوں پر الاؤ کی صورت میں روئی بھری نظر آتی ہے اور جوں جوں وہ اس کے قریب جاتے ہیں وہ کچھ آگے سرک جاتی ہے۔ مسافر آگے بڑھتا ہے تو وہ روشنی اس کو بھٹکا کر اتنی دور لے جاتی ہے کہ وہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ اس کے مارے راستہ گم کر جاتے ہیں۔"

"چھوڑو یہ تم یہاں اس وقت گوگو میں بیٹھ کر نانی اماں کے واہموں کو کیوں زندہ کرنا چاہ رہے ہو۔ مگر بات یہ ہے کہ تم اس سے ڈرتے ہو اور وہ تم سے ڈرتا ہے۔"

"کون؟ وہ — وہ — مجھ سے ڈرتا ہے؟"

حلیم کو صدمہ سا ہوا اور وہ چونک گیا۔ "میں! میں تو اس کو کچھ نہیں کہتا ظفر۔ میں تو اس کے انہماک سے عقیدت رکھتا ہوں۔ میں تو اس کو بڑا فن کار سمجھتا ہوں۔ دیکھو تا میں اب تم کو کیا بتاؤں۔ میرے ذہن میں تو آج اس کی ایک عجیب غریب DIFINITION آئی تھی۔ میں جب رکشی کو جہاز پر چڑھا کر آرہا تھا تو میں سوچ رہا تھا۔ اہل تصوف میں قطب اور ابدال ہوا کرتے ہیں جو دوسروں کی اغراض سے بے مطلب رہ کر ان کی نظروں سے دور اور اوجھل رہ کر ان کے کام آیا کرتے ہیں لیکن میں سوچتا ہوں زندگی کے ہر رخ اور موڑ پر قطب اور ابدال قسم کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ اس کی طرح اپنی جگہ پر قائم و دائم۔ ایک ہی حالت پر برقرار ————"

اچانک ہی ظفر نے اس چھوٹے سے طرار لڑکے کو آواز

دی ۔ اے لڑکا ، دو کون ؟ اس نے دو انگلیاں اوپر
اٹھادیں ۔

لڑکا جھاڑن کندھے پر ڈالے چھوٹی سی گول ٹرے
اٹھائے مشین پر جا کھڑا ہوا ۔ کون بننے کے انتظار میں اس کی
آنکھیں آنے جانے والوں کا تعاقب کر رہی تھیں ۔ پھر وہ
لپکا ہوا اندر آیا ۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کے خوب صورت
پھولدار نیپکنوں میں سلیقے سے لپیٹے دو کون تھے ۔ "صاب جی
دو کون !" اس نے دو انگلیاں اوپر اٹھادیں ۔

ظفر کون ہاتھ میں لئے پھرتی سے باہر نکل گیا ۔

تب حلیم ٹہلتا ہوا باہر آ گیا ۔

جین اینڈ ایلرٹن والے کونے پر اپنے اسکوٹر پر آرام
سے بیٹھا ہوا آدمی ظفر کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا ۔ ایک لحظہ دونوں
نے کچھ بات کی اور پھر دونوں اسکوٹر پر بیٹھ کر ہوا ہو گئے ۔ تو اس
کا مطلب یہ ہے کہ ظفر اپنی خالی جیب کا بوجھ مجھ پر ڈال
گیا ہے ۔ چنانچہ اندر واپس جانے کے بجائے حلیم تیزی سے
آگے بڑھتا چلا گیا ۔ راستے بھر سڑکوں ، شاہراہوں اور گلیوں
کے آخری سرے پر اگیا بتیال کے شعلے نظر آتے رہے ۔ تو یہ فنکار
کے بجائے اگیا بتیال نکلا ۔ اس نے گلی کے آخری موڑ سے
گذر کر گھر کی طرف ہوتے سوچا ۔

اس رات اس نے عجیب گڈمڈ خواب دیکھے ،
پیچ در پیچ گلیاں ، اونچی اونچی فصلوں والے کھیت ،
پگڈنڈیاں ، فضا میں ناچتی اور پھڑپھڑاتی ہوئی بے شمار
اور ان گنت ڈگریاں جیسے آندھیوں کے جھکڑوں میں اڑی
جا رہی ہوں ۔ اندھی چمگادڑوں کی طرح پھٹ پھٹاتی ہوئی
ڈگریاں ۔ ہوائی اڈہ ، فضا میں پرواز کرتے ہوئے جہاز ۔
ہالینڈ کی پن چکیاں ۔ لالے کے کھیت ۔ لالے کے قلب میں
آرام سے سوئی ہوئی افیون ، چرس کی بدبو ۔ بلی آنکھوں والے
شخص کی بغیر چہرے کے فضا میں تھرکتی آنکھیں ۔ اور سونے
سونے راستوں کے دوسرے سروں پر اگیا بتیال کی روشنیاں ۔

دوسری صبح اس کی ماں نے غور سے اس کی طرف
دیکھا ۔ تو اس کو محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں ہر روز
سے زیادہ تکان ، افسردگی اور بے بسی تھی ——

صلاح الدین پرویز

ایک عظیم المرتبت ہے

رات کے پیچھے ہوا ہے
چاند کے پیچھے گھٹا
اور میرے خواب جیسے نام پر
توسِ قزح
توسِ قزح

جھاڑیوں میں ناگنوں کی خوبصورت چھیڑ چھاڑ
آئینوں پر موسمی بیماریوں کا پیچ و تاب
فرش پر بیٹھی ہوئی لولی دواؤں کی کتاب
سرسراتا ہے کوئی پتّا
ہوا کے ساتھ ساتھ
ریشمی گوشے میں بھیگا ہے
کوئی ذرّہ
گھٹا کے ساتھ ساتھ
اور بیری جھاڑیاں ، بیماریاں
ترسی ہیں خوابی نام کے رہوار پہ
رات کے پیچھے ہوا ہے
چاند کے پیچھے گھٹا

—— ۱۹۶۴ ——

اَنت ، آغاز ، اَنت

صبح کے چاندی کی کشتی میں اُتریں گے رام
نرم خوشبو کے ہونٹوں سے چپکیں گے رام
دور تاریک گھر میں کسی کی صدا
رام کی بھیگی بھیگی شرارت لئے
میرے احساس کو گدگدانے لگی
کیسری رنگ ہونٹوں کا جلنے لگا
بھوت پانی کا پلکیں کترنے لگا
اور میں اپنی سچائی کی چیخ کو
تیز کرنے کی کوشش میں اک دائرہ بن گیا
اور اس دائرے میں مری شخصیت
ایک راون کا جذبہ : شرارت مجھے
وَاسنا کی چٹختی ہوئی بندگی کو لئے
چومتی تھی کہا سی حقارت مری
اور پھر
دور تاریک گھر میں کسی کی صدا
اس طرح ڈولتی تھی مرے آس پاس
اپنے گھر کے گلاسوں کو تم پھینک دو
آج پیتل کی ٹونٹی سے اتریں گے رام

۱۹۶۴

آہنگ/۵۲

خلیل تنویر

بُت پرست

ہر کہانی کی ابتدا میں
اُن کا جنم ——
کنواری ماؤں کے پیٹ سے ہوا
لوگ اپنی آنکھوں پر ——
شیشہ چڑھائے ہوئے
حیرانی کی مُدرائیں دیکھتے رہے
دُھند پھیلتی گئی
ہر کہانی کا انت ——
انھیں صلیب پر چڑھا دیا گیا
وہ مر کے بھی نہ مر سکے
بُت بنا دئے گئے

تضاد

دھوپ بڑی تیز رفتاری سے
زینے اُتر رہی ہے
سیر پر چھائیوں کے دائرے پھیلنے لگے ہیں
ذہن میں جوالا مکھی دہک رہے ہیں
مگر جسم بے حرکت ہیں
لوگ! بڑے صبر کے ساتھ منتظر ہیں کہ
زمین کروٹ لے گی!

عقیل شاداب

سڑکوں سے تلووُں کا رشتہ

سڑکوں سے
میرے تلوؤں کا بہت پرانا رشتہ ہے
جب سڑکیں پیدا نہ ہوئی تھیں
تب بھی ان کے خوابوں نے
میرے تلووں کو سہلایا تھا
جتنے کانٹے ٹوٹ چکے تھے
وہی ۔ مسافت کا ورثہ تھے
دریا، صحرا، دشت وجبل سب
میرے تلووں کو بوسہ دے دے کر
سڑکیں ڈھونڈ رہے تھے
میں تنہا تھا
اور میری تنہائی ہر سو گونج رہی تھی
میں چپ تھا، لیکن
میری آواز کا جادو
لمحے لمحے کے ہونٹوں کو چوم رہا تھا

سورج، چاند، ستارے، دھرتی اور آکاش
سب ہی تھے لیکن
ان کا کوئی نام نہیں تھا
سب اپنے اپنے آئینے مانگ رہے تھے
میرے چاروں اور ہوائیں
پاگل ہوکر ناچ رہی تھیں
اور دشائیں میرے سفر کے بوجھ سے تھک کر
ہانپ رہی تھیں
خون پسینہ بوکر
میں رشتوں کی فصلیں کاٹ رہا تھا
اور میرے زخمی تلووں کے نیچے
سڑکیں کانپ رہی تھیں
!!

شفق

آزاد بستی

لائبریری میں اچانک مجھے اپنی پیشانی پر ایک بڑے سے آبلے کا احساس ہوا۔ درد تو کئی دنوں سے تھا مگر میں نے فکر نہ کی برسات کا موسم ہے پھوڑے نکلتے ہی رہتے ہیں مگر اچانک اتنا بڑا پھوڑا، باہر موسلادھار بارش ہو رہی تھی، لائبریری سے جانے والے لوگ دروازوں اور کھڑکیوں سے باہر کھلے میں بارش کے رُکنے کا انتظار کر رہے تھے میں بھی باہر جانا چاہتا تھا مگر.....

میں نے باتھ روم میں لگے آئینے میں پیشانی کا جائزہ لیا اور میری آنکھیں خوف سے پھیل گئیں، آبلے کے اندر تیسری آنکھ جھلک رہی تھی۔ مکمل آنکھ ہوتے کسی بھی پل متحرک ہو سکتے تھے۔ میں نے باتھ روم سے باہر نکل کر دیکھا۔ وہاں کے سارے لوگ میری نئی آنکھ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لوگوں کی نظروں سے مجھے بڑی ڈھارس ہوئی۔ میرے اندر لہریں اُٹھ اُٹھ کر رگوں میں دوڑتے خون میں شامل ہو رہی تھیں۔

مگر ماں! شاید خوش نہ ہو، جب وہ میری دُکھتی پیشانی گرم پانی سے سینکا کرتی تھی تب اُس کی آنکھوں میں تشویش کے بادل ہوتے اور وہ کلمے کی اُنگلی سے ٹٹولتی رہتی...

میں لائبریری سے باہر نکلا تو بارش رُک چکی تھی۔

مگر آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کسی بھی پل بارش پھر شروع ہو سکتی تھی۔ اس لئے دوسری بارش سے پہلے میں گھر پہنچ جانا چاہتا ہوں، اتنی بارش پہلے کبھی نہیں ہوتی تھی اب تو شہر سالوں بھر بارش کی زد میں رہتا ہے۔

میں رکشہ اسٹینڈ کی طرف دیکھا، رکشہ والے محفوظ جگہوں سے نکل کر اپنے بھیگے رکشوں کے پاس کھڑے دُور سڑک پر تیز پانی کا شور سُن رہے تھے۔

میں نے ایک کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونک کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا

چلو گے؟

کہاں؟ اُس نے رکشہ کی بھیگی سیٹ گمچھے سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے سامنے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

آزاد بستی ......

بابوجی! وہاں تو کوئی سواری نہیں جا سکتی۔

میں نے ایک کے بعد دوسرے تیسرے چوتھے رکشہ والوں سے چلنے کو کہا اور آزاد بستی کا نام سن کر سب نے کان تھامے۔

کیا آپ نووارد ہیں؟ وہاں اس وقت سیلاب آیا ہوا ہے، آپ پانی کا شور نہیں سن رہے ہیں، میری مانئے تو ابھی نہ جائیے جب پانی کم ہوگا، ہم آپ کو پہنچا دیں گے۔

مگر میرا گھر جانا بہت ضروری ہے، ماں میرا انتظار کر رہی ہوگی، اس نے کہا تھا، آسمان کا رنگ کہہ رہا ہے بارش ضرور ہوگی۔ ایسے میں تم کھلے میں باہر رہو گے۔۔۔

اور میں نے ہنس کر کہا تھا،

میں فوراً آ جاؤں گا بس لائبریری تک جانا ہے

میں اپنی ماں پر اپنی نئی آنکھ کا ردعمل بھی دیکھنا چاہتا ہوں، اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ماں میری پیشانی کیوں ٹٹولتی تھی وہ اتنی سراسیمہ کیوں رہتی تھی اسے خطرہ تھا کہیں.. کہیں ... اور آج جب دیکھے گی تو ....

جب بارش ہوتی ہے تو میری ماں یوں ہی پریشان رہتی ہے کیونکہ گھر، آنگن، دالان، کمرے سب پانی میں ڈوب جاتے ہیں اور وہ پریشانی کے عالم میں، کبھی دروازے پر، کبھی دیواروں کی نیو، کبھی کمروں کا چکر۔۔ پانی نے کس کس کو متاثر کیا، کس دیوار کی مٹی جھڑی، کہاں گڈھے پڑے، کہاں پانی ٹپکا، کہاں کیا ہوا؟

پہلے کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا، باہر کا پانی نالی کے ذریعہ گھر میں نہیں گھستا تھا۔ لوگوں کے مکانات منہدم ہوئے، نئے مکانوں کے دروازوں پر انہوں نے حفاظت کے لئے مٹی ڈلوا دی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ نالا بند ہو جائے گا تو دروازہ خواہ کتنا ہی اونچا رہے پانی تو اندر جانے کا راستہ ڈھونڈھتا رہتا ہے۔ تو ایسے میں میری ماں کتنی ہی حفاظتی تدبیر کرتی اور مطمئن ہو جاتی کہ اب پانی اندر نہ گھس سکے گا مگر بارش ہوتی تو ساری رکاوٹ ریت کی دیوار بن کر ڈھہ جاتی اور پھر وہی ..... سب کچھ ــــــ میں پیدل ہی چل پڑا ہوں کہ یہ سڑک میرے تلوے کے لمس سے آگاہ ہے یا میں اس کے لمس سے آگاہ ہوں، پوری سڑک پانی میں ڈوبی ہوتی ہے، غلیظ اور بدبودار پانی میں، جن میں کیچوئے، جونک، کیڑے مکوڑے اور سنڈاس کی غلاظت بہہ رہی ہے، بدبو کا بھبکا میری ناک سے ٹکراتا ہے تو میری نئی آنکھ میں کلبلاہٹ ہوتی ہے، پپوٹے پھڑپھڑانے لگتے ہیں۔ میں چھو کر دیکھتا ہوں اوپر کی جھلی جیوں کی تیوں ہے۔ مگر میں نے ناک بند نہیں کی یہ غلاظت ہی تو ہمارا سرمایہ رہ گیا ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو ماں یہ غلاظت بہا دیتی ہے، وہ یہ نہیں سمجھتی کہ اس طرح وہ ایک جگہ کی غلاظت چاروں اور پھیلا رہی ہے، یہی پانی گھر میں گھس کر آنگن، دالان اور کمروں تک کو بدبودار بنا دیتا ہے، جس کی بدبو مہینوں دھلائی کرنے پر بھی نہیں نکلتی۔

پانی میرے ٹخنوں سے اوپر چڑھتا جا رہا ہے۔ میں نے چپل اتار کر ہاتھ میں لے لیا، اور چھپ چھپ کرتا اپنے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔

کئی سفید پوش حضرات گھٹنوں تک پانی میں ڈوبے دونوں ہاتھ غلیظ پانی میں ڈالے کھڑے ہیں، جب بھی کوئی کیچوا، جونک یا کیڑا انہیں نظر آتا وہ اس کی طرف جھپٹتے اور اسے پکڑ کر اپنے لمبے کرتے کی جیب میں ڈال لیتے، کچھ جیب کے بجائے منہ میں ڈالتے اور موٹے موٹے دانت سے کچلتے سنفل سنفل کر منہ چلاتے کہ کہیں کوئی ریشہ پھسل کر باہر نہ گر جائے، اکثر وہ اس بات پر آپس میں جھگڑ پڑتے کہ ان کی طرف آیا ہوا مال دوسرے نے ہڑپ کر لیا۔

تب ہی میری نئی آنکھ پوری طرح متحرک ہو گئی۔

پانی اب گھٹنوں سے اوپر جانگھوں تک آ گیا تھا، اور

سامنے ہی میرا عالی شان گھر پانی میں گھرا میری طرف دیکھ رہا تھا
میرا یہ سترہ کمروں کا مکان، اسے ہمارے پرکھوں نے
بھورے بالوں والوں سے خریدا تھا۔ تب گلی بھی نیچی تھی،
رتیلی تھی اور بارش بھی اتنی نہیں ہوتی تھی کہ گھروں میں پانی
گھسے، اس لئے کبھی نالی کی طرف توجہ نہ دی گئی۔ جب خریداری
کی باتیں شروع ہوئی تھیں تب ہی سے اُن دونوں نے اس گھر میں
باغ لگانے کی فکر کی تھی، اور جب تک گفتگو چلتی رہی وہ
روزانہ سر جوڑ کر بیٹھتے اور کیاریوں کا ڈیزائن اور پھولوں کا
انتخاب کرتے رہتے۔ جس دن گفتگو ختم ہوئی اور ایک بڑی قیمت
دے کر انھیں گھر کی کنجی ملی، کیاریاں بنائی جانے لگیں، پھولوں
کے پودے اکٹھے کئے جانے لگے۔ وہ دونوں خوش تھے مگر جب
کیاریوں میں پودے لگائے جانے لگے دونوں میں اختلاف ہوگیا

یہاں جوہی کا پودا ہونا چاہئے۔

نہیں سرخ گلاب کا۔

یہاں کامنی .....

نہیں بیلا ...

مہینوں بحثیں ہوئیں اور گزرتے دنوں کی گرد اختلاف
کی جڑیں مضبوط کرتی رہی اور پھر وہ دن بھی آیا جب انہوں
نے لاٹھیاں سنبھال لیں اور ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔

بھورے بالوں والا شیطان جس نے دیوار پر شیرہ لگا کر
تماشا کا انتظام کیا تھا دور کھڑا سب کچھ دیکھتا، مسکراتا
رہا۔ پھر لاٹھیاں چل گئیں، سر پھوٹے، خون بہا، جانیں گئیں
تب وہ آگے بڑھا اور ہاتھ اٹھا کر انھیں روک دیا۔

دیوار ..... صرف ایک دیوار ہی سارے دکھوں کا
انت ہے۔

وہ چپ ہوگئے، اپنے اپنے گھروں کو لوٹ تو گئے
مگر اُس کی آواز ناگ بن کر ذہن کو ڈستی رہی، وہ ساری رات
بے چین رہے، سو نہ سکے کہ دیوار کا تصور ہی اذیت ناک تھا۔

صبح ہوئی تو بھورے بالوں والا پھر آیا اور دونوں کے
ہاتھ میں کاغذ تھما دیئے۔

دوسرے دن مزدوروں نے کام شروع کیا، زمین کھودی
گئی، اینٹوں پر اینٹ رکھی گئی اور پلک جھپکتے ہی ایک دیوار
نے باغ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ بظاہر دکھوں کا انت
ہوگیا اور وہ اپنے علاقوں میں اپنی مرضی کا باغ لگانے میں
جُٹ گئے مگر لاٹھیوں کے زخم ایک مدت تک دُکھتے رہے،
رستے رہے درد، ٹیس اور کرب ...

وہ اپنے سگے بھائی تھے نا۔

ماں ننگے پاؤں دروازے پر کھڑی بڑھتے ہوئے پانی
کو تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میری نئی آنکھ پر
نظر پڑی تو خوف سے چیخ پڑی، خود کو سنبھالنے کے لئے چوکھٹ
کا سہارا لیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

یہ ... یہ .... تم ... اُس کے منہ سے بے معنی سے الفاظ نکلے

کیا بات ہے ماں، میں نے اُس کا شانہ پکڑا، اندر چلو

اندر ... وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی، اندر
کہاں جاؤگے، سارا گھر تالاب بنا ہوا ہے، کہیں قدم رکھنے
کی جگہ نہیں، کمروں میں بھی پانی بھر گیا ہے، نیو پتھر کی ہے اس لئے
گرنے کی فکر نہیں مگر وہ گلاب ... چنبیلی اور جوہی کے پودے
جن میں ایک مدت کے بعد کلیاں لگی تھیں کتنی حفاظت کی تھی
میں نے مگر .... وہ جیسے خواب میں بڑبڑا رہی تھی، اُن کی جڑیں
سڑ گئی ہیں۔ میں نے نالی جڑوا دی تھی کہ باہر کا پانی نہ لگے تو شاید
سڑتی جڑیں بچ جاتیں مگر میں کیا کروں ... کیسے کروں .... تم
کل ہو، اُس نے میرا چہرہ چھوا، اور اسی کل کی حفاظت کے لئے
میں ہاتھوں میں گیلی مٹی لئے تمام دن دیواروں کی مرمت کرتی
رہتی ہوں کہ جب میری بینائی ختم ہو جائے تو میں یہ امانت تمہیں
اُسی حالت میں سونپ سکوں جس حالت میں مجھے پرکھوں سے
ملی تھی۔

(بقیہ صفحہ ۶۳ پر)

رونق نعیم

اتنا سارا زہر

کون ہے ؟
کون ہے وہ شیوی ؟
جو رکھ کر تول سکے
اپنے سائے کے ٹکڑوں کو ہی ترازو کے ایک پلڑے میں
اور دوسرے میں
اُن کبوتروں کو جو دشاؤں میں چھٹپٹاتے رہتے ہیں
نہیں نہیں
یہاں ایسا کوئی نہیں
میری صدی کے
کالے
نیلے
سُرخ
رسیلے
پیلی دھوپ کے پاس
اپنے رنگوں کو گروی رکھتے ہیں
اپنے بچے کچھے مرکے ترکے لمحے لے کر
شام کی اُنگلی پکڑ کر
ناف کے نیچے پھسل جاتے ہیں
یا مُٹھی بھرا اجتماع
شیشوں کے پیال سورج سے بھگو کر
خلا میں اُچھال دیتے ہیں
اور میں
اپنی تیسری آنکھ موند لیتا ہوں
اور تب
میری ساری دھرتی دھنس جاتی ہے
میرا پورا آکاش ڈوب جاتا ہے
میری
سبھی دشائیں
بہ جاتی ہیں
نہیں نہیں
میں ان کہکشاؤں اور دیوتاؤں میں نہیں
جو منتھن کر سکوں
اِس وشال اندھے کالے ساگر کو
نہیں نہیں
میں کوئی شیو نہیں
جو پی سکوں
اتنا سارا زہر

—— ——

اختر یوسف

بے نام دِلوں کی ایک نظم

کبھی .. موسم بدلتے تھے، کبھی پلکوں کے سائے میں نگاہیں رنگ لیتی تھیں، نگاہیں رنگ پیتی تھیں
وہی، جھیلیں ندی پلکوں کے نیچے سات رنگے خواب کی لہروں میں ڈوبی
پت جھڑوں کے منظروں کو چوم لیتی تھی، بگولے راکھ بننے کے عمل میں
چہچہاتی دھوپ بنتے تھے، کبھی نیلی ہوا کے ساز کے مضراب ہوتے تھے
کبھی آئینے ہوتے تھے، جہاں جھیلوں ندی کے سات رنگے خواب کی لہروں کے منظر گیت نیلے اور پیلے
گیت بنتے تھے۔ کہیں آکاش ہوتا تھا، کہیں سرسوں لہکتا تھا
کبھی موسم بدلتا تھا، کبھی پلکوں کے سائے میں نگاہیں رنگ پیتی تھیں

● ●

● ●

جیسے ایک لمبی نیند کی نیلی گپھا سے ہم اچانک باہر اُنڈیل دیے گئے ہیں
ایک رنگین فلم آنکھوں کے آگے بڑی دیر سے پھسل رہی تھی
منظروں کی دھند تھی، پیلی نیلی سرخ و سبز
ایک بڑے سے اُجلے کینوا س پر ہماری آنکھوں کی نگاہیں پیلی نیلی سرخ و سبز
شعاعوں کے جال بن رہی تھیں
ایک بڑا سا رنگوں کے دھبوں سے لتھڑا کینوا س آگے جانے کیسے اُلٹا ہو کر اکڑ گیا ہے
جیسے اک لمبی نیند کی نیلی گپھا سے ہم اچانک باہر نکل آئے ہیں اور چار طرف کینوا س کے
اَن گنت کالے کوؤں اور کتّوں کی دھند چھا رہی ہے
خوف کی باہوں کی گرفت ہم پر پتھّر سے پتھّر ہوتی ہے
اُنگلیاں آنکھوں تک پہنچ نہیں پاتی ہیں
عجیب منظر ہے، ہزار آنکھیں ان گنت آنکھیں پتھّر پتھّر ہو گئی ہیں

کون جادوگر تھا، کہاں سے آیا تھا، کیا تھا اُس کے پاس
طلسم سامری، عصائے موسیٰ ... کیا تھا اُس کے پاس، ہزار آنکھیں، ان گنت آنکھیں
غلافوں سے اپنے نکل کھڑی ہیں
ایک بڑے سے کینواس کے چار طرف کالے کوؤں کے پَر بکھرے پڑے ہیں
کالے پیڑوں کی رات کی ندی دور دور تک بہتی جاتی ہے
گہراتی ہے ... کہاں گرتی ہے، پتہ نہیں چلتا ... بس، بہتی جاتی ہے
ایک بڑے سے کینواس کے چار طرف ہزار کتوں کی زبانیں لٹک آئی ہیں
ٹپ ٹپ رال ٹپکتی ہے
کالے پیڑوں کی کالی ندی سے ملتی ہے اور دھند ہے کہ بڑھتی جاتی ہے
اُوپر ... ہمارے اُوپر، آنکھیں اب تھکتی جاتی ہیں
ایک لمبی نیند کی نیلی گپھا سے ہم اچانک باہر نکل آئے ہیں
باہر کہیں بھی کوئی نام نہیں، شبد نہیں
شبدوں سے کٹ کر جانے کیا ہمارے آگے بھی پسر رہا ہے، بس ایک ہی گتی میں
کیا ہے .... شاید کتوں کا پیشاب یا کوئی بے نام سا موسم یا پھر
ریت اور ریت اور ریت اور ریت ...... اور خوف کی بانہیں ہم پہ پتھر پتھر ہوتی ہیں
جیسے ایک لمبی نیند کی نیلی گپھا سے ہم اچانک باہر اُنڈیل دئیے گئے ہیں

— —

ابرارالحسن

مستثنیات

باہر کتنی خوب صورت برف گر رہی ہے۔ ننھی منی، صاف ستھری اسکول کا میدان سفید چادر میں ملبوس ہے۔ لیکن بچے ہیں کہ کھیل میں مگن خوب دوڑ بھاگ رہے ہیں۔ اُن کے رنگین ملبوس، جیسے برف میں پھول کھلے ہوں۔

تم میری طرف اس مایوسی سے کیوں دیکھ رہے ہو۔ جلد ہی تمہاری پہیوں والی کرسی آجائے گی۔ پھر جب برف پگھل چکی ہو گی اور موسم سرما گذر جائے گا۔ تب تم گھر سے نکل کر اسکول کے میدان کی طرف جانا۔ بہت اچھا لگے گا نا ؟

میں نے خود اپنی آنکھوں سے نہیں بہار کے پھول چنتے دیکھا۔ ہلکے پھلکے سفید پھول، جن کے درمیان زرد، سنہری بالی سی ہوتی ہے۔ آسمان نیلا تھا اور بادل کے ٹکڑے سفید اور شفاف جیسے روئی کے گالے۔

وہ آواز کیا تھی؟ شاید کوئی کار رکی اور پھر تیزی سے بھاگی۔
کالی، چوڑی چکنی سڑک پر ایک کچلا ہوا پھول بھی نہیں تھا۔

دفتر میں آج قطعاً دل نہیں لگا۔ چھٹی ہوتے ہی میں تیز قدموں سے گھر کو بھاگا، جو مشکل سے ایک میل ہوگا۔ کچھ ہی دور گیا ہوں گا کہ میرے عقب میں آہٹ ہوئی۔ مڑکر دیکھا تو ایک وجیہہ شخص کو تیز قدموں سے اپنی منزل پر رواں پایا۔

کچھ دور اور آگے چل کر نہ جانے کیوں مجھے یہ وہم سا ہوا کہ وہ شخص میرا پیچھا کررہا ہے۔ جب میں سڑک پار کرکے دوسری طرف آیا تو وہ بدستور میرے عقب میں تھا۔ میں نے اپنی رفتار کم کی تو وہ بھی آہستہ ہوگیا۔ میں نے سڑک دوبارہ پار کیا تو وہ بھی پھر سڑک کی اُسی طرف آگیا۔ میرا وہم یقین بن چکا تھا۔ وہ نہ صرف میرا پیچھا کررہا تھا بلکہ

لحظہ بہ لحظہ نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔

میرا اپارٹمنٹ نزدیک آچکا تھا۔ آخری داہنے موڑ پر وہ بھی میرے ساتھ مڑا۔ اپارٹمنٹ بلڈنگ میں میرے ساتھ داخل ہوا۔ میرے ساتھ ELEVATORS کا انتظار کیا۔ اب میرے لئے یہی چارہ تھا کہ اس کی موجودگی سے مکمل لاعلمی کا اظہار کروں۔

حد تو یہ ہے کہ وہ بھی اُسی ELEVATOR سے اُسی فلور پر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے ایک قدم دروازہ کے اندر رکھ کر بڑی تیزی سے دھکا دیا۔ میں اس کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ وہ یکدم اندر آ گیا۔ ہکلاتے ہوئے میں نے اُسے باہر نکلنے کو کہا تو اُس نے مجھے گریبان سے پکڑا اور ٹائی کی گرہ تنگ کرنے لگا۔ میرے پسینے چھوٹ رہے تھے، رعشہ طاری تھا اس کی گہری سیاہ عینک کی وجہ سے میں اُس کی آنکھیں نہ دیکھ سکتا تھا۔ حتی الامکان خود پر قابو پا کر میں نے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے

ایک طنز آمیز ہنسی اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔ جیسے اُس کا چہرہ تک بدل گیا ہو۔ جیسے وہ وہی تھا جو میں ہمیشہ سے بننا چاہتا تھا مگر جس سے آج تک جان بوجھ کر لاعلمی کا اظہار کرتا رہا تھا۔

اس نے میرے سارے کپڑے اُتار کر خود پہنے۔ جب تک مجھے ہوش آیا وہ میری گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا اور میں ایک بے جان دھبہ سا بن کر فرش پر چسپاں ہو چکا تھا۔

آنگن کی طرف اُس کمرے میں جس کے آگے پختہ صحن تھا، میں لیٹا ہوا چاند کو تک رہا تھا۔ چاند جو بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے برگد کی گھنی شاخوں سے نجات ملی تھی۔

اچانک فقط چاند تھا اور کھلا آسمان۔ میں اُٹھ بیٹھا جیسے چاند بلا رہا ہو۔ ہلکی ہلکی خنکی سے قطع نظر، میں نے صحن سے پائیں باغ کا دروازہ کھولا۔ چاند جیسے اور چمک اُٹھا ہو باغ سے نکل کر ایک غیر مسطح میدان سے گزرتے ہوئے میں نے چاند سے ٹھہرنے کو التجا کی۔ (بادل کا ایک خوفناک ٹکڑا ساتھ آ رہا تھا)۔ میں دوڑنے لگا ...... خدا کا شکر ہوا چاند صحیح سالم نکلا اور تالاب کے پانی میں اُتر آیا۔ اُس کی جگ مگ جگ مگ کرتی لہریں اب میرے سامنے تھیں۔

میں پانی میں اُتر گیا۔ چاروں طرف چاند کی کرنیں لہرا رہی تھیں۔ چاند پر نظر جمائے میں چاندنی میں جیسے گھلتا جا رہا تھا۔ میری کوشش یہ تھی لہروں میں کم سے کم ارتعاش ہو۔ چھوٹے چھوٹے STROKES کے ساتھ میں بہتا چلا گیا۔ تالاب کے دوسرے کنارے پر جو جنگل تھے اُن سے ملے ہوئے کنول کے پھول بھی تھے۔

میری سانسوں میں خوشبودار چاندنی رسی بسی جا رہی تھی۔ مگر کہتے ہیں چاند پر پانی ہے نہ پھول۔ کہتے ہیں کنول کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔

۱

تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ تم نے میرا دل تو نہیں دکھایا میں نے شکایت کب کی؟ وہ تو میرے لاکٹ میں بند چھوٹے موٹے شیشے کے فریم کے چٹخنے کی آواز تھی۔

جانی۔ سُنو، تم جو دوسری طرف کروٹ بدل کر سو جاتی ہو تو مجھے بہت صدمہ سا ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے تم میری ساری ہستی سے انکار کر رہی ہو۔ کیا کیا خواب نہ دیکھے تھے جب ہم ساتھ ہوں گے تو ایک دوسرے سے نظر ہٹانی مشکل ہو گی ... مکمل ہم آہنگی۔ بھئی تم دوسری طرف [illegible]

آج دفتر میں کام بہت تھا۔ صبح سے شام تک
ایک لمحہ بھی سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملی۔ بہت تھک گیا ہوں
بہت نیند آرہی ہے۔ شب بخیر۔

جب سے خزاں نے درختوں کو پتوں سے خالی کر دیا
ہے میرا دل بھی اُجاڑ ہے۔ اب سخت سردی میں درختوں کی
ننگی ٹہنیوں پر برف لدی ہے۔ تم کہتی ہو سمجھوتہ کر لوں۔
برف کو پھول پھل سمجھ لوں۔ جیسے برہنہ احساسات نے
تم سے پیار کے ملبوسات کے لئے کبھی ہاتھ بھی نہیں پھیلایا۔
جیسے وہ مقفل آنسو شفاف ہیروں کے پھول بن چکے ہوں اور
بہنے کے لئے کبھی اُبھرے ہی نہیں
ذرا سورج تو نکل لینے دو۔

وہ جو آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا تھا، کہاں گیا اور
اُس کی راکھ میری مٹھی میں کیسے آئی۔ آج صبح جو کونپل پھوٹی
تھی اُس کو کس نے نوچ لیا۔ تم سمجھ رہے ہو کہ میں شب و روز
کے چکر میں ایک چلتا پھرتا بُت ہوں جس کا دماغ منجمد ہے
اور آنکھیں بے نور۔ لیکن وہ شبنم جس کی کرن نے مجھے آج
تازگی بخشی ہے، میں اُس کی مو[illegible] بھی تک آنسو بہا رہا
ہوں۔

رات ٹھنڈی ہے۔ میرے دوست میں تمہاری یاد
کی خوشبو سے ابھی تک نمناک ہوں۔ جہاں تم بیٹھے تھے
وہاں ابھی تک تمہاری گرمی کا احساس باقی ہے۔ مینٹل پیس
پر جو ٹوٹا ہوا آئینہ ہے وہ ابھی تک جُڑا تو نہیں ———
اور کیا وہ کبھی جُڑ سکے گا؟

آسمان صاف اور شفاف ہے۔ دور دور تک
بادل کا گمان نہیں۔ یوں گہری گہری سانس نہ لو۔

قرۃ العین حیدر کی کسی ہیروئن کی طرح تم اپنی ٹھوڑی
ہتھیلیوں پر ٹکائے، لمبی لمبی پلکیں جھپکا رہی ہو۔ کہتی ہو
میرے ساتھ بیٹھ کر تم فقط مجھے کام کرتے دیکھنا چاہتی ہو۔
میرا دھیان بٹانا تمہارا مقصد نہیں۔ مگر وہ پتھر جو میں تراش
رہا ہوں بار بار ہاتھوں سے پھسل جاتا ہے اور میری دزدیدہ
نگاہیں ژیوانچی (GIVENCHY) کی لپٹوں کا
منبع ڈھونڈنے بھٹک بھٹک جاتی ہیں۔ میں اپنی نس نس
میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تم ابھی ابھی کھل کھلا کھل کھلا کر ہنس
پڑو گی۔ پھر جیسے خوشبودار پھول برسیں گے، رم جھم رم جھم
پھوار ہو گی اور تمہارے باریک کپڑے جگہ جگہ بھیگ کر مہک
اٹھیں گے ——— اور تم چاہتی ہو کہ میں اپنی توجہ
اُسی پتھر پر مرکوز رکھوں جو بے جان ہے۔

تم مجھے محبت کی قسمیں دلا کر کہہ رہے ہو کہ کسی اور کی
طرف نظر بھی نہ کروں۔ تم میرے ہو اور سدا رہو گے اس کا
تو مجھے یقین ہے۔ مجھے تمہاری اس مجبوری کا بھی احساس
ہے کہ مجھ سے کھلے عام نہیں مل سکتے۔ شادی شدہ زندگی
نبھانی ضروری ہے۔
جب رات گئے تم آتش دان کے پاس اپنے بچوں
سے کھیل رہے ہو گے تب میرے ٹھنڈے کمرے میں چوڑے بستر
پر لحاف میں دو گرم سانسوں سے کافی گرمی ہو گی۔ وہ جو
میری جوانی سے کھیل رہا ہو گا وہ تو فقط میری مجبوری ہو گی۔
محبت کی قسم میں کسی اور کی طرف نظر بھی نہیں کروں گی۔ علاوہ

اس کے میرے کمرے کی روشنی بھی تو گل ہوگی۔

تم شوہر کے پہلو میں کتنی پُرسکون لگتی ہو۔ دوسری طرف سوئے ہوئے بچے کے بالوں سے کھیل رہی ہو۔ کتاب زندگی جیسے مجلد ہو چکی ہو۔ اور تم نے آج ایک دفعہ بھی تو میری طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔

آج تو چاند بھی جلدی نکلے گا۔ چمکیلی سوندھی ریت اور ناریل کے پیڑوں میں ہوا کی ٹھہری ٹھہری سرسراہٹ۔ آنچل کب کا ڈھلک کر سوچکا ہوگا۔ اور ہوا چپکے سے آ کر کھلی کتاب کے ایک ورق کو یکلخت اُلٹ کر کچھ دیر کے لئے لکھو جاتی ہوگی۔

تب میں پوچھوں گا۔ "ایسا بھی کیا تھا"۔

کیا تم نے کوئی دوا پلا دی تھی، ایسی نیند تو نہ جانے مجھے کب سے نہیں۔ کیا بجا ہوگا؟

مگر تمہاری آنکھوں میں یہ لال ڈورے کیسے اور تم گھٹنوں پر سر ٹکائے بیٹھی ہوئی میری پلاسٹر شدہ ٹانگوں کو کیوں گھور رہی ہو۔

ادھر آؤ، میرے ہاتھ تو سلامت ہیں، لو تمہیں تھپکیاں دے کر سلا دوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک میری آنکھیں کھلی ہیں میری ایک ہلکی سی آہ بھی نہیں نکلے گی اور نہ ہی میں ایک بار بھی کراہوں گا۔

چلتے چلتے میں نے سڑک کے کنارے سے مٹھی بھر صاف برف اُٹھائی اور دو چار قدم آگے چل کر ہوا میں اُڑا دی صاف سوکھی برف۔

ایک کتا جو سڑک کے دوسری طرف آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اچانک رُکا۔ پھر سڑک پار کر کے بڑی تیزی سے دوڑنے لگا۔

میں روز اُسی ساحل پر، اُسی پتھر کے کنارے اُسی کائی لگے ہوئے گرے درخت کے تنے پر آ بیٹھتا ہوں۔ کافی دیر کے بعد آہستہ سے ایک پاؤں پانی میں دھنسے ہوئے اُسی جانے پہچانے پتھر پر رکھتا ہوں۔

پھر جب زمین تھرتھراتی ہے اور سورج دھندلا ہوتے ہوتے ایک دھبہ سا بن جاتا ہے تو میں درخت کے گرے ہوئے تنے سے یہ پوچھتا ہوں کہ وہ تھک تو نہیں گیا ہے۔

ٹھنڈی برف پر سگرٹ سے نکلی ہوئی آگ گری تو بجھ کر بھسم ہوگئی۔ اُسی ٹھنڈی برف کو گرم پانی کی دھار نے کیا پھلنی کیا۔ تم کیا چیز ہو کبھی بجھی چنگاری، کبھی جلتی گرم دھلا

میں اُسے کہوں بھی تو کیا کہوں۔ ذرا سی غلطی پر کتنا لجاتا ہے۔ انجان پن میں دل دکھا کر کس فقیرانہ انداز سے معافی مانگتا ہے۔ اُس کی چال ڈھال، ہر ادا، اُمنگیں خدا، کتنی تکلیف دہ ہے۔ جیسے چلتا پھرتا "غیر خوبصورتی" کا مرقع۔

وائے افسوس۔ کوئی غلطی تو کر۔ ایسی غلطی کہ گلہ کا موقع تو دے۔ میری سانس سانس برس پڑنے کو پھڑپھڑا رہی ہے۔

(بقیہ ص ۶۳ پر)

غنی حیدر

ایک نظم

اور پھر
خامشی کا بھیانک سماں
چار سو چھا گیا میرے احساس پر
آرزوؤں کا اک کارواں
تھک گیا، رُک گیا، سو گیا!
خلوتِ عہدِ رفتہ کے پہلو میں وہ
اس طرح جیسے نمناکیاں
بسترِ گل پہ آ آ کے جمنے لگیں
تب کوئی روشنی
جل اُٹھی طاقِ ادراک میں
اور اچانک جو شورش ہوئی
لامکاں، بے کراں ذہنِ خفتہ نے دیکھا وہاں
جانے کتنے پتنگے تھے مُردہ پڑے
فرش پر بزمِ احساس کے؟

——— ———

عبدالمنان

ایک نظم

یہ اندھیروں کی سرگوشیاں
میرے اُجالوں پر چھائی جا رہی ہیں
بہت تیز تر
میں ان سرگوشیوں کو چپکے سے
ان اندھیروں سے ذرا ہٹ کر
سُن رہا ہوں
کانپ رہا ہوں
کہ یہ سرگوشیاں میرے ہی متعلق ہیں
میری جستجو کا وہ روشن دیا
جسے مَیں چھپائے اس شہر میں پھر رہا تھا
اور
اس کا لَو میری روح کو روشن کرنے والا تھا
اچانک ان سرگوشیوں کی تیز سانس سے
بجھا دیا گیا
اور
دیا، سرد سے سرد تر ہو چکا!

——— ———

انتظار اور ابھی

سوھن سا ارھی

داغ فرقت کا
محبت کا سلگتا ہوا زخم
تُو تو کہتی تھی کہ بھر جائے گا، مِٹ جائے گا
وقت مرہم تو نہیں ہے، لیکن
وقت بیگانہ رہا۔ کوئی مداوا نہ ہوا

داغ فرقت کا
محبت کا یہ زخم
ایک رِستا ہوا ناسور ہے اب
جو ہمہ وقت سُلگتا ہے مرے سینے میں
اب کوئی لطف نہیں جینے میں

پھر بھی ہر وقت تجھے ڈھونڈھتی رہتی ہے نظر
جیسے آنکھوں کو
کوئی کام نہ ہو اِس کے سِوا
سوچتا رہتا ہوں دن رات یہی
کہ یہ رِستا ہوا ناسور مرا
شدتِ کرب سے
کب روح کو آزاد کرائے
جسم کی قید سے کس وقت چھڑا دے مجھ کو
اُس بلندی کے لئے
ہم جہاں ایک ہوں،
پھر ایک ـــــــ ہمیشہ کے لئے !!

ابراھیم یوسف

کاغذ کی دھجی

کردار جس ترتیب سے آتے ھیں

عظمت خالہ ۔ خدیجہ بیگم ۔ شارق ۔ عالیہ ۔ مُسلم

منظر:

خدیجہ بیگم غمگین و اُداس بیٹھی کوریڈور کی طرف دیکھ رہی ہیں کہ عظمت خالہ کوریڈور سے گزر کر کمرے میں آتی ہیں۔ ان کی چال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تھکی ہوئی ہیں۔ آہستہ آہستہ آکر خدیجہ بیگم کے پاس کھڑی ہوجاتی ہیں۔ خدیجہ بیگم نظریں اٹھا کر انھیں دیکھتی ہیں پھر اس طرح نظریں جھکا لیتی ہیں جیسے شرمندہ ہوں۔ عظمت خالہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہیں اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

عظمت خالہ: دلہن بیگم۔ (خدیجہ بیگم پھر نظریں اٹھا کر دیکھتی ہیں۔ آنکھوں میں آنسو ہیں۔ عظمت خالہ کچھ دیر رک کر) خدا کو سونپا۔

[خدیجہ بیگم ایک دم کھڑی ہوکر عظمت خالہ سے لپٹ جاتی ہیں اور ہچکیوں سے رونے لگتی ہیں دونوں کی ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔ کچھ دیر بعد اپنی ہچکیوں پر قابو پاکر]

خدیجہ بیگم: عظمت خالہ، تم مجھے دُلہن بنا کر لائی تھیں۔ مجھے دُلہنوں کا جوڑا پہنایا تھا۔ کفن بھی اپنے ہاتھ سے دے جاتیں تو اچھا تھا۔ مگر تم.......

[آواز بھرّا جاتی ہے اور وہ خاموش ہوجاتی ہیں۔ عظمت خالہ کچھ دیر خاموش رہتی ہیں۔ پھر دوپٹے سے آنسو پونچھ کر]

عظمت خالہ: دلہن بیگم کیسی باتیں کرتی ہو۔ کفن پہننے کے تو میرے دن ہیں (روپیوں کی ایک گڈی ان کی طرف بڑھاکر) انھیں اپنے پاس امانت رکھ لو۔ میری موت میّت کے لئے ہیں۔

خدیجہ بیگم: نہیں عظمت خالہ۔ جانے کب موت کا بلاوا آجائے۔ شارق میاں کو تو تم جانتی ہی ہو۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) تمہارے جانے کے بعد میں سچ مچ بیوہ ہو جاؤں گی۔

عظمت خالہ: خدا پر بھروسہ رکھو دلہن بیگم۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) شارق میاں اس قدر کٹھور ہیں یہ تو سوچا بھی نہیں تھا۔

خدیجہ بیگم: تم نے خود دیکھا ہے کہ میں نے ان کے ساتھ کبھی کوئی برائی نہیں کی۔ ان کے لئے ان کے چچا سے بھی اُ لجھ

پڑتی تھی۔ مجھے بے سہارا جان کران کا جو کچھ برتاؤ ہے وہ تم دیکھ رہی ہو۔

عظمت خالہ : خدا سب سے بڑا سہارا ہے دلہن بیگم۔ میرا کہا مانو اور بہو بیگم کے ساتھ چلی جاؤ۔ سچ مچ تم یہاں گھٹ گھٹ کر جان دے دو گی۔

خدیجہ بیگم : (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیسے چلی جاؤں۔ آخر کو وہ غیر ہے۔

عظمت خالہ : غیر! جس کو تم بہو بنا کر اپنے گھر میں لائی تھیں اور بیٹی بنا کر گھر سے رخصت کیا، وہ غیر ہو سکتی ہیں؟ کل تمہارے انکار کرنے پر وہ کیسے رو پڑی تھیں یہ تم نے نہیں دیکھا۔ (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں۔ عظمت خالہ کچھ دیر خاموش رہ کر روپے خدیجہ بیگم کے ہاتھ پر رکھ کر) خدا کو سونپا۔ دو چار دن بعد آکر اپنے کپڑے لے جاؤں گی۔

[عظمت خالہ آہستہ آہستہ کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ خدیجہ بیگم کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہیں۔ پھر کھڑکی کے پاس جا کر اس طرح باہر دیکھنے لگتی ہیں جیسے عظمت خالہ کے آخری دیدار کر رہی ہوں۔ کچھ دیر باہر دیکھتی رہتی ہیں پھر وہیں کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد شارق کی آواز "عظمت خالہ، عظمت خالہ" خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں جیسے انھوں نے یہ آواز سنی ہی نہ ہو۔ شارق کمرے میں آکر۔]

شارق : چچی جان۔ عظمت خالہ کہاں ہیں۔ (خدیجہ بیگم آنکھیں بند کیے خاموش [illegible] رہتی ہیں۔ شارق ان کے پاس آکر) چچی جان۔ (خدیجہ بیگم آنکھیں کھول کر شارق کو ایسی نظروں سے دیکھتی ہیں جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ شارق آہستہ سے) عظمت خالہ کہاں ہیں؟

خدیجہ بیگم : عظمت خالہ۔ (ایسے لہجے میں جیسے خود انہیں اپنی بات پر یقین نہ ہو) چلی گئیں۔

شارق : (خدیجہ بیگم کی گود میں پڑی ہوئی روپے کی گڈی کو دیکھتے ہوئے) کہاں چلی گئیں۔

خدیجہ بیگم : (اس انداز سے جیسے خود پر قابو پالیا ہو) تم ہی نے تو جانے کو کہا تھا۔ اب وہ ایسی بے غیرت بھی نہیں تھیں کہ پڑی رہتیں۔ خدا کے فضل سے ان کے بھی دو دو جوان بیٹے ہیں۔

شارق : (طنزیہ) تو وہ اپنے جوان بیٹوں کے پاس چلی گئیں۔ چلیے یہ بھی اچھا ہوا۔

خدیجہ بیگم : تمہارے چچا کی وصیت تھی کہ انھیں ماں کی جگہ سمجھنا مگر تم نے ———

شارق : (بات کاٹ کر) چچا جان کی تو جانے کیا کیا وصیتیں تھیں (لہجے میں تلخی پیدا کرتے ہوئے طنزیہ) چچا جان کا جواب نہیں تھا وصیتیں کرنے میں۔

خدیجہ بیگم : (ایک دم کھڑی ہو کر) شارق میاں۔ مرے ہوئے کی تو عزت کر لو۔ اب اس کی مٹی پلید کرنے سے کیا فائدہ۔

شارق : (اسی لہجے میں) سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ مرتے وقت وصیتیں کیوں کرتے ہیں۔ (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں شارق ان کا چہرہ دیکھ کر) اور پھر چچا جان نے کون سے احسان مجھ پر کیے ہیں کہ میں ان کی وصیتوں کا پاس کرتا پھروں۔

خدیجہ بیگم : (غصہ اور طنز سے) تمہارے اوپر تو تمہارے باپ نے بھی احسان نہیں کیے تھے۔ چچا کس گنتی شمار میں تھا۔

[شارق اس طرح ان کا چہرہ دیکھنے لگتا ہے جیسے اسے ایسے جواب کی اُمید نہیں
تھی۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے۔]

شارق : عظمت خالہ کوئی ایسا فرشتہ نہیں ہیں کہ ان کی موجودگی خیر و برکت کا باعث ہو۔ اور پھر چچی جان میں تو ہر کام اپنی جیب دیکھ کر کرتا ہوں۔

خدیجہ بیگم : تمہاری جیب اتنی دبلی بھی نہیں کہ ایک بڑھیا کا بوجھ نہ اُٹھا سکے اور پھر وہ مفت میں تو ٹکڑے توڑتی نہیں تھیں۔ تم جانتے ہو کہ وہ میرے لئے بڑا سہارا تھیں۔

شارق : (برہمی کے انداز میں) چچی جان۔ عدالت نے صرف آپ کی ذمہ داری مجھے سونپی ہے پوری ایک فوج کی نہیں۔

خدیجہ بیگم : اور میری ذمہ داری بھی کیوں سنبھارے ہو۔ زہر دے دو قصہ پاک ہو جائے گا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) شارق میاں اگر تم سمجھتے ہو تو یاد رکھو کہ میں تمہارے ٹکڑوں کی محتاج نہیں ہوں۔

شارق : میں جانتا ہوں کہ عالیہ بیگم آپ کو یہ سبق پڑھا گئی ہیں۔ (مڑ کر کوریڈور کی طرف جاتے ہوئے) آپ کی ذمہ داری مجھ پر اسی وقت تک ہے جب تک آپ میرے ساتھ ہیں اس گھر سے نکل جانے کے بعد مجھ پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ (کوریڈور میں چلا جاتا ہے پھر پلٹ کر خدیجہ بیگم کے پاس آکر روپئے کی طرف اشارہ کرکے) اور یہ روپیہ کیسا ہے؟

خدیجہ بیگم : عظمت خالہ کا ہے۔ امانت رکھ گئی ہیں۔

شارق : عظمت خالہ کا! (طنزیہ مسکرا کر) یا عالیہ بیگم کو نذر کرنے کے لئے ہے۔

خدیجہ بیگم : بخدا شارق میاں عظمت خالہ کا ہے۔ دو چار دن میں آکر اپنا روپیہ لے جائیں گی۔

[شارق خاموش ہو کر سوچنے لگتا ہے۔ خدیجہ بیگم آہستہ آہستہ الماری کے پاس جاتی ہیں۔ اس میں روپیہ رکھ کر تالا ڈالتی ہیں۔ اور کوریڈور کی طرف جاتی ہیں۔ شارق انھیں جاتا ہوا دیکھ کر۔]

شارق : چچی جان! (خدیجہ بیگم مڑ کر اسے دیکھتی ہیں۔ شارق ان کے قریب آکر) عظمت خالہ کل بلا وجہ الجھ پڑی تھیں اور پھر میرے کہنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ سچ مچ ہی گھر چھوڑ کر چلی جائیں۔

خدیجہ بیگم : (کوریڈور کی طرف بڑھتے ہوئے) اور کیا مطلب تھا تمہارا۔ ایسی سخت باتیں تو تمہارے چچا نے بھی ان سے نہیں کہی تھیں۔

شارق : مگر چچی جان! (خدیجہ بیگم پھر مڑ کر دیکھتی ہیں) آپ خود دیکھ رہی ہیں کہ میں آج کل کس قدر پریشان ہوں بزنس میں برابر گھاٹا ہو رہا ہے۔ ایسے موقع پر کہیں دماغ ٹھیک سے کام کرتا ہے (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں) آپ خود دیکھ رہی ہیں کہ دن رات ایک کر رہا ہوں مگر کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

خدیجہ بیگم : کہا کس نے تھا کہ اپنا کام چھوڑ کر دوسرا شروع کر دو۔ رہا روپئے کا سوال تو تمہاری ماں کے پاس بہت ہے ان سے لے لو۔

شارق : (ہنس کر) وہ تو روپئے کو ہوا بھی لگنے نہیں دیتیں۔ بھلا مجھے دے دیں گی۔ (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں) ایک مہاجن کے پاس جا رہا ہوں۔ شاید کوئی سبیل نکل آئے۔ (دروازے کی طرف جاتا ہے پھر مڑ کر خدیجہ بیگم کی طرف

دیکھ کر) اگر عظمت خالہ آجائیں تو میری طرف سے معافی مانگ لیجئے گا۔
(کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ خدیجہ بیگم پھر دروازے کی طرف آتی ہیں اور کواڑ بند کرکے کنڈی چڑھا دیتی ہیں۔ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہیں پھر کوریڈور کی طرف بڑھتی ہیں کہ دروازے پر دستک۔۔۔ ٹھہر جاتی ہیں اور مڑ کر دروازے کو دیکھتی ہیں۔ پھر دستک۔ چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار ہیں کہ کھولیں یا نہیں۔ پھر دستک کے ساتھ آواز "امی" تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے]

خدیجہ بیگم : کون عالیہ؟ آرہی ہوں بیٹی۔ (کنڈی کھول دیتی ہیں۔ عالیہ کمرے میں آکر جھک کر سلام کرتی ہے) جیتی رہو تم گئی نہیں؟ مسلم میاں کہاں ہیں؟

عالیہ : ایک کتابوں کی دکان پر رک گئے۔ آرہے ہیں۔

خدیجہ بیگم : مگر کل تو تو کہہ رہی تھی کہ آج چلی جائے گی۔

عالیہ : گاڑی دو بجے جاتی ہے امی۔ وہ کہنے لگے چل کر امی سے رخصت ہولیں۔

خدیجہ بیگم : بیٹھ نا۔ کھڑی کیوں ہے۔

عالیہ : (کمرے کے درمیان میں آتے ہوئے) یہ عظمت خالہ چبوترے پر پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھی کیا کر رہی ہیں۔

خدیجہ بیگم : درخت کے نیچے کیوں بیٹھی ہیں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) شارق میاں نے انھیں گھر سے نکال دیا ہے۔

عالیہ : گھر سے نکال دیا ہے! کیوں؟

خدیجہ بیگم : (طنزیہ) ان کی جیب عظمت خالہ کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

عالیہ : میں تو سمجھی تھی کسی کام کو گئی ہیں۔ تھک کر بیٹھ گئی ہوں گی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) ایک دن ان کی جیب آپ کا بوجھ بھی برداشت نہیں کرسکے گی۔ (سوچتے ہوئے کھڑکی کے پاس جاتی ہے پھر مڑ کر خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) امی! شارق صاحب سے کوئی بھی امید رکھنا فضول ہے۔ شاید آپ انہیں غیر سمجھتی ہیں۔ (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں پھر قریب رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں۔ عالیہ بھی آکر ان کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ دیر ان کا چہرہ دیکھتی رہتی ہے پھر آہستہ سے) امی! کیا آپ خود کو تنہا محسوس نہیں کرتیں۔

خدیجہ بیگم : تیرگی سی تنہائی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑی ہوجاتی ہیں) عظمت خالہ تو سچ کہتی تھیں مجھے بیوہ کرکے چلی گئیں۔ (عالیہ بھی کھڑی ہوجاتی ہے) تم بیٹھو بیٹی۔ میں تمہارے لئے چائے بنا لاؤں۔

عالیہ : امی چائے تو میں ابھی ہوٹل سے پی کر آرہی ہوں۔

خدیجہ بیگم : (آنکھوں میں آنسو بھر کر) خدا کو یہ دن بھی دکھلانا تھا کہ جسے میں اولاد سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں، اسے ہوٹلوں میں کھانا پینا پڑ رہا ہے۔

عالیہ : اس کی فکر نہ کیجئے ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) امی! آج انہوں نے عظمت خالہ کو گھر سے نکالا ہے کل آپ سے چولہا چھکوائیں گے اور پرسوں آپ کو بھی رخصت کردیں گے۔

خدیجہ بیگم : (ٹھنڈی سانس بھر کر) قسمت میں جو لکھا ہے پورا ہو کر رہے گا بیٹی۔

عالیہ : قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ بعد میں دیکھا جائے گا امی یہ گھر آپ کے لئے جہنم بن گیا ہے خدا کے لئے آپ میرا کہا مان لیجئے۔

خدیجہ بیگم : (کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھ سے خود سے یہ گھر نہیں چھوڑا جائے گا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اب شارق میاں ہی گھر سے نکال دیں تو دوسری بات ہے۔ ساری زندگی اسی گھر میں گزر گئی۔ رنج اٹھائے خوشیاں دیکھیں۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) تیرے ابا حضور مجھے تو ابھی بھی اس گھر میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

عالیہ : (کچھ دیر خاموش رہ کر) امی ایک دن انسان اتنی بڑی دنیا چھوڑ دیتا ہے۔ پھر یہ تو ————

خدیجہ بیگم : (بات کاٹ کر) اب تو یہ دنیا ہی چھٹ جائے تو اچھا ہو۔ جانے کتنی لمبی زندگی ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی

عالیہ : مگر امی۔

خدیجہ بیگم : (پھر بات کاٹ کر، ٹھنڈی سانس بھر کر) شارق میاں کا کہنا ہے کہ ان کی ذمہ داری اسی وقت تک ہے جب تک میں اس گھر میں ہوں۔

عالیہ : (غصے سے) اور اس طرح وہ آپ کو مجبور اور بے بس کر دینا چاہتے ہیں۔ لات ماریئے ان چند ٹکڑوں پر۔ خدا کی قسم امی مجھ سے آپ کی یہ مجبوری نہیں دیکھی جاتی۔

خدیجہ بیگم : مجبوری! (کوریڈور کی طرف جاتے ہوئے) بیٹی تو بیٹھ۔ میں چائے لے آؤں (آہستہ آہستہ بڑبڑاتی ہیں) عظمت خالہ۔ عظمت خالہ۔

عالیہ : آپ ٹھہریئے میں خود بنا لاؤں گی۔

خدیجہ بیگم : نہیں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) عظمت خالہ نہ سہی میں سہی۔ گھر کا کام کاج تو ہو گا۔

عالیہ : آپ ٹھہرئے تو۔ (خدیجہ بیگم سنی اَن سنی کرتی ہوئی کوریڈور میں اور ایک دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ عالیہ تھوڑی دیر تو خاموش کھڑی رہتی ہے۔ پھر کوریڈور کی طرف بڑھتی ہے کہ باہر سے ہچکیوں کی آواز کچھ دیر کان لگا کر سنتی ہے ہچکیوں سے رونے کی آواز برابر آتی رہتی ہے۔ عالیہ دروازے کے پاس جا کر باہر جھانکتی ہے پھر ایک دم) ارے عظمت خالہ۔ آیئے۔ آیئے۔ آپ باہر کیوں کھڑی ہیں۔ آیئے نا۔ (عظمت خالہ اندر آتی ہیں اور عالیہ سے لپٹ کر رونے لگتی ہیں۔ عالیہ گھبرا کر) کچھ کہئے تو کیا بات ہے۔

عظمت خالہ : بہو بیگم۔ میں دلہن بیگم کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں۔ میں۔ (آواز رندھ جاتی ہے کچھ دیر خاموش رہ کر) میرے لڑکے ہیں۔ بہو ہے۔ اس کے بچے ہیں مگر وہ سب میرے لئے اجنبی ہیں۔ غیر ہیں۔ میں ان میں نہ رہ سکوں گی۔

عالیہ : (آپ بیٹھ جایئے۔ (ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھلاتی ہے۔ پھر خود ان کے پاس بیٹھ کر) آپ ان کے پاس نہ جایئے۔ کون کہتا ہے ان کے پاس جانے کو۔

عظمت خالہ : شارق میاں نے تو مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔

عالیہ : آپ میرے ساتھ چلئے وہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔

عظمت خالہ تکلیف! اب میرے لڑکے بھی ایسے گئے گزرے نہیں ہیں کہ مجھے تکلیف پہنچائیں۔ بہو ہے زبان کی ضرور تیز۔ مگر

ایسی بھی نہیں کہ مجھے برداشت ہی نہ کر سکے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر وہاں دلہن بیگم کہاں ہوں گی۔ میں ان کو نہیں چھوڑ سکتی۔

عالیہ : مگر عظمت خالہ —

عظمت خالہ : (بات کاٹ کر) میں دروازے پر پڑی رہوں گی۔ سڑک پر پڑی رہوں گی۔ (خلا میں گھورتے ہوئے) بہو بیگم۔ مجھے یاد نہیں کہ اس گھر میں کب آئی تھی۔ (جذباتی انداز میں) مجھ سے یہاں ماؤں کی طرح محبت کی گئی بہو بیگم ماؤں کی طرح (حسرت سے) اب تو میری اولاد بھی میرے لئے اجنبی ہو گئی ہے (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں۔ عالیہ کچھ اس طرح خاموش بیٹھی رہتی ہے جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہو کہ کیا کرے کچھ دیر بعد آہستہ سے)

عالیہ : عظمت خالہ گھر سے نکالا جا سکتا ہے مگر دل سے نہیں۔ آپ —

[خدیجہ بیگم چائے کی کشتی لئے ہوئے آتی ہیں۔ عالیہ انھیں دیکھ کر خاموش ہو جاتی ہے عظمت خالہ انھیں دیکھ کر۔]

عظمت خالہ : ارے دلہن بیگم (اُٹھ کر تیزی سے ان کی طرف جاتے ہوئے) مجھے دو یہ کشتی دلہن بیگم۔ مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا (خدیجہ بیگم کے ہاتھ سے کشتی لینے کی کوشش کرتے ہوئے) لائیے مجھے دیجئے۔

عالیہ : نہیں عظمت خالہ۔ اب یہ سب کچھ تو مجھ کو ہی کرنا ہوگا۔ (کشتی عظمت خالہ کو نہیں دیتیں۔ لاکر میز پر رکھ دیتی ہیں۔ پھر ایک دم عظمت خالہ کو اس طرح دیکھتی ہیں جیسے وہ ان کے لئے اجنبی ہوں) عظمت خالہ۔ تم۔ تم تو۔

عظمت خالہ : دلہن بیگم میں تم کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آئی ہوں۔

خدیجہ بیگم : میری زندگی اور موت تو اسی گھر میں لکھی ہے۔ میں اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں گی عظمت خالہ

عظمت خالہ : جہاں بھی میں جاؤں گی۔ ابھی تمہارے دو ہٹے کٹے جوان بیٹے موجود ہیں۔ خدا کی قسم دلہن بیگم اگر انہوں نے تمہاری خدمت نہیں کی تو میں ان کا دودھ نہیں بخشوں گی۔

عالیہ : آپ دونوں میرے ساتھ کیوں نہیں چلتیں۔ کیا میں آپ دونوں کی خدمت نہیں کر سکتی۔

عظمت خالہ : بہو بیگم۔ بیٹی کے گھر میں جاکر کون پڑتا ہے۔ دنیا کیا کہے گی۔

[شارق کمرے میں آتا ہے اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عظمت خالہ کا آخری جملہ سن لیا ہے۔]

شارق : یہی کہے گی کہ میں نے چچی جان پر ظلم کئے تو وہ غیروں کے ٹکڑوں پر جاکر پڑ گئیں اور کیا کہے گی۔

عالیہ : غیر! مسٹر شارق میں نے انہیں کبھی غیر نہیں سمجھا۔ ماں سمجھا ہے۔

شارق : (طنزیہ) عالیہ بیگم اب تو چچا جان بھی نہیں رہے کہ جائداد آپ کے نام منتقل کر دیں۔ عدالت اس پر میرا جائز حق تسلیم کر چکی ہے۔ اور چچی جان کی کفالت میرے ذمہ کی ہے۔ اس لئے اب یہ ناٹک ختم ہی کر دیجئے۔

عالیہ : نہ مجھے جائداد کی پہلے ضرورت تھی اور نہ اب ہے۔ وہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ مجھے صرف امی کی ذات سے دل چسپی ہے۔

سے باہر نہیں جا سکتا۔

شارق : اب چچی جان کے پاس کوئی روپیہ نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو میری مرضی کے خلاف اس گھر سے باہر نہیں جا سکتا۔
اور یہ بھی یاد ہے کہ جس دن چچی جان نے یہ گھر چھوڑ دیا ، میں ان کی ذمہ داری سے بری ہو جاؤں گا۔

عالیہ : (غصہ اور طنز سے) آپ بڑی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ عظمت خالہ کو گھر سے نکال کر امی کو اس بڑھاپے میں
نوکرانیوں سے بدتر بنا دیا ہے۔

شارق : یہ میرے گھر کا انتظام ہے آپ کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

خدیجہ بیگم : تو چپ رہ بیٹی۔ قسمت میں جو کچھ لکھا ہے پورا ہو کر رہے گا

عالیہ : قسمت میں کچھ نہیں لکھا ہے امی۔ مسٹر شارق الٹا سیدھا لکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (خدیجہ بیگم کے پاس
جا کر خوشامدانہ لہجے میں) امی! خدا کے لئے اس جہنم سے نکل چلئے۔ آپ یہاں زندہ نہ رہ سکیں گی۔

خدیجہ بیگم : نہیں بیٹی۔ میری میت ہی اس گھر سے نکلے گی۔ دلہن بن کر کہاروں کے کاندھوں پر آئی تھی۔ چار مسلمانوں کے
کاندھوں پر گھر سے نکلوں گی۔

شارق : (طنزیہ) سن لیا عالیہ بیگم۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد اب کچھ اور کہنے کو نہیں رہا۔

عالیہ : (جذباتی انداز میں) پھر مجھے اس گھر سے کیوں نکال دیا امی۔ اس لئے کہ میں غیر ہو جاؤں۔ میں بھی چار مسلمانوں کے
کاندھوں پر ہی نکلتی۔

[عالیہ خدیجہ بیگم سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ خدیجہ بیگم محبت سے اس کے
سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں مگر خاموش رہتی ہیں اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ شارق
کچھ دیر خاموش رہ کر۔]

شارق : عالیہ بیگم۔ میرے گھر کو عزاخانہ بنانے کی کوشش نہ کیجئے۔

[عالیہ شارق کی بات پر دھیان نہ دے کر برابر روتی رہتی ہے کہ مسلم کمرے میں آتا ہے
اس کے ہاتھ میں دو چار کتابیں ہیں۔ پہلے تو اس ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے پھر
عظمت خالہ سے]

مسلم : عظمت خالہ کیا بات ہے؟ (عظمت خالہ خاموش رہتی ہیں مسلم کبھی عظمت خالہ کو کبھی شارق کو دیکھتا ہے مگر
دونوں خاموش رہتے ہیں مسلم کچھ پریشان سا ہو کر) عالیہ کیا بات ہے۔

شارق : عالیہ بیگم چچی جان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں مگر وہ ان کے ساتھ جانے کو تیار نہیں۔

مسلم : (شارق کو سر سے پیر تک دیکھ کر) یا آپ انھیں جانے نہیں دے رہے ہیں۔

شارق : یونہی سمجھ لیجئے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ عدالت نے ان کی کفالت کی ذمہ داری میرے سپرد کی ہے۔

مسلم : لیکن عدالت نے یہ نہیں کہا ہے کہ وہ آپ کی قیدی ہیں۔ ان کے گھر سے اور کہیں آنے جانے پر بھی پابندی ہے۔

شارق : میں نے ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی ہے مگر غیروں کے یہاں آنا جانا کیا ضروری ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتا

(خدیجہ بیگم عالیہ کو چھوڑ کر مڑتی ہیں اور شارق کو دیکھ کر)

خدیجہ بیگم : عالیہ اور مسلم میاں میرے لئے غیر نہیں ہیں۔
شارق : آپ کے لئے نہ ہوں گے میرے لئے غیر ہیں۔ عالیہ بیگم نے دوسرا نکاح کر لیا ہے اب اس گھر سے ان کا تعلق ختم ہو گیا ہے۔
خدیجہ بیگم : ان کا دوسرا نکاح ہم نے کرایا ہے۔ (طنزیہ) اور پھر ان لوگوں نے میرے ساتھ یہ برتاؤ نہیں کیا کہ عظمت خالہ کو گھر سے نکال کر مجھے نوکرانیوں سے بدتر کر دیتے۔
مسلم : عظمت خالہ کو گھر سے نکال دیا!
شارق : جی ہاں نکال دیا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس پر اعتراض کا حق نہیں۔
مسلم : جی ہاں قطعی نہیں ہے (غصّہ سے) مگر یہ فرض ضرور ہے کہ آپ کو یاد دلادوں کہ امّی نے اپنا مہر معاف نہیں کیا ہے۔
شارق : (کسی قدر گھبرا کر) یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔
مسلم : (اگر ایسا نہیں ہوتا تو عظمت خالہ کے ساتھ آپ امّی کو بھی نکال چکے ہوتے۔ (خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) - آیئے امّی میرے ساتھ چلئے۔ خدا کی قسم آپ مجھ کو فرماں بردار پائیں گی۔ عظمت خالہ بھی ساتھ چلیں گی۔
شارق : یہ چال چل کر آپ مجھ سے مہر وصول نہیں کر سکتے۔
مسلم : یہ امّی کی شرافت ہے کہ آج تک اپنے مہر کے بارے میں وہ خاموش ہیں۔ اور جب تک وہ ہمارے ساتھ رہیں گی انھیں اس کی ضرورت نہ ہوگی۔
شارق : لیکن چچی جان کہہ چکی ہیں کہ وہ اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتیں۔

[مسلم خدیجہ بیگم کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ خاموش رہتی ہیں ان کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کش مکش میں مبتلا ہیں کہ کیا فیصلہ کریں۔]

عالیہ : امّی! شاید آپ ہمیں غیر سمجھتی ہیں۔ (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں۔ عالیہ کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر عظمت خالہ کی طرف دیکھ کر) عظمت خالہ آپ ہی سمجھایئے۔

[عظمت خالہ بھی خاموش رہتی ہیں۔ عالیہ انہیں اور کبھی خدیجہ بیگم کو دیکھتی ہے کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد مسلم عالیہ سے مخاطب ہو کر]

مسلم : آؤ عالیہ چلو۔ (کچھ دیر عالیہ خاموش کھڑی رہتی ہے پھر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔ خدیجہ بیگم پہلے تو عالیہ کو جاتا ہوا دیکھتی رہتی ہیں۔ پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں۔ عالیہ پلٹ کر ان سے لپٹ جاتی ہے اور اس کی ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔ سب خاموش کھڑے رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد مسلم عالیہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) آؤ عالیہ چلو۔

[عالیہ خدیجہ بیگم سے الگ ہو کر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔ خدیجہ بیگم چند سیکنڈ رک کر]

خدیجہ بیگم: عالیہ بیٹی (عالیہ ٹھہر جاتی ہے) تم عظمت خالہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ (عالیہ عظمت خالہ کی طرف دیکھتی ہے مگر وہ خاموش کھڑی رہتی ہیں۔ خدیجہ بیگم آہستہ آہستہ الماری کے پاس جاتی ہیں۔ اس میں سے روپیہ نکال کر عظمت خالہ کو دیتے ہوئے) اسے اپنے پاس رکھو میں اس امانت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔

شارق: (طنزیہ) عظمت خالہ کو کیوں دے رہی ہو۔ عالیہ بیگم ہی کو دو نا، جن کی خاطر یہ سارا پلاٹ رچا جا رہا ہے۔

خدیجہ بیگم: بخدا شارق میاں یہ روپیہ عظمت خالہ کا ہے۔

شارق: کسی کا بھی ہو۔ میرے گھر سے باہر نہیں جا سکتا۔

عظمت خالہ: (نفرت آمیز لہجے میں) شارق میاں۔ میں نے کوڑی کوڑی کر کے اپنی موت میت کے لئے جمع کیا ہے۔ اگر تمہاری نیت اس پر بگڑ رہی ہے تو ضرور رکھ لو۔ مگر خدا کے لئے دلہن بیگم کی نیت پر شک کر کے انھیں ذلیل نہ کرو۔

شارق: عظمت خالہ۔ میں ایسا بھولا نہیں ہوں کہ ان سب چالوں کو نہ سمجھتا ہوں۔

عالیہ: (طنز اور نفرت سے) جو اپنے اچھے خاصے چچا کو عدالت میں پاگل ثابت کر کے اس کی وصیت کی دھجیاں اُڑا سکتا ہے جو اپنے باپ کو عدالت میں کھڑے ہو کر آوارہ کہہ سکتا ہے۔ سچ ہے وہ بھولا بھالا نہیں ہو سکتا۔

شارق: (غصّہ سے) عالیہ بیگم آپ میرے چھت کے نیچے ہیں ورنہ ——

مسلم: (بات کاٹ کر) ہم آپ کی چھت کے نیچے ہیں اسی لئے اپنی توہین کا جواب نہیں دے رہے ہیں (عالیہ کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے) آؤ عالیہ۔ شرافت کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے۔

[عالیہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے سے نکل جاتا ہے۔ کوئی کچھ نہیں بولتا۔ صرف خدیجہ بیگم کی ہچکیوں کی آواز آتی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد شارق تلخ لہجے میں]

شارق: چچی جان رونا دھونا بند کیجئے۔ مجھے اس سے چڑ ہے نفرت ہے

عظمت خالہ: تمہیں تو ہر چیز سے نفرت ہے۔ محبت ہے تو صرف پیسے سے۔ (غصّہ سے خدیجہ بیگم کے ہاتھ سے روپیہ لے کر شارق کی طرف بڑھاتے ہوئے) اگر میرے کفن کی ان دھجیوں سے تمہارا پیٹ بھر سکتا ہے تو لو اپنا پیٹ بھر لو۔

شارق: (غصّہ سے) عظمت خالہ میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔

عظمت خالہ: گھر سے نکال کر بڑی عزت بڑھائی ہے۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) خدا کی قسم کبھی عاصم میاں نے بھی مجھے الٹ کر جواب نہیں دیا۔

خدیجہ بیگم: (روپیہ عظمت خالہ کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے) مگر عظمت خالہ یہ روپیہ تمہارا ہے۔ تم۔

عظمت خالہ: دلہن بیگم۔ زندگی بھر محنت کر کے کمایا ہے۔ جو کچھ باقی ہے اس میں بھی محنت کر کے کما لوں گی۔ کم از کم کوئی تمہیں مکار اور جھوٹی تو نہیں کہے گا۔ (غصّہ سے روپیہ فرش پر پھینک کر دروازے کی طرف جاتی ہیں۔ خدیجہ بیگم تیز تیز چل کر انھیں پکڑ لیتی ہیں)

خدیجہ بیگم: کہاں چلیں۔ عظمت خالہ خدا کی قسم میں زندہ نہیں رہوں گی۔

عظمت خالہ: تم بھی میرے ساتھ چلو۔ دلہن بیگم اگر اصیل ہوں تو تمہیں تکلیف نہ ہونے دوں گی۔ زندگی بھر تمہاری خدمت کروں گی

خدیجہ بیگم: نہیں نہیں عظمت خالہ۔ تم اس گھر کو نہ چھوڑو۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ مجھ سے پہلے تم اس گھر میں تھیں۔ یہ تمہارا گھر ہے
عظمت خالہ: دلہن بیگم میں نے تو یہی سوچا تھا کہ جنازہ ہی اس گھر سے نکلے گا۔ مگر جہاں زندوں کی عزت نہ ہو، وہاں مُردوں کو کون پوچھے گا ــــ

[کمرہ سے چلی جاتی ہیں۔ خدیجہ بیگم خاموش کھڑی رہتی ہیں۔ باہر سے ان کی ہچکیوں کی آواز آتی رہتی ہے۔ خدیجہ بیگم کے چہرے پر عجیب و غریب تاثرات پیدا ہوتے ہیں کچھ خاموش کھڑی رہتی ہیں پھر روپیوں کی گڈی اٹھا کر اسے اس طرح غور سے دیکھتی ہیں جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ایک دم اس گڈی کو شارق پر پھینکتی ہیں اور دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر چلی جاتی ہیں۔ باہر سے عظمت خالہ کی گھرائی ہوئی آواز]

دلہن بیگم ــــ آپ کا برقع ــــ (پردہ)

بقیہ، آزاد بستی

مَیں دیکھ رہا ہوں، میں سُن رہا ہوں، میری دونوں آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں اور تیسری آنکھ پوری طرح روشن ہو رہی ہے۔

ماں نالی بند کر کے مطمئن ہو گئی کہ اب باہر کا پانی اندر نہیں آ سکتا، مگر وہ کیوں نہیں سوچتی کہ ہر گھر کے لئے کھلی نالی ضروری ہے ورنہ گھر کا گندا پانی پورے گھر میں پھیل جائے گا۔ اُسے مکان کی نیو پر بڑا اعتماد ہے، مگر سیلاب کا زور آہنی پشتوں کو بہالے جاتا تو پھر یہ کہنہ نیو، جس نے چپکے سے اپنے ہونٹ کھول دئے ہیں اور گھونٹ گھونٹ سیلاب کا پانی پی رہی ہے جس دن اُس کا پیٹ بھرا ایک زوردار دھماکہ ہو گا اور پھر...

ماں کے سارے بال سفید ہو گئے ہیں، اُس کے ہاتھوں میں رعشہ ہے مگر وہ گرتی دیواروں پر گیلی مٹی تھوپ رہی ہے۔ ایک جگہ کی مرمت کرتی ہے تو دوسری جگہ گر جاتی ہے، دوسری جگہ کی مرمت کی تو تیسری جگہ کی گر جاتی ہے۔

میری ماں کی تیسری آنکھ کب کھُلے گی؟؟ ــ

بقیہ: مستثنیات

وہ شخص جو ابھی تمہارے پہلو سے اُٹھ کر گیا ہے اب واپس نہیں آئے گا۔ اُس نے پوچھا ہے کہ "میں تو پہلے ہی کہتی تھی؟" کہہ کہہ کر تم بہت خوش ہونا؟

مَیں کمرے میں تنہا تمام روشنیاں بجھا کر لیٹا ہوں۔ کھڑکی سے سیاہ آسمان جھانک رہا ہے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ۷ بج رہی ہے۔ یقیناً کوئی انشورنس ایجنٹ یا اور کوئی مشتہر ہو گا۔

سماج کا یہ آخری ربط بھی ٹوٹ جانے دو۔

کلچرل اکادمی، رینہ ہاؤس جگ جیون روڈ گیا

نومبر، دسمبر ۱۹۷۴ء

شمارہ ۵۳/۵۴

دفتر کا پتہ :
رینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ گیا

فون :
رہائش : ۵۳
دفتر : ۴۳۲

کتابت :
قمر نظامی

طباعت :
ہند لیتھو پریس یکلوڈ گنج گیا

شرح خریداری

سال کے لئے	۱۵ روپے
دو سال کے لئے	۲۸ روپے
تین سال کے لئے	۴۰ روپے

فی شمارہ

ایک روپیہ پچیس پیسے

مدیر

کلام حیدری

محتویات

مزامیر

مضامین

افسانے

تبصرے

نظمیں

غزلیں

حمزا میر

'خالص ادب' کی بات بھی اتنی گمراہ کُن ہے جتنی 'مقصدی ادب' کی بات۔ اور دونوں میں سے کوئی بھی سچ نہیں۔ ادب اگر سچ نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے۔ سچ کے لئے بڑی جراءت کی ضرورت ہے، سچ کے اظہار کے لئے ہنرمندی، ریاضت اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ سچ اگر بھونڈا ہو تو سچ لگتا ہی نہیں ہے۔ اس میں کشش بھی نہیں ہوتی۔ اس میں محو کر لینے کی صلاحیت بھی نہیں ہوتی۔

سچ کا بیوپار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ اسے کرنسی میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا اس کی تخلیق طمانیت بخش سکتی ہے، اس میں کھو کر اپنے آپ کو پایا جا سکتا ہے۔ اس میں محو ہو کر ماورائے دنیا ہوا جا سکتا ہے، مگر اس کی تجارت نہیں کی جا سکتی۔ فرماں روائے وقت کے انعامات بھی حاصل نہیں کئے جا سکتے سچ کی تخلیق ماضی بھی ہے، حال بھی ہے، مستقبل بھی۔

'سچ' کے گرد کوئی حصار نہیں کھینچا جا سکتا۔ یہ عصر کا، نہ مکان کا ———— 'عصری ادب' سے بڑھ کر جھوٹ دنیائے ادب میں کوئی نہیں ہے۔ جھوٹ سے ادب کا کیا تعلق؟ ہرچند کہ بعض مرتبہ رفع حجت کے خیال سے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ادب عصری ہوتے ہوئے ادب ہوتا ہے۔ شیر و شکر۔ کہ ان کو الگ الگ نہ کیا جا سکے وغیرہ وغیرہ

مگر سچ یہ ہے کہ ادب 'مفاہمت' کا نام نہیں ہے، ادب 'توازن' کا نام بھی نہیں ہے ان حصاروں میں اسے بند کرنے کی نہ کوششیں نئی ہیں اور نہ اس کوششوں کی ناکامی نئی ہے۔ اس لئے ادب کل بھی محفوظ تھا، آج بھی محفوظ ہے، کل بھی محفوظ رہے گا۔

کلیم الدین احمد

کی

خود نوشت

اپنی تلاش میں

شائع ہو گئی

قیمت : فی جلد تیس روپئے

ہر کتب فروش سے طلب کریں یا براہِ راست ہمیں لکھیے

کلچرل اکیڈمی ، رینہ ہاؤس ، جگ جیون روڈ ، گیا

قتیل شفائی

اے میری انا، جاگ!

میں نے تجھے ماضی کے دریچے میں سجا کر
سوچا تھا، تجھے دیکھنے آئے گا زمانہ
اِک بھیڑ سی لگ جائے گی یادوں کی گلی میں

میں آج بصد یاس تجھے دیکھ رہا ہوں
اب تیرے خد و خال پہ اک دھول جمی ہے
پہلی سی چمک اب نہیں سونے کی ڈلی میں

اس دَورِ خزاں میں ہے مجھے تیری ضرورت
بادل ہے تو سوکھی ہوئی دھرتی پہ برس جا
خوشبو ہے تو ہلچل سی مچا بند کلی میں
اے میری انا، جاگ ———— !

اسلم عمادی

جدید شاعری کے چند نئے موضوعات

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نئی شاعری پرانی شاعری سے مختلف ہے تو اختلاف کی وضاحت اور اس کے امتیاز کا اعلان ہو جاتا ہے۔ بہ طرزِ دیگر اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ نئی شاعری کے چند واضح اضلاع (PERIMETERS) پرانی شاعری سے مختلف ہیں۔ اب نئی شاعری نے کیا کیا تبدیلیاں پیش کیں اس کی توضیح ایک قسم کا تجزیاتی عمل ہے۔ نئی شاعری کی ابتدا کے بعد ایک وقت تک تو اس کی نامانوسیت، اجنبیت اور بغاوت کو نیم پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ لیکن "جو پتھر یہ پانی پڑے متصل"
اب نئی شاعری کے علاوہ دوسری ہر شاعری ہماری نگاہ میں غیر دلچسپ اور اکتا دینے والی محسوس ہوتی ہے۔

نئی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے جو کوششیں ہوئی ہیں ان میں اہم ترین کتاب وزیر آغا کی "اردو شاعری کا مزاج" ہے۔ کتاب کا مقصد [illegible] کا عنوان ہے) نئی اردو شاعری کی تخلیق کرنے والے ذہن کا مطالعہ ہے۔ اس تعبیر میں کن کن سماجیاتی، بدنیاتی [illegible] عناصر کا حصہ ہے۔ گویا کہ یہ کتاب اردو نئی شاعری کے تحت شعور کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کے بعد سب سے قابل ذکر [illegible] لب کے ہیں جن کا پسندیدہ موضوع ترسیل و ابلاغ کے مسائل ہیں اور اسی طرح شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مضامین اور تبصروں [illegible] اظہار و لفظیات کو موضوع کے مقابل میں زیادہ اہمیت دی ہے۔ نئی شاعری کے موضوعات کا ذکر یوں تو بارہا آیا ہے لیکن ان کو اہمیت کم ہی دی گئی ہے۔ یہ بات صحیح بھی ہے۔ عمیق حنفی، بشر نواز، شکیل الرحمن اور فضیل جعفری نے مختلف سمتوں میں نظریات و موضوعاتِ ادب کو مطالعہ کے لئے منتخب کیا۔ ان ادیبوں میں شکیل الرحمن کا نقطۂ نظر شاعری کے نفسیاتی رُخ پر ہے اور میدان کافی تخلیقی ہے۔ عمیق حنفی کے مضامین اور تحریریں خصوصاً "مشغلہ کی شناخت" ان کی عظیم شاعری ہی کی طرح انتہائی گہرے، معنی خیز ہیں، انہوں نے حصارِ ذات، خالی پن کا احساس، سماجیاتی کشاکش کو تکرار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فضیل جعفری نے تنہائی اور بے زمینی کو اپنے مضامین میں خصوصی اہمیت دی ہے۔ میں ناموں کی فہرست بنانے کی بجائے نفسِ مضمون کی طرف لوٹتا ہوں۔

گرچہ ایک مدت سے اس بات کی تشدید کی جا رہی ہے کہ شاعری موضوعات کی نہیں بلکہ خالص شاعری ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ذہنی یکسانیت اور کچھ حد تک تقلیدی شعور نے چند واضح موضوعات بنا ڈالے ہیں۔ ان کا ایک جائزہ پیش نظر ہے۔

ہر نسل جب دنیا میں وجود پاتی ہے تو اپنے آپ کو اپنے سے قبل کی نسل کے بنائے ہوئے اصولوں میں پھنسا ہوا پاتی ہے اور

ہر نئی نسل اپنے تحتِ شعور میں اس نظام کو (جو موجود ہے) اپنی بلاغت کے میعار پر ناپتی ہے ۔ مثلاً ہم ترقی پسندوں کی شاعری کو اپنے طور پر پڑھتے ہیں تو ہم کو اس میں سیاست، ریا اور تبلیغ کا عنصر ملتا ہے اسی طرح جب کوئی ترقی پسند قدیم شاعری کو پڑھتا تھا تو اس میں لگاوٹ، بے کرداری اور بے معنویت کا رنگ پاتا تھا ۔ لیکن ذرا ٹھہر کر اس صدیوں سے بھی طویل زنجیر کی طرف دیکھئے تو ہمار ... دکھ دیتا ہے کہ تقلیدی اور مصنوعی لب و لہجہ میں رد کیا جاتا ہے ۔ میں ایک ترقی پسند کی اس بات کو سچا سمجھتا ہوں کہ ... نی، تجو د دہلوی عزیز لکھنوی، جگر مرادآبادی اور اسی قبیل کے دوسرے شاعر قابلِ تردید تھے ۔ اس لئے کہ وہ زمانے سے میلوں دور اپنی مستعار ذہنیت و تہذیب کے زیرِ سایہ :

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گذرے
تو زندگی مری کیسے کٹے کہاں گذرے

جیسے اشعار کہہ رہے تھے ۔ اسی طرح ترقی پسندوں کی نام نہاد آخری پود بھی بزرگوں کے مزاروں پر روشنی جلانے کا کام کر رہی تھی ۔ ادب عبقریت، نورت اور خلوص کا نام ہے مجاوری کا نہیں ۔ ہماری نسل اس دور میں زندہ ہوئی ہے ۔ جس میں انسانی رشتوں کے تاو بے لوچ ہو چکے ہیں ۔ انسان سب سے ہو کر مشینی دور میں داخل ہو چکا ہے ۔ مشینی دور سے مراد ہے ایک ایسا دور جس میں انسان ایک ضابطۂ عمل اور نظام الاوقات کا اسیر ہو گیا ہے ۔ آپ ہی سوچئے کہ آپ کو اپنے دفتر جانا ہے وقت کم ہے اور ایسی صورت میں آپ ایک شخص کو زخمی ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کیا آپ اس شخص کی مدد کے لئے اپنا دفتر چھوڑ سکتے ہیں ؟ نہیں ۔! آپ پلٹ کر دیکھیں گے پھر آگے چلے جائیں گے اور اسے اس امید پر چھوڑ دیں گے کہ یہ کام (ہمدردی) دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں ۔ کیا آپ ظالم ہیں ؟ قطعاً نہیں ۔ کیونکہ اس آدمی کی مدد کرنا آپ کے ضابطۂ عمل میں نہیں ۔ ایسے لمحے میں :

آدمی ریل کی پٹریاں بن گئے
ریل کی پٹریاں آدمی بن سکیں گی کبھی

_________ عمیق حنفی

یہ سطور آپ کو ذہنی فرحت بخش دیتی ہیں ۔ آدمی مجبور بلکہ HELPLESS ہو کر رہ گیا ہے ۔ تنہا اور بے یار و مددگار ۔!

تنہائی جدید شاعری کا اہم ترین نہ سہی عام ترین موضوع ہے ۔ یوں تو ماضی میں بھی تنہائی غالب، مومن، یاس یگانہ اور اقبال کے کلام میں عکس نما ہے لیکن نئے شہر میں تنہائی کا جتنا گھنیرا سایہ ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھا ۔ نئی شاعری کے تعین میں اکثر اس نقطے کا ذکر کیا گیا ہے بلکہ بیشتر دانش ور تنہائی کو نئی شاعری کا نقطۂ اشاعت سمجھتے ہیں ۔

تنہائی، ذہنی، ذاتی، سماجی اور تہذیبی تنہائی ہے ۔ ہر شخص بذاتِ خود ایک سماج اور ایک تہذیب ہوتا ہے ۔ اس کا ایک شخصی آئینۂ اخلاق اور اصولِ زندگی ہوتا ہے ۔ اس کے محسوسات اور جذبات اس کے اخلاق سے رنگ آمیزی کر کے اس کا ایک مختلف مقام بناتے ہیں ۔ نیا شخص کھو کھلا ہے ۔ اس کے اخلاق سے متاثر ہونے والا دوئم مفقود ہے ۔ اس کے پوزیشن کو دوسرا شخص اس دل چسپی سے نہیں دیکھتا جس کا وہ خواہاں ہے ۔ معاشی اور سماجی نا آسودگی، وقت اور وقت کی کمیابی، مادی انحراف اور روحانی صحرائیت ہر فرد کو اپنے وجود میں تنہا کر دیتی ہے ۔ موجودہ زندگی ایک ایسی رزم گاہ ہے ، جس کا ہر پیاہی اپنی جان کی حفاظت کے لئے آپ لڑ رہا ہے ، یہ ایک ایسا غیر منظم مقابلہ ہے کہ اپنی خصوصیات کو واضح رکھنے کا امکان نایاب ہے ۔

بہت سے لوگ عنوان کی روح تک تو پہنچتے نہیں لیکن اسی کو بہتر سمجھنے لگے کہ ہر غزل میں دو شعر تنہائی پر لکھ دیں ۔ نظم میں

تنہائی کا ذکر کر دیں۔ ظاہر ہے کہ نتیجہ میں جو شاعری آئی، وہ بے اصل ہے۔ اس عملِ غیر صحیح میں ایک اچھی خاصی تعداد شریک ہے۔ تنہائی کا کرب، تنہائی کے اسم مبارک کو لینے سے نہیں ظاہر ہو سکتا۔ اہم بات نئے شاعروں میں نام لکھوانے کی نہیں بلکہ نئے لہجہ نئے اسلوب میں کچھ کہنے کی ہے۔ آپ رسائل میں چھپنے والے بیشتر شعرا کی تخلیقات کو بہ نظرِ جستجو پڑھئے۔ وہی باتیں، علامات اور پیکر صورت بدل بدل کر بہ تہذیب قافیہ یا بہ ترتیب ہیئت جمع ہو جاتے ہیں۔ زبان بیان سب معیار پر اترتے ہیں لیکن ان کی حقیقت نئی شاعری میں صفر ہے۔ بے کار ہیں۔ تنہائی کا صحرا، تنہائی کا جنگل، تنہائی کا زہر، تنہائی کا درخت، تنہائی کا گھر اور نہ جانے کیا کیا ہو گیا ہے۔ گویا تنہائی کا وہی مقام ہے جو پہلے کے شاعروں کے لئے محبوب کی جفا کا اور ترقی پسندوں کے دور میں حاکم کی جفا کا تھا۔ آپ اچھی مثالیں چاہتے ہیں۔ لیجئے:

ابھی غیر دل چسپ ہو جائیں گے ہم
ابھی تم کہو گے کہ بے کار ہے گفتگو کا بہانہ
....

—— بلراج کومل

خود پہ بھی کیوں یقیں نہیں آتا
دن میں بھی خواب کے اثر میں ہوں

—— ظفر غوری

دیکھتے دیکھتے
نیلے پانی پہ لکھی ہوئی
چاند کے نرم ہاتھوں کی تحریر بھی مٹ گئی
تب نگاہیں جہاں تک مرے ساتھ تھیں
دوسرا کون تھا ؟
کوئی بھی تو نہیں —
....

....
کالے گنبد سے ٹکرا کے لوٹ آئی تو
خود مجھے اس کی صورت سے خوف آ گیا / میری بینائی گویائی سب مر گئی
اب فقط ایک حِس ہوں سماعت ہوں میں

—— بشر نواز

تنہائی کا کرب فی الحقیقت مختلف جہات میں عیاں ہوتا ہے۔ کبھی یہ کرب انسان کی انفرادیت کے مسمار ہونے کا المیہ ہوتا ہے تو کبھی یہ اس کی خود فراموشی کا نغمہ ہوتا ہے تنہائی چونکہ ذہنی سماجی اور فکری ہوتی ہے اس لئے اس کا بدنی یا جسمانی آلودگیوں سے رشتہ نہیں ہوتا۔

انسان کے اندر بذاتِ خود دو انسان ہوتے ہیں ایک تو اس کا مثالی شخص (IDEAL PERSON) ہوتا ہے۔ دوسرا اس کا حقیقی عکس (REAL PERSON) ہوتا ہے۔ میں اپنے لئے ذہن میں ایک خاص طرزِ وجود کو پسند کرتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ مجھے اس شکل میں چاہا اور پایا جائے لیکن میری چند قدرتی اور فطری خصوصیات (یا کمزوریاں) ہیں جن کا شاید مجھے پتہ بھی نہیں۔ یہ کرب اس وقت مجھے اپنے شکنجے میں لے لیتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے ہم نفس مجھے (یعنی میرے مثالی شخص سے) ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گویا مجھے اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ میں بذاتِ خود اپنے شخص سے دور ہوں اور میرا عکس جھوٹا ہے۔ یہ احساس انسان کو ایک دورخی شکل سے دو چار کر دیتا ہے پہلے رُخ کی حفاظت اور دوسرے رُخ کی تزئین کتنا دشوار کام ہے۔ انسان دوڑتا ہے ایک ایسے سمندر کی جانب جہاں وہ اس جھوٹے چہرے کو غرق کر دے۔ وہ ایک غیر شخصی کیفیت میں ہے۔ وہ اپنے آپ کو فریب دیتا ہے۔ سوچتا ہے کہ شاید اس کا ہر عمل ایک مسلسل اداکاری کا ایک چھوٹا سا گوشہ ہے۔ وہ غمگین ہے لیکن اس کے چہرے پر مسرت کا مُکھٹا لگا ہوا ہے۔ وہ خوش ہے لیکن اس کی آنکھوں میں تعزیت کے آنسو چھلک رہے ہیں۔ وہ ماحول کا اسیر ہے۔ ایسا اسیر جو تپش اور دباؤ کے تحت اپنی حقیقی شکل کو بدل دیتا ہے۔ اور اس گہرے ILLUSION کا شکار ہونے کے بعد وہ جب اپنے "مثالی کردار" کا سایہ دیکھتا ہے تو ــــ

عجب سانحہ مجھ پر گذر گیا یارو\
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

ــــــــ شہریار

یہ روحیں اس لئے چہروں سے خود کو ڈھانپے ہیں\
لے ضمیر تو الزام بے وفائی نہ دے

ــــــــ وحید اختر

اس سے ذرا ہٹ کر ایک ایسا لمحہ بھی آتا ہے کہ شاعر اپنی انفرادیت کو نہیں جانتا وہ دیکھتا ہے کہ تمام چہرے ملیک سے ہیں تمام جذبات، تمام رنگ و روغن، تمام نظریات مٹ چکے ہیں۔ اور ایسے لمحے میں وہ چاہتا ہے کہ اس کو پہچانا جائے۔ انفرادیت کی شکست ذہن فرسا ہے۔ اور تنہائی کے درد کو بڑھا دیتی ہے۔ انفرادیت کو قائم رکھنے والا ایک ایسا شخص ہے جو تیز دوڑتے ہوئے ایک بے پناہ ہجوم میں بے تعلق گذارہ کرسکے۔ کتنا دشوار ہے اس کا تجربہ۔ غالباً انفرادیت کی شکست منفرد خصوصیات کی شادیوں کے افراط کا سبب۔ ایسی افراط کہ واحد چہرے کی تلاش ناممکن ہے۔ زمین کا کینوس جتنا مختصر ہوتا جاتا ہے۔ اتنا ہی انسان ترقی کی سرحدوں کو پار کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ تمام شکلیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں اور ان کی پہچانیں ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتی ہیں۔

اینٹی ہیرو اور ABSURD کردار اسی انتشار کی آئینہ دار ہیں۔ یہ کردار ایک نئی اور منفرد شکل کی تلاش کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اس سیل بے کراں میں دادِ ہنر یا تمغۂ عظمت کی خواہش کی بجائے ہر شخص اپنے آپ کو ایک جداگانہ انداز میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اور ایسے لمحہ میں

چیخ اٹھتی ہے ۔

یہ تمنا نہیں اب دادِ ہنر دے کوئی
آ کے مجھ کو مرے ہونے کی خبر دے کوئی

خلیل الرحمٰن اعظمی

روحوں کو دوام دینے والو
جسموں کی سبیل کچھ نکالو
شعلہ کوئی مستعار دے دو
یا لاش کو اب مزار دے دو

عزیز قیسی

آج کی زندگی میں رشتے جو کہ ٹوٹ گئے ہیں، لایعنی ہیں اور اس لایعنی چیز کا ماتم وہی کر سکتا ہے جس کے سینے میں آزاد اور بے باک شعلہ ہو۔ سماجی جانور رسوم و قیود کی چکی میں پس کر اپنے آپ کو انسانیت کا ایک بے معنی حصہ بنا چکے ہیں ۔ سرمایہ داری کے خلاف احتجاج کرنے والے رہبروں نے اپنے فن کو سرمایہ کے حوالہ کر دیا ۔ اور سرمایہ دار بن گئے ۔ یہ دعویٰ کرنے والے تھے ۔ جدید شاعر پیغمبری کا دعویٰ نہیں کرتا وہ اپنے احتجاج کو مبہم لیکن طاقت ور لہجے میں پیش کرتا ہے۔

یہ باتیں تو تنہائی کے بارے میں تھیں ۔ دوسرا موضوع ہے ذات ۔ ذات کے بارے میں نئی شاعری میں مختلف تراکیب پیدا ہوئی ہیں حصارِ ذات، غمِ ذات، شعلۂ ذات، صحرائے ذات وغیرہ ۔ ذات ایک بہت قدیم اور فلسفیانہ عنوان ہے ۔ اس کے سمجھنے کے لئے انسانی فطرت، اس کی حقیقت اور اس کے اندر کی نفسیات شکست و ریخت کا سمجھنا ضروری ہے ۔ اس عنوان کی اشاعت میں کمیتا حنفی نے گہرے DEVOTION کے ساتھ کام کیا ہے ۔ یہ ایک بسیط موضوع ہے ۔ اکثر مقلد چیخ چیخ کر گانے لگے کہ میں اپنی ذات سے جدا ہوں، میرے پاس ذات کا غم ہے ، میں ذات کے حصار میں قید ہوں ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ ان خرافات کا ادب سے کوئی رشتہ نہیں ۔ ذات کا شعور انسان کا وہ شعور ہے جس کے ذریعے اپنے آپ کو فن کار مرکز جان کر دائرے کھینچتا ہے ، دائروں میں جو بھی شکلیں بنتی ہیں ۔ وہ کائنات کا نظام رکھتی ہیں۔

ذات ایک کائنات ہے جس میں تمام انبساط کی کیفیات اور غم کی نیرنگیاں پوشیدہ ہیں ۔ اس کا قلندر یہ نہیں دیکھتا کہ X یا ✓ علامت مجموعی طور پر کس جانب رکھی جا سکتی ہیں، منفی یا مثبت ۔ ؟ وہ زندگی کی حقائق کا منکر نہیں ہوتا لیکن وہ مجازی کھلونوں سے زندگی کے حقائق کا تعلق قطع کر دیتا ہے ، وہ ابدی موت کا قائل نہیں بلکہ حیات میں تزکیہ کا متلاشی ہے ، وہ یہ نہیں سوچتا کہ ایک کردار اور دوسرے کردار میں کیا مکالمہ ہوتا ہے ۔۔۔۔ وہ تو اس مکالمہ میں اپنے رنگ کو ڈھونڈتا ہے ۔

فلسفۂ ذات قطعاً نیا فلسفہ نہیں ، بلکہ اس کا آفاقی فنون سے بنیادی رشتہ ہے ۔ ذات کا طویل و لبیا سمندر اپنے اندر خاموش شانوں سے جاگتی ہوئی صبحوں تک چیختی ہوئی آنکھوں سے دھندلاتے ہوئے چہروں تک ہنستی ہوئی روشنی سے بے زبان اندھیروں تک ہر فاصلہ کو پوشیدہ رکھتا ہے ۔ انسان کو اگر ذات کا عرفان نصیب ہو تو وہ طاقت ور ترین اور دانش ور ترین ہو جاتا ہے ۔

بیس صدیوں کا سیولا ہو تم
آپ اپنے میں اُترتی ہوئی

چپ چاپ گھاؤں میں
گھنے پیڑ تلے
کھوجتا رہتا ہوں بتلاؤ کہاں کھو گئے تم ۔ ؟
ورثہ ــــ قاضی سلیم

آتا ہوں میں زمانے کی آنکھوں میں رات دن
لیکن خود اپنی نظروں سے اب تک نہاں ہوں میں
ــــ عمیق حنفی

عروجِ ذات وہ مقام ہے کہ جب انسان کو خود دگم شدگی میں سرور ملتا ہے وہ درد میں لذت لیتا ہے ۔ اس کی زندگی میں ایسی جمالیاتی حس داخل ہوتی ہے جو اسے سراب میں لذتِ سیرابی، خواب میں کمالِ تعبیر اور زخم میں ایقان زندگی عطا کرتی ہے ۔

ذات کے شعلوں کی لپیٹ میں کائناتِ فکر و نظر آ جاتی ہے
دہکتے ہوئے گرم آکاش کا ایک ٹکڑا
مری انگلیوں پر مچلنے لگا ہے
ادھر گھومتے گھومتے مرے پاؤں کے نیچے زمیں رک گئی ہے
دوسری موت ــــ حمید الماس

نئی شاعری کا ایک مقبول عام موضوع موجودہ زندگی کی بے معنویت ہے ۔ موجودہ زندگی انسان کے OPTION کو کوئی اہمیت نہیں دیتی اور وہ اس پر ایک نظام الاوقات نافذ کر دیتی ہے ۔ یہ زندگی کا رویہ انسان پر عجیب سا دباؤ ڈالتا ہے ۔

اس پابند اور منقسم زندگی کا ردعمل فرد پر دو طرز سے ہوتا ہے (۱) شینیت (۲) غیر حقیقی حقائق کا احساس۔ شینیت کا یہ عالم ہے کہ آپ کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ چاہے موسم کل خوب صورت ہو یا خراب آپ کو فلاں وقت پر فلاں حالت پیدا ہوتا ہے ۔ میں نے اپنے ایک شعر میں اس بات کو یوں ادا کیا ہے ؎

کل بھی اس وقت بس یہی ہوگا
پہلے اتنا تھا اعتبار کہاں

دوسرا ردعمل آپ پر اس وقت ہوتا ہے جب آپ کے پاس فرصت ہو اور آپ دوسروں کے سلوک اور ماحول میں بے انتہا بے دردی محسوس کریں ۔

ایک طرف تو ایسے روز و شب ہیں جن میں لوگ زندگی کو لمحہ لمحہ کر کے قتل کرتے ہیں ۔ دوسری طرف ایسی زندگی ہے جو اتنی کم فرصت ہے کہ اپنے تمناؤں پر نظر کرنے کی مہلت نہیں دیتی ۔ اس بندھن میں اصلی انسان کہاں ہے ؟ قدرت و فطرت سے بہرہ اندوز و لطف اندوز ہونے کا ذوق کس کام کا ؟ ہندوستان کی نئی نسل اپنے پرکھوں کی طرف حیرت سے دیکھتی ہے کہ انھیں کتنی سادہ ستھری، اور غیر شعوری زندگی نصیب ہوتی تھی ۔ نئی زندگی ایک قید خانہ میں تبدیل ہو گئی ہے ۔ اختیاری اور موجود قید خانہ ۔

بارشوں میں اس سے جا کے ملنے کی حسرت کہاں
کو گئے دو کوٹلوں کو اب مجھے فرصت کہاں

—————— منیر نیازی

پڑھتے ہیں لوگ ہجر کے لمحات میں کتاب
ہم بھی اُچھالتے ہیں خرابات میں کتاب

—————— ذفار خلیل

شاید اک دن
مجھ کو دفنانے کی بھی
فرصت نہ ملے گی
میرے اپنے بیٹے کو
اور بھی غم ہیں زمانے میں

—————— حمید الماس

نئی شاعری کا ایک اہم موضوع "موت" ہے۔ موت ہماری زندگی کے ان مسائل میں سے ہے جن کے خلاف ہماری ساری تاریخ جنگ کرتی رہی ہے۔ اس کو آج سے پہلے بھی اتنی ہی اہمیت تھی۔ ذوالقرنین آبِ حیات کی تلاش میں پھرتا رہا۔ بدھا نے موت کو ذریعۂ نجات قرار دیا۔ یہ مسئلہ اردو شاعری میں بھی اکثر زیر بحث رہا۔ دو عمدہ اشعار ہیں۔

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

—————— میر

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے ان ہی اجزا کا پریشاں ہونا

—————— چکبست

لیکن قدیم طرزِ فکر میں سنجیدگی، اطمینان اور فلسفہ طرازی تھی۔ غالباً یہ اس معاشرہ کی کامل پسندی اور غیر جذباتیت کا نتیجہ تھی۔ نیا شاعر جس ماحول میں ہے وہ جذباتیت کا خواہاں ہے۔ سکون و خوش گزاری موجودہ زندگی میں عنقا ہو گئے ہیں۔ موت کے موضوع نے گذشتہ ۲۵ برسوں میں عالمی ادب پر قبضہ کر لیا ہے غالباً اس کی وجہ سائنسی بغاوتوں، اصولی نظریات اور مذہبی آزادی کے مقابل موت کی فصیل سخت کی ثابت قدمی ہے۔ موت کے موضوع کے دو رخ ہیں۔ (۱) موت سے خوف (۲) موت سے عشق

موت سے خوف زدہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی علامات سے متنفر نہیں ہیں لیکن زندگی سے پیار بھی نہیں کرتے انھیں صرف اس بات کا خوف ہے کہ کہیں یہ رہی سہی علامات بھی ختم نہ ہو جائیں۔ دوسری جانب موت ہماری زندگی کا ایک عجیب غریب لمحہ انبساط ہے جب ہم دنیا و مافیہا کی نیازمندیوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، دنیا کی کش مکش، روز و شب کے فتنہ و فساد، معصومیت کی شکست ہمیں جس ذہنی کوفت اور سانسوں پر پڑے ہوئے جس بوجھ سے دوچار کرتی ہیں۔ ان سے ہم موت کے دامن میں چھپ کر فرار حاصل کر سکتے ہیں۔ ن۔م راشد کا

نظم "دریچے کے قریب" ہو یا عمیق حنفی کی "موت کے لئے ایک نظم" یا شمس الرحمٰن فاروقی کی "مناجات" - ان سب کے پیچھے انسان کا بنیادی جذبۂ حریت ہے۔ جو مریضانہ ذہنیت والوں کی نگاہ میں فراریت کے بدمزہ سے نام کے تحت پہچانا جاتا ہے۔ ہمارے متصوفانہ سرمائے میں بھی موت ایک مرتکز نقطۂ انبساط ہے۔ فنائیت، عرفان، نروان، مکتی اور کثرت سے وحدت کی طرف رجوع غالباً موت ہی کے عشق کی علامتیں ہیں۔ جدید شاعر موت کو ایک بسیط معنی میں استعمال کرتا ہے۔ چند مثالیں لیجئے۔

زمستاں میں تمازت کے جزیرے میں بناؤں گا
اگرچہ اس حسیں لمحے میں بھی
چاروں طرف آواز ہوگی
موت کی آواز
لاکھوں صورتوں میں
اور ہم سب کو ڈرائے گی
ہمیں ہر روشنی سے جانب ظلمت بلائے گی

——— جزیرے ——— بلراج کومل

میں عکسِ آرزو تھا ہوا لے گئی مجھے
زندانِ آب و گل سے چھڑا لے گئی مجھے ——— زیب غوری

کن حرفوں میں جان ہے میری
کن لفظوں پر دم نکلے گا
سوچ رہا ہوں
ابجد ساری یاد ہے مجھ کو
لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ ——— آخری لفظ پہلی آواز ——— سلیمان اریب

موت کے بعد جدید شاعری کا ایک عام عنوان "مستقل اقدار سے اختلاف" ہے۔ جدید شاعر زندگی کے کسی فلسفے، کسی بنے ہوئے طرز زندگی کسی اصولی آدرش سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اقدار ٹوٹ گئی ہیں یا معدوم ختم ہوگئی ہیں۔ ان وہ نئے ماحول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کررہی ہیں۔ مثلاً کل کی عیدیں آج چاہے کتنی ہی عجیب لگیں کل کے عوام کے لئے مسرت کا سرچشمہ تھیں۔ آج پھر ہم نے چند عیدیں بنالی ہیں اور اجتماعی مسرت کا حصول کرتے ہیں۔ اندازِ فکر اور APPROACH کی یہی یکسانیت شاعر کو برانگیختہ کردیتی ہے جب ہم نئی دنیا بساتے ہیں تو اپنے آپ کو نئے اصول بناکر دوبارہ کیوں مقید کرلیتے ہیں۔ نیا شاعر اس تنظیم ESTABLISHMENT کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے عموماً اس رجحان کو تشکیک پسندی کا عجیب و غریب نام دیا جاتا ہے اس بغاوت سے دو رجحانات چل پڑے ہیں۔ ایک رجحان تشدد پسند ہے اور بنیادی اوامر سے بھی بےزار ہے۔ دوسرا رجحان معتدل

ردعمل کی صورت میں ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ یہ بغاوت صرف آئینہ پیش کرتی ہے یا عکس کے ہاتھ میں ہتھیار بھی دیتی ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ نیاشاعر INERT (خاموش) بغاوت کا عادی ہے۔ وہ بدترین مناظر کو پیش کرتا ہے، اس کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن اس میں مشورہ دینے کی ہمت نہیں ہے۔

موجودہ معاشرہ ایک تعمیمی انتشار سے گزر رہا ہے۔ تعمیمی انتشار سے مراد موجودہ سماجی فلسفوں کی تعمیمی کیفیت کا انتشار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک معمولی یا غیر معمولی سی شخصی کوشش ہوتا ہے کہ سماجی فلسفی ایک خاص حل تلاش کرتا ہے جس سے کہ عالم کا ارتقاء ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک معمولی یا غیر معمولی سی شخصی کوشش ہوتی ہے جس کو وہ منطق کی (جو صریح بھی ہو سکتی ہے غیر صریح بھی) مدد سے ہر مسئلہ کا حل قرار دیتا ہے۔ مثلاً مارکس کی معاشی معاشرت گاندھی کی روادارانہ معاشرت اور رادھا کرشنن کی ویدک معاشرت۔

میرا تجزیہ ہے کہ ایسے حل کسی کو خوش نہیں کر سکتے۔ نہ غریب خوش نہ امیر خوش۔ اسی طرح ہماری ذہنی تربیت ایک ہی نگاہ میں دو مخالف طرزِ فکر کی تعریف کرتے ہیں۔ اس رویہ کو نام نہاد رواداری کہا جاتا ہے بدتہذیبی کی علامت ہے۔ ہم ایک ہی نگاہ میں دو مخالف طرزِ فکر کی تعریف کرتے ہیں۔ ایسی بدتہذیبی ہمارے نوجوان کو خلفشار سے دوچار کرتی ہے وہ ہر اصول کو اپنے طور پر رد کرتا ہے رد اس لئے کرتا ہے کہ وہ سادہ زندگی کا متمنائی ہے۔ وہ اقدار کی الجھنوں سے ایک ایسے شخص کی طرح نکلتا ہے جو غرقابی سے نکل کر سانس لینے کی کوشش کرے۔ نیا شاعر اس ماحول میں شریک ہو کر بھی SELECTIVE یعنی تخصیص پسند ہے۔ ان رجحانات کے پیشِ نظر دو طرزوں کی شاعری پیدا ہوئی۔ دونوں ہی قابلِ غور ہیں:

ہڈیاں گوشت کے خوب صورت غلافوں میں
پھر سے لپٹنے لگیں
زندہ رہنے کا ہر فلسفہ
نیند کی کھائی میں کھو گیا۔

کل برہنہ ملی تھی مجھے ________ حسن فرخ

سلاسل بہ پا روحِ انسانیت ہے
اٹھا دو یہ تابوتِ آداب و قدغن
جلا دو یہ اوراقِ فکرِ پریشاں
سعیر و سقر کی نمائندہ سوچیں
مرے دردکا کیا مداوا کریں گی
کہاں قدسیانِ خلوص و وفا
ازل تا ابد ہادیہ ہادیہ ہوں
ازل تا ابد ہادیہ ہادیہ ہوں

ہادیہ ________ صہبا وحید

معبدوں کے چراغوں میں روغن نہیں
آج ایمان کا کوئی مسکن نہیں
———— عمیق حنفی

تجویز ہو رہی ہے دبا دیا جائے
مزاج کی رونقیں نفاست وسیلے قانون صاف ستھرا رکھیں گے
بجز قدیم ذرے گلو وگفتار میلے کرتے رہے ہیں، فٹ پاتھ
منضبط شہری زندگی کے علاوہ کنکریٹ روشن

نفیس لامرکزیتِ اظہار ——— افتخار جالب

ایک اور رجحان ہے جو ہماری زندگی سے قریب ترین ہے۔ وہ ہے انسانیت سے محبت۔ عجیب بات ہے کہ جدیدیت میں جس خلوص کے ساتھ انسانی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں کی گئی تھی۔

ترقی پسند شاعری میں انسانی نفسیات، معصوم لمحوں کی گرفتاری اور سادگی کے بجائے مواد اور طرز اظہار کو اہمیت دی جاتی رہی۔ شاعری مصنوعی کرداروں کے سہارے چلتی اور شاعر کے سوچے سمجھے STEPS پر قدم بہ قدم ختم ہوتی۔ مزدور کے پسینے کی تعریف کے لئے کوہِ نور سے کوہِ طور تک کی ہر مثال شان و شوکت کے ساتھ روندی جاتی۔ ظاہر ہے کہ پیشہ ور واعظ فقط ہوتا ہے حساس نہیں۔

نیا شاعر جس کرب کو اپنے سینے میں اتار لیتا ہے۔ اسے اپنی ذات، اپنی نفسیات اور اپنے شعور کے محور میں ایک آزاد انداز سے رنگ دیتا ہے۔ وہ کینوس پر اپنا پسندیدہ رنگ لگاتا ہے لیکن وہ رنگ کے لئے کسی COLOR CODE رنگوں کے ضابطہ کا اسیر نہیں بننا چاہتا۔

ستم زدگی، خوف زدگی، توہم اور ظلم سے انسان آزاد نہیں ہو سکتا یہ ایک مفروضہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اس لئے کہ درجات، طبقات اور ناآسودگی انسانی زندگی کا اصل ہے۔ اس کرب کو نئے ماحول میں کچھ زیادہ ہی خوفناک صورت ہو گئی ہے۔ تباہ کاریاں، فسادات، قتل و غارت گری کے نئے امن پسند حربے۔ سیاسی انتشار اور بڑھتی ہوئی لامرکزیت۔ انسان کو غیر فطری طور پر درندہ صفت بنائے جا رہے ہیں۔

نیا شاعر اسی درندگی کو ذاتی تحرکات سے محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک پگھلتے ہوئے پتھر کی طرح ہے جو بے انتہا حرارت میں ڈال دیا گیا ہو۔ وہ انسان کی انسانیت سے مایوس نہیں، بلکہ انسان کی بدلتی ہوئی ہیئت سے پریشان ہے کہیں اس کے خون میں زہر تو نہیں سما گیا ہے۔ وہ چلتے ہوئے اندھے ہتھیار کی طرح تو نہیں ہے۔

وہ انسان کو ایک ویرانے میں اُگے ہوئے پودے کی طرح پاتا ہے جس پر زندگی کے اٹھے گرم ریگستانی ہوا کی طرح گزرتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ان بے گناہ قیدیوں کے لئے آنسو ہے، جو سیاسی حکمرانوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر ان معصوم بچوں کے لئے آہ ہے جنہیں چیر کر کنوؤں میں پھینک دیا گیا۔ اس کا امتحان کے بارے میں سوچ کر پسینے سے تر ہو جاتا ہے جن کو پیدا

ہونے سے موت تک دھماکوں اور حملوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ ان غموں کو اپنے آپ میں حل کر لیتا ہے۔ پھر وہی کہتا ہے جو وہ اپنے آپ کو کردار بنا کر کہے۔ گویا اس کے تاثرات خالص بر خود انداز ہوتے ہیں نئی شاعری گھناؤنے ماحول کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ وہ انسانوں کو مشین، آواز اور دھوئیں سے بھرے ہوئے معاشرہ، حیوانی کھردرے پن اور ذہنی ہیجان سے آزاد کرانے کے لئے متحرک رہتی ہے۔

غیر مستقیم طور پر انسانی کرب کچھ اور ہی رنگ لاتا ہے:

تو اے نیک دل لڑکیو ــــ الوداع!
یاد رکھنا، ہماری حقیقت سے گزرو تو آنسو بہا کر دعا مانگنا
قیدیوں، شاعروں اور محکوم آبادیوں کے لئے
اور بیمار بچوں کی ماں کے لئے
اور اس کے لئے جو تمہارے بدن کا مسافر ہے لیکن
ہمارے سفر کی شہادت ہے!

ــــ نیک دل لڑکیو ــــ عباس اطہر

جب بھی سگرٹ نئی جلاتا ہوں
شہرِ مرحوم یاد آتا ہے

ــــ احمد آباد ــــ عادل منصوری

ہر ایک شاخ برہنہ ہے سر پہ سورج ہے
کبوتر اڑ کے بھی آیا تو کس پہ بیٹھے گا ــــ فاروق شفق

اور ساقی فاروقی، ادیب، عمیق حنفی، بشر نواز وغیرہ کی شاعری میں ایسی مثالیں فراواں ہیں۔

شاعری کے یہ موضوعات نئے تو نہیں لگتے۔ ویسے ہمیں موضوعاتی شاعری کرنی بھی نہیں چاہئے۔ شاعری کے میدان میں مقابلہ اور موضوعات کو بہتر طور پر ادا کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کا سوال نہیں، طرحی شاعرہ کا ماحول نہیں۔ لیکن کہیں ہمارے پاس باز گشت ہی تو نہیں رہ گئی۔ کہیں ہم تقلیدی ہی تو نہیں ہوتے جا رہے ہیں، کہیں ہمارے پاس انوکھا پن ہی باقی نہ رہا؟ یہ ہمیں ایک بار پھر سوچنا پڑے گا۔؟

اپنی تخلیق کے اختتام پر اپنا پتہ جلی حروف میں ضرور تحریر کریں۔ (ادارہ)

تین نظمیں

شاہین

زرد قاش

کیا خبر پھر ایک جھونکا آئے
آنگن میں کوئی اک برگِ آوارہ کہیں سے آ گرے
چونک اُٹھے وہ سادہ لڑکی
اور جب سنبھلے
تو اس کو اور بھی بیتاب کر دے
چائے کی سُرخی میں
اک لیموں کی گھلتی زرد قاش

موت بھی رحم کے قابل ہے

موت مصروفِ مشقت ہے شب و روز
مرے باپ کی مانند
کہ جو ایڑیاں گھس گھس کے جیا اور مرا
زندگی رحم کے قابل ہے، یہ تسلیم
مگر
موت بھی رحم کے قابل ہے
ذرا دیکھو تو

خداوند

خداوند۔ تو جتنا اونچا ہے اتنا ہی یخ ہے
خداوند۔ ہم وہ چٹانیں ہیں
تو جن کے اوپر کھڑا ہے
خداوند۔ نیچے جہنم ہے جس میں گھٹن ہی گھٹن ہے
خداوند۔ اب اس عذابِ مسلسل سے
ہم کو رہا کر
خداوند ——— اب ہم بھی آتش فشاں بن چلے ہیں

مظہر امام

شاد عارفی کی شاعری کا انفرادی پہلو

ہماری تنقید عموماً دو ٹوک اور فیصلہ کن بات کرنے سے کتراتی رہی ہے۔ اکثر ہمارے ناقدین ہاں اور نہیں کے درمیان چکر لگاتے رہتے ہیں۔ وہ ادھر بھی رہنا چاہتے ہیں اور ادھر بھی۔ آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہی ہوگا۔ کسی عالم قسم کے شخص نے اپنے رکسی دوست سے پوچھا۔ "بتاؤ، کالے رنگ کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟"

بے چارہ سیدھا سادہ تھا۔ اُس نے اپنی عدم واقفیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے "عالم" دوست سے درخواست کی کہ وہی کالے رنگ کی خصوصیت بتائے۔

عالم دوست نے فخر کے ساتھ اپنے سر کو جھٹکا دیا اور اپنی ہمہ دانی کا سکّہ جماتے ہوئے بولا۔ "یہی کہ وہ سفید نہیں ہے۔"

اب یہ لطیفہ ہے تو لطیفہ سہی، لیکن اگر آپ اپنی محبوب زبان کے محبوب ناقدین کی تحریریں پڑھیں تو ان کے تنقیدی تجزیوں کو اسی سیاہ و سفید کے دائرے میں محصور پائیں گے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ شاد عارفی کو ہمارے عزیز تنقید نویسوں کے یہاں وہ درجۂ اعتبار نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ شاد عارفی کی شاعری کو نہ تو رنگوں کی مناسبت سے سمجھا جا سکتا ہے اور نہ انہیں کسی خانے میں اٹکل پچو فٹ کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے مروجہ اور پسندیدہ اسلوب سے روگردانی کرکے اپنی آواز کو ایک نئی شان عطا کرنے کی کوشش کی:

شاد مجھے یہ دھن رہتی ہے
اپنا نغمہ اپنی لے ہو

ایسا نہیں ہے کہ یہ توفیق ان کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہ ہوئی ہو، لیکن شاد عارفی نے کئی اور بڑے جرم کئے۔ وہ اس "دکشن" کے پیچھے نہیں دوڑے جس نے اس دور کے کئی شاعروں کو خلعتِ پسندیدگی عطا کی۔ انہوں نے کئی کمزور لیکن مقبول شعرا کی طرح اپنی شاعری کے زرد چہرے پر تشبیہات و استعارات کا غازہ نہیں ملا۔ وہ نہ کسی تحریک سے براہ راست اور باضابطہ وابستہ ہوئے اور نہ انہوں نے مشاعروں میں نغمہ گری یا اداکاری کے جوہر دکھائے۔ شاعری ان کے لئے نہ شہرت اندوزی کا ذریعہ تھی اور نہ تسکین انا کا بہانہ۔ ان کے سوچنے اور کہنے کا ایک خاص ڈھنگ تھا اور انہوں نے وہی کہا اور اسی ڈھنگ سے کہا جو انہوں نے بہتر سمجھا۔ مفتیانِ ادب کی تعریف و تنقید سے بے نیاز وہ اپنے ماحول کی داخلی اور خارجی کیفیات کے مزاج داں تھے۔ انہوں نے فکر و احساس کی روشنی میں سماجی عوامل کی تصویریں

بنائیں۔ اپنے ملک کے سیاسی اور معاشرتی نظام کی افراط و تفریط نے ان کے حساس دل پر گہرے زخم لگائے اور انہوں نے تلملا کر اس طنز اور ہجو کا حربہ استعمال کیا جس نے شعری پیکروں کو تیز نشتروں میں تبدیل کر دیا۔ ان کے یہاں نہ تو جوش کی سی بلند آہنگی ہے اور نہ فیض کی سی دھیمے سروں میں الاپ۔ شاد عارفی نے رسمی طور پر نہ بغاوت کے نعرے لگائے نہ انقلاب کے نغمے گائے۔ انہوں نے عمل جراحی سے معاشرے کے فاسد مادے کو نکالنا چاہا۔ آنچل کو پرچم بنانے کی تلقین کے پس پردہ وہ نسوانی جسم کے حسین نشیب و فراز کے دیدار کا شوق نہ رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک پرچم ایک ایسے دائمی انقلاب کی علامت تھا جو انسان کی خوش ... مساوات اور اخلاقی سربلندی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ انہیں انقلاب کی دستک اس نظام کے چور دروازے پر سنائی دینے لگی تھی ،

یقیں کیجئے انقلابات بستی   محلات کے سائے سائے کھڑے ہیں

اور اس لئے وہ ارباب سیاست کو متنبہ کرتے تھے ،

جھپٹ پڑیں نہ کہیں دن میں مشعلیں لے کر   عوام کو نہ سمجھاؤ کہ روشنی کم ہے

شاد عارفی کے طنز کا خاص نشانہ موجودہ سیاست اور سیاست سے متعلق افراد ہیں :

ہر غلط بات پر بھی ہاتھ اٹھاؤ   یہ نمائندگی نہیں ہے ، شرماؤ

کہہ رہے ہیں کہ پڑو پاؤں نگہبانوں کے   آپ ہمدرد ہیں ہم سوختہ سامانوں کے ؟

جناب شیخ سیاست کے پھیر میں پڑ کر   بتان دیر کو پروردگار کہتے ہیں

شاد کے یہاں اس دور کے عام استعاروں شمع ، سحر ، رہبر ، رہزن وغیرہ کا استعمال بہ حد وافر ہوا ہے۔ لیکن ان استعاروں کی معنوی تہیں ان کے یہاں عام شاعروں کی بہ نسبت زیادہ ہیں اور یہی وہ وصف ہے جس نے ان استعاروں کو علامتوں کا درجہ دے دیا ،

باغباں کو اعتماد گلستاں حاصل بھی ہے ؟   آپ یہ تحقیق فرمائیں گے ؟ اتنا دل بھی ہے !

وہاں بہاروں کی باغبانوں سے سازشیں بار ور نہ ہوں گی

جہاں خزاں نے اٹھا دیا ہو سوال کانٹوں کی آبرو کا

صحن گلشن پہ ، قفس ایجاد و !   "راستہ بند ہے" یہ لکھوا دو

مطلع کہہ لیا ہے ، نظم وطن کا گلہ نہیں   "پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں"

شاد عارفی کے یہاں عشق و محبت کی والہانہ کیفیات کا اظہار شاذ و نادر ہی ملے گا۔ انہوں نے اپنی کئی نظموں میں عشق کے جنسی پہلو کی طرف اشارے کئے ہیں اور کہیں کہیں جذبہ عشق پر طنز کے تیر بھی چلائے ہیں۔ افلاطونی محبت کا دخل تو خیر شاد جیسے حقیقت پسند کے یہاں کیا ہوتا ، لیکن عشق کے SUBLIME رشتہ اور مہذب احساسات کی نقش گری بھی شاد کے یہاں نہیں ملتی۔ عشق کی تپش و خلش اور سوز و گداز سے ان کا کلام نا آشنا ہے۔ کوچۂ محبوب میں انہیں آبلہ پائی کا موقع نہیں ملا۔ یا شاید ان کی افتاد طبع نے ہی کسی کا فرادا کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کرنے کی اجازت نہ دی۔ وہ کوچۂ عشق سے گذرے ضرور ہیں جیسا کہ خود کہتے ہیں :

دو چار برس حضرت حالی کی طرح شاد

مجھ کو بھی جنون لب و رخسار رہا ہے

لیکن شاید ان کی تشنگی روح کو وصال کی چھلکتی ہوئی گلابی نصیب نہیں ہوئی۔ حسن ان کی دسترس سے دور ہی رہا۔ ہو سکتا ہے ان کے لہجے کی تلخی اسی محرومی کی پیدا کردہ ہو۔ اپنی مشہور نظم "بسنت" میں وہ کہتے ہیں :

وہ چمپئی لباس ہر طرف کہ دیکھ اور ترس
یہ ساریوں پہ رنگ و روپ جس پہ کس کو دسترس
یہ "دسترس" کی بات صرف قافیہ سمجھا گئی

نہیں یہ قافیہ نہیں، برائے بیت بے اثر
سنیں جو نوحہ خواں رہے ہیں اعتبار حسن پر
یہ کہہ تو دوں کہ میں بھی ان کا ہم خیال ہوں مگر
وہ پھول توڑتے ہوئے مرے قریب آ گئی

شاد عارفی کی دلچسپی حسن کے وجود سے اتنی نہیں جتنی چمپئی لباس اور ساریوں سے ہے۔ اور نظم کا مجموعی تاثر یہی ہے کہ حسن پر ان کی دسترس نہ ہونے کی بات ہی حقیقی ہے۔ کسی کا پھول توڑتے ہوئے شاد کے قریب آجانا محض ایک لمحاتی سانحہ ہے ورنہ وہ بھی انھیں کے ہم خیال ہیں جو اعتبار حسن پر نوحہ خواں رہے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، شاد حسن و عشق کے شاعر نہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں نامرادیاں اور حقائق کی تلخیاں اس حد تک سرایت کر گئی ہیں کہ خالی خولی رومان کے لئے زیادہ جگہ باقی نہیں رہ گئی۔ شاد کو بدلے ہوئے حالات کی گراں باری کا عرفان ہے اور وہ اسی گراں باری کے شاعر ہیں :

شاد حسن و عشق پر بھی تھی کبھی میری نظر　　اک زمانہ تھا مگر
آج میری ہر غزل وابستۂ حالات ہے　　سوچنے کی بات ہے

جی ہاں، "سوچنے کی بات ہے !" یہ مستزاد بھرتی کا نہیں ہے۔ جنونِ لب و رخسار ایک خاص دور میں ہر ایک کو ہوتا ہے شاد کی نظر بھی کبھی حسن و عشق پر تھی، اب غم دوراں نے انھیں اس نگاہ سے محروم کر دیا۔ اب وہ "وابستۂ حالات" ہیں، لیکن گذرے ہوئے "دو چار برس" کی لطیف یادیں ذہن کے کسی تاریک نہاں خانے میں کسی سہمے ہوئے طائر کی طرح پال فشاں ہوتی ہیں اور انہیں [illegible]رات کی خواب افروز دنیا [illegible] جاتی ہیں :

آتے ہی اپنے بستر پر　　میں ہوتا ہوں اس کے گھر پر

مجھے تو یہ شعر مومن کے مشہورِ زمانہ شعر سے کسی طرح کمتر نظر نہیں آتا۔ بلکہ شاید اس میں معنوی پیچیدگی زیادہ ہے جو روح کو نئے اہتزاز سے لذت آشنا کرتی ہے اور پھر عاشق کا محبوب کے گھر جانا، بہ نسبت اس کے کہ محبوب عاشق کے گھر آجائے، ہمارے ماحول میں زیادہ قرین قیاس اور حقیقی معلوم ہوتا ہے۔

شاد نے غزلیں اور نظمیں دونوں ہی کامیابی کے ساتھ لکھی ہیں۔ دونوں اصناف سخن میں ان کا رنگ منفرد اور کئی معنوں میں اکثر شعرا سے ممتاز نظر آتا ہے۔ ان کے لہجے میں انوکھا پن اور ان کی طرز ادا میں ندرت ہے۔ انھوں نے غزل کو نرم و نازک، دھیمے اور سریلے لہجے کی بجائے بے باک، کھرا اور واضح لہجہ دیا ہے۔ وہ غزل کی اہمیت کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں غزل کی اشاریت سے بھی

گہری بات کے ابلاغ کا کام لیا جا سکتا ہے۔ وہ حیات و کائنات کے حقائق و معارف کو، زمانے کی ستم انگیزیوں اور نظام حکومت کی چیرہ دستیوں کو غزل میں چابک دستی کے ساتھ سمونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور اس کا دعویٰ بھی کرتے ہیں:

تائید غزل کے بارے میں دو چار اشارے کیا کم ہیں
تو لمبی لمبی نظموں سے تو شعر ہمارے کیا کم ہیں

وہ غزل میں صداقت کی تلخیوں کو بیان کی لطافت کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں:

صداقتوں کی تلخیوں کے ساتھ شاد عارفی ۔۔۔ لطافتِ بیانِ واقعہ غزل کی جان ہے

ہو سکتا ہے، غزل کے لئے لطافتِ بیان کو وہ لابدی قرار دیتے ہوں، لیکن خود شاد عارفی کے یہاں لطافت کم، البتہ ندرت کم و بیش ہر جگہ ہے۔ ان کی غزل گوئی تقلیدی نہیں جس پر طنز کرتے ہوئے جوش ملیح آبادی نے کہا ہے:

یہ فقط رسمی مقلد وامق و فرہاد کے ۔۔۔ مر رہے ہیں آج تک معشوق پر اجداد کے
آج تک غالب ہے ان پر وہ رقیب روسیاہ ۔۔۔ کر چکا ہے زندگی جو میر و مومن کی تباہ
بانی ہے ترکے میں ان لوگوں نے ہر لے، ہر صدا ۔۔۔ ان کے لب پر بھی وہی ہے جو ولی کے لب پہ تھا

شاد عارفی اس غزل کے قائل نہیں جس میں حسن و عشق کے سطحی اور پست جذبات کا اظہار ہو اور جس کا مقصد محض تفریح یا تفنن طبع ہو:

وہ جو ننگی ناچتی رہتی ہے بزم عیش میں
اس غزل کا شاد کیا، ماحول بھی قائل نہیں

آپ شاد عارفی کی کوئی غزل کہیں سے اٹھا لیں، آپ کو لہجے میں جدت اور نیا پن ملے گا۔ ان کے موضوعات میں خواہ بہت نکالنے والی بات نہ ہو، لیکن ان کے لہجے میں ہمیشہ ایک چونکانے والی کیفیت ملے گی۔ وہ جادۂ عام پر چلنا بھی اسی طرح کسر شان سمجھتے ہیں، جس طرح آستانِ خواص پر جبہ سائی کو۔ ان کے ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اپنی تقدیر کو پیٹے جو پریشاں ہے کوئی ۔۔۔ آپ کے بس میں علاج غم دوراں ہے کوئی!
اپنی مرضی سے تو اُگتے نہیں خود رو پودے ۔۔۔ ہم غریبوں کا بہرحال، نگہباں ہے کوئی
زرد چہروں نے تبسم کو کیا ہے رُسوا ۔۔۔ ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی
چاپ سُن کر جو ہٹا دی تھی، اٹھا لا ساقی ۔۔۔ شیخ صاحب ہیں، میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

شاد عارفی بھر کم الفاظ کا سہارا نہیں لیتے، لیکن ان کے اشعار کی معنوی سطح شاید ہی کبھی پست ہوتی ہو۔ وہ سیدھے سادے عام فہم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے قائل ہیں۔ اس سے ان کی غیر معمولی ابلاغی صلاحیت کا ثبوت ملتا ہے۔ رمزیت اور ایمائیت ان کی غزلوں کا خاص وصف ہے، لیکن ان میں کہیں ابہام یا پیچیدگی نہیں۔ ایک اور غزل کے اشعار دیکھئے، کتنے سادہ، کتنے بلیغ!

چمن کو آگ لگانے کی بات کرتا ہوں ۔۔۔ سمجھ سکو تو ٹھکانے کی بات کرتا ہوں
سحر کو شمع جلانے کی بات کرتا ہوں ۔۔۔ یہ غافلوں کو جگانے کی بات کرتا ہوں
روش روش پہ بچھا دو ببول کے کانٹے ۔۔۔ چمن سے لطف اُٹھانے کی بات کرتا ہوں

"وہ باغبان جو پودوں سے بیر رکھتا ہے — یہ آپ ہی کے زمانے کی بات کرتا ہوں
شراب سرخ کی موجوں سے مدعا ہوگا — اگر میں خوں میں نہانے کی بات کرتا ہوں
وہ صرف اپنے لئے جام کر رہے ہیں طلب — میں ہر کسی کو پلانے کی بات کرتا ہوں
یہاں چراغ تلے لوٹ ہے، اندھیرا ہے — کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں
نقاب روئے زمانہ نہ اٹھ سکے گی کہ میں — گلوں سے اوس اٹھانے کی بات کرتا ہوں

بھٹکے ہوؤں کو نئی فکر دے رہا ہوں شاد
منجھے ہوؤں کو سکھانے کی بات کرتا ہوں

لگے ہاتھوں اس غزل پر قبلہ کلیم الدین احمد کی "عملی تنقید" بھی دیکھ لیجئے:

"بات کرتا ہوں" — بات کیجئے، اس میں چنداں مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ کوئی نئی بات ہے یا کوئی آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکتا ہے۔ "سمجھ سکو" "نئی فکر دے رہا ہوں" ـــــــ "اپنے منہ میاں مٹھو" سے اس قسم کی چیزوں کی زیادہ وقعت نہیں:

وہ صرف اپنے لئے جام کر رہے ہیں طلب
میں ہر کسی کو پلانے کی بات کرتا ہوں

ہر کسی کو پلانے کی بات کرتے ہیں — اور بھی بہت سے لوگ یہ بات کرتے ہیں۔ سیکنڈ ہینڈ باتوں کو اس شان سے کہنا مذاق صحیح و لطیف کی کمی کی غمازی کرتا ہے۔"

آپ کو بھی مزہ تو آیا ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "ہر کسی کو پلانے والا" شعر اپنے اندر کوئی ندرت نہیں رکھتا، لیکن صرف ایک شعر کی بنیاد پر "مذاق صحیح و لطیف کی کمی" کا فتویٰ دے دینا کلیم صاحب جیسے مفتی کا ہی کارنامہ ہو سکتا ہے۔ "سمجھ سکو" اپنے منہ میاں مٹھو قسم کی چیز نہیں اگر صرف یہ کہا جائے کہ:

چمن کو آگ لگانے کی بات کرتا ہوں

تو عام آدمی ہی نہیں، شاید خود کلیم صاحب بھی اسے مجذوب کی بڑ سمجھیں گے اور شاعر کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ یہ ٹھکانے کی بات ہے غالباً شاد عارفی کی نظر سے یہ "عملی تنقید" نہیں گذری ورنہ ممکن تھا وہ اس طرح کا کوئی شعر کہہ ڈالتے:

کبھی تو بات کرو ٹھیک کی، جب لکھو تنقید — ارے کلیم! ٹھکانے کی بات کرتا ہوں

شاد عارفی سرتاپا، اول تا آخر شاعر تھے۔ انھیں اپنے منصب شعری کی آبرو کا لحاظ تھا۔ کئی گرم و سرد آندھیاں چلیں، بڑے بڑوں نے حالات کے آگے جبین نیاز جھکا دی۔ لیکن شاد کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی، انھوں نے حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔ انھیں اس تلخ حقیقت کا شدید احساس تھا کہ موجودہ دور شعر و ادب کے لئے ناساز گار بنتا جا رہا ہے اور صرف تخلیق فن کے سہارے زندہ رہنا محال ہو گیا ہے۔ انھیں اس امر کا بھی ادراک تھا کہ شاعری جو کبھی ذہنی انقلاب کا سرچشمہ تھی اب اپنی اہمیت کھوتی جا رہی ہے۔ وہ طنزاً ذل برداشتہ ہو کر کہتے ہیں:

اس نے جب سو تیر چلائے   میں نے ایک غزل چپکا دی

غزل چپکانے سے کیا ہوتا ہے! روئی کے گالوں کی طرح نرم و نازک شاعری سے ظلم کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جبر و استبداد سے نبرد آزما ہونے کے لئے شاعر کو اپنے کلام میں تلوار کی تیزی اور تیر کی چبھن پیدا کرنی پڑتی ہے۔ شاد عارفی زندگی بھر یہی کوشش کرتے رہے۔

شاد کی شخصیت اور شاعری میں کوئی بُعد نہ تھا۔ وہ اوپر سے کچھ اور، اندر سے کچھ اور نہ تھے۔ دنیاوی جاہ و جلال، آرام و آسائش، عزت و منصب، روس و امریکہ کا سفر ان کے آدرش نہ تھے۔ اور نہ انھیں محفل خوباں ہی میں سرخرو ہونے کی ہوس تھی۔ وہ اپنے ماحول اور حالات زمانہ کے نبض شناس تھے۔ اور ایک بہتر، پُرسکون، خوش حال زندگی کے نقیب۔ انھیں انسانیت کے ناسوروں کا علم تھا جن کا علاج وہ مرہم سے نہیں بلکہ نشتر سے کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان ناسوروں میں بھرے ہوئے فاسد مادّے کو خارج کئے بغیر چارہ نہیں۔ انھیں فیض کی طرح علم تھا کہ: " تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا۔ " لیکن فیض نے یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے ہاتھ اٹھا لیا کہ:

اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں، مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

شاد عارفی غیر ذمہ دار نہیں، وہ حالات کا جائزہ صبر و استقلال سے لیتے ہیں اور حقائق سے نظر نہیں چراتے۔ وہ ایک ماہر جراح کی طرح زخموں پر نشتر زنی کرتے ہیں، بظاہر بے رحمی کے ساتھ، لیکن ساری کائنات کا درد اپنے سینۂ مجروح میں چھپائے ہوئے:

ہلکے پھلکے طنز سے گویا ٹکڑے ٹکڑے پتھر دیکھا   جس نے مجھ کو گھور کے دیکھا، میں نے اس کو ہنس کر دیکھا

ظاہر ہے یہ ہنسی بڑی تحقیر آمیز ہنسی ہے۔ بے حد دل شکن، زہر کی طرح رگ و پے میں سرایت کر جانے والی۔ تحقیر آمیز طنز کی تلخی غالب کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن جس حد تک شاد عارفی کے یہاں ہے، غالباً اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں۔ اس طنز میں وہ نشتریت ہے جو روح کی گہرائیوں میں اُترتی چلی جاتی ہے:

اصطلاحاً بُرے کو بھلا کہہ دیا   یعنی گالی نہ دی، رہنما کہہ دیا

شاد عارفی کے لہجے میں ایک طرح کا اکھڑ پن (ROUGHNESS) ہے جو بے تکلف بات کہنے (OUTSPOKENNESS) سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کے لہجے میں وہ نرمی تہذیب و شائستگی نہیں ملے گی جس کے ڈانڈے ریاکاری سے ملتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں برملا کہتے ہیں، نہ کسی خوف کھاتے ہیں، نہ کسی سے نرمی برتتے ہیں:

ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں   ہم کسی خانہ برانداز سے ڈرتے ہی نہیں

شاد کے انداز بیان میں جو تیکھا پن ہے، اس کی مثال موجودہ اردو شاعری میں کم ہی ملے گی۔ ان کے کلام میں صداقت اور برجستگی کے ساتھ خلوص بھی ہے اور جذبے کی گرمی بھی، اور اسی لئے وہ بڑی بے باکی سے ڈٹ کر کہتے ہیں:

میں دنیا پر طنز کروں گا   دنیا میرے کیوں درپے ہو

مجھے منصب پیغمبری کی ہوس نہیں، لیکن ادب میں پیشین گوئی کو کچھ اتنا معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا، مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری نسل نے جس طرح راندۂ درگاہ سخن یگانہ کو پھر سے کرسی منزلت پیش کی، اسی طرح وہ شاد عارفی کو بھی مسند عظمت پر لا بٹھائے گی۔ شاد عارفی کا فن جدید نسل کے احساس اور طرز احساس سے زیادہ قریب ہے۔

—— ——

شاہد احمد شعیب

مرا بُک شلف خالی ہے

مرا بک شلف خالی ہے کتابوں سے
یہاں اب میرے بچّوں کے کھلونے ہیں

کتابیں پھینکتا تھا جس گھڑی میں
شبد بے چاروں نے آنسو خوب برسائے
جلوسی شکل میں آئے
ہزاروں بنتیاں کیں ۔
پچھلے احسانوں کے سارے واسطے دیتے رہے
کہنے لگے :

سچ سچ کہو
ہم نے تمہاری مٹھّی میں
کیا گیان کا سورج نہیں رکھا
تمہارے آسمانوں میں
ستارے تجربوں کے ہم نے کیا ٹانکے نہیں ؟ ـــــ بولو

میں چپ ہوں
گیان کا سورج
ستارے تجربوں کے ـــــ جب سے میرے دل میں اُترے تھے
مری آنکھوں کے آگے دُھند بڑھتا ہی چلا جاتا تھا ہر لمحہ
مگر اب
گیان کا سورج
ستارے تجربوں کے ـــــ پھینک آیا ہوں
مجھے آبھاس ملنے لگ گیا ہے اب
انوکھی روشنی میں جگمگاتے سے نشاط افزا دنوں کا

• •

مرا بک شلف خالی ہے
یہاں اب میرے بچّوں کے کھلونے ہیں

ھارون الرشید

سوزشِ غم

بستیاں شوق کی ہوئیں ویراں
اب مرے دل بتا کہ جائیں کہاں

اب نہ ہمدم نہ ہم زباں کوئی
میزباں ہے نہ میہماں کوئی

ایک دل وہ بھی بے قرار و حزیں
اب تو کوئی بھی غم گسار نہیں

منزلِ شوق کا پتا نہ نشاں
لے کے جائیں کہاں یہ سوزِ نہاں

دل کو پہلو میں لے کے سو جائیں
غم کی پہنائیوں میں کھو جائیں

ظفر صہبائی

گھڑی کے الارم سے طلوع ہوتی ہوئی صبحوں کا کرب

ایبسٹرکٹ نظم

میں اک چھوٹے تاریک کمرے میں پیدا ہوا تھا
وہیں آج تک رہ رہا ہوں
کھلی آنکھ تو سب سے پہلے اندھیرا ہی دیکھا
مجھے آخری بار بھی تیرگی دیکھنا ہے
کبھی صبح کی پہلی کرنوں نے میرے بدن کو نہ چوما
کبھی صبح کی نم ہواؤں نے مجھکو طراوت نہ بخشی
نگاہیں طلوعِ سحر کے مناظر سے واقف نہیں ہیں
مرے شہر کی اونچی اونچی عمارات نے
جذب کر لی ہیں میری بصیرت کی لہریں
بہت دور ان انجذابی دواروں کے پیچھے
جہاں ڈوبتے اور ابھرتے ہیں یہ روز و شب کے مناظر
وہاں تک رسائی کا امکان ٹوٹا ہوا پل ہے جس کو
ابھی پار کرنا ہی ممکن نہیں ہے
مرے رات دن جس طرح کٹ رہے ہیں، کٹیں گے
کبھی بند کمرے میں چپکے سے آکے
جگائیں گی مجھ کو نہ سورج کی کرنیں
گھڑی کا الارم، جو برسوں سے صبحوں کا پیغام دیتا ہے
دیتا رہے گا
مری آنکھ نے اوّل اول بھی دیکھا تھا گہرا اندھیرا
مجھے آخری بار بھی تیرگی دیکھنا ہے ــــ ــــ

بھوک ایک کمپلسری بیماری ہے
اخبار پڑھو !
سیاسی نٹ اچھل کود رہے ہیں
چولھے کی سیلی ہوئی زمین کی نم بھاپ
انگاروں کو کوئلہ بنا رہی ہے
چلو دھرمیندر کی نئی فلم دیکھیں گے
سالا بڑا دھانسو ہیرو ہے
ارے وہ رہی
بالکل گلابی ہے اور کٹ جیا بھادری سا
آخ تھو
اے غلاظت سنبھال مجھ پر ہنسا کیوں تھا
دو بوڑھے بیمار ہاتھ
سرد ہوتی ہوئی آگ بار بار کرید رہے ہیں
ٹھنڈک نے ضرورتیں دہکا دی ہیں
لاؤ پیس ڈالو سارے اجزا، سارے عناصر
ہا ہا ہا ہا
نئی مورتیں گڑھو گے
مگر تمہارے ہاتھ کہاں ہیں
چلو سب کورس میں فلمی گیت گائیں، بغلیں بجائیں۔

ابرارالحسن

مستثنیات ۲

میرے دوست، اس خط میں جہاں جہاں سیاہی پھیلی ہے، اُسے آنسوؤں کے قطرے مت سمجھنا۔ آج کل تو اس بلا کی ہے کہ سب دریا بھی خشک ہو گئے ہیں۔ پیاسی زمین چیخ گئی ہے مجھے یقین ہے کہ تم کبھی نہ کبھی واپس آجاؤ گے۔

دیکھو، آج میں نے کچھ زیادہ پی لی ہے۔ کچھ ہوش ،، کچھ ہوش میں آنے کی خواہش نہیں۔ عرصے سے جو جذبات ہوئے ہیں، اُبل نہ جائیں۔ دیکھو جو کچھ مُنہ سے نکل جائے معاف کر دینا۔ اور یہ سمجھ لینا کہ یہ سب ہوش میں کہے گئے ہیں ،ہوشی میں ہرگز نہیں۔

زمین تپ کر لوہے کی طرح لال ہو رہی ہے۔ گرد کا طوفان میں تمہارا لاشہ ابھی ابھی تڑپ کر ٹھنڈا ہوا ہے۔ ناجم کر عنابی ہو چکا ہے۔ کچھ ابھی تک لال ہے۔ ساتھ میں ایک پھٹا ہوا جھنڈا گرا ہے۔ جس پر ایک ہما تمہیں بڑے دھیان سے تک رہا ہے۔

دوست کے نام

۱ــــــ تم شکایت کر رہے ہو کہ کوئی دروازہ نہیں کھولتا۔ تم نے دستک ہی کب دی۔ اپنے کھیل میں مگن ہوا کی طرح چھب دکھلا کر کھو جاتے ہو۔ اور پھر ہم ناداروں پر دبِش لگاتے ہو۔ بس بہت کھیل ہوا۔ میں کب سے چٹخنی اُتارے، دروازہ سے لگا، ٹھنڈے موم کی مانند انتظار کر رہا ہوں۔

۲ــــــ تم شاید ناراض ہو جبھی نہیں بولتے۔ چپ چاپ ساتھ چلتے رہو۔ ہر لمحہ تمہاری جیتی جاگتی شخصیت تمہاری خاموشی کے بیکراں بوجھ سے اپنی حقیقت جتاتی رہتی ہے۔ نہ مسکراتے ہو، نہ نظریں ہی اُٹھاتے ہو۔ کیا کیا جتن کیے ہیں۔ کبھی ہنسانے کی کوشش کی ہے۔ کبھی اندھیرے کمرے میں ایک کونے میں چھپ کر خود رو دیا ہوں۔
شاید تم ناراض ہو جبھی نہیں بولتے۔

۳ــــــ آج کی رشوت تو دے چکا۔ آخر میرا اتنا کیا دوش۔ ہر لمحہ سایہ کی طرح ساتھ لگے رہتے ہو۔ تمہارے تو لاکھوں

پرستار ہیں۔ مسجد، مندر، کلیسا، بھرے پڑے ہیں۔ اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو۔

---

۴ ـــــ جاؤ، جاؤ، اپنا راستہ لو۔ بات بن بات، دھیان بٹا کر، راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہو۔ دوپہر کی دھوپ میں پیپل کے نیچے دم لینے کو رُکتا ہوں تو طرح طرح کی میٹھی بولیاں سنانے آجاتے ہو۔ کبھی چنچل بادل کے روپ میں راستہ میں دھوپ اور چھاؤں کا جال بچھاتے ہو۔ جدھر مڑتا ہوں ایک نئی حقیقت بن کر، جھلک دکھا کر کھو جاتے ہو۔ میرے دوست، اس تندہی سے چاروں اور دیکھ دیکھ کر میرا تن چکرا گیا ہے ـــــ میں نے کب کہا کہ میں تمہاری کھوج میں ہوں۔ میں نے کب کہا کہ تم سامنے آہی جاؤ۔

جاؤ، جاؤ، اپنا راستہ لو۔ میں زندگی کی اُلجھنوں میں کھو جانے کی کوشش کر لوں گا۔

---

۵ ـــــ ابھی اِدھر دکھن کی جانب میں نے خاک اُڑتی دیکھی۔ اور اُدھر پگڈنڈیوں پر ایک نقطہ آنکھ سے اوجھل ہو گیا۔ شیشم میں ہوا یوں سائیں سائیں کر رہی ہے، جیسے تیزی سے دوڑنے کے بعد ہانپ رہی ہو۔ دوپہر کی ٹھنڈی ہوا، تو نے اُسے کہاں دیکھا؟

---

۶ ـــــ سورج ڈوب چکا تھا اور میں تھکا ہارا، وہی ازل کا بوجھ اُٹھائے، ندی کے کناروں کے ساتھ ساتھ گاؤں کو لوٹ رہا تھا۔ اچانک آہٹ ہوئی مڑ کر جو دیکھا تو ابراہیم تھا۔ اس کی آنکھوں میں اطمینان کا سمندر دیکھ کر میں اور بھی نادم ہوا۔ میری نظریں زمین میں گڑ گئیں۔ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ زندگی کا یہ دور بھی ایک ازلی حقیقت ہے۔ اس میں ندامت کیسی۔ اُس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری سفارش کرے گا۔

---

۷ ـــــ اے میرے خدا، تو نے میری آنکھیں کھولیں اور کیسے کیسے تجربات کرائے۔ کیسے کیسے مشاہدات سے ہم نفس کیا۔ اے خلاقِ عالم، جب یہ پھڑکتی سانس تجھ میں کھو جائے گی تو کیا وہ مشاہدۂ عظیم ہوگا ـــــ کیا تو اپنے آپ سے بہت خوش ہوگا؟ میں نے مانا کہ تو ہر کاریگری میں ماہر ہے، بڑی مشاقی سے زندگی کو دائروں میں گھماتا رہتا ہے۔ مگر اے خدا ـــــ وہ دائرے جو مکمل ہونے سے پہلے کٹ گئے، اُن کا خدا کون ہے؟ کیا تیری قدرت ابھی نامکمل ہے؟

---

۸ ـــــ تم کس کی تلاش میں ہو؟ ہر چیز کو اُلٹ کرتے رہتے ہو۔ جنگل جنگل آگ لہکا کر پانی کے طوفان اُٹھاتے ہو ہر لمحہ ایک نیا روپ دھار لیتے ہو۔ کبھی ایک آہ بن کر ڈوب جاتے ہو تو کبھی ایک نئی امنگ بن کر نکھر جاتے ہو۔ تم صدیوں سے کس کی تلاش میں ہو ـــــ میرے خدا تم اُکتا نہیں گئے ـــــ؟

---

۹ ـــــ تم سمجھتے ہو کہ تم مجھ سے چھپتے پھرو گے۔ کیا تم بھول گئے ہو کہ آج جب سورج ڈوب رہا تھا اور اُفق شراب کی طرح لال ہو رہا تھا تو میں نے تمہاری جھلک پا لی تھی، اگرچہ تم پلک جھپکتے نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ میں نے مانا کہ میں پریشان ہو کر گھٹنوں میں سر دبائے اپنی اُداسی کا سوگ منا رہا تھا۔ مگر کیا تم بھول گئے کہ گھر کی تمام روشنیاں بجھا کر جب اچانک میں نے سر اُٹھایا تو سامنے برف سے ڈھکے کھیت میں تمہیں پھر چاندنی میں نہاتے پایا۔ لمحہ بھر کو جیسے تمہارے قدم رک گئے ہوں اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے تمہیں چھو لیا ہو۔

تم سمجھتے ہو کہ تم مجھ سے چھپتے پھرو گے مگر مجھے ابراہیم نے

تمہارا سارا راز بتا دیا ہے۔

ماسے۔۔۔ آج تم صبح سے یوں وارد ہوئے ہو جیسے سارا قرض وصول کر کے ہی جاؤ گے۔ اتنا خوب صورت دن ہے۔ ہلکی ہلکی مزیدار سردی ہے، چمکدار سورج ہے، اور کھیت کھیت سے جنگل اور تالاب سے عجیب خوشبودار دھواں اُٹھ رہا ہے۔ مکان کے باہری حصے سے کچھ دور پھر جو گوہال ہے وہاں ابھی ابھی گائے نے ایک بچھڑا دیا ہے۔ گوالے کی آنکھیں چمک رہی ہیں اور گائے بچھڑے کو چاٹ رہی ہے۔

اتنا خوبصورت دن ہے۔ بس تھوڑی دیر میں دھان کٹنے شروع ہوں گے۔ بڑی بڑی کڑھائیوں میں دہی جمائی جائے گی۔ کٹے ہوئے دھانوں کے ٹال لگے ہوں گے اور ہم کھیلتے کھیلتے اُن میں یوں کھو جائیں گے جیسے ہمیشہ سے اُن کا حصہ ہوں

دن بھر تم ساتھ ساتھ رہے۔ شام کو کھیتوں سے واپسی پر میں مویشیوں کے گلہ میں میں کھو جانا چاہتا تھا مگر تم نے لب آنکھ سے اوجھل ہونے دیا۔ مجھے تھوڑا تو خوش ہو لینے دو۔ یہ جو ایک سانس اتنی خوب صورت ہے اسے بسر کر لینے دو مجھے معلوم ہے کہ تمہارا قرض چکانا ضروری ہے اور تم لے کر ہی ٹلو گے۔

اب رات ہے اور چاند دمک رہا ہے۔ تالاب میں]کنو[ل کھلے ہیں۔ تالاب کا پانی رات کی خنکی سے متاثر نہیں بلکہ]اُ[ن کے دھوپ کی تمازت کی ہلکی یاد چھپائے بیٹھا ہے۔ میں]ا[ب چھوٹی سی کشتی میں اکیلا اس کنارے سے اُس کنارے]جا[رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ جیسے تمہیں بھول جاؤں گا۔

میں نے مانا کہ یہ دو چار لمحے تم نے مجھے قرض دئے ہیں۔]مگر[ن یہ تو کہو کہ کیا میں نے ہاتھ پھیلایا تھا۔ کیا تمہاری تجوری]خالی[ہی نہیں۔ تم کس ہوس کا شکار ہو گئے ہو۔ لالچی، سنگدل]کا[لے کیوں نہیں۔

ہاں ہاں جو ہوا سو ٹھیک ہوا۔ یہی نا کہ بس کے ٹائروں کے ساتھ گھسٹتے ہوئے تم دور تک چلے گئے۔ تمہارے ٹخنوں کی ہڈیاں چور چور ہو گئیں۔ اور جب تمہیں ہوش آیا تو پہیوں والی کرسی تمہاری رفیقِ حیات بن چکی تھی۔
مگر یہ جو تمہاری آنکھوں میں مشاہدہ کی امنگ ہے علاوہ یہ جو تمہارے ہونٹوں پر سودائیوں کی سی مسکراہٹ ہے ان کو کون قید کرے گا۔

تو کہو اے دوست تیار ہو نا؟ یہ بلندی زیادہ تو نہیں فقط چار ہزار فیٹ۔ کہتے ہیں نیچے کھائی میں طرح طرح کے رنگین پتھر پائے جاتے ہیں۔ شاید وہ پتھر کبھی پھول تھے۔ جو ہم سے پہلے اور محبوبوں کی باہم گرفت کی تپش سے پگھل کر پتھر بن گئے ہوں۔

میں پتھر کے پانی کی طرح سر پٹک پٹک کر تحلیل ہو رہا ہوں۔ مگر تم پتھر کی مانند خاموش ہو۔ کبھی تو پتھر گھسے گا۔؟

میں نے ابھی ابھی تمہیں گھر سے نکل جانے کو کہا ہے۔ میں تمہاری موجودگی سے بہت گھبرا چکی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔
کیا میں بلاؤں گی تو تم واپس آجاؤ گے۔؟

میں نے کل ہی کئی پلانٹس (PLANTS) خریدے ہیں۔ ان کے عجیب عجیب سے نام ہیں۔ میرے ڈرائنگ روم میں یہ بڑھیں گے، پھلیں پھولیں گے۔ اور یہ چھوٹا سا شیشے کا ایکوائیرم (ACQUARIUM) جس میں سے ننھی منی مچھلیاں مچل رہی ہیں۔ میں نے ان مچھلیوں پر کئی کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ جس کی دُم بڑی ہے۔ وہ MALE ہے۔ میں ان کا خوب خیال رکھوں گی روز انھیں وقت پر غذا کھلاؤں گی۔

مچھلیاں اور پلانٹس، کتنی جاندار ہیں یہ چیزیں۔
جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔

آج بڑے زوروں کا طوفان اُٹھا ہے۔ میرا لکڑی کا مکان جیسے کہ ہل رہا ہو۔ شیشے کی یہ نازک کھڑکیاں کیا اس تیز ہوا کا زور روک لیں گی۔ (کھڑکیوں پر جیسے کہ مستقل دستک ہو رہی ہے) یا یہ شیشے ٹوٹ جائیں گے اور وہ تصویریں جو میں دامن میں سمیٹے بیٹھا ہوں، دفعتاً تتر بتر ہو جائیں گی۔

تم دستک تو دو۔ شاید اس مکان کا مالک بوڑھا ہو اور اس کی اکلوتی بیٹی ٹی۔ وی (T V) سے اُکتا کر اپنے سنگھار سے بھی تھک چکی ہو۔ (برف کے طوفان میں تمام راستے بھی مسدود ہیں) بلکہ شاید وہ کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی ہو کہ کوئی راہرو ہی زندگی کی نشان دہی کر رہا ہو۔

تم دستک تو دو۔ شاید وہی لڑکی عنابی سوئیٹر پہنے اپنے بلونڈ (BLONDE) بالوں کو بکھرائے، کافی کا پیالہ ہاتھ میں تھامے دروازہ کھولے۔ اور شاید وہ تمہارے نتھنوں پر جمی ہوئی برف دیکھ کر سمجھ جائے کہ یقیناً تمہاری کار راستے میں پھنس گئی ہوگی اور تم دور سے پیدل چل کر آ رہے ہو۔ اور شاید وہ تمہیں آتش دان کے پاس بلا کر گرم رم (RUM) کا گلاس لا کر دے۔

شاید وہ تمہیں رات بسر کرنے کی اجازت بھی دیدے یا شاید یہ گھر بھی اُجاڑ ہو۔ اور یہاں کے مکین بھی یخ بستہ SKI RESORTS کو چھوڑ کر شہر کو جا چکے ہوں۔

تم دستک تو دو۔

میں اپنے دوست کے ساتھ جب اُس کے گھر میں داخل ہوا تو وہ اشاروں اشاروں سے مجھے اُس کمرے کی طرف لے چلا جہاں آم کے ڈھیر رکھے تھے۔ اس کے لئے ہمیں آنگن سے گذر کر، دہلیز کے بعد برانڈہ طے کر کے دوسری طرف جانا ہوتا۔ برانڈہ جہاں اُس کی ماں کھری چارپائی پر دوپہر کی خواب آور ہوا کا شکار سوئی تھی۔ ساتھ میں ایک بچہ، جس کے ہونٹوں پر مکھیاں چپاں تھیں نہ جانے کس طرح اپنی نیند برقرار رکھے تھا۔

ہم آموں والے کمرے میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ رستم کی ماں جاگ اُٹھی۔ رستم نے بڑی تندہی سے اپنا رُخ اک دوسرے کمرے کی طرف کر لیا جہاں میں اکثر تخت پر بیٹھ کر رستم کو حساب سکھاتا تھا۔

"عقیل آج مجھے تجارت کی مشق کرا دو"۔ رستم جان بوجھ کر بلند آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہاں بیٹا"۔ رستم کی ماں بول اُٹھی "ذرا اچھی طرح سمجھایا کرو"۔ ——— ہم دونوں نے ایک ساتھ اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

بچپن کا ذکر ہے۔ میں امی ابا سے لڑ جھگڑ کر بڑی مشکلوں سے انھیں راضی کر کے دو دنوں کے لئے اپنے جگری دوست رشید کے گھر گاؤں آیا ہوا تھا۔ کل صبح ناشتہ کے بعد ہی سے جو ہم کھیل میں جُٹے تو بمشکل کھانے کے لئے وقت نکال سکے۔ پہلے تو سائیکل چلانے کا مقابلہ ہوا۔ طرح طرح کے مقابلے ایجاد کیے گئے۔ آنگن کے اس سرے سے دوسرے سرے تک راستہ میں کئی موڑ بنائے گئے جن سے گذرنا ضروری تھا۔ اب تو مجھے یاد بھی نہیں، بس یہ یاد ہے کہ رشید خوب ہارتا رہا۔

آج سب سے پہلے گاؤں کی چھوٹی جھیل میں تیرنے گئے وہاں تیراکی کے مقابلے ہوئے۔ بعد میں شہر کو جانے والی سڑک کے کنارے املی کے پیڑوں پر چڑھتے رہے، کچھ املی کھائی، کچھ املی کے بیج جمع کیے۔ دوپہر کو غلیل بازی ہوئی اور شام کو سب سے مزہ رہا، کبڈی کھیلی گئی۔

رشید :- مجھے اپنی قمیض پہننے کو دی تھی کیونکہ میں زیادہ کپڑے ساتھ نہیں لایا تھا۔

کبڈی میں میری پارٹی نے رشید کے گروپ کو خوب ہرایا جب ہم تھکے ہارے واپس ہو رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ کل صبح یہ سب مزہ ختم ہو جائے گا۔ مجھے تنہا بس پر بیٹھ کر اپنے گھر جانا ہوگا۔ میں سمجھا رشید بھی یہی سوچ کر بہت خاموش ہے۔

گھر پہنچتے ساتھ رشید نے مجھے اُس کی قمیض واپس کرنے کو کہا اور یہ بھی کہ اگر میں رات ہی کو اپنے گھر واپس جانا چاہوں تو جا سکتا ہوں ــــــ

آخری بس شہر کو جا چکی تھی۔

مجھے اپنے ایک عزیز دوست کی مطلقہ بیوی کے پاس اپنے دوست کے پرانے حسابات چکانے کے لئے کچھ دنوں سے کئی بار جانا پڑتا تھا۔ ایک روز باتوں ہی باتوں میں میرے ازدواجی تجربوں کا ذکر بھی نکلا۔ اور میں عام شوہروں کی عادات کے مطابق اپنی بیوی پر بھی ۷۸۷۸۷ جملے کسنے لگا۔

میرے دوست کی مطلقہ بیوی نے مجھے بڑی سنجیدگی سے سمجھایا اور یقین دلایا کہ وہ محض میری مدد کرنا چاہتی ہے مگر جہاں تک وہ میری بیوی کی شخصیت سے واقف ہے اُس کا خیال ہے کہ میری بیوی میرے لئے موزوں نہیں۔

اور میں ایک فلم پر ہی ٹل گئی۔

خالد میرے بار بار کے اصرار سے تنگ آ چکے تھے۔ قصور اُن کا بھی کیا تھا۔ اگر ہم کپڑے اور برتن دھونے کے لئے نوکرانی رکھ لیتے تو کھاتے کیا؟ خالد کی خندہ پیشانی دیکھو کہ انہوں نے اس مہینہ نوکرانی نہ رکھنے کے معاوضہ میں ایک انگریزی فلم دکھانے کا وعدہ کر لیا تھا۔

آج میں بہت مسرور تھی۔ شام کو ڈاکٹر ژواگو دیکھنے جانا تھا۔ دوپہر کو میں نے سوچا کیوں نہ خالد کی قمیض دھو ڈالوں بے چارے ایک قمیض کتنی بار پہنتے تھے۔

کپڑے پانی میں ڈالنے ہی والی تھی کہ ایک پرزہ گرا۔ کسی محترمہ کا خط تھا۔ نہ صرف فلموں کا تذکرہ تھا بلکہ ریستورانوں اور ڈانس ہال کا بھی۔

میری نگاہوں کے سامنے بہت سی نوکرانیاں ناچ ناچ کر گزر گئیں۔

تمہاری کب کی شادی ہو چکی ہے۔ اور نہ جانے تم کتنی دور، کس پرائے دیس میں، کتنے بچوں کی ماں ہو۔

مگر آج بھی میری یہی دعا ہے کہ اگر پھر کبھی ملاقات ہوئی تو تم سے یہی درخواست کروں گا کہ وہ گہری سبز قمیض پہننا جس سے تمہارا سفید جسم چھن چھن کر نکلتا تھا۔ اور چھت پر ریلنگ سے لگ کر اُسی جگہ تیلیوں سے سوئٹر بننا۔ تاکہ جب ایک تیلی تمہارے ہاتھوں سے غیر ارادی طور پر گر جائے اور میں اُسے اُٹھا کر تمہیں تھمانے لگوں تو اتنی ہی غیر ارادی طور پر اُس تیلی سے میں تمہارے جسم کے اُسی حصہ کو چھو دوں۔ تم بھونچکا ہو کر غصہ بھی ہو جاؤ اور شرما کر لال بھی اور میں بوکھلا کر نیچے کو بھاگ جاؤں۔

آج بھی یہی دعا ہے کہ اگر زندگی دوبارہ ملے تو اُسی ایک واقعہ کی صورت میں۔

میرا ایک پیر بُری طرح مجروح ہے اور پاؤں بھی زخمی ہے اب اُڑ نا دُشوار ہو گیا ہے۔ اب اُڑ نا دُشوار ...

میرا ایک پیر بُری طرح مجروح ہے اور پاؤں بھی زخمی ہے اب اُڑ نا دشوار ہے۔ اب اُڑنا دُشوار ہے لنگڑاتے گرتے پڑتے جھاڑیوں میں سر چھپا رہا ہوں وہ جھاڑیاں جو اس موسم میں پتوں سے بری ہیں۔ شکاری کے قدم یقیناً تیز ہو چکے ہوں گے اور اُس کا کتا میری تلاش میں لپک چکا ہوگا۔

میرا ہی گرم خون ٹھنڈی برف پر چلا چلا کر میری ہی نشان دہی کر رہا ہے۔ سفید برف پر لال لال بوند۔۔۔

(بقیہ ص ۵۳ پر)

ایک لمحہ

شاہد ماہلی

لمحہ
دل کے بہت پاس سے
گزرا ہوا صرف ایک لمحہ
بہا لے گیا ہے
جانے کتنے خوابوں ، خواہشوں
اور منصوبوں کو
بچا ہے
ہڈیوں تک دھنسا ہوا سناٹا
رُکتی ہوئی سانسیں
ڈوبتی ہوئی نبض
اور سرد ہوتا ہوا جسم
پھر کوئی تیز ہوا کا جھونکا
ڈھیر ساری گڈ مڈ آوازیں
چیخ ، ہنسی اور مسکراہٹ
گھر ، دفتر ، بیوی ، بچے
اور آئندہ بیس برسوں کا منصوبہ
بھاگتی ہوئی آڑی ترچھی تصویریں
ایک کے بعد دوسرے بے ربط مناظر
اور پھر
ٹھہر گیا ہے گزرے ہوئے لمحے کا سایہ
ڈرا ڈرا سہما سہما دل
اور تھر تھر کانپتا ہوا جسم

آہنگ ۵۴/۵۳/۵۲

بدخواب اندھیروں کی جڑیں

اشعر ہاشمی

چشم در چشم
اُترتی ہوئی
بدخواب اندھیروں کی جڑیں
اپنے لاختم سفر پر نہ کہیں ٹھہریں گی
ہم جو سُنتے تھے
کسی سیلِ رواں کی آہٹ
آسمانوں سے اُترتے ہوئے
چٹانیں کترتے ہوئے
بے خوف گزرتے ہوئے
پانی کی صدا
ان دنوں اس کی اسیری کا گماں ہوتا ہے
ایسا لگتا ہے
برستے ہوئے سورج نے کہیں
دھوپ کے پیڑ گرہ بند کیے رکھے ہیں
ہم جو سنتے تھے
کسی سیلِ رواں کی آہٹ
ان دنوں اس کی اسیری کا گماں ہوتا ہے
چشم در چشم
اُترتی ہوئی بدخواب اندھیروں کی جڑیں
نرم مٹی میں
پرت بعد پرت
پشتہا پشت بہت دور نکل جائیں گی
پیڑھیں میں کہیں اُتر جائیں گی
ٹوٹ کر گرتی ہوئی آخری دیوار کے ملبوں سے
ہم نے بارود کا جو ڈھیر لگا رکھا ہے
کون دکھلائے گا پھر آگ اُسے !

سوہن راہی

سوغات

اک اک موتی ہو کر ٹوٹیں
پیار کی مالائیں آنکھوں سے
سپنے درد کے گیت بنے
اور خاموشی میں ڈوب گئے
گیتوں کی کلیاں کملائیں
آشاؤں کے چاند بجھے

زخموں کے آنگن میں، لیکن
میرے پاگل سُونے دل نے
تیری یاد کے گہنے پہنے
یاد کے گہنے ٹوٹ نہ پائیں
پھول نہ سپنوں کے مرجھائیں

نظام صدیقی

ایک بات

ٹیوب لائٹ ٹیوب کی نرم، پُرسکون اور سنہری روشنی کے غبار میں رُبیں خود کو اینمل فلاسک میں بند سا محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ پہلے دن اُسی آراستہ کمرہ میں داخل ہو کر اُس کو گمان ہوا تھا کہ اُس نے آسودگی اور تسکین کے پُراسرار، خوابیدہ اور نیم فراموش جزیرہ میں قدم رکھا ہے۔ اُس کی فضا میں ایک اچھوتی لذت تھی۔

آج دوپہر ہی سے کوئی سوگوار اور بیکل سا خیال تھا، جو اُس کی گرفت میں بھرپور طور پر نہیں آرہا تھا۔ خیال نہیں شاید کچھ اور ہی تھا۔ تاروں کی سرد، اچھوتی اور خیالوں کو اداس کرنے والی خوشبو کے مانند پتہ نہیں کس بے نام سی نازک شے کا لطیف احساس تھا، جو جگنو سا ایک ثانیہ کے لئے چمکتا اور دماغ کے کسی تاریک گوشہ میں سہم کر گم ہو جاتا۔ وہ نہایت بے تابی سے اُس کا ذہنی تعاقب کرتا۔ اُس کو دیوانہ وار دبوچ لینے کی کوشش کرتا لیکن کوندا تنی عارضی ہوتی کہ وہ ہر بار نہایت بے بسی سے اندھیرے میں بھٹکتا رہ جاتا۔

روزی ہمیشہ کی طرح کاپی مونگھتی سی ڈکٹیشن لے رہی تھی اُس کی نیلی آنکھوں میں کسی خواب، کسی زخم، کسی درد یا کسی مُسرت کی ہلکی سی رمق بھی نہ تھی۔ وہی موم کی مریم سا بے جان انداز، وہی ایک مشینی رفتار سے چلتا ہاتھ، وہی کاپی پر نب کی تیز سرسراہٹ —

رُبیں کو تعجب ہو رہا تھا کہ کیسے اُس کے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ پورے پورے جملے بن جاتے ہیں۔ کیسے روزی ایک بار بھی آنکھ اُٹھائے اور کچھ پوچھے بغیر انھیں آڑی ترچھی لائنوں میں بدلتی جاتی ہے گویا بولنے والی زبان اور لکھنے والے ہاتھ دونوں ایک ہی مشین کے حصہ ہوں اور وہ مشین خود بخود رواں دواں ہو۔ اُس میں نہ اُس کے کسی ارادہ کا دخل ہو اور نہ روزی کے دل کی کسی دھڑکن کی لڑکھڑاہٹ شامل ہو۔

پھر ہی ستاروں کے ٹوٹنے کی کوندسی دو مختصر سُرخیاں شعور کے اُفق پر تیزی سے نمودار ہوئیں جو صبح کے اخبار میں بڑی خبروں کے سمندر میں ایک دوسرے سے دور اور الگ دو جزیروں کے مانند صفوتیں اور ساحت پر نظر آرہی تھیں۔ دہلی کی فیس پر ایک بلا کی خوب صورت نوجوان لڑکی کی دہشت ناک خودکشی، سکریٹریٹ میں ایک افسر کی ہارٹ اٹیک سے موت۔ ایک سفید میز پر سفید کپڑے سے ڈھکی دو نعشیں — عورت کا چہرہ ناہید کا۔ سرکاری افسر کا اُس کا اپنا — ڈکٹیشن کے الفاظ ان چہروں کے اوپر بادل کے ٹکڑے کے مانند منڈلا رہے تھے — وِی ریگریٹ ٹو اسٹیٹ ڈیٹ انپائنٹ آف سومین ار ییر ریمانڈرز آن دی پوائنٹ ......!

روزی کی اسکرٹ کا رنگ گہرا سُرخ تھا۔ اُس رنگ نے چہرہ کو اپنے میں ڈبو لیا تھا۔ وہ ایسا بھڑکیلا جذبات انگیز رنگ کیوں منتخب کرتی ہے جس کے باعث وہ عورت کم خطرہ کا سگنل زیادہ معلوم ہوتی ہے یا کسی مخدوش جملہ پر لگا ہوا چیختا ہوا سرخ نشان جس کی طرف خواہ مخواہ آدمی کی توجہ مرکوز ہو جائے اور چند ثانیہ کے لئے وہ پاگل ہو جائے۔

دماغ میں پھر وہی احساس کی دبی دبی بھینچی بھینچی کسمساہٹ اس بار ناہید کے چہرہ کے ساتھ عود کر آئی۔ وہ ساڑھے پانچ بجے ٹی۔ سنٹر میں آئے گی۔ آج اُس کی زندگی پر بن گئی ہے۔ کیا مطلب؟ کچھ ہو گا ہی۔ ایک عرصہ کے بعد اُس نے فون کیا بھی تو اُس میں دل نوازی کی ہلکی سی رمق بھی نہ تھی۔ صرف دو ایک جملہ کے بعد بات چیت کا سلسلہ ہی منقطع کر دیا جس سے اُس کی اندرونی کشمکش کا راز عیاں تھا۔

اِس کم بخت روزی کے لباس کا سُرخ دمکتا رنگ کیسا تکلیف دہ ہے۔ نہ جانے کیوں اُس کو آج کل بیٹھے بیٹھے بیر بہوٹی ہی بننے کا خبط ہو گیا ہے۔ آدمی کو بگڑنے دیر نہیں لگتی۔ مگر یہ کب سیدھی ہی تھی۔ سیدھا ہونا تو دنیا میں سب سے مشکل کام ہے۔ اسی سالے کو دیکھو۔ اُس کے کان پر جوں ہی نہیں رینگتی ...... وی ہیو ناٹ ریسیوڈ اینی کمیونی کیشن فرام یور سائڈ۔

روزی کے چہرہ پر اتنی اُدھڑی اُدھڑی بناوٹ کیوں ہے ڈکٹیشن لیتے وقت وہ ویسی ہی نارمل کیوں نہیں نظر آتی جیسی اُس دن پارک میں کسی مرد کے پہلو میں بیٹھی اُس کو غلط انداز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ کیسا جذبات کے طوفان سے گلنار ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے آ کر وہ بھی فلاسک میں بند کیوں ہو جاتی ہے؟ ... پیپرا ...

ورزش میں فیس پیپر اونچی اُٹھتی لہریں۔ لہروں میں ڈوبتا اُترتا نازک بدن ... بیس سے ساتھ کاروں کی لمبی قطار

جسم کو ایک ایمبولنس میں ڈالا جا رہا ہے۔ ٹریفک کی بھیڑ میں ایمبولنس تیزی سے گزرتی جاتی ہے۔ ناہید اپنے بلے بس بیچنے جسم کو دیکھ کر ڈری ہوئی ہے۔ وہ ایمبولنس کے دروازہ پر دستک دے رہی ہے ...... مجھے اپنا پوسٹ مارٹم نہیں چاہیے

ٹریفک، سگنل، سینما کے بڑے بڑے ہورڈنگ ٹرانسسٹروں کی آوازیں، بوتلوں روشنیاں، میزوں پر پیش کی جا رہی طشتریاں۔ مٹن چاپ۔ آلو چھولے۔ ناہید! ناہید! پوسٹ مارٹم کے لئے لے جاتا جسم سرکاری افسر کا ہے یعنی اُس کا اپنا۔ ساتھ تین لڑکے ہیں۔ یہ لڑکے کس کی اولاد ہیں۔ میری روح تو کنواری ہے۔ ایک لڑکا کہہ رہا ہے۔ پاپا دفتر کی کیبن میں اسٹینو کو ڈکٹیشن دے رہے تھے۔ جب اچانک ..... ! وی ٹو فرڈر ڈرا یور اٹینشن ٹو ڈیٹ !

پوسٹ مارٹم کی میز پر چیر پھاڑ ہونے والی ہے۔ بلب روشن کر دیئے گئے ہیں۔ "ا یکارڈنگ ٹو سیکشن نائن ٹو آف آڈر ایگری منٹ۔"

اچانک ایر کنڈیشنگ پلانٹ کے رُک جانے سے ساری عمارت چلتے چلتے ٹھہر گئی۔ روزی نے دونوں ہاتھوں کو اوپر کی طرف اُٹھا کر بے ساختہ انگڑائی لی۔ اُس کا کبوتر کے بچہ سا اُوپر کو اُٹھا تو بشکن سینہ آپے سے باہر ہو کر اور تن گیا۔ چہرہ اندرونی تموج سے سورج کی طرح تمتما اُٹھا۔ اُس کے گدگدے ذرا اوپر کو اُٹھے اور کھلے گول گول شہوت انگیز سرخ ہونٹ سکڑ سمٹ کر مختلف دلآویز زاویئے اختیار کرنے لگے۔ بھری بھری گداز ریشمیں باہیں مضطرب ہو اُٹھیں۔ سرخ بھورے چکنا سے اسکرٹ میں ذرا دبی دبی اور بھینچی بھینچی کیلے کے تنے سے چکنی بے داغ، خوب صورت اور ملائم جانگھیں اور بھرپور کسی کسی سڈول دودھیا پنڈلیاں بے اختیار آپس میں گتھم گتھا اور سرگوشیاں کرنے لگیں۔ نازک کرنے ایک عجیب سا دلربا شہوت انگیز۔ اینگل پر سانس کھینچ لیا تھا جس کے باعث اُس کے اُبھرے

اور بھولے کو لہوں میں ایک بڑی دلکش سی شاعرانہ تمکنت پیدا ہوگئی تھی جو غضب کی چیلنج آگیں تھی۔

وہ ابھی چند ثانیہ قبل کی موم کی گڑیا اب آہستہ آہستہ سراپا جنسی دھماکہ میں تبدیل ہو رہی تھی جو فدائی بے احتیاطی پر آدمی کے ہوش و حواس کے پرخچے اڑا دینے کے درپے تھی۔ روزی کے دعوت بخش عشووں سے بے نیاز رحیم نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس کرہ کی دفترشاہانہ روایت کے مطابق اس کے ہونٹوں پر کوئی الوداعی بوسہ نہیں تھکا۔ اس نے خود ہی فائلوں کو اٹھا کر الماری میں مقفل کر دیا۔ حالانکہ ابھی بہت کام باقی تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب سارے کام پورے ہو جائیں۔ ہر آج آنے والے کل کے لئے کچھ نہ کچھ وراثت چھوڑ جاتا تھا۔ دن بھر کی دیدہ ریزی نے اس کے جسم کے ریشہ ریشہ سے خون کو نچوڑ لیا تھا

... تھک خوردہ مشین سا بے جان، روزی کی غلط انداز نظروں سے بچتا ہوا کیبن سے باہر نکل گیا۔

اُس کو اس وقت شدت سے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی بھاری چٹان کندھوں پر لے کر چل رہا ہو۔ کندھوں پر نہیں سر پر۔ پتہ نہیں کیوں ذہنی گراں باری ہر وقت برقرار رہتی تھی، جس کے دباؤ سے اکثر جسم کا رواں رواں کراہ کر آنسوؤں میں نہا اٹھتا تھا۔ اور میز کے نیچے ردی کی ٹوکری کاغذ کے گیندوں سے بھر جاتی تھی۔ اس کے اندر کی لکیریں، دائرے اور زاویے اس ذہنی کرب کے گراف ہوتے تھے جن کو وہ اپنی زیرلب مسکراہٹ کے نقاب میں چھپائے رہتا تھا اور روزی کو دیکھتا رہتا تھا جس کو حالات اور ضرورت کے دباؤ نے شاید کوک بھری گڑیا بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کیوں کسی کی مجبوری کا فائدہ اٹھائے۔ اس کا دوست کہیں بے قرار دل کے ساتھ منتظر ہوگا۔ بار بز خود آتو نہیں ہونے پھر اس قدر بندگی کی کیا ضرورت ہے؟ اُس کو اپنے افسر کی نشہ میں موصت بات یاد آگئی۔ ”اولاڈ ہوائے زندگی میں اُڈلٹری کی بھی ضرورت ہے۔ ورنہ آدمی کا دل پھٹ جائے۔

یہاں انتخاب کی آزادی کہاں ہے؟ اگر ہے بھی تو حالات کہاں یقینی ہیں؟ ہر چیز غیر محفوظ اور غیر یقینی ہے۔ پھر یہی ایک دل اور ہزار غم جاناں اور غم دوراں“ —— اس غیر محفوظیت کی غیر مرئی چٹان سے ہی ٹکرا کر آج آدمی پاش پاش ہو کر کتنے حصوں میں بٹ گیا ہے۔ اس نقابوں کے شہر بمبئی میں اُس کا دل محبوب کے گلے میں باہیں ڈال کر سسک رہا ہے تو جسم پاس کی کرسی لپٹا اُبلا پڑ رہا ہے۔ دماغ سود خور سیٹھ کی تجوری میں بند کراہ رہا ہے۔ رواں رواں ماں باپ بھائی اور بہن کے لئے رو رہا ہے۔ شخصیتیں مسخ ہو رہی ہیں اور لپ سٹک اور پاؤڈر اور ملبوسات اور تحائف چاہئے تاکہ ان کو زیادہ دنوں تک مرمت کر کے کارآمد اور جاذب توجہ بنایا جا سکے۔ ہر چیز کی آج قیمت ہے۔ کل یہاں کہاں محفوظ ہے؟ آج ہی پیر کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی ہے۔

آفس سے باہر آکر ایک لمحہ کے لئے خیالات کی رو سے بچتے ہوئے ایک بار پھر اُس نے چپکے سے کلائی کی گھڑی دیکھ لی پانچ بجے ہیں۔ ناہید نے ٹی۔ سنٹر میں ساڑھے پانچ بجے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اُس کا پورا کرنا مشکل ہی معلوم ہو رہا تھا۔ بھیڑ کے دباؤ سے اچانک اُس کو احساس ہوا کہ وہ فلورا فاؤنٹین کی جگہ کسی دوسری شاہراہ پر نکل آیا ہے۔ ہر شام آخر شام ہوتی ہے۔ اُس کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ یہ بات بمبئی کے قیام کے دوران ایک سال سے آہستہ آہستہ ذہن سے فراموش ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کے احساس کے تیز چکراتے دائرہ میں وقت کی گردش کے صرف دو ہی نام تھے۔ دن اور رات اور دو ہی روپ جو اُن کے شناختی کارڈ کے مصداق تھے۔ کیبن کے ٹیوب کی روشنی اور سڑک کے ہنڈوں کی روشنی —— دونوں کے بیچ کا وقفہ ایک ایسے جھٹپٹے کے مانند تھا جو انہیں باہم جوڑتا تھا۔ گھر اور دفتر کے درمیان الکٹرک ٹرین کے سفر کے مانند —— سامنے سڑک پر پھیلا ہوا ایک سرخ بادل کا سایہ —— یہ ایک بیگانہ سا تجربہ تھا

اُس سرخ رنگ کے زیرِ سایہ تیز ٹریفک کے جوکھم سے گزر کر اُس نے فلورا کی مورتی والے حصہ کو پار کیا اور ایک بار پھر اُسی جوکھم سے گزر کر تار گھر کے فٹ پاتھ پر آ گیا۔ لیکن اتنی ہی دیر میں گرد و پیش کا رنگ پہلا جیسا قائم نہیں۔ بھیڑ کے جس بہاؤ کے ساتھ اُس نے سڑک پار کی تھی۔ اُسی کے ساتھ وہ آگے بڑھتا گیا۔ اپنے وجود کے ایک حصہ سے وہ بھی بھیڑ کے ساتھ تھا۔ لیکن دوسرا حصہ زبردستی اُس کو بھیڑ سے الگ کر کے تی سنٹر کی طرف لے جا رہا تھا۔ پہلے کے بیتے ہوئے وہ دل نواز لمحات اُس کی باہوں میں بار بار بے اختیار گنگناتی ہوئی مستیوں کے ساتھ تازہ ہوا کھتے تھے۔ کوئی ایسی بلا کی جادوئی چیز تھی جس سے دُور دُور جاتا ہوا بھی وہ اُسی کے نشہ آور دائرہ میں غیر دانستہ طور پر سحر زدہ گھوم رہا تھا۔ اُس کی احساس کمتری سے چور چور نحیف باہوں میں والہانہ خود سپردگی کے نشے سے بے سُدھ ناہید کا قیامت آگیں نازک جسم کسی خستہ حال شاعر کے ذہن میں اٹکے ہوئے رومانی مصرعہ کے مانند کیف پرور تھا۔ وہ اُس کے مخمور کن شباب کی لطافتوں اور بلاغتوں میں ڈوبا ہوا دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا تھا جیسے وہ کسی اسٹیبلشمنٹ کے بڑے کَل کا حقیر زنگ خوردہ پرزہ نہ ہو بلکہ کسی داستانی غزل کا کا رومانی شہزادہ ہو جو کسی ماہ پارہ کے پہلو میں محوِ ناز و نیاز ہے اور آسمان اُس کا خیمۂ زر و گل بن گیا ہے۔ اور دھرتی اندر سبھا نہ جانے کس طلسم کے طفیل یہ ہوش رُبا لمحات اُنگلی تھام کر بچہ کے مانند اس سولیوں کے جنگل میں بنا کسی وحشت کے چل رہے تھے۔ اُس کے صحن میں کسی کی بھی اسکوٹر رُکتی تھی تو فوراً ہی اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ وہ کتاب میز پہ پٹک کر دیوانہ وار دروازہ لڑتے اور کانپتے ہاتھوں سے کھولتا۔ ناہید مسکراتے لبوں کو بڑی ادا سے سکوڑتے اور سمیٹتے ہوئے اندر آتی تھی جس کے بنتے اور بگڑتے زاویوں سے دل ٹپک ٹپک پڑتا تھا۔ اور دروازہ بند ہوتے ہی وہ بلا کی معصومیت سے

اور دل کشی سے آنکھیں موند کر باہیں اُس کے سر پر رکھ
اس کا دل گلاب کے مانند کھل جاتا اور دماغ میں نور
پنکھ ڈولنے لگتے اور بے ساختہ لبوں پر شیلی کا یہ مصرعہ آ

ET US NOW THE EARTH WITH
RAZY DREAMS

(ہم کو دھرتی کو پاگل خوابوں سے بونے دو)

" اُوہوں! محض خواب بونے سے کام نہیں چلے گا ورنہ آنسوؤں کی فصل کاٹنا پڑے گی۔"

" کیوں؟ اُس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے۔"

" نہ بابا نہ! سپنے جتنے رنگین ہوتے ہیں۔ اُن کے ٹوٹنے سے اتنا ہی دُکھ ہوتا ہے۔"

" یہ تو آدمی کے ظرف اور توفیق کی بات ہے کہ وہ ا خواب کے لئے کتنی قربانی کرتا ہے یا اُس کی کم سے کم قیمت چکاتا ہے۔ ورنہ سچ پوچھو تو خواب ہی حقیقت کے پیدا ہونے ہیں۔"

" یہاں ہر خواب کو حقیقت میں بدلنے کی آزادی کہا ہے؟ اس کے چہرہ پر سوچ ستاروں کی دھیمی روشنی کی طر پھیل گئی تھی۔

" ہے کیوں نہیں ——— پہلے اپنے خواب آدمی وفادار تو ہو۔ پھر وہ جو چاہتا ہے اس دنیا میں کر سکتا

" آدمی کو وہی چاہنا چاہئے جو وہ کر سکے۔"

" یہ دیوانوں کا نہیں بلکہ موقع پرستوں، مصلحت زادوں اور بزدلوں کا شیوہ ہے۔"

" اب میں تم سے بحث تو کرنے سے رہی۔ بہر حال خواب میرے والدین کو قطعاً پسند نہیں۔ ان سے ایک گھر کی دیواریں نہیں کھڑی ہو سکتیں۔ اس کے لئے مناسب پیسے چاہئیں۔"

" پیسہ سب کچھ نہیں ہے۔"

" سب کچھ کون کہتا ہے۔ لیکن تازہ فیشن کے مطابق آد

خدا ہو ہی ہے۔"

"ہوگا۔ اسی لئے تم کو وہ لوگ ٹھیکیدار ساجد میاں کے اینٹوں کے بھٹہ میں جھونکنا چاہتے ہیں آں؟"

"شاید۔"

"تمہارے وجود سے وہ اینٹوں کا بھٹہ جنت بن جائیگا البتہ میری زندگی ضرور جہنم زار ہو جائے گی۔"

"سچ بتاؤ کیا مجھ کو کسی بھٹہ والے کی بیوی ہونا چاہیے"

"نہیں تم کو کسی فن کار بے حد خوب ہونا چاہئے۔ اس کی روح کا بے قرار نغمہ ہونا چاہئے۔"

"سچ مچ! ——— ڈریم گرل آں؟ وہ بھی کسی فن کار کی ——— کبھی تب تو بہت خوبصورت ...... بہت خوبصورت۔"

"اور نہیں تو کیا میں جھوٹ بولتا ہوں ——— آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اِدھر دیکھو۔ تم بہت خوبصورت ہو بہت۔" رئیس نے اپنی خواب ناک آنکھیں اس کی مخمور آنکھوں میں ڈال دیں۔

"میرے آئینے میرے فن کار! اُس کے چہرہ پر ایک دم چمک سی بکھر گئی۔ "پھر تو تم آئی۔ اے۔ ایس کے مقابلہ میں بیٹھ رہے ہونا۔ اُس سے گھر والوں کے آنسو پوچھے جا سکتے ہیں۔ تمہاری کالج کی لکچرر شپ تو بڑی واہیات چیز ہے۔ پھر اُردو کے رسائل سے کیا ملتا ہے۔؟"

"اگر ایسا ہے تو میں تمہارے لئے شعر و ادب کی دیوی کی پوجا چھوڑ کر مقابلہ میں ہی بیٹھوں گا۔ حالانکہ مجھے کسی بھی نوعیت کی نوکر شاہی سے چڑ ہے۔"

ناہید نے چونک کر حیرت اور خوشی سے اُس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ جہاں زمین سے آسمان تک وہی صرف وہی تھی۔

"وعدہ" ——— ناہید کی روح اُس کے ہم ——— اُس نے ناہید کی روز کی معصومت آگیں اصرار سے تنگ آکر اثبات میں سر ہلا دیا تھا اور ناہید رات کی رانی کے مانند کھلکھلاتی ہوئی اس سے لپٹ گئی تھی۔ باہوں کی گرفت میں بے بس پرندہ کی طرح بے قرار اُس کا زندگی اور خوشی سے بھرپور جسم اُن کو کیا چھوئی موئی سا نازک معلوم ہوا تھا۔ جیسے ذرا سے دباؤ سے وہ آدھا رہ گیا ہو۔ اکثر ایسے ہی رومان پرور لمحوں میں اُس کو خود پر حیرت ہوتی تھی۔ آخر کم بخت کیا بلا تھی۔ ان مٹھی بھر ہڈیوں میں جو اس پر آسیب کی طرح سوار ہو گئی تھی۔ اور ہر وقت بے قرار رکھتی تھی کہ اُسی کو خدا بنا کر دن رات اُسی کی پرستش کرو۔ اگر دل کی نجات چاہتے ہو ورنہ غموں سے مفر نہیں۔ اس کے حسن میں اُس کے بے قرار دل کے لئے دستِ عیسٰی سی ایک عجیب تسکین بخش کیفیت تھی۔ وہ اکثر گھبرا کر سوچتا کیا یہ معصوم روح جس کی یاد بھی روحِ مریم کی طرح زندگی بخش ہے۔ کبھی اس مشینوں کے شہر میں پتھر کی بے رحم مورتی میں تبدیل ہو سکے گی جس کے قدموں پر سر پٹکنے سے بھی درد کا کوئی درمان نہ ہوگا۔ کیا اس ننھے سے موم کے جسم میں اس کے والدین کبھی پتھر کا کلیجہ نصب کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے جو شاید اُس کی محبت کا کبھی کتبہ بن جائے۔ کیا مجھے سچ مچ شیلی، کیٹس، بائرن، رین بو، فیض، مجاز اور بشیر بدر کی پوجا کے بجائے کمیشن ماسٹر پر دیدہ ریزی کرنی چاہئے۔ یہ میرا خواب نہیں اُس کا ہے۔ میں زندگی بھر صرف پڑھنا پڑھانا چاہتا ہوں۔ لیکن خوابوں کا کیا خواب ٹوٹ بھی تو سکتے ہیں۔ کیا یہ شکستِ خواب کے کرب کو جھیلنے میں میری ہم سفر بھی بن سکے گی یا مجھ کو تنہائی، اور پیاس کے صحرا میں ہمیشہ ہمیشہ بھٹکنے کے لئے نہایت بے التفاتی سے چھوڑ کر چل دے گی۔ کبھی کبھی تو وہ نہایت تلخی سے پوچھتا۔

"کیوں جی یہ تم کو آئی۔ اے۔ ایس کا اتنا کریز کیوں ہے۔؟"

"میں ... میں دراصل تمہیں اپنے والدین کی آنکھوں میں سربلند دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اُس جاہل بھتیجے کے اصل اوقات بتاکر اُس کا بھتیجا بٹھا دینا چاہتی ہوں۔ یہ میرا خواب بڑا تابناک ہے۔ دکھی دل کا خواب۔ خدا کرے یہ پورا ہو۔"

"مگر اس مقابلہ میں بڑی جھکنگ چاہیئے پاگل لڑکی ۔ میں ایک جھکڑ اور جھکڑ اُردو کا شاعر اور ادیب۔ اگر سچ مچ ناکام ہوا تو جان جانے کا خطرہ ہے۔ تم اس دکھ کو برداشت کر سکو گی۔"

"یہ دکھ تو بہت اچھا ہے۔ دراصل محبت دکھوں سے ہی عظیم ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ مروں گی۔"

ناہید اکثر اوقات پوری پوری دوپہر اس کے ساتھ گزارتی اور اس کے گمبھیر سکوت میں اُس کے نوٹس اُسارنے میں بھی مدد کرتی تو اس کے مضمحل چہرہ پر اُمید کی ہلکی سی کرن دوڑ جاتی اور اُس کے تپتے اور سلگتے احساس کی آنچ پر قطرہ قطرہ شبنم ٹپکنے لگتی۔ اُس وقت اس کو زندگی کی معنویت کا شدت سے احساس ہوتا۔ زندگی دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر خود میں اکیلے جینے کی نہیں بلکہ آپس میں بانٹ کر ہنستے مسکراتے ہوئے گزارنے کی چیز ہے۔ ورنہ بیکراں تنہائی اور بے معنویت سے زندگی جہنم زار بن جاتی ہے۔ اس جہنم کو ذرا سی محبت اور ایثار سے جنت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ صرف خود غرضی اور خود پرستی سے ذرا سی آنکھ بچالی جائے تو پھر ایک دوسرے میں سما جانے میں کوئی چیز سدراہ نہیں ہوتی۔ پیار اور اہنکار کا کوئی ساتھ ہی نہیں پیار اگر جوڑتا ہے تو اہنکار توڑتا ہے۔ وہ چپکے چپکے بڑے پیار سے ناہید کو کام میں ہاتھ بٹاتے دیکھتا رہتا۔ وہ سچ مچ حسین ترین لڑکی تھی۔ اُس کی آنکھیں بڑی پیاری تھیں اور بڑی اداس بھی جیسے ابھی رو کر اٹھی ہوں۔ ہونٹ بڑے نفیس تھے اور بال تو بے تحاشہ خوب صورت، کندھوں پر آبشار کی طرح گرتے دکھائی دیتے تھے جن میں ڈوب کر بیان دے دینے کو جی چاہتا تھا کہ اس آب سیاہ میں کہیں شاید آب حیات کا بھی پتہ ہو۔ اس کے وجود سے واقعی ویران اور اُجاڑ کمرہ میں ایک بہار کی سی دل نواز کیفیت چھائی رہتی۔ ذرا سی کوئی بات اُن کے دلوں میں نہ جانے کتنے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیتی جو انگنت خوشیوں کی پو در رنگا رنگ ہوتی۔ وہ موڈ میں آ کر پر خود فراموشی کے عالم میں اکثر بڑی اپنائیت سے بات کرتے ہوئے اس کے وجود میں سراپا ڈوبی رہتی اور آہستہ آہستہ اس کے بال، چہرہ اور ہونٹوں کو سہلاتی، تھپکتی اور مروڑتی رہتی۔ اس کے نازک جسم کی نسوں بکھیرتی چاندنی ایک دم سے اس کو بے خود کر دیتی وہ اس کی بے خودی کی تاب نہ لا کر محبت کی دھوپ سے تمتمائے چہرے کو اس کے بال والے سینہ میں چھپائے ہوئے بڑی والہانہ سپردگی سے اُس کی باہوں میں سما جاتی۔

"میری دنیا، میری جنت، میری روح!"

اُس کے بے قرار ہونٹ اُس کی پلکوں سے ہم آغوش ہو جاتے۔ ایک ہلکی سی تھرتھری سے ناہید کا چہرہ شبنم میں دھلے شفق کے مانند دمک اٹھتا اور ہونٹوں پر طمانیت کی روشنی پھیل جاتی۔ گرم سانسوں کی خوشبو سے پوری شخصیت مہک مہک اٹھتی۔ تو وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز از خود رفتہ ہونے لگتا۔ تو وہ کسمسا کر اُس کی باہوں سے نکلنے کی ناکام کوشش کرتی۔ تو وہ آہستہ سے سرگوشی کرتا جیسے یہ آواز ازل سے سفر کرتی ہوئی اب دھیرے دھیرے ابد کی روح میں اترتی ہو۔

"تم اتنی بے قرار کیوں ہو؟ کیا دھرتی ڈول گئی؟"

"ہاں۔ آں!" وہ تیز سانسوں کے درمیان سہم کر کہتی "ڈول گئی۔"

اچانک اُس کے اندر ایک ڈری ڈری سی نرم جھجک اور احتیاط پیدا ہو جاتی اور پورا چہرہ ذرا چونک کر ایک دم سے تیز تیز سانس لیتے ہوئے گلاب میں بدل جاتا اور اُس پر بے نام ولولوں کے ہزار قطرے لرزنے لگتے۔ اس کے جسم کا رواں رواں مزاحمت کرنے لگتا۔ "ابھی نہیں ... ابھی نہیں۔"

ناہید کی یہ معصومیت آگیں سرگوشی اور مزاحمت اُس کو

بہت اچھی لگتی تھی۔ جو ایک طرف اس کے اعتماد کو بڑھا دیتی
اور دوسری طرف اس کی دیوانگی کو ایک عجیب لطیف سا سلیقہ
عطا کر کے اس کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا کر دیتی۔ وہ نہایت
بے قراری سے اپنے ہاتھوں کے ہالے میں اس کے چہرہ کو لے کر
نہایت شوخی سے کہتا۔

"تمہیں دیکھ کر اس وقت بے ساختہ خیال آتا ہے کہ
تم کوئی جیتی جاگتی لڑکی نہیں ہو بلکہ گلاب کا پھول ہو جو تیز ہوا
کی پاگل باہوں میں تھرتھرا رہا ہو۔ کیوں میرے سہرے کا پھول
بننا قبول کرو گی؟"

ناہید کے چہرہ پر ایک عجیب سی بے باک حیا کا عالم
طاری ہو جاتا۔ جیسے شمع پروانہ کی طرف نگراں ہو۔ پھر وہ بڑی
ادا سے حسب عادت اپنے ہونٹوں کو مروڑ کر کہتی جیسے گلاب
جامن کھا رہی ہو۔ "ہاں .... ہاں!"

وہ ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے برستی محبت کی شراب
سے بے خود ہو کر اس کو گود میں لے کر پاگلوں کی طرح بس ناچتا
ہی چلا جاتا تو وہ نہایت خفگی سے زچ ہو کر انکار کرنے لگتی۔

"نہیں نہیں..... نہیں ـــ تم بالکل وحشی ہو۔ مجھے
چھوڑ دو .... مجھے چھوڑ دو ..... نہیں تو اللہ کی قسم مر جاؤں گی۔"

"بھلا بھونرے کے بوجھ سے آج تک کوئی پھول مرا ہے۔"
وہ فلک شگاف قہقہہ لگاتا۔

"یہاں جان پر بن گئی ہے۔ تمہیں اپنی پڑی ہے۔
یہ شاعر وادیب ایک دم سڑی ہوتے ہیں۔ ایسے پاگلوں
کو کون اپنے سر منڈھے گا۔" اس پر ہسٹریا سا غصہ کا دورہ
پڑتا۔

وہ ایک دم اپنی سرمستی اور از خود رفتگی سے گھبرا کر پشیمان
ہو جاتا تو وہ اس سے علیحدہ ہو کر کھل کھل کر ہنستی ہی چلی جاتی۔
کمرہ میں ایک پیارا سا شور ایک دل کش ہنگامہ برپا ہو جاتا۔
وہ پلک جھپکتے ہی کمرہ سے نکل کر اپنی اسکوٹر کو لے کر ہوا ہو جاتی۔

تو وہ نہایت مسرت اور حسرت سے اس راستہ کی طرف بڑی دیر
تک دیکھتا رہ جاتا تھا جو اس کے دل کی طرح اس کے اسکوٹر
کے پیچھے دور دور تک بچھتا چلا جا رہا تھا۔

کئی بار تو وہ اس کے محتاط رویہ سے ایک دم پریشان
ہو جاتا۔ عجیب لڑکی ہے۔ خواہ مخواہ نہ جانے کیوں خفا ہو جاتی
ہے۔ یہ تو ٹھیک ہی ہے کہ وہ ایک حد سے آگے بڑھنا ناپسند
نہیں کرتی۔ پھر وہ سر پھری لڑکی حقیقتاً کیا سوچتی اور چاہتی ہے۔
اس کا وہ تصور نہیں کر پاتا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے یوں ہی ہنسی
سے اکھڑ کر بات کی تو اس کا چہرہ جس طرح کا ہو گیا۔ اس کے
ہونٹ جس طرح پھیکے پڑ گئے۔ پیشانی کی رگیں جس طرح کانپنے
لگیں اور آنکھیں بھیڑ میں کھو رہے بچے جیسی آنسوؤں میں دھندلا
گئیں۔ اس نے خود اس کو بڑا خوف سا محسوس ہونے لگا کہیں
اس کو ہسٹریا کا دورہ نہ پڑ جائے۔ وہ جانتا تھا کہ اندر ہی اندر
ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کے ڈیڈی کرنل جلال الدین
بہت سخت آدمی تھے۔ وہ جتنے آزاد خیال تھے، اتنے ہی وضعدار
بھی تھے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی ان کی آمرانہ ذہنیت برقرار تھی
ماں تو خیر اشرافیہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کو اپنے خاندانی شرافت
اور وقار پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے والدین سے بہت ڈرتی تھی
اور انھیں کی مرضی سے ایک ٹھیکیدار سے اس کی شادی طے
ہو چکی تھی۔ ناہید اس شادی سے انکار کرنا چاہتے ہوئے بھی
یہ بات زبان پر نہ لا پاتی تھی۔ ایک بار وہ چائے پر ان کے یہاں
مدعو تھا۔ تو ناہید کی ماں نے اس کے سامنے ہی کہا تھا:

"لکچرر صاحب آپ اس بے وقوف لڑکی کو ذرا سمجھائیے
کہ وہ شادی کے سلسلہ میں اب زیادہ ٹال مٹول نہ کرے۔ آپ اس کو
سمجھائیں گے تو سمجھ جائے گی۔ آپ کی یہ بہت زیادہ عزت کرتی
ہے۔ عمر کا چاہے اتنا زیادہ فرق نہ ہو۔ پھر بھی آپ کی شاگرد ہ
ہونے کے ناتے آپ کی بیٹی کی طرح ہے۔ ان لوگوں نے اتنے دنوں
تک بہرے کہنے سے انتظار کیا ہے۔ لیکن وہ سالہا سال تو انتظار میں

نہیں بیٹھ رہی گے۔ لڑکا بھی شادی کے بعد بزنس کے سلسلہ میں یورپ کے دورہ پر نکلنا چاہتا ہے۔"

اس کے پیروں سے ایک کپکپاہٹ اُٹھی تھی۔ جو اُس کے جسم میں سوئیوں کی طرح پھیل گئی تھی۔ اندر سے کوئی چیز ٹکڑے دھوئیں کی طرح آنکھوں میں رہ رہ کر اُمنڈ رہی تھی۔ بار بار محسوس ہو رہا تھا کہ اب اس چیز کو بہہ جانے دے، تو وہ اپنے میں کچھ ہلکا محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن استاد اور شاگرد کا مقدس رشتہ۔ والدین کے سامنے پیش ہو سکتی ہے۔ اُس نے آنسوؤں کا گلا گھونٹ دیا۔

اس شام کو ناہید کے گھر سے لوٹ کر وہ شاہراہ پر اس طرح دیر تک گھوم رہا تھا جیسے دماغ میں سڑکوں کا حساب ہی نہ بن رہا ہو۔ اچانک اُس نے چونک کر اپنے وجود سے باہر آ کر پایا کہ بھیڑ اُس سے آج بھی پیچھے چھوٹ گئی ہے۔ کراسنگ پر بجلی کا سرخ رنگ دیکھے بغیر وہ سڑک کے درمیان آ پہونچا تھا۔ اس نے دوڑ کر سڑک پار کر لی۔ اگر پانچ سکنڈ کی دیر ہو جاتی تو وہ تیزی سے آتی شیورلیٹ کے نیچے آ گیا ہوتا۔ چرچ گیٹ کے پاس وہ سُرنگ میں اُترا تو اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ سُرنگ کی تنگ گولائی اور ریلی آوازوں کا دباؤ محسوس کرتا وہ بہت آہستہ چل کر اوپر آیا۔ باہر آتے ہی اُس کو ایک ٹھنڈی سی تھرتھری محسوس ہوئی جیسے ابھی ابھی وہ اپنے حال کے مخونا غار میں تھا۔ اور اب اچانک وہاں سے گزرے کل سے چیلنج آنکھیں دبائے پر نکل آیا تھا۔

اُس دن جب چائے پر بلایا گیا تھا۔ تو اُس نے دل میں کچھ اور ہی سوچا تھا۔ لیکن اپنے گھر میں خود ناہید کا انداز اُس کو بڑا غیر فطری سا محسوس ہوا تھا۔ کسی بہت دور کے شناسا جو زندگی کے مختلف راہوں پر گامزن ہو۔ کہیں دور تک، والہانہ اپنائیت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ نہ جانے کس طرح کی دوری نے اپنی کمند میں پھینک کر ایک ثانیہ میں ان کو اجنبی اجنبی سا بنا دیا تھا۔ اُس کا تو اس اجنبیت کے دباؤ سے دم گھٹ کر رہ گیا تھا۔ پھر اُس کی بڑی بہن تو بار بار کمرہ میں آ کر اس طرح مشکوک نظروں سے اُس کو دیکھتی تھی جیسے اُس کی موجودگی میں کمرہ کی کسی بھی چیز کی عصمت محفوظ نہ ہو۔ اُس کو خود بھی عدم سلامتی کا ایک عجیب سا ہر وقت احساس پریشان کر رہا تھا۔ جب ناہید کی ماں نے وہ شادی والی بات کہی تھی تو ناہید گم سم ہو کر بس ایک طرف دیکھتی رہی تھی۔ چند ثانیوں کے لئے اس کے ساتھ کمرہ میں اکیلی ہوتے ہی وہ کچھ کہنے ہی والی تھی۔ لیکن اسی وقت ماں کے لوٹ کر آجانے سے اس کے الفاظ گلے میں ہی اٹک کر رہ گئے تھے۔ اُس کے بعد وہ ایک ہی بار اُن کے یہاں گیا تھا۔ صرف ایک بار جب وہ آئی۔ اے۔ ایس میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اس کے پہونچتے ہی چرچ گیٹ سے ایک ڈبل فاسٹ گاڑی وسل دے کر پلیٹ فارم سے سرکنے لگی تو ناامیدی کی ایک ہلکی سی لہر اُس کے جسم میں دوڑ گئی۔ سامنے کے فٹ پاتھ پر پہونچتے ہی وہاں کھڑی ٹیکسی کا دروازہ ٹیکسی ڈرائیور نے کھول دیا۔ "ٹیکسی صاحب"۔ اُس نے جواب نہیں دیا۔ تو ڈرائیور نے منہ بچکا کر دروازہ زور سے بند کر دیا۔ بس اسٹاپ پر لمبا کیو تھا۔ ایک خالی بس اُسی وقت آ کر رکی تھی۔ کیو میں کھڑے سب لوگ اُس میں سما جانے کی اُمید لئے ایک بے چین ٹھہراؤ کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ جو لڑکی کیو میں سب سے پیچھے تھی۔ اُس کے جسم کی تراش و خراش اتنی پرکشش تھی کہ اس کی نگاہیں اس سے لپٹ لپٹ گئیں جس کی آنچ سے شاید اُس کا خوش نما جسم اور چہرہ پگھل کر ناہید کے سراپا میں ڈھل گیا۔ اس کی آنکھیں کئی بار حیرت سے ٹھیک اسی طرح بند ہوئیں اور کھل گئیں جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے ناہید کے کمرہ کی کھڑکی کا ایک پٹ جھٹکے سے بند ہو اٹھا، اور پھر کھل گیا تھا۔ کھڑکی پر آویزاں پردہ، پٹ اور سلاخوں سے اُلجھ کر آزاد ہوا تھا تو اس طرح اوپر کو تیر گیا تھا کہ کمرہ ننگا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ دالان صحن، آنگن، ناہید کی بڑی بہن، کچن میں حکم صادر کرتی ہوئی ماں،

...ں میں لیزی چیئر پر بیٹھے ہوئے کرنل صاحب سب اس
...کا حصہ بن گئے تھے جو اس وقت حقارت، نفرت اور
...سب کا چیخنے اور دہاڑتے ہوئے پوسٹر بن گئے تھے۔ مگر کچھ لمحہ
...پہلے وہ کے سلاخوں سے چپک جانے کے سبب کمرہ پھر باہر سے
...ہو کر اپنے میں ڈھک گیا تھا۔ خلاف توقع اس بار کسی نے اس
...آنا پسند نہیں کیا تھا۔ ناہید کے والدین نے تو مبارک باد تک
...دینے کی زحمت گوارہ نہ کی تھی۔ اب موری کے اینٹے بھی سر کے تلخ
...نے لگے ہیں۔ کیا زمانہ آن لگا ہے۔ ناہید تو کئی دن سے بخار کی
...وجہ سے اپنے کمرہ میں ہی بے سُدھ پڑی تھی۔ وہ سب کو سلام
...کے نظر انداز کرتا ہوا اس کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔ اس
...میں ایک عجیب سی خود اعتمادی آ گئی تھی۔ ناہید کے لمبے بال
...تکیہ پر پھیلے ہوئے تھے۔ آنچل کے تلے دو چراغ روشن تھے۔ چہرہ پر
دھواں دھواں پھیلا ہوا تھا۔ نگاہوں میں ایک عجیب سی
دل کو مسوسنے والی ہراس تھی۔ اُس کو دیکھتے ہوئے وہ ہڑبڑا کر
اُٹھ بیٹھی اور اس کے کمرہ کے مانند یہاں بھی اپنے جسم کو بھول
سی گئی۔ وہ سر تا بہ قدم شبنم و گل میں بدل گئی تھی۔ اُس کے
ہونٹوں پر رُکی رُکی سی ہنسی اور آنکھوں میں رُکے رُکے آنسو
بیک وقت بڑے سکون نما بھی تھے۔ لیکن وہ کچھ ہی دیر بیٹھ کر
وہاں سے لوٹ آیا تھا جیسے وہ کسی اجنبی دیار میں بھولے سے
چلا آیا ہو۔ ہر شے آج اسکو اتنی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی
چلتے وقت وہ اکیلے میں ناہید سے اتنی ہی بات کہہ پایا تھا۔
"دیکھو اب ذرا جلد خدا کے لئے اچھی ہو جاؤ۔" اُس کی
آنکھوں کے اندر کوئی چیز چُبھ سی گئی تھی۔

ناہید نے بخار میں آہستہ سے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے
مسکرا کر کہا تھا۔ "خدا کے لئے ...... تمہارے لئے نہیں آں؟"

اُس دن ناہید کے گھر سے لوٹتے ہوئے اس کو بہت
روحانی اذیت پہونچی تھی۔ ناہید کے جملہ کو دُہراتے ہوئے اُس کو
محسوس ہو رہا تھا جیسے خود اس کو بھی بخار ہو گیا ہو۔ وہ گھر نہ لوٹ کر
بیرج، ہابے لیز، نیپولی ہر ریسٹورنٹ کے چکر لگاتا رہا تھا لیکن
اُس کو کہیں سکون نہیں مل رہا تھا۔ وہ ان کے ہجوم اور شور و
غل سے گھبرا کر میرین ڈرائیو کے فٹ پاتھ تک چلتا چلا آیا تھا۔
وہاں پہونچ کر بائیں طرف کے راستہ کی طرف وہ انجانے ہی بڑھتا
چلا گیا تھا۔

نیری مَن پائنٹ! چٹانوں کے اوپر سے اُمڈ کر آتے پانی
کی انگنت کروٹیں۔ سامنے اُس طرف سے آتی ایک دیسی ہی
تنگ سڑک کے پیچھے بڑے بڑے بادبانوں جیسے بکھرے بادلوں کے
ٹکڑے۔ سر کے اوپر اُٹھا ایک گھنا گھنا سرمئی! لایا ٹکڑا جو ابھی
کھلی شام کو قبل از وقت رات کے بگڑے حلیہ میں بدل دینے کے
درپے تھا۔ اگر وہ کم بخت نیم وحشی ٹکڑا اچانک ٹوٹ کر برسنے لگے
تو اس بُری حالت میں تنہائی میں بھی وہ اپنے لت پت جسم کو
کس طرح ڈھو پائے گا۔

ایک بادل اندر گھرا تھا۔ اسی طرح بکھرا بکھرا اُدھڑا اُدھڑا
بادل۔ اندر کی شام باہر کی شام سے زیادہ گہری اور اداس
تھی۔ اُس کے سایہ میں کوئی چیز کسک رہی تھی۔ کیوں یہ کسک
رہ رہ کر ایک زخم کے مانند اُبھر آتی تھی؟ اور صرف وہ کسک ہی
نہیں تھی ایک اور احساس بھی تھا۔ روئیں روئیں سے گزرتے ہوئے
بلیڈ جیسا سَر سَر — سَر! وہ کسی بھی طرح اس کربناک احساس
سے خود کو نہیں بچا سکتا تھا۔

یہ خیال آتے ہی کہ وہ ایک گھنٹے سے چل رہا ہے۔ اُس کو
یکایک تکان محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ جا کر سب سے نزدیک
کی بنچ پر نیم دراز سا ہو گیا تھا۔ بنچ کے پاس ایک بڑا پرانا آسیب
زدہ لیمپ پوسٹ تھا جس کے شیشہ پر دھوئیں اور موسم نے کئی ایک
شکلیں بنا دی تھیں۔ وہ بنچ کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔
گندے چتکبرے شیشہ پر اُس کو کئی کئی شکلیں نظر آنے لگیں۔ یہ
اُس کی ہمیشہ کی عادت تھی۔ سڑک سے گزرتی گاڑیوں کے نمبر جوڑنا
اور کہیں کوئی داغ نظر آتے ہی اُس کے سر، منہ اور پیر نکالنے لگنا

لیمپ کے شیشے میں ایک اسکرین تھا اور اُس پر دکھائی دیتی شکلیں؟ پہلی دُبلی شکل ناہید کی تھی۔ دوسری کبھی اُس کے باپ کی شکل اختیار کرلیتی اور کبھی اُس کی ماں کی اور تیسری؟ وہ ایک بڑھا کمزور آدمی تھا جو گھٹنوں کے بل وہاں گِرا ہوا تھا۔ وہ آدمی وہاں کیوں تھا اُن شکلوں کو اپنی بے بسی دکھا کر اُن سے کیا پانا چاہتا تھا؟

تینوں شکلیں ایک دم سپاٹ تھیں۔ ان میں کسی طرح کے قوس، خطوط اور زاویوں کا بناؤ اور سنوار نہ تھا بلکہ آسیب کا بگاڑ ہی نظر آرہا تھا۔ آسمان ایک کالے پوسٹ کارڈ کے مانند تھا۔ پوسٹ کارڈ پر لیمپ کی تصویر تھی۔ تصویر میں کچھ اور تصویریں ایک کے اندر دوسری — ایک بڈھا کمزور آدمی ایک شرم سے دُہری لڑکی میں بدل ہوگیا تھا۔ لڑکی چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر کسی طرح اپنے کو دوسروں کی نظروں سے بچائے رکھنا چاہتی تھی۔ پاس کی دونوں شکلیں ایک خستہ عمارت کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں تھیں جو درخت کے اوپر ڈھ آنے کو تھیں۔

اُس نے سخت ذہنی کرب کے سبب آنکھیں زور سے موند لی تھیں۔ اس طرح اُن شکلوں سے چھٹکارہ مل گیا تھا۔ لیکن لکڑی کے بنچ کے بازو پر زیادہ دیر لیٹا نہیں گیا تھا۔ ٹی۔ سنٹر کے پہلے چوراہے پر ہی تیز بریک لگنے سے بس ایک جھٹکے سے قریب رُک کر ہانپنے لگی۔ وہ لڑکی جس نے ابھی چند لمحہ قبل ناہید کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اُس کے اوپر ہڑبڑا کر تقریباً گر گئی تھی دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

" آئی۔ ایم۔ سوری — لیکن دونوں میں کسی نے دوسری طرف نہیں دیکھا۔

ہر اسٹاپ پر دو تین جسم اُس کی ننگی پشت یا بانہوں کو رگڑ جاتے تھے ویسے بھی تین طرف سے اُس کی پیٹھ، جانگھ کمر اور کوہنوں پر ان جسموں کا ایک دباؤ مستقل طور پر قائم تھا جیسے وہ اُس کے اُبھرے، بچھرے، اُمڈے اور بھرے بھرے حصوں پر زبردستی استری کرکے ہموار کرنے کے درپے ہوں۔ ایک یا زیادہ بہت سارے جسموں کا ایک ساتھ بوجھ پڑنے سے لڑکی کی بھویں تلملا کر تن گئیں۔

" اُف! "

" آبادی بہت بڑھ گئی ہے " پاس کھڑے ایک شخص نے اپنے بڑے دانت کو بھک سے نکال کر ہمدردی کا اظہار کیا۔ لڑکی تھوڑا پہلے سے اور سمٹ کر کھڑی ہوگئی ہو بہو جیسے ناہید اُس کے دھول دھپہ اور گرماگری سے خفا ہو کر کھڑی ہوتی تھی۔

" بارش بہت خراب موسم ہے۔" کسی دوسرے نے کہا۔

" عادت کی بات ہے۔ ویسے امیروں کے یہاں اسی موسم میں اندر سبھا کا اکھاڑہ جمتا ہے۔"

" اِنس ہوری بل! " لڑکی نے آنکھ ملنے پر پہلی بار اُس سے بات کی۔

" کیا چیز؟ ——— بارش "۔ اُس نے خیالات کے تیز چکر لاتے جھکڑ سے یکایک نکلتے ہوئے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

" نہیں یہ بس کا سفر — " وہ بیک وقت دونوں مسکرانے لگے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ " آبادی کم کرنے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو بڑے شہروں پر بم گرانے چاہئیں یا لوگوں کو برف خانوں میں رکھا جائے۔ "

بس ایک جھٹکے سے ٹی۔ سنٹر کے قریب رک گئی۔

اے دل بیتاب ٹھہر! ایک بار پھر سوری کا باہم تبادلہ ہوا۔ اس کا جسم بھی ذرا چونک کر آنکھ ملنے لگا۔ لڑکی کا جسم اُس کے جسم میں دھنس سا گیا تھا ناہید ہی کی طرح، وہ شاید ٹی سنٹر میں اُس کی منتظر ہی ہو۔

وہ تیزی سے ٹی سنٹر کی طرف بڑھا تو اُس بس سے اُترنے والی خوب صورت بلا نے اُس کے شانہ پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر جیسے ایک نئی اپنائیت کا ویزیٹنگ کارڈ اُس کی طرف بڑھادیا۔ " یہ کہاں برف خانہ میں جا رہے ہیں؟

بھلا تو کہتے ہیں کیا اگر ما گری کے لئے میں بھی ساتھ ہولوں "۔ اُس کو
ساختہ اسٹیفو زوزی یاد آ گئی۔ وہ آسیب زدہ سا چلایا
نہیں " لڑکی ایک دم سے سہم کر دوسری طرف بڑھ گئی۔
ٹی۔ سنٹر کے اندر خاصی بھیڑ تھی جیسی اکثر نہیں ہوتی تھی
دفتروں سے اُٹھ کر آئے تھکے ہارے اکیلے آدمی۔ اپنے آپ
سے اُکتائی ہوئی سنوری اکیلی عورتیں۔ دو ایک اکڑے، اور
نئے باس اور سکریٹری بنا جوڑے جیسے ابھی لانڈری سے سیدھے
نکل کر چلے آرہے ہوں۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز چہچہاتے
لڑکے اور لڑکیاں جو کلوکوز گلیسکو کے اشتہار کی طرح چہک
رہے تھے۔ لیکن کسی گوشے میں ایسی کوئی لڑکی نہیں تھی جس کو
دیکھ کر ناہید کا شبہ ہو سکتا جو بشیر بدر کی غزل کے مانند خوبصورت
اور منفرد ہے۔

ایک گوشے کے کیبن کا پردہ اُٹھا کر اطمینان سے بیٹھتے
ہوئے اُس نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ پانچ پینتیس!،
ناہید نے جس طرح فون پر بات کی تھی۔ اُس سے تو یہی معلوم
پڑتا تھا کہ وہ ساڑھے پانچ بجے سے پہلے پہونچ جائے گی۔

" ذرا وقت سے پہونچیو۔ یہ نہ ہو مجھے بہت زیادہ
انتظار کی کوفت برداشت کرنی پڑے "۔

تو کیا وہ انتظار کے کرب سے بچنے کے لئے دانستہ دیر
کر رہی ہے یا دیر سے آکر دیکھنا چاہتی تھی کہ پہلے سے آکر بیٹھے
ہوئے اُس کی آنکھوں میں کیسے جذبات موجزن نظر آتے ہیں
چھ مہینے کے بعد آج وہ پہلی بار آرہی تھی۔ وہ بھی تو ٹریننگ
سنٹر کی خاک چھان رہا تھا۔ کاش اُس کو پہلے سے اندازہ ہوتا
کہ آئی۔ اے۔ ایس افسری ایک بالاتر منشی گری سے زیادہ
کچھ نہیں ہے۔ وہ شام ہوتے ہی اپنی تنی نسوں، تھکی آنکھوں
اور درد کرتی ریڑھ کے باعث کس قدر افسردہ اور ملول ہو جاتا
اس وقت وہ اُس کو کس قدر یاد آتی۔ وہ وقت گزاری کے لئے
فیض کا مصرعہ گنگنانے لگا جو یک لخت ذہن میں عود کر آیا۔

ترا حسن دستِ عیسیٰ تری یاد روئے مریم

ایک بار پھر اُس نے گھڑی دیکھی تو اس کا دل ایک عجیب سے وسوسہ
سے مضمحل ہو گیا۔ اور مصرعے نے دم توڑ دیا۔ دماغ میں دفتر کے
فون کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور وہ جملہ اُس کے دماغ کی نسوں کو
مضراب کی طرح رگڑنے اور پیٹنے لگا ہوں۔ میری جان پر آبنی
ہے۔ اُس کو بار بار ناہید کے گھر والوں کا ہتک آمیز رویہ یاد آنے
لگا۔ کیوں؟ آخر ایسا کیوں؟ کیا اُن کو میری کامیابی شاق
گزری تھی۔ البتہ ناہید کا پیارا چہرہ یکبارگی پورے چاند کی طرح
دمک اُٹھا تھا۔ ویٹر آرڈر لینے کے لئے اُس کے قریب ذرا جھک
گیا تھا۔ کہنیاں میز پر ٹکائے اُس نے اکیلے آدمی کی طرح آرڈر
دے دیا ـــ " ایک ہنگل کافی گرم "۔

" رُمیں! ـــــــ " اسی وقت اُس نے ایک زرد چاند
کو خود سے جھک کر بولتے دیکھا۔

" اوہ! تم ـــ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے
پھر مُڑ کر بیرے سے جلدی سے کہا۔ " ڈبل کافی ـ خوب گرم۔
میں بیٹھوں گی نہیں ــــــ ایک ہی منگاؤ۔ "
اس کے خوبصورت چہرہ پر اُداسی، اُلجھن اور پریشانی آپس میں
گڈمڈ ہو رہی تھی۔

" ارے واہ! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسی بھی کیا جلدی۔
" ڈیڈی کا ڈرائیور گاڑی میں ہے۔ ڈاکٹر کے یہاں کا بہانہ
کر کے بڑی مشکل سے آئی ہوں۔ "
" طبیعت کیسی ہے؟ ہتھیلیوں سے ہتھیلیوں میں جاتا ایک
سوال۔ اُن کی اُنگلیاں آپس میں گتھ گئی تھیں۔
" ٹھیک ہی ہے۔ "
" اتنی پریشان کیوں نظر آرہی ہو۔ کوئی نئی بات ہو گئی کیا؟
" نہیں، بات تو وہی پرانی ہے۔ میں اب جاؤں گی۔ "
" لیکن آئی ہو تو صرف اتنا کہنے کہ تم اب جاؤ گی؟ "
وہ خاموش نظروں سے اُس کو دیکھ رہی تھی سامنے میں ایک

بیمار سا سونا پن تھا۔ پھر اُس کو محسوس ہونے لگا۔ ناہید کی آنکھیں اُس کی اپنی آنکھیں ہیں جن سے وہ خود کو دیکھ رہا ہے خشک بکھرے بالوں والا چہرہ، کندھے ذرا جھکے جھکے، کیا ان کندھوں سے اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اُس کی ریڑھ کی ہڈی درد کرتی رہتی ہے۔

"تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جاؤ ـــــ بیٹھ کر بتاؤ کہ..."

"میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکوں گی۔ میں صرف ایک بات کہنے آئی تھی۔"

"کہو۔" وہ سر سے پیر تک کان بن گیا۔

کچھ ایسا تھا کہ دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھ پانا ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ جب وہ دیکھتا تھا تو ناہید کی آنکھیں ہٹ جاتی تھیں۔ ناہید دیکھتی تھی تو وہ آنکھیں ہٹا لیتا تھا۔ پھر بھی بیچ کے خلا میں ایک اک ٹک نظر بھی تھی۔ شاید اُسی نظر کا وہ سامنا نہیں کر پا رہے تھے۔

"کچھ کہنے کے لئے اب باقی نہیں رہا۔ کہوں گی کیا۔ صرف معافی مانگنے آئی تھی۔"

"معافی کس بات کے لئے آئی؟" اُس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔

"ڈیڈی نے کل تاریخ دے دیا۔ ممی اگلے ہفتہ شادی کر دیں گی۔"

اُس کو اپنی سانس اُکھڑتی محسوس ہوئی۔ "اور تم نے مان لیا۔"

"میں منع نہیں کر سکتی تھی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ ڈیڈی سے کچھ کہنے کی میری ہمت نہیں ہے۔ وہ اپنے قول کے بڑے دھنی ہیں۔ امی اور آپی بھی پتھر دل بن گئی ہیں۔ وہ لوگ تو سب جانتی ہیں۔ پھر بھی انھیں یہی ٹھیک معلوم ہو رہا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ تم اُن کے برابر کے نہیں ہو۔ تمہارا خاندان بہت معمولی ہے۔ آئی۔ اے۔ ایس افسر ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ تمہارا اپنا کیا ہے؟ آخر تو غلام ہی ہو۔"

"تو یہ لوگ ہمارے خواب کو خاندان و نسل کی صلیب پہ لٹکا کر جشن منانا چاہتے ہیں۔ میں اس خواب کے لئے قربانی کی بات نہیں کرتا۔ کیا تم میں اِس کی قیمت چکانے کی بھی ہمت نہیں رہی میں تو سوچ رہا تھا کہ کم از کم آئی۔ اے۔ ایس میں بیٹھانے اور کامیاب کرانے کے بعد تم کو اپنا ایک ساتھ مرنے کا وعدہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ ناکامیاب ہوتا تو شاید مجھ کو بھی زیادہ گلہ نہ رہتا۔ سمجھتا کہ اہل ہی نہ تھا۔ تمہاری ادنیٰ سی خواہش کو پوری نہ کر سکا۔ لیکن اب..... تمہیں انصاف سے کہو۔"

"میں....... میں...... اسی لئے معافی مانگنے آئی ہوں تم نے میرے لئے سب کچھ کیا۔ مجھ ہی سے کچھ نہ ہو سکا۔"

اس کی آنکھوں میں بہت سارے دُکھ تھے اور بہت سی سوچیں بھی۔

"تم سمجھتی ہو بس چند الفاظ کی خیرات دے دینا ہی کافی ہے۔" وہ سسکنے لگی ـــــ "تو مجھے یقین کر لینا چاہئے کہ تم آج آخری بار آئی ہو۔"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔"

"لیکن مطلب تو یہی نکلتا ہے۔"

"نہیں اب جاؤں گی۔ ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔"

اس کے دماغ میں ایک بھنور سا گھوم گیا۔ ناہید کا چہرہ اس بھنور کے مرکز میں تھا اور کئی چہرے اس کے گرد منڈلاتے ہوئے ایک ساتھ بات کر رہے تھے۔ ناہید کی ماں کا چہرہ زور زور سے چلا رہا تھا۔ اُس کے ڈیڈی کا چہرہ ہلکے ہلکے کچھ پھسپھسا رہا تھا۔ اس کی بہن کی آنکھوں سے شک کا زہر اُبل رہا تھا۔ اُس کا افسر آنکھیں دوسری طرف کئے کہہ رہا تھا۔ اولڈ بوائے۔ اَڈلٹری زندگی کی ضرورت ہے۔ ایک دل ہزار غمِ جاناں اور غمِ دوراں۔ اُس کے علاوہ کتنے اور چہرے۔ اسٹینو روزی کا چیلنج آگیں چہرہ جس سے

اپنی انگیا میں آتش فشاں بم چھپا رکھے تھے۔ ناہید کے ہونے والے شوہر کا چہرہ جس کے اینٹوں کا بھٹہ اُس کے عشق کے لئے آتشِ نمرود بن گیا تھا۔ بس میں بیٹھی لڑکی کا چہرہ ۔ برف خانہ میں کہاں جا رہے ہیں۔ تین طرف مرد جسموں کا انبار پیٹھ، چھاتی کمر، کولھے، اور جانگھ پر ـــــ آتشیں بموں کو کیا ہوگیا ؟ آبادی بڑھتی جا رہی ہے ...... ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔

اُس نے یکبارگی آپے سے باہر ہو کر کہا " تم نے نہیں کہا تو میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ آج کے بعد تم کبھی میرے پاس آنے کی زحمت نہ کرنا۔

اُس کے دماغ کا بھنور کسی اندر کی سطح میں ڈوب سا گیا جسم میں اُس کو ایسی کمزوری محسوس ہونے لگی جیسے اُس کو کسی نے پیٹ کر وہاں ڈال دیا ہو۔

وہ اُٹھنے کے لئے کھڑی ہوئی تو اُس نے غصہ کے عالم میں ہاتھ پکڑ کر نیچے جھٹک دیا۔

میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ جو کچھ بھی طے ہوا ہے۔ تمہاری مرضی سے ہوا ہے۔ والدین کے سامنے اپنی بے دست و پائی کا بہانہ صرف ایک فراڈ ہے۔ تم نے شروع ہی سے اس مقدس رشتہ کو محض وقت گزاری کا ایک دلچسپ شغل سمجھا ہے۔

ناہید کی آنکھیں پھر اُسی طرح بھیڑ میں کھوتے ہوئے بچہ کی آنسوؤں میں دھندلا گئیں۔ اُس نے بڑی کوشش سے اپنی باہیں اُٹھائیں اور اس کے کندھوں پر رکھ دیں۔ "مجھے معاف کر دو۔"

وہ اس کی باہوں کو ایک جھٹکے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ لیکن بہت آہستہ سے ہٹا پایا۔ " ویسے بھی میرے یہاں آنے کا موقع نہیں رہے گا۔ تمہیں تو اینٹوں کے بھٹوں کو گلزار بنانے کے لئے یہاں سے جانا ہی ہے۔ یوں بھی ٹرانسفر کرا کر کہیں مرکھپ رہوں گا۔ "

ناہید چند لمحوں تک چپ چاپ اُس کو دیکھتی رہی پھر نہایت آہستہ سے سرگوشی کی " ایک بات کہوں۔" اور ایک بار پھر اس کے بہت قریب جھک آئی۔ اُس کے بالوں کی لٹیں اُس کے ہونٹوں کو چومنے لگیں۔

" یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم بغیر شادی کے مجھے ......

قریب بہت قریب وہ ڈرا ہوا بے بس مانوس چہرہ تھا ستواں ناک، ہونٹ، آنکھیں، پیشانی، ٹھوڑی۔ لمبے بے حد لمبے بال ـــ سب بے حد شناسا سا۔ پھر بھی اُس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن سب کو پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ وہ چہرہ جو اُس کے لئے ایک نمایاں انفرادیت اور محبوبیت رکھتا تھا۔ اچانک اُن سب چہروں جیسا ہو گیا تھا جن کو اُس کے سبب اجنبی تصور کرتا تھا۔ کتنی ہی باتیں ایک ساتھ اُس کے دل میں آئیں کہ اُس کو حسب عادت باہوں میں سمیٹ کر بے تحاشہ چومنے لگے...... کہ اس کو جھنجھوڑ کر دور ڈھکیل دے کہ اُس کو زبردستی اپنے ساتھ کہیں بھگا لے جائے ..... کہ اُس کو کچھ نہ کہہ کر اُس کی آنکھوں میں بے بسی سے لرزتے آنسوؤں کو دیکھتا رہے۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ کر صرف اتنا کہہ سکا۔

" دیکھو ناہید، میں نے تم سے صرف اتنا نہیں چاہا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو...... "

اُس نے بے چارگی اور کرب سے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ ہتھیلیوں کے اندر تاریک بیابان اپنے میں غرق کئے لے رہا تھا ایک کنواں تھا بہت گہرا جس کی دلدلی سطح پر پہونچ کر وہ دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جدھر ہاتھ بڑھتے ادھر دیوار نہیں ملتی۔ پیروں کے نیچے کا دلدل اس کو نگلتا جاتا تھا۔ بہت دیر اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد (جو کہ اس کے لئے بیکراں وقت تھا) اُس نے آہستہ سے ہتھیلیاں آنکھوں سے ہٹا لیں۔ اس کا خیال تھا ناہید جا چکی ہوگی۔ مگر ناہید اُس کے سامنے گم سم بیٹھی تھی۔ اُس کا چہرہ گہری سنگین اور درد انگیز سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُسی وقت اُس کا ڈرائیور بیرے کے ساتھ آگیا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے ایک بار پھر اُس کو بڑی حسرت و یاس سے دیکھا اور نہایت تھکے قدموں سے ٹی۔ سنٹر سے باہر نکل گئی۔ ـــــ ـــــ

مظفر حنفی

○

بلندیوں سے جو اپنے مکان کو دیکھا
پلٹ کے پھر کبھی آسمان کو دیکھا

تو اپنا سا کھدر بھی چھوٹ جائے گا یارو
اگر کسی نے قدم کے نشان کو دیکھا

الٹ پلٹ کے ہر اک زاوئیے سے موجوں نے
قطب نما کو، کبھی بادباں کو دیکھا

لگائے آنکھ فراتِ سراب سے کوئی
کسی کی تشنہ لبی نے کمان کو دیکھا

بتائے دیتا ہوں پتھر ہے میرے ہاتھوں میں
اگر کسی نے مرے مہرباں کو دیکھا

مرا شمار ہے لرزیدہ سنگ میلوں میں
غبار نے مری ترچھی اڑان کو دیکھا

وہ قتلِ عام، جسے نقدِ شعر کہتے ہیں
غزل کے باب میں چنگیز خان کو دیکھا

زمیں ہے تنگ مظفر مرے زمانے میں
سبھی طباؤں نے ہندوستاں کو دیکھا

غلام مرتضیٰ راہی

○

ابل پڑا ہوں تو اب پتھروں سے داب مجھے
نہ سوچ، کیسے کیا تو نے دستیاب مجھے

سب ایک موڑ تک آئے مرے تعاقب میں
اور اُس کے بعد سمجھنے لگے سراب مجھے

اتر چکا تھا میں گہرائی میں سمندر کی
کہاں سے کھینچ کے لے آئی سطحِ آب مجھے

چمک دمک سے مری، بند ہو گئیں آنکھیں
کہا گیا اسی عالم میں آفتاب مجھے

وہ میرے سامنے بت بن کے رہ گیا راہی
ذرا رہی تھی اُسے دیکھنے کی تاب مجھے

پرکاش فکری

○

رفتہ رفتہ سب مناظر کھو گئے ، اچھا ہوا
شور کرتے تھے پرندے سو گئے ، اچھا ہوا

کوئی آہٹ، کوئی دستک کچھ نہیں کچھ بھی نہیں
بھولی بسری اک کہانی ہو گئے ، اچھا ہوا

ایک مدت سے ہمارے آئینے پہ گرد تھی
آنسوؤں کے سیل اس کو دھو گئے ، اچھا ہوا

بے کلی کوئی نہ تھی تو دل بڑا بے زار تھا
اب حوادث زہر اس میں بو گئے ، اچھا ہوا

رنگ اپنا ہو نمایاں شوقِ بے جا تھا ہمیں
راستوں کی دھول میں ہم کھو گئے ، اچھا ہوا

بے سبب روتا تھا فکری اور رلاتا تھا ہمیں
اب زمانہ ہو گیا اس کو گئے ، اچھا ہوا

آزاد غزل

حق اعظمی

ہاتھ آیا نہ گوہر کبھی عمر بھر، زہر خوش ہو کے پیتے رہے ہم مگر آپ کے نام امرت اچھالا کئے
بحرِ ہستی کو یونہی کھنگالا کئے
تھے اندھیرے کھڑے راہ میں جا بجا
آرزومندگانِ سحر، دربدر شہرِ امید میں ہی بھٹکتے رہے اپنی بے چہرگی کا اُجالا لا کئے
ہلا ہپ، کیبرے، بیٹ کرتی ہوئی نور بالاؤں کے جسم کی حدتوں سے فضا گرم تھی
کوکھ میں اپنی کہسار برفیلے احساس پالا کئے
اژدہوں سی ہر اک سمت پھیلی ہوئی رہگذر منزلوں کو نگل کر تھی شاداں بہت
ہم کو چلنا تھا چلتے رہے، ذوق چلنے کا از حد دوبالا کئے
آئینے کی ذرا کرچیاں چُن تو لیں سانس لینے تو دے تھوڑی سی زندگی
ہے وہی یہ زمیں جس کے سانچے میں ہم چاند، سورج، ستاروں کو ڈھالا کئے
خواب چنتی رہی ہر تمنا
ہم کہیں بھی رہے، جس طرح بھی رہے ہر جگہ یاد تیری رہی ہم سفر اپنی باہوں کا ہالا کئے
ہم نے ڈھونڈھی کہیں گاہ اپنی کہاں، سائے ہی سائے اپنے محافظ رہے
برچھیاں دھوپ کی ہم پہ پڑتی گئیں وہ ہواؤں سے خود کو سنبھالا کئے

یوسف اعظمی

○

رنگوں کی دھنک ہے نہ کفِ موجِ صبا ہے
جسموں کے چمن زار میں خوشبو کا خلا ہے

انساں کا مقدر ہے کہ خوابوں کی فنا ہے
خود اپنی صداؤں کا افق ڈھونڈ رہا ہے

سنگ و شرر، صلیب، چتا، دشت، دائرہ
دیوانگی کو آج یہی کچھ تو ملا ہے

ذہنوں میں تیرگی کی سمیت کا شہر ہے
اپنی حیات جیسے کہ بے نام سزا ہے

احساس کے ہاتھوں میں نہیں پیار کی ریکھا
پرچھائیوں کے شہر میں دل چیخ رہا ہے

سایہ ہے دھواں یاد کا دن کے سراب میں
خوابوں میں حبس لمس کا مہتاب گھلا ہے

○

کتنی حسین لگتی ہے چہروں کی یہ کتاب
سطروں کے بیچ دیکھئے پھیلا ہوا عذاب

چیخوں کا جسم، نغموں کے شعلے ورق ورق
احساس بن گیا ہے کسی درد کی کتاب

چہروں پہ آج کتنی نقابوں کا بوجھ ہے
زخمی ہے آئینے کے سمندر میں ہر حباب

یزدانِ دل میں تو لئے پھولوں سے پر اُمید
لمحوں میں گھل رہا ہے تمناؤں کا شباب

سہمی ہوئی ہیں آنکھیں سحر کے جمال سے
آسیب بن کے شب کو ڈرانے لگے ہیں خواب

اپنا وجود جیسے ہے موہوم آرزو
دشتِ سفر ہے خواب کا پھیلا ہوا سراب

عبداللہ کمال

○

کچھ تلخ تھا سچ ذائقہ
ہر سمت ہے سنگِ صدا
اک زہر نے مجھ کو پیا
اب خوف ہے سہما ہوا
شب سنگ ہے دن آئینہ
ریزوں میں، میں ریزہ ہوا
مجنوں نہ بن تیشہ اٹھا
پچھلا سبق! اب بھول جا
کچھ سازشیں یعنی خدا
سب جھوٹ ہے!
میرے سوا

انور ادیب

○

ہر شخص اپنے آپ سے بیگانہ تھا بہت
سناٹا یوں تو شہر میں پھیلا نہ تھا بہت

میرے قدم ہی راہ میں تھک کر ٹھہر گئے
ویسے طویل دھوپ کا رستہ نہ تھا بہت

سننے کو اس کے سارا محلہ اُمڈ پڑا
حالانکہ خوشگوار وہ قصہ نہ تھا بہت

ساحل پہ ناریل کے سبھی پیڑ خشک تھے
دریا نے یوں تو راستہ بدلا نہ تھا بہت

کیا سوچ کر نہ جانے سبھی لوگ رو پڑے
جنگل میں یوں تو شور شرابہ نہ تھا بہت

خوابوں کے بیچ رہ کے کسی طرح جی لیا
اونچا مکان یوں تو کشادہ نہ تھا بہت

عبد المتین

ایسا ہوا

وہ رات اس کے لئے بہت اہم ثابت ہوئی۔ اُس رات اس کے وجود نے ایسے سفر کا آغاز کیا، جس کی اسے خبر نہ تھی۔

حسب معمول بیٹ منٹن کھیل کر اور لذیذ کھانوں کا ذائقہ لے کر وہ سو گئی تھی ...... پھر اچانک آدھی رات میں اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے دیکھا، کمرہ میں نیلے رنگ کا نائٹ لیمپ جل رہا تھا اور اس کی ہلکی نیلی روشنی میں اس کی ممی عریاں تھیں۔ ان کا سڈول، متناسب جسم سنگ مرمر کے مجسمہ کی طرح چمک رہا تھا ...... پھر ایک سایہ بڑھا اور ان پر جھک گیا۔ جس طرح وسیع سمندر کے کنارے پر آسمان جھک جاتا ہے .... جھکتے ہی سایہ نے اپنی زباں ممی کے جسم پر پھیرنی شروع کر دی ...... اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے جسم میں، جس میں خوش نما خطوط اور زاوے اُبھر رہے تھے، کسمساہٹ محسوس کی اور کسمساہٹ میں ایک خفیف سی گدگدی جو بند کلی باد نسیم کو شگفتہ پھول کو چومتے وقت محسوس کرتی ہے پھر ایسے لگا کہ اس گدگدی اور زبان کی لذت سے ماورا کچھ اور بھی ہے ...... وہ اس راز کی جستجو میں چل پڑی۔

سفر طویل تھا، مگر وقت تیز آرا ہے، جو ہر طوالت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ لمحہ، سکنڈ، منٹ، گھنٹہ، شب و روز، ماہ و سال، دہجگ .... تو ایک جگ بیت گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم متناسب اور سڈول ہو گیا۔ اس کے بازو گداز ہو گئے اور اس کے بالوں میں جنگلی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو رچ گئی۔ اس نے سوچا، یہ سب کس لئے؟ اور کیوں؟ اس نے چاہا کہ اپنے جسم کو خود اپنی زبان سے چاٹ کر تحلیل کر دے ...... اچانک اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے قلعہ کی طرح ایک مکان ہے۔ اس میں بے شمار کمرے تھے۔ اس کے صدر دروازہ میں قفل لگا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک چبوترے پر سیاہ لباس پہنے ہوئی ایک بوڑھیا بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں کنجیوں کا گچھا تھا۔ جیسے وہ وقتاً فوقتاً بجا رہی تھی۔ کمروں سے مختلف قسم کی دھیمی دھیمی آوازیں آ رہی تھیں، جس میں "چپ چپ" کی آواز نمایاں تھی۔ وہ بوڑھیا کے پاس گئی اور اس نے کہا۔ "میں سفر سے گھبرا گئی ہوں میں اس مکان میں رہنا چاہتی ہوں؟"۔ بوڑھیا نے اسے سر سے پاؤں تک بہ غور دیکھا۔ اور پھر کہا "تم اس مکان میں نہ رہو

سفر سے نہ گھبراؤ۔ بہت جلد تمہیں منزل مل جائے گی۔ سفر جاری رکھو۔" لڑکی نے کہا:

"میں اس مکان ہی کو منزل تصور کر دوں گی۔"

بوڑھیا نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور کہا "بہتوں نے یہ بات کہی ہے۔ آؤ ذرا ان کا مآل دیکھو، پھر فیصلہ کرو گی۔"

بوڑھیا نے تالا کھولا اور اُسے اندر لے کر چلی گئی۔ ایک کمرے کے دریچہ کے سامنے کھڑی ہو کر بوڑھیا نے کہا۔

"دیکھو یہاں۔"

لڑکی نے اندر جھانکا۔ ایک پلنگ پر ایک حسین و جمیل عورت دراز تھی۔ یک بیک وہ اُٹھی اور اس نے اپنے جسم سے سارے کپڑوں کو الگ کر دیا اور پھر اپنی زبان سے اپنے جسم کو چاٹنے لگی .... اور چاٹتے چاٹتے بے دم ہو کر فرش پر گر گئی۔ لڑکی نے پلٹ کر بوڑھیا کو دیکھا اور پوچھا "اب کیا ہوگا؟" اس نے کہا "یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔"

"جب تک اس کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا اور سخت نہ ہو جائے گا۔"

اس نے بوڑھیا کی جانب تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا اور وہاں سے چل پڑی۔ چلتے چلتے وہ اکتا گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک مستطیل نما چٹان تھی۔ وہ اس پر بیٹھ گئی۔ درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر دھوپ اس کے جسم کو مس کر رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اس کی نظر ایک درخت کی جڑ پر پڑی۔ جہاں ایک خوش رنگ سانپ اپنے منہ کو اپنی دم سے بنائے ہوئے گھیرے میں چھپائے دھوپ کھا رہا تھا یک بیک اس نے اپنے جسم کو لباس سے بے نیاز کر دیا اور برہنہ ہو کر چٹان پر دراز ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد سانپ اس کے پاس آیا اور اپنے پھن پھیلا کر اس کے تلوے چاٹنے لگا۔ اس کے پورے جسم میں گدگدی ہونے لگی۔ اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر سانپ اس کے سارے جسم کو چاٹنے لگا۔ اور چاٹتے چاٹتے اس کے وجود کو تحلیل کر دیا۔

.... اور پھر ایک مدت کے بعد ایک جھونپڑے کے نزدیک کچھ لوگ ایک درویش کو گھیرے کھڑے تھے۔ درویش آنکھیں بند کئے ہوئے ایک چٹان پر خاموش بیٹھا تھا۔ دفعتاً ایک بچہ کے رونے کی آواز آئی۔ درویش نے آنکھیں کھولیں اور اپنے اِرد گرد کے لوگوں سے کہا:

"بُرے دن آرہے ہیں۔"

سارے لوگ کے چہرے زرد پڑ گئے اور وہ بے چینی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ آفتاب اُفق پر سرخیوں میں لت پت کسمسا رہا تھا۔

ایک شخص نے کہا "تعجب ہے، صبح ہو رہی ہے اور آفتاب وہیں ہے، جہاں غروب ہو رہا تھا۔"

دوسرے نے کہا "صبح نہیں، شام ہو رہی ہے۔" تمام لوگ متوحش ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

درویش وہاں سے اُٹھا اور آفتاب کی سمت چل پڑا۔

بقیہ، مستثنیات

کسی کی اشتہا کا کیا منظر ہوگا۔

اے میرے خدا، جسے تو ڈرامہ کہہ کہہ کر مجھے اب تک بہلاتا رہا تھا۔ کیا یہ اُس کا آخری منظر ہے؟ میں بہر طور یہ کوشش کر رہا ہوں کہ میری اداکاری میں فرق نہ آنے پائے۔ مگر اے خدا، اب تو پردہ گرنے ہی والا ہوگا، سامعین کہاں ہیں؟ اور ہمیں کس سے داد ملے گی؟

فاروق شفق

○

رُت نئی ہم شرارتوں میں رہے
آج دن بھر قیامتوں میں رہے
ایسے گھیرے ہوئے ہے یہ دُنیا
جس طرح کوئی عورتوں میں رہے
زرد دن میں تلاش کران کو
رات بھر جو مسرتوں میں رہے
اس نے باہر ہی کب نکلنے دیا
ہم ہمیشہ حکایتوں میں رہے
سچ کے الفاظ ڈوبے ڈوبے سے
اس کی جھوٹی شہادتوں میں رہے
چاند، سورج ہماری دنیا کے
بجھتی شمعوں کی صورتوں میں رہے
ہم نے کوئی سفر کیا ہی کب
ہم تو اپنی مسافتوں میں رہے
ہم نے اوڑھا گلابی موسم بھی
پھر بھی اندر تمازتوں میں رہے
جس سے میں ہوں وہ میرے اندر ہے
جیسے فن کار مورتوں میں رہے
شام سے صبح ہو سکی نہ شفق
کچھ دنوں ایسی حالتوں میں رہے

اقبال ماہر

○

مسکراتے ہوئے ماضی کو صدا دی جائے
آج کی رات تو یادوں سے سجا دی جائے
یا دیانوں کو جنوں خیز ہوا دی جائے
پھر یہ کشتی رہِ منزل پہ لگا دی جائے
قبل اس کے کہ کوئی حادثہ ہم پر گزرے
یہ لرزتی ہوئی دیوار گرا دی جائے
کیا یہاں مصلحتِ وقت کے چوراہے پر
یہ محبت کی امانت بھی لٹا دی جائے
روز افسانہ نیا گرمیِ محفل کے لئے
گاہے گاہے نئی افواہ اُڑا دی جائے
شہرِ احباب کو توفیقِ سماعت نہ ہوئی
اجنبی راہ میں غیروں کو صدا دی جائے
میں اُفق پر ہوں چمکتا ہوا سورج ماہر
شمعِ محفل تو نہیں ہوں کہ بجھا دی جائے

نصیر پرواز

ذہنوں کا کرب، غم دلوں کی چبھن تمام
غم بجھ گیا تو عظمتِ دیوانہ پن تمام

اپنی ہی بات ہو تو کسی سے نہ کچھ کہوں
ہے میرے سامنے تو مگر انجمن تمام

اب زندگی کا کوئی نیا زاویہ نہیں
بیٹھے ہیں سر جھکائے روایت شکن تمام

بیدار کر رہا ہوں نئے ذہن کا افق
کیا غم جو بجھ گئے ہیں چراغِ کہن تمام

تو نے بھی ہر نگاہ کو مایوس کر دیا
تجھ کو بھی کھا گیا ہے ترا بانکپن تمام

ہیں ذہن و دل پہ بار ادھوری رفاقتیں
ہے اضطرابِ شوق مرا تن بدن تمام

عریاں ہے میرے سامنے صحرائے آرزو
سر پر اٹھائے پھرتا ہوں اپنا بدن تمام

رگ رگ میں بس گیا ہے سکوتِ نظر کا زہر
ڈسنے لگی ہے تلخیٔ کام و دہن تمام

بس ایک زاویے پہ ہے نظارگی کو ناز
ہنستی ہے اتفاق پہ دل کی لگن تمام

مجھ سے وہ جب ملا تھا کوئی اجنبی سا تھا
بچھڑا تو جیسے چھوٹ گئے سجان و تن تمام

میرا زوال ہے کہ ارادوں کی آبرو
پروانے ڈھونڈتے نہ رہیں بانکپن تمام

پرواز جو خلوص کی عظمت سمجھ سکے
یا رب عطا ہو اس کو ترا علم و فن تمام

نصر قریشی

دیواروں کے جسم کے اندر اک ٹوٹی دیوار لگے
اونچے مکانوں میں بھی ہم کو ہر سایہ بیمار لگے

سوکھے پتے، شاخیں برہنہ، بادل بھی پیاسے صحرا
سر پہ خیالوں کی چادر بھی اب تو سایہ دار لگے

گردِ حوادث، آگ کی بارش، قہرِ خدا، زہریلا دھواں
شہرِ زیست میں سانس بھی لینا روح پہ اک آزار لگے

دیواروں سے سر ٹکرا کر زخمی صدائیں لوٹ آئیں
اپنا مکاں بھی ہم کو اب تو جیسے کوئی کہسار لگے

لفظوں کا سیلاب، معانی کی وادی کو چاٹ گیا
حرف و صوت کی ٹوٹی کشتی کیسے دریا پار لگے

بنتی بگڑتی چند لکیریں، تحریروں کا بوجھ بنیں
میں وہ افسانہ ہوں جس کا روٹھا ہر کردار لگے

فکر و نظر کے ویرانوں میں یادوں کی خوشبو جاگی
چپہ چپہ، ذرہ ذرہ، آئینہ بردار لگے

ٹوٹتے لمحوں کے مقتل میں زندہ رہیں کس طرح نصر
ننگے سروں پر اندیشوں کی لٹکی ہوئی تلوار لگے

لیں

جذبہ جو آسمان کی رفعت نہ پا سکا
الفاظ کی صلیب سے نیچے اُتر گیا

پردے بہت دبیز تھے چہروں پہ جھوٹ کے
سچ بولنے کی آئینہ جرأت نہ کر سکا

احساس کی فصیل میں زخمی تھا ہر بدن
لب تک نہ آ سکا مرے اندر کا ماجرا

صدیوں کا بوجھ لادے ہیں پیکر تو ڑ چلیں
جو لوگ کہتے ہیں مجھے ننگِ ارتقا

سورج کے وار سہ لئے پتھر ہوا کے کھائے
خیمہ ہوں جیسے میں کسی خانہ بدوش کا

یاد آ گئے مجھے کئی چہروں کے اشتہار
"ٹو لیٹ" کا بورڈ جب کہیں دیکھا لگا ہوا

خوابوں کے جزیرے جو ویراں ہیں ظہیر
پھر مانگنے لگے ہیں تری نیند کی غذا

ظہیر غازیپوری

مرے قلم کا لہو اس قدر عیاں تو ہوا
کتابِ وقت کا ہر لفظ خونچکاں تو ہوا

یہ اور بات ہے اُردو سمجھ کے ٹال دو تم
ہمارے چہرے پہ اخبار کا گماں تو ہوا

گرفت میں کوئی سورج نہیں تو کیا غم ہے
مری نگاہ کی زد میں خود آسماں تو ہوا

یہ مانتا ہوں جلا صرف دشتِ جاں میرا
مگر دیارِ تمدن دھواں دھواں تو ہوا

یہ کم نہیں کہ چراغوں تلے پناہ ملی
ہمارے سر پہ اندھیروں کا سائباں تو ہوا

ہماری سانس کی دستک پہ چونکتے کیوں ہو
تمہارے شہر میں خود اپنا بھی مکاں تو ہوا

حقیر ریت کا ذرہ ہوں پھر بھی میرا وجود
ظہیر گہرے سمندر کا راز داں تو ہوا

آہنگ ۶/۳ ۵۴/۵

عبد الصمد

ایک اور ایک ــــــ ایک

راجندر بھاٹیہ سے کتنے دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی؟

پورے دس برس!

دس برس کا عرصہ کتنا لمبا ہوتا ہے اس کا احساس ہمیں اب جاکر ہوا تھا۔ دس برسوں نے ہم دونوں کے اندر زمین آسمان کا فرق پیدا کردیا تھا۔ کہاں دس برس پہلے کی کالج کی ہنستی کھیلتی کھلنڈری زندگی اور کہاں اب بیوی بال بچوں والی ذمہ داری!

اور کون جانے یہ ملاقات ہوتی بھی یا نہیں۔ وہ تو بس اتفاق ہی تھا جب ہم دونوں اکٹھے ہی راجگیر میں جمع ہوگئے تھے اور یہ بھی اتفاق ہی کی بات تھی کہ ہم لوگ ایک ہی ریسٹ ہاؤس میں اوپر نیچے ٹھہرے ہوئے تھے اور تین دن کے بعد بھی ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جان سکے تھے۔ وہ تو بس دعا دیجئے جاپان کو جس نے ہندوستان کو "روپ وے" (ROPE WAY) دے کر ہم دونوں کی ملاقات کا موقع فراہم کیا اور اس سے زیادہ گن گائیے ہمارے ہندوستانی انتظام کی جس کی وجہ کر دو بچھڑے ہوئے دوست ایک دوسرے سے مل سکے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ راجگیر میں بنے "روپ وے"

دیکھنے کی خواہش میری بیوی روشنی کی تھی، میری مطلقاً نہ تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کرسیاں بہت خطرناک طور پر بنی ہوئی تھیں آگے پیچھے کوئی روک نہیں تھا اور بے ہوش ہو جانے کی صورت میں نیچے کھائی میں گر جانے کا احتمال تھا۔ میں ٹھہرا شروع سے کمزور دل کا ــ راجگیر کا پروگرام اتفاقاً بنا تھا اور بے پناہ مصروفیت کے باوجود بنا تھا لیکن پروگرام میں "روپ وے" شامل نہیں تھا لیکن روشنی کی ضد کے آگے مجھے ہار ماننی پڑی کیونکہ میں ذرا صلح کل آدمی ہوں اور روشنی کو بگاڑ کر میں اپنی تفریح کا ستیاناس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ــــــ لیکن کم بخت قسمت ــــــ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ جل تو جلال تو پڑھتا ہوا اور روشنی کے ہمت دلانے پر (ظاہر ہے بیوی کے سامنے میں بزدل کیسے بن سکتا تھا!) میں اس پر چڑھ تو گیا لیکن عین اس وقت کہ ٹھیک میری کرسی کے نیچے کھائی اپنا منہ پھاڑے تھی، بجلی فیل ہوگئی ــــــ ٹھیک اسی وقت پتہ نہیں مجھ پر کس قسم کا دورہ پڑا کہ میں ساکت سا ہوکر رہ گیا۔ ذہن خالی خالی سا ہوکر آسمانوں میں سیر کرنے لگا اور پھر مجھے کچھ پتہ نہیں چلا کہ کیا ہوا۔ بجلی تو شاید جلد ہی ٹھیک

وگئی تھی لیکن روشنی بی کی ساری ہسکیٔی ختم ہوگئی تھی ۔۔ کنارے
مجھے اُتارا گیا اور سیاحوں میں سے ایک ڈاکٹر نے بڑھ کر میری نبض
دیکھنی شروع کر دی ۔ جلد ہی میں سنبھل گیا اور ہوش میں آتے ہی ڈاکٹر
سے لپٹ پڑا ۔ وہ راجندر بھاٹیہ تھا ۔ میرا برسوں کا دورافتادہ
دوست ــــــ میں نے کہا ۔

" واہ ! جئے تو یار کے کندھے پر ، جائے تو یار کے
کندھے پر ۔ "

راجندر بھاٹیہ اپنی بیوی کے ساتھ تھا اور وہ بھی تفریحاً
راجگیر آیا ہوا تھا اور اسی رسٹ ہاؤس میں تھا جس میں ہم ٹھہرے
ہوئے تھے ــــــ اُس نے مجھے اپنی بیوی سے ملایا اور
میری بیوی سے بھی مل کر وہ خوش ہوا ۔ اس کی بیوی پدمنی ایک
خاموش خاموش سی سنجیدہ لڑکی تھی اور تین بچوں کی ماں ہرگز
نہیں لگتی تھی ۔ لگتی تو روشنی بھی نہیں تھی لیکن روشنی میں وہ بات
قطعاً نہ تھی جو پدمنی میں تھی بالکل اسی طرح جس طرح پدمنی میں وہ
بات نہ تھی جو روشنی میں تھی ۔ راجندر بھاٹیہ کو پاکر ہماری تفریح
دوبالا ہوگئی تھی ۔ وہ ایک بہت ہی زندہ دل اور کھلنڈرا انسان
تھا اور ہر غم و مایوسی کو چٹکیوں میں اُڑا دیا کرتا تھا ۔ یہ عادت اس
کی اب تک برقرار تھی ۔ بھاٹیہ کالج کے کھلنڈرے لڑکوں کا لیڈر
اور تمام تفریحات اور پروگرام کا سربراہ ہوا کرتا تھا ۔ اگرچہ میری
طبیعت سنجیدہ تھی اور میں کھلنڈرے لڑکوں کے ساتھ اپنے کو ایڈجسٹ
نہیں کر پاتا تھا پھر بھی راجندر بھاٹیہ پڑھنے میں مجھ سے دبا رہتا
تھا اور میں اس کی مدد کیا کرتا تھا ۔ بات یہ تھی کہ اس کی پڑھنے
کے علاوہ بھی اور بہت سی مصروفیات تھیں اور میرا ناتا نہ صرف کتابوں
سے تھا ورنہ ایسی بات ہرگز نہ تھی کہ وہ کند ذہن تھا یا پڑھنے سے
جی چُراتا تھا ۔ بی اس سی کے بعد ہم دونوں جدا ہوگئے ۔ میں آگے
تعلیم کے لئے دہلی چلا گیا اور وہیں سے ایم ایس سی کرنے کے بعد مقابلے
کے امتحانات میں بیٹھا اور کامیاب بھی ہوا ۔ اس کے بعد میرا تقرر
کیرالہ میں ہوا اور تب سے میں وہیں مختلف محکموں سے منسلک تھا

راجندر بھاٹیہ کا مکان لکھنؤ میں تھا اور وہیں سے اُس نے ڈاکٹری
کی تعلیم حاصل کی اور پھر بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لئے غیر ممالک بھی گیا ۔
شادی بھی اس نے وہیں کی ۔ پدمنی مانچسٹر میں فلسفہ میں ڈاکٹریٹ
کر رہی تھی اور اُن لوگوں کی شادی محبت کی شادی تھی ۔

ہم لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے روف ٹاپ پہ
بنے ریسٹورنٹ کی طرف بڑھ گئے ۔ اب میں ایک ذمہ دار آئی اے ایس
افسر تھا اور راجندر بھاٹیہ لکھنؤ کا ایک مشہور سرجن بن چکا تھا ۔
اب ہم دونوں دس سال پہلے کے بلراج اور راجندر بن چکے تھے ۔
رہیں پدمنی اور روشنی ۔ تو دو ہم عمر عورتوں کو سہیلیاں بنتے کتنی
دیر لگتی ہے ۔

اور سناؤ یار ! " راجندر بھاٹیہ نے میرے ہونٹوں میں
لگے سگار کو لائٹر دکھاتے ہوئے کہا ؛

" تم نے شادی محبت کی کی' یا شادی کے بعد محبت کی ۔؟

اس کی بے ساختہ بول دینے والی عادت ابھی تک
نہ گئی تھی ۔

محبت کی بات سن کر روشنی کچھ شرما سا گئی اور میں نے
مسکراتے ہوئے جواب دیا ۔

" نہیں یار ! محبت تو ہم نے اب شروع کی ہے ۔ تمہاری
طرح پہلے ہی کیوپڈ کے شکار نہ ہوگئے تھے ۔ " راجندر بھاٹیہ نے
ایک زوردار قہقہہ لگایا ۔ اور بولا ۔

" زندگی محبت ہی سے عبارت ہے ۔۔ یہ محبت جب بھی
کی جائے کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ بہرکیف تمہاری بھابی نے میری
زندگی کو قابلِ رشک بنا دیا ہے ۔ "

پدمنی دھیرے سے مسکرا دی ۔ میں نے محسوس کیا کہ
راجندر بھاٹیہ نے خواہ مخواہ یہ بات کہہ دی ہے ۔ روف ٹاپ
سے ہم لوگ ایک ہی ٹیکسی پر ریسٹ ہاؤس آئے اور راجندر بھاٹیہ
کی ضد پر پہلے اُسی کے کمرے میں جانا پڑا ۔ وہاں پدمنی نے اپنے
ہاتھوں سے ہم لوگوں کو کافی بنا کر پلائی ۔ ۔ راجندر بھاٹیہ آتے ہی

ایک مسہری پر دراز ہو گیا تھا اور ہم لوگ کچھ دیر تک اُس سے باتیں
کر کے اپنے کمرے میں لوٹ آئے تھے۔

اور ——— پھر تو ہم لوگوں کا لطف ہی دو بالا
ہو گیا تھا۔ ہم راجگیر کی کھلی فضاؤں میں آزاد پنچھیوں کی طرح
اُڑتے پھرتے تھے ——— ہاں ہم لوگ آزاد پنچھی ہی سے
لگتے تھے جو برسوں بعد قید سے نجات پایا ہوں اور جو موقع غنیمت
جان کر اپنی تمام آزاد آرزوئیں پوری کر لینا چاہتے ہوں ۔
بچوں کو ہم اپنے رشتہ داروں کے پاس چھوڑ آئے تھے اس لئے
اس طرف سے بھی اطمینان تھا۔ روشنی اور پدمنی کو کبھی کبھی اپنے
بچوں کی یاد کا دورہ سا پڑ جاتا تھا اور ہم مرد بھی اُن سے متاثر
ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔

اس صبح و شام کے ساتھ نے مجھ پر یہ انکشاف کیا تھا کہ پدمنی
اور راجندر بھاٹیہ دو بالکل مختلف مزاجوں کے مالک تھے۔ ایک
چنگھاڑتا ہوا شور شرابے سے بھرپور دریا تھا اور دوسرا ایک
پُرسکوت اور ٹھہری ہوئی ندی تھی لیکن دونوں کا سنگم ہوا تھا۔
یہ ایک حقیقت تھی اور اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی ۔
راجندر بھاٹیہ کے مزاج سے تو میں پہلے ہی واقف تھا اور یہ بھی
ایک عجب اتفاق تھا کہ روشنی اور میرے مزاج میں بھی بڑا فرق تھا
یہ اور بات تھی کہ ہم دونوں نے اپنی اپنی جگہ سے تھوڑا تھوڑا
کھسک کر اس فاصلے کو بہت ہی کم کر دیا تھا اور وہ لوگ اپنی
اپنی جگہ برقرار تھے۔ ہمیں یہ دیکھ کر کبھی کبھی تکلیف پہنچتی تھی کہ جب
کبھی ہم لوگ چاندنی کا لطف اُٹھانے کے لئے جنگلوں میں نکل جاتے
اور اس موقع پر راجندر بھی ساتھ ہوتا تو پدمنی کے سر میں درد ہو جاتا
اور وہ کمرے ہی میں گھُسی رہتی۔ یا جب ہم لوگ بیڈمنٹن کھیلنے کا
پروگرام بناتے تو ایک ساتھی کے نہ ملنے کی وجہ کر یہ پروگرام کا ستیاناس
ہو جاتا کیونکہ پدمنی کو اس قسم کے کھیل پسند نہ تھے یا اگر پسند بھی تھے
تو وہ نہ کھیلتی تھی ——— پدمنی کو کتابوں کا شوق تھا اور راجندر
بھاٹیہ کا نظریہ یہ تھا کہ زندگی پریکٹیکل ہونی چاہئے ، کتابیں تو
تھیوریٹیکل زندگی کا درس دیتی ہیں ۔

ایسی بات نہ تھی کہ وہ لوگ وہ نہ کر سکتے تھے جو ہم نے
کر لیا تھا۔ آخر ایسا کیوں تھا کہ پدمنی اور میرے مزاج میں بڑی
یکسانیت تھی اور اسی طرح سے روشنی اور راجندر بھاٹیہ کے
مزاج ، عادات و اطوار ایک دوسرے سے ملتے تھے لیکن ہم دو
میں خوب چھڑ رہی تھی۔ کبھی کبھی تو میں مذاق سے کہہ اُٹھتا،
" بھئی راجندر ! ہم لوگوں سے محبت اور شادی دو
میں غلطی ہو گئی ہے ! "

لیکن اب تو مذاق کا رشتہ ہی ختم ہو گیا تھا وہ یوں
پدمنی نے ایک دن کہہ دیا تھا :
" مزاج میں یکسانیت تو بھائی بہن ہی میں ہوتی۔
ارے واقعی ——— پدمنی نے کتنی سچ با
کہہ دی تھی اور پھر ہم دونوں واقعی بھائی بہن بن گئے تھے اور
بھی اپنے بھائی کی بہن بن گئی تھی ——— یعنی راجندر بھاٹیہ کی
اور اُس دن اسی مقدس رشتے کی لہر تھی ناجس ۔
پدمنی کو تڑپا دیا تھا۔

قصہ دراصل یہ ہوا تھا کہ صبح ابھی ابھی ہوئی تھی سورج
اپنے پورے آب و تاب سے نکلنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ر
کو یہ جھک سوار ہوئی کہ اس وقت پہاڑوں کی سیر کی جائے اور
کے سورج کا لطف وہیں لیا جائے۔ میں ٹھہرا ذرا دیر سے اُٹھنے
ایک آئی اے ایس افسر ——— ! لیکن میری، میرے حاکم کے سا
کچھ نہ چلتی تھی ——— !

روشنی نے بڑی بے دردی سے مجھے اُٹھا دیا اور اپنی تجو
رکھی۔ میں نے کراہ کر کہا۔

" ڈارلنگ ! "

روشنی نے بڑے پیار سے کہا۔

" ڈارلنگ ——— ! ؟ "

روشنی کے لہجے میں اتنا پیار تھا، اتنی شیرینی، اتنی لطافہ

تھی تھا اس ---- اور ---- اور ---- بس میں
انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگر انکار کر دیتا تو پھر خدائی سے بھی
انکار کرنا پڑتا۔

جانے کو تو میں چلا گیا لیکن پہاڑ پر چڑھنے سے میری روح
ہمیشہ فنا ہوتی ہے ہم لوگ جس پہاڑ پر گئے تھے اس میں اوپر چڑھنے
کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور میری یہی رائے تھی کہ سیڑھیوں
سے اوپر چڑھا جائے لیکن روشنی کی ضد ---- یہ
بات روشنی کے مزاج میں داخل تھی کہ وہ سیدھا راستہ چھوڑ کر
ہمیشہ ٹیڑھا میڑھا راستہ منتخب کرتی ہے اور مجھے بھی ہمیشہ اس کا
ساتھ دینا پڑتا ہے۔ جس کا نتیجہ کبھی کبھی خطرناک بھی نکلتا ہے اور
یہی نتیجہ یہاں بھی نکلا۔ پہاڑ پر چڑھنے کے چکر میں، میں کئی بار
گرا، کئی بار لڑھکا اور ہر جگہ سے زخمی سا ہو گیا لیکن پھر بھی ہنستا
رہا۔ بہادری وغیرہ کی بات تو خیر چھوڑیئے لیکن ---- بیوی کے
سامنے میں رو بھی کیسے سکتا تھا۔ روشنی کے سہارے ریسٹ
ہاؤس پہنچا تو سب سے پہلے پدمنی سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ اور پھر
تو اس کی عجب حالت ہو گئی ---- ویسی ہی جیسی ایک
بہن کی ہوتی ہے۔ ایسی تڑپی تھی جیسے ایک بہن تڑپتی ہے اور
روشنی تھی کہ کاٹو تو خون نہیں ---- جیسے مجرم، جیسے
قاتل ---- وہ تو میں نے ہنس بول کر معاملہ رفع دفع
کر دیا ورنہ میری بہن بھی کچھ کم غصہ ور نہیں تھی۔

اور اس نے میرے دل میں محبت کی کرن پھوٹ پڑی
تھی ---- ایک بھائی کے دل میں ---- !

اُس دن راجندر بھاٹیہ اکیلے ہی راؤنڈنگ کو چلا گیا
تھا۔ غالباً پدمنی کے انکار کرنے پر اس سے کچھ اُلجھ پڑا ہو گا اور
اسی تاؤ میں ہم سے بھی نہیں کہا۔ پدمنی میرے کمرے میں چلی آئی
تھی اور رمی کا پروگرام بن گیا تھا۔ دیر تھی تو صرف اتنی کہ روشنی
سنگھار دان کے سامنے بہت دیر سے بیٹھی تھی۔ اب وہ ذرا
فرصت پالے تو کھیلا جائے! میں مسہری پر اس طرح بیٹھا تھا
کہ میرا عکس بھی آئینے میں دکھائی دے رہا تھا اور پدمنی ہم لوگوں کے
درمیان بیٹھی تھی اس طرح کہ کبھی کبھی اس کا چہرہ بھی آئینے میں جھلک
جاتا تھا۔ روشنی کبھی کبھی نظر بچا کر مجھے آئینے ہی میں آنکھ مار
دیتی تھی اور میں مسکرا دیتا تھا اور پدمنی کتنی حسرت سے روشنی کو
تک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اتنی حسرت کیوں تھی، میں
نہیں سمجھ سکا لیکن میں اُس دن راجندر بھاٹیہ سے اُلجھ پڑا تھا ----
---- راجندر جو میرا بہت ہی گہرا دوست تھا، تھوڑی
دیر تک وہ سگریٹ سے اُلجھتا رہا اور کچھ سوچتا رہا اور پھر بڑی
بڑی دھیمی آواز میں بولا (مجھے اُس سے اسی کی توقع تھی!)

" یار کیا بتاؤں! پدمنی میری بیوی ہی نہیں، محبوبہ بھی ہے
ہم لوگوں نے محبت کی شادی کی ہے۔ میں اس کے بغیر جی نہیں سکتا۔
وہ میری سب کچھ ہے ---- میری جان، میرا ایمان ---- ! لیکن
اتنے عرصے ہو گئے وہ اب تک میرے مزاج کو نہیں سمجھ سکی۔ وہ
ہر بات میں ضد پکڑ لیتی ہے اور میری مرضی کے خلاف کچھ کر ڈالنے سے
کبھی نہیں چوکتی ---- کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے
ہم لوگ پیار کا صرف ناٹک کھیل رہے ہیں ---- ڈراما!
اور تماشائی یہ در و دیوار ہیں ----

بڑی گمبھیرتا، بڑی سنجیدگی سے بول رہا تھا وہ۔ میں بھی
سوچ میں پڑ گیا اور بولا۔

" تمہیں پدمنی سے یہ شکایت ہے کہ وہ تمہارے مزاج کو نہیں
سمجھ سکی لیکن ہو سکتا ہے اُسے بھی تم سے یہی شکایت ہو ---- !؟"

" میں پدمنی کے لئے اپنی جان، اپنا ایمان، اپنا سبھی کچھ
نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔ وہ کبھی کہے تو ---- میں اس کے
ہاتھ میں خنجر دے کر سر رکھ دیتا ہوں کہ نہیں ---- ! " راجندر بھاٹیہ
بڑے جوش سے بولا۔

" یار تم تو پریکٹیکل آدمی تھے ---- تمہارے مُنہ سے
یہ نیوراٹیکل باتیں کیسے ---- ! " میں نے کچھ طنزاً کہا۔ راجندر
بھاٹیہ کچھ نہ بولا۔ صرف سگریٹ پیتا رہا اور دھوئیں کے مرغولے

چھوڑتا رہا۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے پھر کہا۔

"دیکھو مسٹر راجندر! تم تو مجھ سے واقف ہو۔ میں تو ایسا نہ تھا۔ یہ پہاڑ پر چڑھنا اور گھوڑسواری اور سیر و سیاحت اور کھیل کود — بھلا میں تو ان چیزوں کا آدمی نہ تھا لیکن اب ہوں کیونکہ روشی ان سب چیزوں کی شوقین ہے۔ روشی کتابوں سے بہت بھاگتی تھی۔ اُسے ناول، افسانے اور شعر و شاعری سے خدا واسطے کا بیر تھا لیکن اب وہ میرے مضامین کی سب سے سخت تنقید نگار ہے۔ جہاں میں ہوں وہاں کے ادبی مجلسوں کی صدارت روشی ہی کے ذمہ ہے۔ اب بتاؤ، یہ سب کیسے اور کیونکر ہوا — ؟"

"بھئی میں کیا بتاؤں — پدمنی کبھی مجھ سے کھل کر باتیں کرے تو کہوں — واقعی تم لوگوں کی زندگی قابل رشک ہے۔"

راجندر بھاٹیہ کچھ ہار مانتے ہوئے بولا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا مرض لاعلاج ہوتا جا رہا ہے اور مجھے اُس پر رحم آنے لگا۔

اتفاق سے اُسی روز میرا ایک دُور افتادہ دوست آفتاب مل گیا وہ پاس کے گاؤں کا ایک بڑا کاشت کار تھا۔ مقابلے میں میرے ساتھ تھا اور ناکامی کے بعد کھیتی کرنے لگا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کا مکان یہیں کہیں آس پاس ہے۔ وہ راہگیر اپنی کسی ضرورت سے آیا تھا۔ ہم لوگ ملے تو ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ وہ زبردستی مجھے اور روشی کو اپنے گاؤں لے گیا۔ میں نے بہت چاہا کہ راجندر اور پدمنی بھی چلیں لیکن پدمنی تیار نہ ہوئی میں نے بھی اس خیال سے زیادہ ضد نہیں کیا کہ ان لوگوں کو تنہائی کی زیادہ ضرورت تھی!

آفتاب کے گاؤں کی فضا مجھے بہت اچھی لگی۔ سیدھے سادے معصوم لوگ، گھٹن اور حبس سے کوسوں دُور کھلی اور بے باک ہوا اور فضا — نہ جھگڑا نہ پولیس نہ تھانہ — شاید جنت یہی ہوگی لیکن نہیں، یہاں تو انسان ہیں، جنت میں انسان کہاں ہوں گے وہاں تو فرشتے ہوں گے!

آفتاب نے اپنے گاؤں ہی کی ایک لڑکی سے شادی کر لی تھی اور بڑی خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا۔

دو تین روز کے بعد ہم واپس آئے تو عجب ماجرا دیکھا۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے راجندر بھاٹیہ کے کمرے کے دروازے پر ہم لوگ ٹھٹک سے گئے۔ دروازے پر پردہ گرا ہوا تھا اور اندر سے سسکنے کی آوازیں آ رہی تھیں! ایک لمحے کے لئے ہم لوگ سن سے رہ گئے۔ اسی لمحہ راجندر بھاٹیہ سگریٹ سلگاتا ہوا نکل آیا اور مجھے دیکھ کر ہاتھ پکڑے ہوئے میرے کمرے کی طرف بڑھا اور پریشان لہجے میں کہنے لگا۔

"یار کیا بتاؤں — پدمنی بس روئے جا رہی ہے — جس دن سے تم لوگ گئے ہو بس رونے کی دھن سوار ہے۔ کیا بتاؤں —!"

"آخر بات کیا ہے۔؟"

میں نے سگار کو لائٹر دکھایا۔

"بات تو کچھ نہیں — بس ضد سوار ہے کہ واپس چلو۔ میں نے ہزار کہا۔ بابا۔ بلراج اور روشی کو تو آنے دو اب تم ہی کچھ کرو۔ نہیں تو یار میں چلا جاؤں گا۔!"

راجندر بھاٹیہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے روشی کو پدمنی کے پاس بھیج دیا اور سگار کی راکھ چٹکی سے جھاڑتے ہوئے راجندر سے بولا۔

"دیکھو یار! — میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔ زندگی کا سمبل ایک، آدھا اور آدھا مل کر ہی پورا ہوتا ہے۔ جس دن تم لوگ اس بات کو سمجھ لوگے سمجھو تمہیں زندگی کا نروان حاصل ہو گیا۔"

"یار — تم تو صرف نصیحتیں کرنے لگتے ہو۔"

راجندر بھاٹیہ نے کہا۔ مَیں صرف مسکرا دیا اور سگار کے خوشبودار مرغولے راجندر کے منہ پر چھوڑتا رہا اتنے میں روشی پدمنی کو لے فتح مندی کے احساس سے مغلوب مُسکراتی ہوئی لوٹ آئی پدمنی نے منہ ہاتھ دھو کر ہلکا سا میک اپ کر لیا تھا اور ایک

آسمانی رنگ کی ساڑی باندھ لی تھی۔ راجندر پدمنی کو دیکھ کر [illegible] اٹھا اور ہم لوگوں کا پروگرام فوراً پارک کی سیر کا بن گیا۔ میری خواہش نہ تھی لیکن چونکہ سبھوں کی خواہش تھی اس لئے ایک کی خواہش کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ پارک بہت بڑا تھا اور ریسٹ ہاؤس کے نزدیک ہی تھا، بہت خوب صورت پارک تھا۔ بہت سے درخت، بہت سے نایاب پھولوں کی کیاریوں کے بیچ ایک حسین سی جھیل تھی جس میں ایک کشتی پڑی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے کچھ دیر تک کشتی میں جھیل کی سیر کی۔ پھر ——— اور پھر جیسے ہم لوگ اپنی عمروں کی تمام پچھلی دہلیزیں پھلانگ گئے۔ اب ہم لوگ صرف لڑکے، لڑکیاں رہ گئے جو اسکول کے بعد میدان میں قلانچیں بھرتے پھرتے ہیں۔ ہم لوگوں نے بچپن کے تمام کھیل دہرا ڈالے۔ اس وقت کوئی دیکھتا تب کہتا۔ ہنسی آتی ہے کیسے ہو گئے تھے ہم لوگ۔ اور سب سے زیادہ تعجب کی بات تھی کہ پدمنی بھی ان تفریحوں دل کھول کر حصہ لے رہی تھی جیسے غبار چھٹ گیا تھا اور فضا کھلی اور صاف ہو گئی تھی!

کھیل ہی کھیل میں ایک عجب گڈمڈ سی بات ہو گئی۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے پیچھے دیوانہ وار بھاگنے لگے۔ میں، راجندر بھاٹیہ، روشنی اور پدمنی ——— کبھی وہ، کبھی وہ، کبھی وہ اس کے پیچھے، کبھی وہ اس کے پیچھے ——— اتنے میں پدمنی ایک بڑے درخت کے پیچھے چھپ گئی اور راجندر کو پکارنے لگی۔ راجندر بھاٹیہ بھی ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا اور پدمنی کو پکارنے لگا۔ اب میں اور روشنی اکیلے رہ گئے۔ میں نے دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پکارتے رہے اور ہم لطف اندوز ہوتے رہے۔ جب کافی دیر ہو گئی اور ہم نے دیکھا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہے ہیں تو میں دوڑ کر راجندر کی طرف چلا گیا اور روشنی، پدمنی کی طرف۔ اور ہم لوگوں نے دونوں کو پکڑ کر تھوڑے فاصلے پر کھڑا کر دیا۔ پتہ نہیں کون سا جذبہ تھا جس سے مغلوب ہو کر دونوں دوڑے اور ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ہم دونوں کی پروا کئے بغیر ——— اور لپٹے رہے!

دوسرے دن ناشتے سے فارغ ہو کر میں کھڑکی کے سامنے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور روشنی کچھ گنگناتے ہوئے آئینے کے سامنے بیٹھی تھی کہ پدمنی اور راجندر بھاٹیہ کمرے میں آ گئے۔ دونوں کہیں جانے کی تیاری میں معلوم ہوتے تھے۔ راجندر بھاٹیہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"مسٹر مجسٹریٹ ——— ہم لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کل جس فاصلے پر آپ نے ہم لوگوں کو لا چھوڑا تھا اُسے ہم برقرار رکھیں گے ——— اور اس وقت ذرا گرم کنڈ میں نہانے جا رہے ہیں!"

پدمنی نے تھوڑا سا گھونگھٹ نکال لیا تھا اور کچھ شرمائی شرمائی سی لگ رہی تھی۔ دونوں فوراً چلے گئے۔ میں کھڑکی سے ان لوگوں کو دیکھتا رہا ——— دونوں پگڈنڈی کے راستوں ہوا کے دوش پر چلے جا رہے تھے ——— دور اور دور ——— بہت دور ——— پہاڑوں کے دامن میں کھوئے جا رہے تھے اور وہ یوں تو دو تھے لیکن اب ایک معلوم ہو رہے تھے ——— ! ——— ———

تبصرے

نذرِ سجاد

مرتبہ: عبدالقوی دسنوی سیفیہ کالج بھوپال

جناب عبدالقوی دسنوی نے "نذرِ سجاد" کے نام سے ڈیمائی سائز پر غالباً سیفیہ کالج میگزین کا خاص نمبر شائع کیا ہے۔ غالباً اس لئے کہ اسے کہیں پر کالج میگزین کا خاص نمبر بتایا نہیں گیا ہے۔ صرف "معاون طلبا" میں چند نام دیکھ کر یہ قیاس ہے کہ یہ کالج میگزین کا نمبر ہے۔

یہ نمبر بڑی محنت اور باریک بینی سے تیار کیا گیا ہے۔ چار سو صفحات کا یہ خاص نمبر پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جو کسی نہ کسی طرح بانیٔ سیفیہ کالج جناب ملا سجاد حسین مرحوم کی شخصیت و خدمات سے متعلق ہیں۔

"نذرانۂ عقیدت" کے تحت خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے

"ذکرِ جمیل" کے تحت بانیٔ سیفیہ کالج کے رشتہ دار احباب وغیرہ کی وہ یادیں ہیں جو جناب ملا سجاد حسین مرحوم کی شخصیت کے متفرق اور مختلف پہلوؤں سے متعلق ہیں۔

"تعمیر" کے عنوان سے جو باب ہے اُس میں کالج کی تفصیلات وغیرہ ہیں۔

"ماحول" کے عنوان سے جو باب ہے وہ بھوپال کی تاریخ ماضی اور حال کے احوال سے متعلق ہے۔

"مطالعہ" باب کے تحت 'سیاسیات' اور 'خطوطِ غالب' دو مضامین ہیں۔

اس نمبر کی کوئی قیمت کہیں پر درج نہیں۔ غالباً یہ برائے فروخت نہیں ہے اور کالج کے طلبا اساتذہ اور محمد ردو ل کے لئے ہی ہے۔

نام کتاب: **گناہ کا رشتہ** (افسانوں کا مجموعہ)
مصنف: مانک ٹالہ
پبلیشر: خود مصنف
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ۔ دہلی
قیمت: چھ روپئے

اٹھارہ کہانیوں کا یہ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

مانک ٹالہ کا نام نیا نہیں ہے۔ کہانیاں پڑھنے والے اُن کا نام جانتے ہیں۔

مختلف ادبی رسائل میں مانک ٹالہ کی کہانیاں آتی رہی ہیں اور پسند کی جاتی رہی ہیں۔ یہ اچھا ہوا ہے کہ ان کی کہانیوں کا مجموعہ منظرِ عام پر آگیا۔ کیوں کہ کئی کہانیاں ایک ساتھ پڑھنے ہی کوئی مستحکم رائے کسی افسانہ نگار کے بارے میں قائم ہو سکتی ہے۔

اٹھارہ کہانیوں کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مانک ٹالہ کو کہانیاں لکھنا آتا ہے۔ بے ساختگی اور وارفتگی ان کہانیوں میں وافر ہے۔

جدید افسانہ نگاری کا رجحان 'انور' کی تلاش ہے۔ مانک ٹالہ کے افسانوں میں یہ رجحان بھی ہے۔ ابہام برائے ابہام سے گریز کر کے مانک ٹالہ نے ترسیل کے فرض کو بھی پورا کیا ہے یہ کہانیاں پڑھنے کے قابل ہیں۔

نام کتاب: **دائرہ دائرہ** (شعری مجموعہ)
شاعر: رونق نعیم
ناشر: پُسپتا ۱۰۱ کادیہ گھاٹ روڈ۔ شیب پور ہوڑہ
قیمت: چار روپیے۔

یہ شعری مجموعہ ہندی اور اُردو دونوں میں ہے اسے خوب صورت انداز سے چھاپا گیا ہے اور کاغذ بہت عمدہ

استعمال کیا گیا ہے۔ لکھائی بھی اچھی ہے۔

رونق نعیم ایک باشعور اور ٹھہر ٹھہر کر کام کرنے والے شاعر ہیں۔ شاعری کے اسرار و رموز کو انہوں نے وجدان کے توسط سے جانا اور پہچانا ہے۔ صنعتی علاقے کے گھناؤنے پن سے واقف ہیں۔

چھوٹی نظموں میں بڑی باتیں اور شاعرانہ باتیں کہہ کر جانے والے اس شاعر کا مجموعہ لائق مطالعہ ہے۔

کلام حیدری